بسم الله الرحمن الرحيم

انتخاب
تفسیر المیزان

(جلد: 4)

تالیف و تصنیف:

علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

☆☆☆☆☆

مترجم:

علامہ سید افتخار حسین نقوی النجفی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں!

تعارف

نام کتاب:	انتخاب تفسیر المیزان
تالیف:	علامہ محمد حسین طباطبائیؒ
ترجمہ و حاشیہ:	سید افتخار حسین نقوی النجفی
معاونت:	مولانا محمد نقی
کمپوزنگ و فارمیٹنگ:	شاہد علی جعفری
فنی معاونت:	قرآن سنٹر، لاہور
جلد:	چہارم
ناشر:	مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر لاہور: 042-37211214

معراج کمپنی لاہور: 042-37361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد: 0333-5234311

فہرست

سورہ نحل 45

سورہ کے مطالب 45

امر خدا 45

رُوح کا معنی 46

اللہ کا بلند مقام 48

انسان کی ناسپاسی کی ملامت 49

انسان کے لیے جانوروں کی خلقت 49

جانوروں کا فائدہ 50

اللہ کا سیدھا راستہ 51

نباتات میں اللہ کی نشانیاں 53

اللہ کی وحدانیت کی نشانیاں 54

رنگ برنگ نباتات اللہ کی نشانیاں 55

سمندر کے فوائد 57

پہاڑوں، نہروں اور راستوں کے فوائد 57

ستارے اللہ کی وحدانیت کی نشانی 58

سابقہ آیات کا نتیجہ 59

اللہ تعالیٰ کی بے حساب نعمتیں 59

علم الٰہی 60

غیر خدا کسی چیز کے خالق نہیں.. 61

مشرکین کے معبود غیر زندہ موجودات 61

اللہ کی ربوبیت کے دلائل کا نتیجہ... 63

اللہ کا علم اور آگاہی 63

مشرکین کی بات.. 64

اچھی یا بری سنت ڈالنے کا اجر یا سزا... 65

خدا اور رسولؐ کے منکرین کا انجام 66

اُخروی عذاب 67

موت کے وقت کافروں کی حالت... 68

کافروں سے گفتگو 68

اہل تقویٰ کی خصوصیات.. 69

متقین کا اجر و پاداش 71

موت کے وقت متقین پر فرشتوں کا سلام 71

ظالموں کا انجام 72

برے اعمال کی سزا.. 73

کافروں کی بے تکی بات... 74

رسولوں کا بھیجا جانا الٰہی سُنت 76

ہدایت دینے کا اختیار پیغمبر کے پاس نہیں...................................... 78

مشرکین کی جھوٹی قسمیں.. 78

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا مقصد 79

اللہ کا ارادہ 80

اللہ کی راہ میں ہجرت کا ثمر 81

صبر کرنے والے 82

اہل ذکر سے سوال 83

قرآن کے نزول کا سبب 84

سازشیوں کو دھمکی 86

سرکشوں کے لیے عذاب الٰہی 87

ظالم عذابِ الٰہی سے بچ نہیں سکتے 88

مخلوقات کا اللہ کو سجدہ 89

ہر شئے کا اللہ کے حضور سجدہ کرنا 90

فرشتوں کی حالتِ اطاعت 92

بخشش کی اُمید اور عذاب کا خوف 93

آسمانوں اور زمین کی مالکیت 94

ساری نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں 95

تکلیف دور ہونے پر انسان کی ناسپاسی 96

نعمات الٰہی کی ناسپاسی کا انجام 97

رزق کے معاملے میں مشرکین کا شرک 98

اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دینا 99

مشرکین کی بیٹیوں سے نفرت 100

آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کی مثال 102

صفات کمالیہ کا اللہ کے ساتھ خاص ہونا.......... 103
گناہگاروں کو معین مدت تک مہلت.......... 105
مشرکین کا غلط فیصلہ.......... 106
سابقہ اُمتوں میں اللہ کے رسول.......... 107
قرآن نازل کرنے کا مقصد.......... 108
آسمان سے پانی کا اُتارا جانا.......... 108
جانوروں میں معاد کی نشانی.......... 110
پھلدار درختوں میں اللہ کی نشانیاں.......... 111
شہد کی مکھی.......... 112
شہد کی مکھی کو شہد بنانے کی ہدایت.......... 113
انسان کی زندگی کے مراحل.......... 115
رزق میں بعض انسانوں کی برتری کی حکمت.......... 116
بیویاں اور اولاد اللہ کی نعمتیں.......... 118
خود ساختہ معبودوں کے پاس کسی چیز کا اختیار نہیں.......... 119
اللہ کے لیے مثالیں پیش کرنا.......... 120
ایک غلام کی مثال.......... 121
دو آدمیوں کی مثال.......... 122
پوشیدہ امور کے بارے علم الٰہی.......... 124
عالَم جہل میں انسان کی ولادت.......... 125
فضا میں پرندوں کی پرواز اللہ کی نشانی.......... 127

انسان کی ضروریات.......................................128
اللہ کی بے حساب نعمتیں.......................................129
رسول اللہؐ کی ذمہ داری.......................................131
نعمات الٰہی کا انکار.......................................132
روز قیامت، روز جزا.......................................132
گناہگاروں کے عذاب میں تخفیف نہیں.......................................133
خیالی معبودوں کی عبادت کرنے والوں کو جواب.......................................134
قیامت میں کفار و مشرکین کی حالت.......................................135
کفر کے سربراہوں کے لیے دگنا عذاب.......................................136
ہر اُمت کا گواہ.......................................137
انصاف، بھلائی اور نیکی کا حکم.......................................138
عہد و پیمان کی وفاداری.......................................141
قسمیں توڑنے والوں کی مثال.......................................143
لوگوں کے اختلافات کی حکمت.......................................144
قسموں سے سوء استفادہ کرنے کی ممانعت.......................................146
عہد الٰہی کو تھوڑے داموں بیچنے سے منع.......................................147
اللہ کے ہاں نیک عمل کا اس سے بہتر اجر.......................................148
صالحین کے لیے بہترین زندگی.......................................149
تلاوت قرآن کے وقت شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا.......................................151
مومنین پر شیطان کا تسلط نہیں.......................................152

مشرکین پر شیطان کا غلبہ................................ 152
نسخ آیت کی حکمت................................ 154
رُوح القدس کا قرآن لانا................................ 155
پیغمبر اکرمؐ پر مشرکین کی تہمت................................ 156
کفار قابل ہدایت نہیں................................ 158
جھوٹی تہمتیں لگانے والے بے ایمان لوگ................................ 158
ایمان کے بعد کافر ہونے والوں پر غضب الٰہی................................ 159
غضب الٰہی کی وجہ................................ 160
دُنیا پرستوں کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہریں................................ 161
آخرت کا گھاٹا................................ 162
اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کا اجر................................ 163
روزِ قیامت، روزِ جزاء................................ 164
پرامن بستی کی مثال................................ 165
ظلم اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ................................ 166
حلال و طیب روزی پر اللہ کا شکر................................ 167
کھانے پینے کی حرام چیزیں................................ 168
بغیر دلیل کسی چیز کو حلال یا حرام کہنے سے منع................................ 169
یہودیوں پر حرام چیزیں................................ 170
بخشنے والا اور مہربان اللہ................................ 172
حضرت ابراہیمؑ کا تعارف................................ 174

ابراہیمؑ کا شکر 175

ابراہیمؑ کے لیے دُنیا و آخرت کی خوبی 176

پیغمبر اکرمؐ کو ابراہیمؑ کی پیروی کا حکم 176

یہودیوں کا رویہ 177

رب کی طرف دانشمندی سے بلانے کا حکم 178

تکلیف کے برابر بدلہ 180

رسول اللہؐ کو صبر کی تلقین 181

اللہ کی توفیق پر اظہار تشکر 182

سورۃ الاسراء 184

سورہ کے مطالب 184

سبحان 185

اسراء 185

مسجد الاقصیٰ 185

معراج کی غرض 186

جسمانی معراج 186

الکتاب 187

کتاب وسیلہ ہدایت 187

کتاب بھیجنے کا ہدف 188

وکیل سے مراد 188

ذریت.. 189

نوحؑ کی کشتی.. 189

وفائے عہد.. 189

اللہ کا حتمی فیصلہ.. 190

بنی اسرائیل کا فساد.. 191

بنی اسرائیل کا دوبارہ اقتدار.. 192

بنی اسرائیل کی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کا سبب.. 193

بنی اسرائیل کا دوسرا فساد.. 193

بنی اسرائیل کے لیے اُمید کی ایک کرن.. 194

قرآن کی خصوصیت.. 195

قرآن کا وعدہ.. 195

عمل صالح بجالانے والے.. 196

آخرت پر ایمان کی اہمیت.. 197

انسان کی کمزوری.. 197

انسان کی بہتری.. 198

انسان کو تنبیہ.. 198

دن اور رات اللہ کی نشانیاں.. 199

طائر اور انسان کا عمل.. 200

قیامت کے دن اعمال نامہ.. 202

ہدایت و گمراہی کا نتیجہ.. 203

اللہ کا قانون 204

عقل کی اہمیت 204

کسی قوم کی ہلاکت کے اسباب 205

قَرن سے مراد 206

اللہ کا قانون 206

عاجلہ سے مراد 207

دُنیا کی خواہش 207

آخرت کے طالب 208

اللہ کی امداد 210

بعض لوگوں کی بعض پر برتری کا قانون 212

غیر اللہ کو معبود بنانے کا نتیجہ 213

عبادت کے بارے الٰہی قانون 214

والدین کے ساتھ احسان 215

خاندانی تعلقات کی اہمیت 215

بڑھاپے میں احترامِ والدین کی تاکید 216

ماں باپ کے لیے دُعا 217

بندوں پر اللہ کی مہربانی 218

حق اور تفضل کا فرق 219

تین گروہوں کا حق 219

تبذیر 220

شیطان کے ساتھی 221
انفاق نہ کر سکنے کی صورت میں 222
بندھے اور کھلے ہاتھوں کا مفہوم 223
انفاق میں درمیانہ روی کا حکم 223
رزق کی وسعت اور تنگی کا معیار 224
تنگ دستی کے خوف سے اولاد کو قتل کرنا 225
زنا کی ممانعت 226
انسان کی جان اور مال کا احترام 227
مقتول کے وارث کا حق 228
زمانہ جاہلیت کا رواج 228
یتیم سے مراد 229
یتیم کا مال کھانا 229
یتیم کے مفادات کا خیال رکھنا 229
عہد و پیمان کی وفاداری 230
ناپ تول کا قانون 230
عمل کی بنیاد آگہی پر رکھی جائے 232
علم کے ذرائع 232
متکبرانہ چال کی ممانعت 233
اللہ کی جانب سے ممنوعہ امور 235
فرعی و شرعی احکام 236

مشرکین کے متعلق اللہ کا بیان.. 237

قرآن کی خصوصیت.. 237

مشرکین پر احتجاج.. 238

اللہ کی عظمت و برتری.. 239

تمام موجودات کا تسبیح کرنا.. 240

تمام موجودات کا باشعور ہونا.. 241

اللہ حلیم و غفور ہے.. 242

روز جزا کا انکار.. 243

قرآن سننے پر کفار کی کیفیت.. 244

کافروں کا قرآن سن کر مسلمانوں کے بارے بیان.. 245

رسول اللہؐ سے خطاب.. 245

مشرکین کا اپنی طاقت کا اللہ کی قدرت سے تقابل.. 246

معاد کے منکرین کے لیے جواب.. 248

قیامت کا دن.. 249

موت اور دوبارہ زندہ ہونے پر لوگوں کا بیان.. 249

مومنین سے خطاب.. 250

اللہ کا رحمت کرنے یا عذاب دینے کا اختیار.. 251

خدا کا سارے حالات سے آگاہ ہونا.. 252

انبیاء میں برتری.. 252

اللہ کے سوا دوسروں سے مدد طلب کرنا.. 253

مشرکین کی خواہشات 254
اسلام میں توسل کا نظریہ 254
قیامت سے پہلے سب کی موت 256
اللہ کا معجزات اور آیات کو بھیجنا 257
پیغمبر اکرمؐ کا خواب اور شجرہ ملعونہ 259
اللہ کی سنت 260
ابلیس کا انکار 261
شیطان کا گستاخانہ انداز 262
ابلیس کے لیے مہلت 263
ابلیس کے لیے کھلی چھٹی 264
انسان کے مال و اولاد میں شیطان کی شراکت داری 264
ابلیس کے وعدے 265
بندگانِ خدا 266
اللہ کا اپنے بندوں پر مہربان ہونا 266
اللہ کا نافرمانوں کے لیے واضح بیان 267
نافرمانوں کے لیے مزید بیان 268
انسان پر اللہ کا انعام اور انسان کی ناشکری 269
قیامت کا منظر نامہ 271
امام سے مراد 272
قیامت میں ظلم کی نفی 273

دُنیا کے اندھے آخرت کے اندھے...................................273
مشرکین کی آرزو اور شرارتیں...274
عصمت کا انتظام...275
پیغمبر اکرمؐ کو تنبیہ..276
رسول اللہؐ کا مکہ سے اخراج کا نتیجہ...................................277
اللہ کا قانون...277
نماز کے اوقات اور نماز کا قیام...278
نماز صبح کا مشہود ہونا..278
نماز شب کی اہمیت...279
رسول اللہؐ کی دُعا...280
حق کا غلبہ اور باطل کا خاتمہ..281
قرآن کی خصوصیت...281
دلوں کا کمال...282
ایمان سے مراد...283
قرآن ظالموں کے لیے نقصان دہ...283
انسان کا مزاج...284
خیر و شر کی نسبت...285
اخلاقیات کا تقاضا...287
اللہ کا ظاہر و باطن سے آگاہ ہونا...287
رُوح سے مراد...288

رُوح کے بارے میں مخلوق کا علم.......... 290

اللہ کی قدرت 290

قرآن کی برتری.......... 291

قرآن کے بیانات کی خصوصیات.......... 292

کفار مکہ کے مطالبات.......... 294

کفار کی جانب سے طلب کیے گئے معجزات.......... 294

انسانوں میں سے رسول کا ہونا 296

اللہ کا فیصلہ ہدایت دینے والے کے بارے 297

دو اہم مطلب.......... 297

زمین والوں کی ہدایت کا وسیلہ.......... 298

بت پرستوں کا خیال اور زمینی حقائق.......... 298

اللہ کی گواہی.......... 299

اتمام حجت بر مشرکین 301

جہنم کافروں کے لیے کیوں؟.......... 302

معاد کا انکار کرنے والوں کو جواب.......... 303

خلقت بعدی کا خلقت اولیٰ کے مثل ہونا.......... 303

خداوند قادر ہے.......... 303

کافروں کی توبیخ 304

حضرت موسیٰؑ کے معجزات 305

موسیٰؑ اور فرعون کا مکالمہ.......... 306

فرعون کا موسیٰؑ کے بارے فیصلہ............ 307
بنی اسرائیل کے بارے اللہ کا فیصلہ............ 308
وعدہ آخرت............ 308
قرآن کی خصوصیت............ 309
رسول اللہؐ کی خصوصیات............ 309
قرآن کا نزول............ 310
قرآن کا اعتراف کرنے والے............ 311
قرآن کے منکروں سے دوٹوک بات............ 311
بعثت کا یقینی ہونا............ 312
اللہ کے اسماء............ 312
اللہ کے اسماء بارے وضاحت............ 313
اللہ کی ذات بارے............ 313
اسماء الحسنٰی کی اقسام............ 313
اللہ کے اسماء الحسنٰی............ 314
بت پرستوں کا رویہ............ 314
نماز کے بارے حکم............ 315
اللہ ہی لائق حمد کیوں؟............ 316
اللہ کی کبریائی............ 317
سورۃ الکھف............ 319

سورہ کے مطالب 319
کتاب کا تعارف 319
اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی وجہ 319
قرآن کے نزول کی مصلحت 320
قرآن کے اہداف 321
خدا کی طرف بیٹے کی نسبت دینا 322
رسول اللہؐ کیلئے تسلی اور زندگی کی حقیقت 323
مومن و کافر کا فرق 324
رسول اللہؐ کے لیے تسلی 325
یہودیوں کی طرف سے مشرکین کو یاد کرائے گئے سوالات 326
اصحاب کہف کا واقعہ 327
اصحاب کہف کے لیے اللہ کی امداد 328
اصحاب کہف کو بیدار کرنے کا مقصد 328
ہدایت یافتہ جوان 329
اصحاب کہف کی خصوصیات 330
اللہ تعالیٰ کا انعام 331
مومن جوانوں کا اپنی قوم کے بارے بیان 331
دو جوانوں کی گفتگو 332
غار کے حالات 333
اللہ کی نشانیاں 334

غار کے اندر کے حالات 335
اصحاب کہف کا کتا 335
اصحاب کہف کو لمبی نیند سلانے کا مقصد 336
اصحاب کہف کے جاگنے کے بعد 337
اصحاب کہف کی تعداد 338
احتیاط سے کام لینے کی وجہ 338
اصحاب کہف سے لوگوں کی آگہی 340
لوگوں میں اصحاب کہف بارے اختلاف 341
اصحاب کہف کی تعداد بارے لوگوں کا اختلاف 342
قرآنی تعلیمات سے ایک اہم امر 343
اللہ کی یاد 344
غار میں اصحاب کہف کے قیام کا عرصہ 344
اللہ کا فیصلہ حتمی ہے 345
اللہ کی جانب سے دو دلیلیں 346
رسول اللہؐ کے لیے تسلی 347
رسول اللہؐ کو تبلیغ دین میں صبر کی تلقین 348
رسول اللہؐ کے لیے خصوصی ہدایت 349
اُمیہ بن خلف کے متعلق رائے 349
کفار کے لیے واضح اعلان 351
صاحبان ایمان کی جزاء کا وعدہ 352

مومنین کے لیے انعامات.................................... 353
ایک باغ کی مثال.................................... 354
باغ کے مالک کا انداز گفتگو.................................... 355
متکبر کا انجام.................................... 356
صاحب باغ کا قیامت سے انکار.................................... 357
انسان کو اپنی خلقت یاد رکھنی چاہیے.................................... 357
مومن مرد کی گفتار.................................... 359
نعمت الٰہی کا کفران کرنے والے کا انجام.................................... 361
کفران نعمت کرنے والے کا کوئی مددگار نہیں.................................... 362
اللہ کی مالکیت و حاکمیت.................................... 362
دُنیاوی زندگی کے لیے دوسری مثال.................................... 364
دُنیاوی زندگی کی مثال.................................... 364
دُنیا کا مال و متاع.................................... 365
قیامت بپا ہونے کا منظر.................................... 366
مشرکین کے حالات کا بیان.................................... 367
قیامت کے دن اللہ کا اعلان.................................... 368
قیامت کے دن اعمال نامہ.................................... 369
گناہگار اپنا اعمال نامہ دیکھیں گے.................................... 370
فرشتوں کی اطاعت کرنا اور ابلیس کی سرکشی.................................... 371
انسانوں کے لیے نصیحت.................................... 371

مشرکین کی مذمت.......................................372
اُمور کی تدبیر میں ولایت.......................................372
مشرکین کا اپنے معبودوں سے رابطہ کٹ جانا.......................................374
مجرمین کا ٹھکانہ.......................................375
حقیقت شناسی کے لیے نمونے.......................................375
لوگوں کی ہٹ دھرمی.......................................376
رسول اللہؐ کے لیے حوصلہ و تسلیت.......................................377
بڑا ظلم.......................................378
عذاب میں تاخیر.......................................379
اللہ کا ستم گاروں کے بارے قانون.......................................380
موسیٰؑ کا اپنے شاگرد سے مکالمہ.......................................380
مچھلی کا بھولنا اور مچھلی کا زندہ ہونا.......................................381
موسیٰؑ کا کھانا طلب کرنا.......................................382
بھولنے کی نسبت شیطان کی طرف دینا.......................................383
موسیٰؑ کے لیے علامت.......................................384
اللہ کی خصوصی رحمت.......................................384
علم لدُنی سے مراد.......................................385
حضرت خضرؑ کے بارے.......................................385
حضرت موسیٰؑ کی عالم ربانی سے درخواست.......................................386
بے صبری کی وجہ.......................................387

صبر و برداشت کا وعدہ.. 387
عالم ربانی کی تعلیم کے لیے شرط.. 388
شاگردی کے آداب.. 388
حضرت خضرؑ (اُستاد کی جانب سے ادب کالحاظ).. 390
حضرت موسیٰؑ کی پہلی کلاس.. 390
حضرت موسیٰؑ کا بے محل سوال کرنا.. 391
حضرت موسیٰؑ کا معذرت چاہنا.. 392
کشتی میں سوراخ کے بعد بچے کا قتل.. 392
خضرؑ کا موسیٰؑ کے لیے جواب.. 393
تیسری بات سوال کرنے پر فراغت.. 394
حضرت خضرؑ کا بغیر اجرت لیے دیوار بنانا.. 394
حضرت خضرؑ کا موسیٰؑ کو فارغ کرنے کا اعلان.. 395
کشتی کو عیب دار بنانے کا فلسفہ.. 396
لڑکے کو قتل کرنے کا فلسفہ.. 397
نیک شخص کا بدلہ.. 398
خضرؑ کے جوابات کے تناظر میں سبق.. 399
خزانہ جو پوشیدہ تھا اس کے متعلق.. 400
جناب ذوالقرنین کا قصہ.. 401
ذوالقرنین کا سفر.. 402
ظالموں کے ساتھ رویہ.. 402

ظالم کے لیے سزا اور نیک کے لیے جزاء 403
ذوالقرنین کا فیصلہ 403
مشرق کی جانب سفر 404
اللہ کی عطا 405
دو پہاڑوں کے درمیان کا واقعہ 405
یاجوج ماجوج کا قصہ 406
ذوالقرنین کا دیوار بنانے پر آمادگی کا اظہار 407
دیوار بنانے کا سامان 408
دیواروں کی مضبوطی 408
اللہ کی رحمت کا تذکرہ 409
قرآن کی پیشن گوئی 409
کافروں کی حالت کا بیان 410
غیر اللہ کو سرپرست وولی بنانا 411
مشرکین کے نام پیغام 412
مومنوں کی قیامت کے دن حالت 414
اللہ کے کلمات 415
انوار عالم کلمتہ اللہ ہیں 416
اللہ کا رسول بشر ہے 418
سورۂ مریم 420

اس سورت کے مطالب 420
حروف مقطعات سے با معنی جملہ 421
زکریاؑ کی دُعا کا قبول ہونا 422
حضرت زکریاؑ کی دعا 423
اللہ سے وارث کی درخواست 423
حضرت زکریاؑ کی خواہش 424
زکریاؑ کی دُعاء کی قبولیت 425
بیٹے کی بشارت پر زکریاؑ کی حیرت 426
اللہ کا اپنی قدرت کا اظہار 427
حضرت زکریاؑ کے لیے نشانی 428
یحییٰؑ کے لیے الٰہی فرمان 429
یحییٰؑ کے لیے اللہ کے عطیات 430
یحییٰؑ کا والدین اور لوگوں سے رویہ 430
اللہ کی طرف سے سلام 431
حضرت مریمؑ کے پاس رُوح کا آنا 432
رُوح کو دیکھ کر بی بی مریمؑ کا ردعمل 433
جبرئیلؑ کی حضرت مریمؑ سے گفتگو 434
حضرت مریمؑ کا جبرائیلؑ سے مکالمہ 435
مریمؑ کی حیرت پر جبرئیلؑ کا جواب 435
عیسیٰؑ کی ولادت کے وقت مریمؑ کی پریشانی 437

حضرت عیسیٰؑ کا گواہی دینا 440
ہارون سے مراد 440
قوم کے اعتراضات اور عیسیٰؑ کا جواب 441
حضرت عیسیٰؑ کا مزید بیان 443
عیسیٰؑ اور یحیٰؑ میں سلام کا فرق 443
عیسیٰؑ کے بارے اللہ کا واضح بیان 444
اللہ کی ربوبیت 445
ظالموں کا اللہ کے محضر میں موجود ہونا 446
غفلت میں رہنے والوں کو ڈرانا 446
زمین اور اہل زمین کے اموال کی وراثت 447
حضرت ابراہیمؑ کے دو وصف 448
ابراہیمؑ کا اپنے چچا سے مکالمہ 449
ابراہیمؑ کی اپنے چچا کو توحید کی دعوت 450
ہدایت کا معنی 450
شیطان کی انسان سے دشمنی 451
ابراہیمؑ کا اپنے چچا کو خطرہ سے آگاہ کرنا 452
آزر کا ابراہیمؑ کے لیے جواب 453
ابراہیمؑ کا اپنے سوتیلے باپ کی دھمکی پر جواب 454
ابراہیمؑ کا بت پرستوں سے علیحدگی کا اعلان 455
ابراہیمؑ کے لیے عطیہ الٰہی 456

امامت کا انعام 456

حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ 457

موسیٰؑ کے لیے اعزاز 458

موسیٰؑ کی دُعا کی قبولیت 459

حضرت اسماعیلؑ کا تذکرہ 460

اسمٰعیل بن حزقیل کے مزید اوصاف 461

حضرت ادریسؑ کا تذکرہ 462

منتخب انبیاء کے بارے خصوصی بیان 463

بدکردار جانشینوں کے بارے 465

ایمان اور توبہ کرنے والوں کا انجام 466

ہمیشہ کی جنت 466

بہشت کی خصوصیات 467

بہشت کا ارث میں ملنا 468

فرشتوں کی حقیقت 468

اللہ کی عبادت 470

معاد کا انکار کرنے والے کی بات 471

منکرین معاد کا انجام 472

سب کا پل صراط سے گزرنا 473

اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے 475

کافروں کے بیان کا جواب 475

گمراہوں کے لیے واضح اعلان 476

صالح مومنین کے لیے اللہ کا انعام.. 477

کافروں کے منہ زور بیانات کا جواب.. 479

حق کا انکار کرنے والے کا جواب 480

مشرکین کے غلط خیالات کی نفی.. 480

جھوٹے معبودوں کی عبادت کا انجام 481

کافروں کے لیے شیاطین معاون ومددگار.. 482

کافروں پر عذاب لانے میں جلدی کی خواہش.. 483

متقین کا انجام.. 484

مجرموں کا انجام 484

بت پرستوں کی افتراء پردازیاں.. 486

تمام مخلوقات اللہ کی اطاعت میں 487

صاحبان ایمان کا امتیاز.. 488

قرآن کی بقاء 489

دشمنانِ خدا کا انجام.. 489

سورۃ طٰہٰ.. 492

اس سورت کے مطالب 492

قرآن یادآوری کے لیے ہے.. 493

اللہ کا عرش.. 494

اللہ کی ملکیت کی وسعت 495
علم الٰہی کی وسعت 496
اللہ ہی تنہا معبود ہے 496
حضرت موسیٰؑ کا واقعہ 497
وادی طویٰ اور کوہ طور 498
موسیٰؑ کے لیے نبوت کا عہدہ 499
موسیٰؑ کے لیے پہلا حکمنانہ 499
قیامت کے اَمر کا مخفی رکھا جانا 500
کافروں کا انکار تمہاری راہ میں رکاوٹ نہ بنے 501
موسیٰؑ کے لیے معجزات 502
فرعون کے پاس جانے کا حکم 505
اللہ سے موسیٰؑ کی درخواست 507
درخواست کی وجہ 507
حضرت محمد مصطفیؐ کی دعا 508
درخواست کی قبولیت کا فائدہ 509
موسیٰؑ کی دعا کی قبولیت 510
موسیٰؑ کا بچپن سے رسالت تک کا سفر 511
موسیٰؑ اللہ کے خاصان سے 514
موسیٰؑ اور ہارون کی ذمہ داری 514
فرعون کے پاس تبلیغ کے لیے جانے کا دستور 515

فرعون سے خطرہ کا اظہار..516
اللہ کی خصوصی امداد کا اعلان..517
فرعون کے لیے پیغام رسانی کا انداز..517
الٰہی پیغام کی مخالفت پر فرعون کو عذاب کی دھمکی..518
اللہ تعالیٰ کا تعارف..519
بت پرستوں کا نظریہ..519
فرعون کو موسیٰؑ کا جواب..520
خصوصی ہدایت بارے سوال..522
علم الٰہی کا تذکرہ..522
الٰہی ہدایت کے مظاہر..524
اللہ کی نشانیاں..525
فرعون کا ردعمل..526
موسیٰؑ کو فرعون کا جواب..526
فرعون کا موسیٰؑ کو مقابلہ کا چیلنج..527
فرعون کی تیاری..528
موسیٰؑ کا فرعون اور اس کے اعوان و انصار کو خطاب..529
موسیٰؑ کی نصیحت کا اثر..530
فرعونیوں کا فیصلہ..531
فرعون کے جادوگروں کا اعلان..532
موسیٰؑ کا فیصلہ..533

موسیٰؑ کے لیے اللہ کا فرمان......................................534
فرعونی ساحروں کا ایمان لانا......................................535
جادو گروں کے خلاف فرعون کا سخت اقدام......................................536
جادو گروں کا فرعون کو ترکی بہ ترکی جواب......................................537
جادو گروں کا مجمع عام میں واضح اعلان......................................538
مجرموں کے لیے جہنم کی سزا......................................539
ایمان اور عمل صالح کے ثمرات......................................540
موسیٰؑ کو مصر سے اپنی قوم لے کر نکلنے کا حکم......................................541
فرعونیوں کا غرق آب ہونا......................................542
بنی اسرائیل کے لیے الٰہی نعمات......................................543
بنی اسرائیل کی ناشکری......................................544
اللہ کا رحمت اتارنے کا وعدہ......................................544
بنی اسرائیل کی سیرت و رویہ......................................545
موسیٰؑ کا اپنی قوم کے خاص افراد کے ہمراہ کوہ طور پر آنا......................................546
موسیٰؑ کی قوم کی گمراہی......................................547
موسیٰؑ کی اپنی قوم کے پاس واپسی......................................548
قوم کا موسیٰؑ کو جواب......................................549
گوسالہ بنائے جانے کا احوال......................................550
گوسالہ پرستوں کی مذمت......................................551
حضرت ہارونؑ کا اپنی قوم کو متنبہ کرنا......................................551

ہارونؑ کی مخالفت 552
موسیٰؑ کا ہارونؑ سے ناراضگی کا اظہار 553
سامری سے موسیٰؑ کا سوال 554
سامری کا موسیٰؑ کے لیے جواب 555
سامری کی سزا 556
گوسالہ کا انجام 557
موسیٰؑ کا بنی اسرائیل کے لیے واضح اعلان 557
سابقہ واقعات کا تذکرہ 558
قرآن سے منہ پھیرنے والوں کا انجام 559
اللہ کا علم 561
شفاعت کا مسئلہ 562
اللہ کا احاطہ علمی 563
مالکیت اللہ کے لیے ہے 564
ایمان اور عمل صالح 565
قرآن کا عربی زبان میں اترنا 565
اللہ کی بلند شان اور قرآن کا نزول 566
رسول اللہؐ کے لیے خصوصی فرمان 567
حضرت آدمؑ سے عہد و پیمان 568
ابلیس کا سجدہ سے انکار 568
آدمؑ کے لیے اللہ کی وصیت 570

آدمؑ و حوا کے لیے الٰہی فرمان..................................572
اللہ کے فرمان کی پیروی نہ کرنے کا نتیجہ..................................573
قیامت کے دن کفار کی پریشانی..................................575
مجرموں کے سوال کا جواب..................................576
اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے والے..................................577
گذشتہ اُمتوں کے حالات سے سبق آموزی..................................578
عذاب کی تاخیر کا سبب..................................578
رسول اللہؐ کے لیے خصوصی فرمان..................................579
رسول خداؐ کے لیے اللہ کا خصوصی فرمان..................................581
پیغمبرؐ کے لیے اپنے عیال بارے خصوصی فرمان..................................582
مشرکین کی بہانے تراشیاں..................................583
قرآن کے نزول سے پہلے عذاب..................................584
نتیجہ کا انتظار..................................584
سورۃُالانبیاء..................................585
اس سورت کے مطالب..................................585
قیامت کے دن احتساب..................................586
ذکر الٰہی سے منہ موڑنا..................................586
دلوں کا لہو ولعب..................................587
مشرکین کے لیے جواب..................................588

معجزات کے انکار پر عذاب الٰہی 591

کافروں کے اعتراض کا جواب 591

انبیاء کی زندگی بارے 593

انبیاء کی نصرت 593

اللہ کا احسان 594

ظالموں پر عذاب الٰہی اور ان کا ردعمل 595

ظالموں پر عذاب اُتارنے کی وجہ 597

باطل کی نابودی اور حق کا غلبہ 600

اللہ کا مِلک و مُلک 601

فرشتوں کی خصوصیات 601

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں 603

خدا سے نہیں، غیر خدا سے سوال ہوگا 605

کافروں سے دلیل لانے کا مطالبہ 607

اللہ کا اپنی معبودیت کا اعلان 608

مشرکین کا فرشتوں کو اللہ کی اولاد قرار دینا 609

فرشتوں کے متعلق خصوصی بیان 610

غیر خدا کی الوھیت کا دعویٰ 611

توحید ربوبی اور تدبیر عالم پر برہان 612

زمین سے استفادہ کا انتظام 614

آسمان کو محفوظ بنانے کی بات 615

اجرام سماویٰ کا حرکت میں رہنا.. 616
مشرکین کے دعویٰ کا جواب.. 617
موت کا حتمی ہونا.. 617
رسول اللہؐ کے ساتھ کفار کا رویہ.. 619
مشرکین کا عذاب مانگنے میں جلدی کرنا.. 619
عذاب کا اچانک آجانا.. 621
اللہ کی پکڑ.. 621
اللہ کے عذاب سے بچاؤ.. 623
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں.. 624
اللہ کا انعام.. 625
اللہ کا خبردار کرنے کا انتظام.. 626
عذاب کو دیکھنے کے بعد کفار کا اظہار.. 626
قیامت کے دن اعمال کا حساب لیا جانا.. 627
کتاب توریت کا وصف.. 627
اہل تقویٰ کا وصف.. 628
قرآن کے بارے بیان.. 629
ابراہیمؑ کے لیے خصوصی انعام.. 630
ابراہیمؑ کا اپنی قوم کو ہدایت دینا.. 631
ابراہیمؑ کا اللہ کی ربوبیت کا اعلان.. 632
بت پرستوں کو ابراہیمؑ کی دھمکی.. 633

ابراہیمؑ کا بتوں کو توڑنا............ 634

بت پرستوں کا ردِ عمل............ 635

ابراہیمؑ کی گرفتاری اور ان سے باز پرس............ 636

بت پرستوں کی ہٹ دھرمی............ 637

بت پرستوں کو ابراہیمؑ کی دعوت............ 638

ابراہیمؑ کو سزا دینے کا فیصلہ............ 639

ابراہیمؑ کی حفاظت کا انتظام............ 640

ہجرت کا حکم............ 641

اللہ کی ہدایت............ 642

حضرت لوطؑ کی شان............ 643

حضرت لوطؑ کے لیے نبوت کا مقام............ 644

نوحؑ کا تذکرہ............ 644

قوم نوحؑ پر عذاب الٰہی............ 646

داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا قصہ............ 646

سلیمانؑ پر اللہ کا فضل و کرم............ 648

سلیمانؑ کے لیے انعام............ 649

شیاطین کا سلیمانؑ کے اختیار میں ہونا............ 649

حضرت ایوبؑ کی دعا............ 650

ایوبؑ کی دعا کی قبولیت............ 651

تین انبیاء کا تذکرہ............ 652

حضرت یونسؑ کا قصہ..... 652
یونسؑ کی دُعا کی قبولیت..... 654
زکریاؑ کا تذکرہ..... 655
جناب مریمؑ اور عیسیٰؑ کا تذکرہ..... 657
اُمت واحدہ کا تصور..... 658
انبیاء کی توحیدی دعوت..... 659
اعمال صالحہ کا ریکارڈ..... 660
ہلاک شدگان کی دُنیا میں واپسی..... 660
بند یاجوج ماجوج کا کھل جانا..... 661
مشرکین اور بت پرستوں کا انجام..... 663
متقین، مومنین و صالحین کا انجام..... 665
زمین پر صالحین کی حکومت..... 668
رسول اللہؐ کا اعزاز..... 669
لوگوں کے لیے واضح پیغام..... 670
اللہ تعالیٰ سے رسول خداؐ کی درخواست..... 671
سورۃ الحج..... 673
اس سورت کے مطالب..... 673
تمام انسانوں سے خطاب..... 674
قیامت کی ہولناکی..... 675

اللہ کے بارے، بغیر دلیل جھگڑا کرنا 675

شیطان خبیث کی خاصیت 676

انسان کی خلقت کے مراحل 677

اللہ ہی حق ہے 679

قیامت کے دن مُردوں کا زندہ ہو جانا 680

معاد کے منکروں سے متعلق 681

منحرف پیشواؤں کی کارستانیاں 682

عذاب میں جلنے والوں سے خطاب 682

اللہ کی مشروط عبادت کرنے والے 683

غیر خدا کی پرستش کرنے والے 684

مومنین و صالحین کا انجام 685

اسباب کے متعلق مشرکین کا غلط خیال 686

قرآنی آیات کا وصف 687

مختلف گروہوں کا تعارف 688

اللہ کا سجدہ کرنے والے 690

انسانوں کا سجدہ کرنا 691

انسانوں کے دو گروہ 692

مومنوں کے لیے انعام 694

مشرکین مکہ کے بارے 695

ابراہیمؑ کے لیے فرمان 696

حج کی عبادت کا اعلان 697
حج کے فوائد اور جانوروں کی قربانی 698
قربانی کا حکم 699
صفائی ستھرائی کا حکم 700
بیت عتیق 700
اللہ کے احکام کا احترام 701
اللہ کے موحد بندے 702
اللہ کے شعائر کی تعظیم 703
قربانی کے جانوروں بارے بیان 704
اُمتوں کے لیے عبادت کا پروگرام 705
اونٹ کے ذبح کرنے کا طریقہ 706
آیت کے مطالب کا خلاصہ 707
اللہ کے لیے دلوں کا تقویٰ کا 707
اللہ کی جانب سے مومنوں کا دفاع 708
جارحیت کیے جانے والوں کے لیے جہاد کی اجازت 709
عبادت گاہوں کو آباد کرنا 710
مشرکین کے مظالم 711
اقتدار میں آنے والے مومنین کی شان 712
کافروں کے لیے مہلت 714
آبادیوں کا ویران ہونا 715

لوگوں کی بے توجہی 715
مشرکین کا عذاب مانگنا 717
کافروں کے لیے مہلت 717
رسول خداؐ کی ذمہ داری 718
انبیاء کی پیغام رسانی میں اللہ کی مدد 719
شیطان کی شرارت 720
اہل علم کا امتیاز 721
کافروں کا آخر عمر تک رویہ 722
اللہ کا ملک اور مملکت 723
اجر و ثواب کا معیار 724
عقاب و سزا کا قانون 725
رات اور دن کا دورانیہ 725
مظلوم کی نصرت 726
آسمان سے پانی اُتارنا 728
اللہ کی مطلق مالکیت 728
اللہ کی قدرت مطلقہ کی نشانیاں 729
انسان کی حیات و موت کے مراحل 730
ہر اُمت کے لیے خاص عبادت کا ہونا 731
مشرکین کے خیالات بارے بیان 732
مشرکین کے احوال بارے آگہی 732

مشرکین کی عبادت بارے بیان 733
آیات سننے پر مشرکین و کفار کا رد عمل 734
تمام انسانوں سے اللہ کا خطاب.. 735
اللہ کی معرفت کا نہ ہونا.. 736
اللہ کے مصطفے بندے.. 737
فرشتوں کا رسولوں کے ساتھ ارتباط.. 738
نماز کا حکم 739
جہاد کا حکم 740

سورہ نحل

(مکی۔ کل آیات 128)

سورہ کے مطالب

الٰہی نعمات کا اظہار، انسان کا عالم وجود کے نظام کے ساتھ ارتباط اور تعلق، توحید پر استدلال، مشرکین کے خیالات کا بطلان اور ان کے کفر اور شرک کی سزا، حقیقی عبادت کا فقط اللہ کے ساتھ مخصوص ہونا اور دین حق صرف وہی دین ہے جو اللہ کی طرف سے ہے اور باقی سارے قوانین اور شریعتیں قابل قبول نہیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ①

"اللہ کا حکم آ پہنچا تم اس میں جلدی مت کرو، وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے"۔

امر خدا

امر خدا سے الٰہی نصرت کا وعدہ مراد ہے جو مومنین کے لئے نصرت اور کافروں کے لئے ذلت اور خوارگی کی شکل میں پورا ہوگا۔[1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ مشرکین سے فرما رہا ہے کہ وعدہ الٰہی متحقق ہونے کے قریب ہے اور اس کے ظہور کا وقت نزدیک ہو چکا ہے، تم اس کے واقع ہونے میں جلدی مت کرو بلکہ اس سے فرار کے

[1]۔ کتاب غیبت نعمانی کے باب ۱۱ صفحہ ۱۹۸ میں ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ اللہ کے امر سے امر ظہور حضرت امام مہدی علیہ السلام مراد ہے، اس امر کے بارے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی امام کا ظہور اپنے معین وقت پر ہی ہوگا لہٰذا تم اس کے واقع ہونے میں جلدی نہ کرو چاہو یہ ظہور اپنے وقت پر ہی ہوگا۔

راستے کی تلاش میں رہو تاکہ اس سے بچ سکو۔ یقینی بات ہے کہ پروردگار عالم مشرکین کے شرک اور استہزاء اور عذاب کے جلد واقع ہونے کی خواہش سے برتر اور منزہ ہے، کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کب کس پر عذاب اُتارنا ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲

”وہ اپنے بندوں سے جس کے پاس چاہتا ہے فرشتوں کو وحی دے کر بھیج دیتا ہے یہ کہ خبردار کردو کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں پس مجھ سے ڈرتے رہو“۔

رُوح کا معنی

”رُوح“ حیات اور زندگی کا سرمایہ ہے۔ البتہ ایسی حیات جس میں شعور اور ارادہ ہو۔ رُوح ایک مستقل وجود اور مستقل حقیقت ہے جو حیات، علم اور قدرت رکھتی ہے۔ رُوح وہ کلمہ حیات ہے جسے خداوند تبارک و تعالیٰ نے اشیاء میں استعمال کیا ہے اور اسے اپنی مشیت کے ذریعے زندہ اشیاء کو حیات عطاء کی ہے۔ (سورہ شوریٰ، آیت : ۵۲) ترجمہ ” :اور یہ اسی طرح ہے کہ تجھے اپنے امر سے رُوح کی وحی کی ہے“ کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مورد میں اسے سے وحی مراد لی گئی ہے۔ یعنی کلمہ وجودی کا رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر اُتارا جانا، اس کا معنی یہ ہے کہ رُوح کو رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کیا ہے۔ خواہ اس آیت میں ”بالرُوح “ کی با مصاحبت کے لیے ہو یا سببیت کے لیے، اس کے معنی میں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ فرشتوں کا رُوح کے ہمراہ اُترنے کا مطلب، رُوح کو پیغمبر اکرم ﷺ کے قلب میں القاء کرنا ہے۔ نیز

فرشتوں کا رُوح کے سبب اُترنا بھی اسی معنی میں ہے۔ بہرصورت یہ آیت سابقہ آیت کے سبب کو بیان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک سے منزہ ہے کیونکہ وہ اپنے فرشتوں کو رُوح کے ہمراہ (جو اللہ کے امر کی نوع سے ہے اور اس کے کلمہ کی ایجاد سے اس کا تعلق ہے یا امر کے سبب یا اس کے کلمہ کے سبب) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (یعنی انبیاء) پر اتارتا ہے تاکہ وہ انسان کو ڈرائیں اور بتائیں کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے، وہی یکتا ہے، خبردار کسی کو اللہ کا شریک مت بناؤ۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کی وحدانیت کا اعتراف کریں اور اس کے مقام اور شان سے ڈریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔

الوھیت کا تقاضا ہے کہ بندے اس کا تقویٰ اختیار کریں کیونکہ ہر خیر اور ہر سعادت اللہ کے ارادے پر موقوف ہے۔ تقویٰ عمل اور عقیدہ کے مرحلے میں اپنی اصلاح کرنے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کے سامنے تواضع و انکساری، اللہ کی واحدنیت کے عقیدے کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ اسی لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی جانب دعوت دینے میں قولی اور نظری مقام پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ عملاً بھی لوگوں کو توحید کی جانب بلایا۔اور انذار کے مقام پر انہیں عقیدہ اور عمل کے انحراف سے روکا۔ اس بناء پر ''لا الہ الا انا'' میرے سواء کوئی معبود نہیں ہے؛ اعتقادی مسائل کو شامل ہے اور'' فاتقوا'' پس تم سب مجھ سے ڈرو؛ عملی مسائل کو شامل ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳

''اسی نے آسمان اور زمین کو ٹھیک طور پر بنایا ہے وہ ان کے شرک سے پاک ہے''۔

اللہ کا بلند مقام

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت کے برحق ہونے کا مطلب ان کی خلقت کا خاص ہدف، مقصد اور غرض کے تحت ہونا ہے۔ اور یہ بھی بیان ہو چکا کہ ان کی خلقت کا مقصد اللہ کی طرف رجوع کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا ہے۔ اس دن نیکوکار نیکی کا بدلہ لیں گے اور گناہگار اپنے گناہ اور برائی کی سزا بھگتیں گے۔

حق ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ کی خلقت میں ذرہ برابر بھی باطل کی گنجائش موجود نہیں ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ مشرکین کے بنائے ہوئے شرکاء سے پاک و منزہ ہے چاہے وہ فرشتے ہوں یا فرشتوں کے علاوہ ان کے گھڑے ہوئے دوسرے شرکاء جنہیں وہ درگاہ الٰہی میں شفیع قرار دیتے ہیں۔ اُن کا ان شرکاء کو شفیع قرار دینے کا ہدف یہ تھا کہ وہ خیر کی طرف ان کی راہنمائی کریں اور شر سے انہیں بچائیں۔ حالانکہ یہ سارے شرکاء باطل ہیں اور خلقت اور تدبیر کے امر میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کے سواء کوئی مدبر نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

لہٰذا یہ شرکاء اُن کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے جنہیں وہ اللہ کی درگاہ میں اپنا سفارشی سمجھتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس کی تدبیر میں کوئی بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔ اللہ اپنے بندوں پر غالب ہے، اس کے بندوں میں سے جو بھی اللہ کے سیدھے راستے سے منحرف ہوتا ہے وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بندوں کا اللہ کے سیدھے راستے سے گمراہ ہونا اس لحاظ سے نہیں ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دے سکتا بلکہ اللہ نے اس کا ارادہ ہی نہیں کیا اور نہیں چاہا کہ ان کو ہدایت دے؛ اس کی وجہ ان کے گناہ اور ان کی الٰہی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ بہرحال خداوند متعال ہر چیز پر قاہر و غالب ہے اور سیدھا راستہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرار کیا

ہے، اسی راستہ پر چلنے سے ہی انسان اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۴﴾

''اسی نے آدمی کو ایک بوند (پانی کے قطرہ) سے پیدا کیا پھر وہ یکایک کھلم کھلا جھگڑنے لگا''۔

انسان کی ناسپاسی کی ملامت

یعنی نسل انسانی کی بقاء نطفے سے ہے۔ اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام کی خلقت نطفے سے نہیں ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پست اور گھٹیا نطفے سے تام الخلقت انسانی شکل میں خلق کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اتنا بے شرم اور ناسپاس ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جھگڑنے لگتا ہے اور آیات الٰہی کو جھٹلاتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں انسان کی ملامت اور سرزنش کی گئی ہے۔

وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمۡ فِیۡهَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ﴿۵﴾

''اور تمہارے واسطے چارپائیوں کو بھی اسی نے بنایا، ان میں تمہارے لیے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے کھاتے بھی ہو''۔

انسان کے لیے جانوروں کی خلقت

''اَنۡعَامَ'' میں اونٹ، گائے اور بھیڑ جیسے جانور شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان جانوروں کے متعلق فرمارہا ہے کہ ہم نے انسان کے فائدے کے لیے چارپایوں کو خلق کیا ہے تاکہ وہ ان کی اون اور جلد کو سردی سے بچنے اور لباس بنانے کے لیے استعمال کرے۔ اور ان کے دودھ،

گوشت اور چربی سے کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرسکے۔

وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶

"اور تمہارے لیے ان میں زینت بھی ہے جب شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے کے لیے جاتے ہو"۔

"جَمَالٌ" زینت، خوبصورتی اور اچھے منظر کو کہا جاتا ہے۔ "اراحة" جانوروں کو ان کی چراگاہوں سے واپس پلٹانے کے معنی میں ہے۔ "سرح" جانوروں کو چرانے کے لیے باہر لے جانے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب تم جانوروں کو شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے کیلئے جاتے ہو تو تمہارے لیے ان میں زینت وخوبصورتی ہے۔

وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

"اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر ان شہروں تک لے جاتے ہیں کہ جہاں تک تم جان کو تکلیف میں ڈالنے کے سوا نہیں پہنچ سکتے تھے، بے شک تمہارا رب شفقت کرنے والا مہربان ہے"۔

جانوروں کا فائدہ

جانوروں کے دوسرے فائدوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہارے بھاری چیزوں اور بوجھ کو طولانی مسافتوں پر لے کے جاتے ہیں اور دشوار راستوں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ان دور کی مسافتوں تک جانوروں کے بغیر بھاری چیزیں لے جانا انسان کے لیے نہایت سخت امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے انسان کے لیے مسخر کرکے اس سے ایک بھاری بوجھ کو اٹھالیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

وَّالۡخَيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً ؕ وَيَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸﴾

"اور گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے، اور وہ چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے"۔

یہ آیت، آیت نمبر ۵ کے لفظ "اَنۡعَامَ" پر عطف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں، گدھوں اور استروں کو تمہارے لیے خلق کیا ہے تاکہ تم ان پر سوار ہو جاو اور ان سے استفادہ کرسکو، نیز یہ تمہارے لیے زینت کے اسباب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو اور ان کے علاوہ دوسرے ایسے جانوروں کو خلق کیا ہے جنہیں تم نہیں جانتے ہو اور انہیں تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔ تاکہ تم اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان سے استفادہ کرسکو۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصۡدُ السَّبِيۡلِ وَمِنۡهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰٮكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۹﴾

"اور اللہ تک سیدھی راہ پہنچتی ہے اور بعض ان میں ٹیڑھی بھی ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھی راہ بھی دکھا دیتا"۔

اللہ کا سیدھا راستہ

"قَصۡدُ" اپنی راہ پر استقامت کرنے کو کہتے ہیں۔ "قَصۡدُ السَّبِيۡلِ" سے وہ راستہ مراد ہے جس کا قصد کیا گیا ہے اور انسان کو اپنے مقصد تک پہنچاتا ہے۔ یہ لفظ "جَآئِرٌ" کا مخالف ہے کیونکہ جائر گمراہ کرنے والے راستے کو کہتے ہیں جو اس راستے پر چلنے والے کو اس کے مقصد تک نہیں پہنچاتا ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اس نے انسان پر احسان کیا ہے اور اس پر رحمت کرنے کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔ تاکہ ان کے لیے سیدھا راستہ معین کرے اور اس کی جانب ان کی ہدایت کرے تاکہ وہ اس راستے پر چل کر سعادت پا سکیں۔ اور ہر چیز کے اندر ایسی قوت اور طاقت قرار دی ہے جسے اگر صحیح راستے پر استعمال کرے تو سعادت اور اپنے مطلوبہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

اس بارے سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝۵۰

ترجمہ: ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس تمام موجودات کو خلق کیا ہے اور انہیں ہدایت دی ہے۔''

''ھدایت'' سے وہ القاءات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فطرت اور انبیاء کے واسطے سے انسان کے اندر رکھ دیئے ہیں۔

انحرافی راستے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں دی گئی ہے جس پر چلنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انحرافی اور ٹیڑھے راستے کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا ہے۔ راہ انحرافی حقیقت میں سیدھے راستے سے خارج ہو جانا ہے۔ لہٰذا انحرافی راہ حقیقت میں راستہ ہی نہیں ہے بلکہ راستے کا گم جانا اور گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غالب ہے۔ لہٰذا جو بھی سیدھے راستے سے گمراہ ہو جاتا ہے تو وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو اس کی تدبیر میں مغلوب نہیں کر سکتا۔ ان کی گمراہی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دینے سے عاجز ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے (ان کے فسق و فجور کی وجہ سے) ان کی ہدایت کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ بہر صورت اللہ تعالیٰ قاھر اور غالب ہے۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمۡ مِّنۡہُ شَرَابٌ وَّ مِنۡہُ شَجَرٌ فِیۡہِ تُسِیۡمُوۡنَ ﴿۱۰﴾

''وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی اُتارا ہے اسی میں سے پیتے ہو اور اسی سے درخت (تیار) ہوتے ہیں جن میں چراتے ہو''۔

آیت کا معنی واضح ہے۔ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کا تذکرہ شروع کیا ہے جو زیادہ تر زمین سے اگنے والی ہیں اور ان نعمتوں کو انسان اور دوسرے جاندار خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یُنۡۢبِتُ لَکُمۡ بِہِ الزَّرۡعَ وَ الزَّیۡتُوۡنَ وَ النَّخِیۡلَ وَ الۡاَعۡنَابَ وَ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۱﴾

''تمہارے واسطے اسی سے کھیتی اور زیتون اور کھجوریں اور انگور اور ہر قسم کے میوے اُگاتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو غور کرتے ہیں''۔

نباتات میں اللہ کی نشانیاں

اللہ تبارک و تعالیٰ آسمان سے پانی اُتارتا ہے، اس پانی کے فوائد کیا ہیں؟ اس آیت میں ان فوائد سے کچھ کو بیان کیا گیا ہے۔ زمین پر پانی پڑتا ہے تو اس سے گھاس اور نباتات اُگتے ہیں جو حیوانات کی غذا بنتے ہیں۔ پھل اُگتے ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ لہٰذا پانی ہی سے سب اللہ کی ساری نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جو نعمات جاندار موجودات کی زندگی کے لیے وسیلہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش کو اتارا جس سے ہر شئے

زمین سے اُگی اور اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو پانی سے زندگی دی جیسا کہ (سورۃُ الانبیاء، آیت :۳۰) میں اس بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ ۔۔۔

ترجمہ: ''اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی عطا کی ہے۔۔۔''

اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے عمومی روزی کا انتظام پانی سے کیا ہے۔ نباتات، گھاس، سبزہ اور کھیت کا اُگنا ربوبیت میں اللہ کی یکتائی اور وحدنیت کی دلیل ہے، یہ بہت ہی مضبوط دلیل ہے جس میں اہل تفکر اور سوچنے والوں کے لیے عبرت ہے۔اس آیت میں بے شمار نباتات اور میوہ جات و پھل فروٹ میں سے بعض کا نام لینے کی وجہ ان میں موجود غذائی اہمیت اور فوائد ہیں۔ یہاں پر ذکر شدہ میوہ جات اور نباتات ، پانی، میوہ جات اور نباتات کے لیے نمونے کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور رات اور دن اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے، اور اسی کے حکم سے ستارے بھی کام میں لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں'' ۔

اللہ کی وحدانیت کی نشانیاں

اللہ تعالیٰ نے ساری چیزیں انسان کے اختیار میں دی ہیں۔ پہلے بھی بیان ہوچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو انسان کے آرام کے لئے اور دن کو کام کاج اور معیشت کے لیے قرار دیا ہے۔ سورج، چاند اور ستارے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے

محکم نظام کے تحت حرکت میں ہیں اور سب انسان کی رہائش اور اس کی معیشت اور زندگی کے لیے مفید اور منافع بخش ہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی کا نظام ان ہی کے تحت چل رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اثبات پر دلیل ہے۔ ان دلائل کی بنیاد ایسے علمی اور عقلی مقدمات ہیں جنہیں صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان آسمانی اجرام اور ستاروں اور سیاروں کے بارے میں غور فکر کرتے ہیں۔[1]

وَ مَا ذَرَاَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہٗ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

"اور تمہارے واسطے جو چیزیں زمین میں رنگ برنگ کی پھیلائی ہیں اِن میں اُن لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سوچتے ہیں"۔

رنگ برنگ نباتات اللہ کی نشانیاں

"ذَرَاَ" خَلَق کے معنی میں ہے۔ "اِخۡتِلَافِ اَلۡوَان" سے معدنیات اور زمین سے اگنے والے رنگ برنگے عناصر و اجزاء مراد ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ شاید رنگوں کا اختلاف، مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو۔ یہ ایسے امور ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور ربوبیت میں اس کی یکتائی پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ ان دلائل کی بنیاد فلسفی مقدمات ہیں جنہیں فقط وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو وجود کے کلی مسائل سے آگاہ ہیں۔ مثلاً

[1]۔ آج کے دور میں فزکس کے علم نے ثابت کیا ہے کہ تمام طبیعی چیزوں میں موجود طاقت ایک ہی طاقت پر منتہی ہوتی ہے اور ان سب کو ایک ہی جگہ سے فیض مل رہا ہے۔

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عالَم متغیر ہے یعنی ہمیشہ اس میں تبدیلی اور تغییر رونما ہو رہی ہے اور اس کے لیے حتمی طور پر ایک مادے کی ضرورت ہے اور یہ بھی معلوم ہو کہ پورا عالم ایک عمومی مادہ سے بنا ہے اور پورے عالم کے اجزاء کا مواد آپس میں تشابہہ ہے۔ دوسری جانب لازم ہے کہ مادہ کے یہ سارے اختلافات ایک غیر مادی امر تک پہنچیں جو اس مادہ کے ماوراء ہے۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یہ تین دلیلیں جو سابقہ آیات میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے پہلی دلیل سادہ مقدمات پر مشتمل ہے جسے کوئی بھی انسان تھوڑے سے غور و فکر کے بعد سمجھ سکتا ہے۔ دوسری دلیل، علمی اور سائنسی مقدمات پر مشتمل ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو فلکیات کے علوم کے ماہر ہیں اور ستاروں کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔ اور تیسری دلیل جیساکہ ذکر ہوا، فلسفی مقدمات پر مشتمل ہے اور اس کی نسبت اہل تذکر کی طرف دی گئی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡهُ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّ تَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡهُ حِلۡیَةً تَلۡبَسُوۡنَهَا ۚ وَ تَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡهِ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

"اور وہ وہی ہے جس نے دریا کو کام میں لگا دیا کہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اسی سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو، اور تو اس میں جہازوں کو دیکھتا ہے کہ پانی کو چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور تاکہ تم اُس کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو"۔

سمندر کے فوائد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ایک اور وسیلے کا ذکر شروع کر دیا ہے جو پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں کو اور شہروں اور راستوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اس نے تمہارے لئے سمندر مسخر کئے ہیں تاکہ وہاں سے مچھلی کا تازہ گوشت حاصل کرسکو۔ دریاوں میں موتی مونگے اور مرجان ہیں تم انہیں وہاں سے نکال کر اپنے لئے زیور اور زینت کے وسائل بنا سکتے ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پانی کی سطح پر کشتی چلانے کے وسیلہ سے تمہارے لیے دائیں بائیں جانے کا ذریعہ فراہم کیا، تاکہ تم مختلف جگہوں پر جا کر اللہ کے فضل و کرم سے روزی تلاش کرو۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے خشکی میں بھی انسان کو بہت ساری نعمتیں عطا کی ہیں اور روزی کے سارے وسائل خشکی میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن دریائی نعمتوں کے ذریعے اس نے اپنا اضافی فضل اور احسان انسان کو عطا کیا ہے تاکہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرے اور اللہ کی جانب متوجہ ہو۔ کیونکہ انسان عادی نعمتوں سے اتنا اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جتنا غیر معمولی نعمتوں سے اللہ کی جانب متوجہ ہو سکتا ہے۔

وَ اَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

"اور زمین پر پہاڑوں کے بوجھ ڈال دیے تاکہ تمہیں لے کر نہ ڈگمگائے اور تمہارے لیے نہریں اور راستے بنا دیے تاکہ تم راہ پاؤ"۔

پہاڑوں، نہروں اور راستوں کے فوائد

اللہ تعالیٰ نے زمین پر محکم و مضبوط پہاڑ کھڑے کیے ہیں تاکہ زمین پر لرزہ نہ ہو اور تمہاری زندگی کا نظام درہم برہم نہ ہو نیز زمین پر تمہارے لئے نہریں اور ندی

نالے جاری کر دیے تاکہ اُن میں چلنے والے پانی سے زراعت اور باغات کے لئے فائدہ اٹھاسکو اور اپنے پالتو جانوروں کو پانی سے سیراب کرو۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور راہنمائی کے لیے مختلف راستے بنائے ہیں تاکہ تم ان پر چل کر اپنے مقصد تک جاسکو۔ اصولی طور پر راستے کا ہدف اور اس کی غرض و غایت، ہدایت ہے خواہ طبیعی راستے ہوں یا انسان کے بنائے ہوئے راستے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے آثار اور نشانیاں ہیں۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اور نشانیاں بنائیں، اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں"۔

ستارے اللہ کی وحدانیت کی نشانی

"عَلَامَات" ایسے امر کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے امر کے لئے نشانی اور علامت بنے۔[1] اس آیت میں خداوند تبارک و تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اس نے تمہارے لئے ایسی علامات و نشانیاں قرار دی ہیں جن کے ذریعے تم ان چیزوں پر استدلال کرسکتے ہو جو تمہارے حواس سے غایب ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ستارے خلق کیے ہیں جن کی منزلوں اور مقامات کے مطابق انسان خشکی اور دریاوں میں اپنے راستوں کی راہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ ایک مستقل علم ہے جس کی طرف اللہ تبارک و تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے اور یہ سب اللہ کے تیار کردہ ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے بندوں پر انعامات ہیں۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

"پھر کیا جو شخص پیدا کرے اس کے برابر ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کرے، کیا

---

[1]۔اصول کافی میں داؤد جصاص سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا؛ نجم سے رسول اللہ ﷺ اور علامات سے آئمہ ہدیٰ علیہم السلام مراد ہیں۔ (مترجم)

تم سوچتے نہیں"۔

سابقہ آیات کا نتیجہ

اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں تفصیل سے ربوبیت کی یکتائی پر دلائل دیے ہیں۔ اب اس آیت میں ان سب کے خلاصے کے طور پر فرما رہا ہے کہ وہ جس نے ان سب چیزوں کو خلق کیا ہے اور انسان کو وہ سب نعمتیں عطا کی ہیں جن کے بغیر اس نظام میں خلل واقع ہو جاتا، لہٰذا ان سب کا خالق، مدبر اور عالم وجود کا مالک صرف وہی ہے۔ اسے تمہارے سارے امور پر احاطہ ہے خواہ آشکار ہوں یا پوشیدہ۔ مشرکین کے بنائے ہوئے جھوٹے خداوں میں ربوبیت کی ان صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی پورے عالم کا معبود ہے، وہ لاشریک ہے، اس کا نام بلند ہے، وہ بڑی شان والا ہے۔ در حقیقت اس آیت میں الٰہی صفات کا غیر خدا کی صفات سے مقابلہ کیا گیا ہے تاکہ یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے، غیر خدا کی صفات کبھی بھی اللہ کی صفات کے مساوی نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اس آیت میں جو استفہام ہے وہ استفہام انکاری ہے۔ آخر میں فرمایا کہ تم کیوں اس بات کو سمجھتے نہیں اور اتنا بڑا فرق تمہیں نظر کیوں نہیں آتا ہے؟

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾

"اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو ان کا شمار نہیں کر سکو گے، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

اللہ تعالیٰ کی بے حساب نعمتیں

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی بے حساب نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور

فرمایا ہے کہ اللہ کی نعمتیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر تم انہیں گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ کیونکہ حقیقت میں کوئی بھی موجود ایسا نہیں ہے جو کل نظام کے مقابلے میں نعمت نہ ہو۔ اگرچہ ممکن ہے بعض موجودات دوسرے بعض موجودات کی نسبت نعمت نہ ہوں۔ لیکن الٰہی نعمات کو اس کی مخلوقات اور موجودات کے تناسب سے گنا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ امر اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی رحمت اور مغفرت کی برکت سے ہے۔ کیونکہ اللہ اپنی مغفرت سے اشیاء کی بدی اور کمزوری کو چھپاتا ہے اور اپنی رحمت سے اُن کے نفس کے کمال کو ظاہر کرتا ہے اور اسے زیور جمال سے آراستہ کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت تمام موجودات پر پھیلی ہوئی ہے اور ہر موجود دوسرے موجود کے لئے خیر اور نفع بخش ہے۔ یہی امر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ کی نعمتیں قابل شمار نہیں ہیں اور انہیں گنا نہیں جا سکتا۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو"۔

علم الٰہی

اس آیت میں ربوبیت کا تیسرا رُکن یعنی علم بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا پہلا رکن خلق اور ایجاد کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی خالق اور موجد ہے، اس بنا پر جو وجود دیتا ہے وہی اس کے لیے قوانین بھی بناتا ہے۔ ربوبیت کا دوسرا رکن مغفرت اور رحمت کی بنیاد پر نعمتیں دینا ہے۔ اور اس کا تیسرا رکن علم ہے۔ اگر معبود علم کی صفت سے متصف نہ ہو تو بندوں کا عبادت کرنا یا نہ کرنا مساوی ہوگا بلکہ اس کی عبادت کرنا ایک لغو اور بے ثمر عمل ہوگا، پس ضروری ہے کہ معبود اور الہٰ ایسا ہو جس کے پاس علم ہو اور اس کا علم ظاہر اور باطن دونوں کے بارے میں ہو کیونکہ عبادت کی بنیاد نیت پر ہے اور

نیت انسان کے باطن سے مربوط ہے۔ لہٰذا خداعزوجل ظاہر اور باطن دونوں کا عالم ہے۔ اسی وجہ سے وہی اس لائق ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔

وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾

"اور جنہیں اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں"۔

غیر خدا کسی چیز کے خالق نہیں

اس آیت میں مشرکین کے معبودوں میں عبودیت کے پہلے رکن یعنی خلق اور ایجاد کے نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مشرکین کے جتنے معبود ہیں وہ خلق کرنے پر قادر نہیں ہیں اور کسی کو وجود نہیں دے سکتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔ پس عبودیت کا پہلاُ رکن ان میں موجود نہیں ہے۔ جب عبودیت کا پہلا رکن ان میں موجود نہیں ہے تو لازمی طور پر اس کا دوسرا رُکن یعنی نعمتیں عطا کرنا بھی ان میں موجود نہیں ہے کیونکہ عبودیت کا دوسرا رکن پہلے رکن کی فرع اور اس کے ثمرات میں سے ہے۔ لہٰذا مشرکین کے معبود ہرگز رب نہیں ہیں، فقط خداوند تبارک و تعالیٰ ہی رب ہے۔

اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ۙ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

"وہ تو مردے ہیں جن میں جان نہیں، اور وہ نہیں جانتے کہ لوگ کب اٹھائے جائیں گے"۔

مشرکین کے معبود غیر زندہ موجودات

اس آیت میں مشرکین کے معبودوں میں عبودیت کے تیسرے رُکن کے فقدان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عبودیت کا تیسرا رُکن ظاہر اور باطن سے آگاہ ہونا ہے۔

مشرکین کے معبودوں اور بتوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ انسان کے ظاہر اور باطن سے آگاہی حاصل کرسکیں کیونکہ مشرکین کے بنائے ہوئے خداوں میں حیات اور شعور نہیں ہے۔ جب حیات نہیں ہے تو وہ کسی چیز کے بارے میں علم وآگاہی بھی نہیں رکھتے۔ وہ مردوں کی مانند ہیں جن میں حیات نہیں ہوتی۔ جب ان میں حیات نہیں ہے تو لازمی بات ہے کہ ان میں علم و شعور بھی نہیں ہے لہٰذا انہیں معلوم نہیں ہے کہ انسانوں کو کس وقت مبعوث کیا جائے گا۔ علم کے سارے مظاہر میں سے فقط مردوں کے اُٹھائے جانے کے وقت کے علم کا اس لیے تذکرہ کیا ہے کیونکہ روز بعث اور اٹھائے جانے کا دن انسانوں کو جزاء وسزا اور ثواب وعقاب دینے کا دن ہے اور معبود پر لازم ہے کہ وہ بندوں کو جزاء دینے کے دن سے واقف ہو۔ بتوں میں ہرگز ایسا علم نہیں ہے، اس بناء پر وہ کس طرح معبود ہو سکتے ہیں؟ پس اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کوئی بھی مستقل خدا نہیں ہے، کیونکہ بالذات اُن میں قوام ہی نہیں ہے، لہٰذا اللہ ہی عین حق ہے اور اُسی کی عبادت برحق ہے۔ جن میں ربوبیت کی ضروری صفات نہیں پائی جاتیں، وہ عبادت کے لائق نہیں ہیں۔ خلق اللہ ہی نے کیا ہے، انعام اور نعمتیں اُسی کی طرف سے ہیں اور ظاہر و باطن کا علم اسی کے پاس ہے، پس وہی رب ہے، اس کے علاوہ کوئی اور رب نہیں ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

"تمہارا معبود اکیلا معبود ہے، پھر جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل نہیں مانتے اور وہ تکبر کرنے والے ہیں"۔

اللہ کی ربوبیت کے دلائل کا نتیجہ

سابقہ آیتوں میں بیان کیے گئے ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل کا نتیجہ یہ بنتا ہے کہ سارے انسانوں کا معبود ایک ہے۔ اس کے بعد ذکر ہونے والی عبارتیں اسی پر ہی متفرع ہیں اور اسی مطلب کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ توحید سے مراد اللہ کی وحدانیت کا عقیدہ رکھنا، اللہ کے رسولوں کی پیغام رسانی کے مضمون پر ایمان لانا، روز حساب و جزاء پر ایمان لانا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں کافر سے وہ شخص مراد ہے جو روز جزاء اور آخرت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ روز جزاء پر ایمان، اللہ کی وحدانیت پر ایمان کا لازمہ ہے، اسی طرح اللہ کی طرف سے بھیجے گئے رسولوں پر ایمان لانے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آخرت پر ایمان لایا جائے۔ بہرحال یہاں پر کہا گیا ہے کہ کافروں کے دل حق کے منکر ہیں لہٰذا یہ حق کے سامنے تکبر کرتے ہیں۔ یعنی عناد اور دشمنی کی وجہ سے وہ حق کو جھٹلاتے ہیں اور حق کی اطاعت نہیں کرتے۔ ان کے پاس اس عمل کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں ہے۔ وہ فقط دشمنی کی بنیاد پر اور خود کو برتر خیال کرکے حق کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے اور حق کو قبول نہیں کرتے۔

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

”ضرور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں، بے شک وہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا“۔

اللہ کا علم اور آگاہی

”لَا جَرَمَ“ بتحقیق اور یقیناً کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ یقینی طور پر اُن کے

ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال کی بنیاد پر انہیں جزاء دے گا اور اُن کے انکار کی بنیاد پر اُن کی گرفت کرے گا۔ کیونکہ وہ مستکبر اور معاند ہیں، اللہ انہیں دوست نہیں رکھتا۔ یہ عبارت سخت ترین سزا دینے کی دھمکی اور اس سے کنایہ ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ۙ﴿۲۴﴾

''اور جب ان سے کہا جائے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں یہ تو پہلے لوگوں کے قصے ہیں''۔

مشرکین کی بات

سوال کرنے والے یا تو بعض مومنین ہیں جنہوں نے کافروں سے امتحان لینے کے لئے یہ سوال کیا ہے۔ یا مشرکین نے مومنوں کا مذاق اڑانے کے لیے ایک دوسرے سے یہ سوال کیا ہے۔ یا دعوت الٰہی کی حقانیت کے بارے میں متحیر شخص نے مشرکین سے یہ سوال کیا ہے۔ بہر صورت سوال کرنے والے جو بھی ہوں، مشرکین ان کے جواب میں کہتے ہیں یہ وحی اللہ کی جانب سے نہیں ہے بلکہ یہ جھوٹ، خرافات اور سابقہ اقوام کے قصے کہانیاں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ بیانات سوائے جھوٹ اور افسانہ پردازی اور خرافات کے اور کچھ بھی نہیں ہیں۔

لِیَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾

''تاکہ قیامت کے دن اپنے بوجھ پورے اٹھائیں، اور کچھ ان کے بوجھ جنہیں وہ بے علمی سے گمراہ کرتے ہیں، خبردار! برا بوجھ ہے جو وہ اٹھاتے ہیں''۔

اچھی یا بری سنت ڈالنے کا اجر یا سزا

اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ جب کافروں نے وحی الٰہی کو سابقہ اقوام کے قصے کہانیاں اور افسانے قرار دیا تو وہ اس بات سے خود بھی گمراہ ہوئے اور اپنی ان باتوں کے ذریعے انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا لہٰذا قیامت کے دن وہ اپنے گناہوں کا مکمل بوجھ کے علاوہ ان لوگوں کا بوجھ بھی اُٹھائیں گے جنہیں انہوں نے بغیر علم کے گمراہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے منقول ایک روایت بھی اس آیت کے مضمون کی تائید ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا:

"من سن سنة حسنة کان له اجرها و اجر من عمل بها من غیر ان ینقص من اجر شیء و من سن سنة سیئة کان له وزرها و وزر من عمل بها" 1

ترجمہ: "جو بھی کوئی اچھی روایت ڈالے گا تو اسے اس عمل کا اجر ملے گا اور اس کا اجر بھی اسے ملے گا جس نے اُس طریقے پر عمل کیا ہو گا یا اس راہ پر چلا ہو گا اور اس پر عمل کرنے والے کے اجر سے کچھ کم بھی نہیں ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی بری سنت اور روش ڈالتا ہے اور برے رویے کی بنیاد ڈالتا ہے تو اس کا بوجھ اس کی گردن پر ہے اور اس کے گناہ کا بوجھ بھی جس نے اس بری روایت پر عمل کیا"۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۶

1۔ تحف العقول، صفحہ ۲۴۳۔

''ان سے پہلے لوگوں نے بھی مکر کیا تھا پھر اللہ نے ان کی عمارت کو جڑوں سے ڈھا دیا، پھر ان پر اوپر سے چھت گر پڑی، اور ان پر عذاب آیا جہاں سے انہیں خبر بھی نہ تھی''۔

خدا اور رسولؐ کے منکرین کا انجام

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کو دھمکی دی ہے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف سازشیں کیں اور فرمایا ہے کہ کیا انہیں ان لوگوں کے بارے میں علم نہیں ہے جنہوں نے اس سے پہلے اللہ کے خلاف سازشیں کیں اور دعوت توحید کو باطل کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ کس طرح ان پر دنیاوی عذاب اُتارا؟ اور اُن کی سازشیں اس طرح خود ان کی طرف پلٹا دیں جس کی انہیں توقع بھی نہیں تھی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ساری سازشوں کو اس طرح ویران کر ڈالا جب ان کی توجہ اُن کے سر کے اوپر چھت پر تھی کہ اچانک وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی بنیادیں ہلنے لگی ہیں اور ان کی چھت ان کے اوپر آگری۔ اللہ تعالیٰ اس طرح سازشیں کرنے والوں کی سازشوں کو خود ان کی طرف پلٹاتا ہے اور انہیں نابود کر دیتا ہے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۲۷﴾

''پھر قیامت کے دن انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا میرے شریک کہاں ہیں جن پر تمہیں بڑی ضد تھی، جنہیں علم دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ بے شک

آج کافروں کے لیے رسوائی اور برائی ہے"۔

اُخروی عذاب

اس آیت میں مشرکین کے اُخروی عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ دُنیاوی عذاب کے بعد قیامت کے دن انہیں ذلیل و خوار کیا جائے گا اور ان سے سوال کیا جائے گا کہ وہ شرکاء جو تم نے بنا رکھے تھے اللہ کے اور جن کے بارے میں اہل حق سے تم جھگڑتے تھے اور دشمنی رکھتے تھے اور دین خدا میں اختلاف ڈال رکھا تھا؛ وہ تمہارے شرکاء کہاں ہیں؟ کیوں آج ان کا کوئی نام و نشان نہیں ہے؟

تو اس وقت وہ لوگ جنہیں اللہ کی وحدانیت کا علم تھا اور توحید کی حقیقت ان کے لئے روشن تھی ان مشرکین سے کہیں گے کہ تم جن کی پرستش کرتے تھے اور جن کو تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا تھا وہ سراب اور خیال کے سواء کچھ نہ تھے۔ بلاشک ذلت و خواری اور برائی کافروں کے ساتھ مخصوص ہے۔

لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾" (سورہ نبا، آیت :٣٨)

ترجمہ: "ایسا دن ہے کہ اس میں بخشنے والا رب اللہ جس کو اجازت دے گا اس کے علاوہ کوئی نہیں بول سکے گا اور وہ جو بولے گا تو صحیح بولے گا" کے قرینے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں (الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ) سے اہل عصمت مراد ہیں جو حق اور صحیح گفتگو کے سواء کچھ نہیں بولتے۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ ۖ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِن سُوءٍ ۚ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٨﴾

''یہ وہ لوگ ہیں کہ فرشتوں نے ان کی ایسی حالت میں روح نکالی تھی کہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے، پھر وہ صلح کا پیغام بھیجیں گے کہ ہم تو کوئی برا کام نہ کرتے تھے، کیوں نہیں بے شک اللہ کو تمہارے اعمال کی پوری خبر ہے''۔

موت کے وقت کافروں کی حالت

اس آیت میں پچھلی آیت کی وضاحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس وقت فرشتے کافروں کی جان لینے کے لئے اُن کے پاس پہنچیں گے، جبکہ وہ ظلم اور کفر میں مشغول ہوں گے تو اچانک اُنہیں فرشتوں کے سامنے تسلیم ہونا پڑے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے تو کوئی براکام نہیں کیا ہے۔ لیکن اسی جان کنی کی حالت میں اُن کی بات جھٹلائی جائے گی اور اُن سے کہا جائے گا جی ہاں !خداوند تمہارے کئے ہوئے اعمال سے آگاہ ہے اوراس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٢٩﴾

''سو دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہو، پس متکبرین کا کیا ہی برا ٹھکانہ ہے''۔

کافروں سے گفتگو

یہ آیت کافروں سے کی جانے والی گفتگو کا تسلسل ہے جس میں کہا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن کفار سے کہا جائے گا کہ اے کافرو! تم میں سے ہر ایک اپنے اعمال اور کفر کے مطابق جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازے سے جہنم میں داخل ہو جاؤ اور وہاں ہمیشہ رہو۔ جن لوگوں نے تکبر کیا اور اسے اپنی نفسانی صفت بنا لی ان کا ٹھکانہ بہت برا

ہے؛ جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ (سورۂ غافر، آیت: ٦٠)

"سچ یہ ہے کہ وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں اور اللہ کے حضور نہیں جھکتے تو وہ بہت جلدی آتش جہنم میں وارد ہوں گے جہاں پر انہوں نے ہمیشہ رہنا ہے"۔

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"اور پرہیزگاروں سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں اچھی چیز، جنہوں نے نیکی کی ہے (ان کے لیے) اس دنیا میں بھی بہتری ہے، اور البتہ آخرت کا گھر تو بہت ہی بہتر ہے، اور پرہیزگاروں کا کیا ہی اچھا گھر ہے"۔

اہل تقویٰ کی خصوصیات

پچھلی آیات میں کافروں کی خصوصیات کا تذکرہ ہوا تھا اس کے مقابلے میں اب اس آیت میں مومنوں کی خصوصیات کو بیان کیا جا رہا ہے اور فرمایا ہے کہ اہل تقویٰ مسلسل پرہیز گاری کی صفت میں تھے، اللہ کے فرامین پر عمل پیرا تھے، اللہ نے جس سے روکا تھا اس کو انجام نہیں دیتے تھے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے تمہارے لئے کیا اُتارا ہے تو وہ کہتے: خیر! یعنی جو بھی اللہ نے بھیجا ہے وہ خیر اور اچھی

چیز ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ایسے معارف اور احکام پر مشتمل ہے جن کے مطابق عمل کرنے میں دُنیا و آخرت کی سعادت ہے۔ اہل تقویٰ کی اس بات میں دو چیزوں کا اعتراف ہے؛ پہلی بات :قرآن، اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ دوسری بات: قرآن میں جو کچھ ہے وہ خیر ہے اور اس میں دُنیا و آخرت کی سعادت ہے۔ ان دو باتوں کو ''خیراً'' کے منصوب لانے سے سمجھایا گیا ہے۔

اس کے بعد والا کلام بظاہر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔'' احسان'' سے مراد قرآن کے مضمون کے مطابق عمل کرنا ہے جس کے نتیجے میں عدل اور نیکی کی بنیاد پر ایک صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو اس دُنیا میں احسان کریں گے وہ اچھا اجر پائیں گے اور رشد و سعادت اور کمال کو پہنچیں گے۔ اور یقیناً انہیں آخرت میں اس سے برتر اور بہتر اجر ملے گا کیونکہ آخرت کا گھر جاودانی ہے اور وہاں کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی ہیں، وہاں ہر گز فناء و زوال نہیں ہے اور وہاں کی نعمتیں کبھی نقمت میں نہیں بدلیں گی۔ لہٰذا کتنا اچھا ہے متقین کا گھر۔ جی ہاں! اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو اس طرح اجر دیتا ہے۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ ‌ؕ كَذٰلِكَ يَجۡزِى اللّٰهُ الۡمُتَّقِيۡنَ ۙ‏ ﴿۳۱﴾

''ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جو چاہیں گے انہیں وہاں ملے گا، اللہ پرہیزگاروں کو ایسا ہی بدلہ دے گا''۔

متقین کا اجر و پاداش

یہ آیت پچھلی آیت کی تاکید اور توضیح ہے کہ اہل تقویٰ کے لیے جنت میں ایسے باغات ہوں گے جن کے نیچے ندیاں رواں دواں ہوں گی اور وہ جو بھی آرزو کریں گے ان کے لئے مہیا کر دی جائے گی، وہ وہاں پر ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔ اور خداوند اہل تقویٰ کو اس طرح اجر و ثواب دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی آیت: ۶۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ۚ﴿۶۰﴾

ترجمہ: ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟''

الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ‌ ۙ يَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۲﴾

''جن کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں ایسے حال میں کہ وہ پاک ہیں، فرشتے کہیں گے تم پر سلامتی ہو بہشت میں داخل ہو جاؤ بسبب ان کاموں کے جو تم کرتے تھے''۔

موت کے وقت متقین پر فرشتوں کا سلام

فرشتے اہل تقویٰ کی روح ایسی حالت میں قبض کر لیں گے جب وہ ظلم، شرک اور گناہوں کی پلیدگی سے پاک ہوں گے۔ اور ان سے کہیں گے: تم پر درود اور سلام ہو۔ (فرشتوں کا اہل تقویٰ پر درود و سلام در حقیقت ان کے لیے امن و امان کی ضمانت ہو گی) اس کے بعد فرشتے ان سے کہیں گے: اپنے ان اعمال کے عوض جن کو تم دنیا میں انجام دیتے رہے، بہشت میں داخل ہو جاو۔ فرشتوں کی یہ بات اُن کے لئے بہشت میں جانے کی رہنمائی ہو

گی یعنی ان سے کہیں گے کہ آپ اس طرح بہشت میں چلے جاؤ۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

"کیا اب اس کے منتظر ہیں کہ ان پر فرشتے آئیں یا تیرے رب کا حکم آئے، اسی طرح ان سے پہلے والوں نے بھی کیا تھا، اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے"۔

ظالموں کا انجام

یہ آیت ظالموں کے لیے دھمکی ہے۔ فرشتوں کے آنے سے ان کے پاس عذاب لانے والے فرشتوں کا آنا مراد ہے جو آکر ظالموں کا صفایا کر دیں گے۔ امرِ خدا کے آنے سے قیامت کا برپا ہونا مراد ہے جس دن اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے گا اور اُن سے انتقام لے گا۔ یا اس سے مراد وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے خلاف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد فرمائی۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے۔

بہرحال اس مطلب کی تاکید اور تائید میں مزید کہا ہے کہ جو تم سے پہلے لوگ تھے وہ بھی تمہاری طرح عمل کرتے تھے اور حق کا انکار کرتے تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے جس کے نتیجے میں ان پر بھی عذاب الٰہی نازل ہوا۔ ان پر اُتارا جانے والا عذاب، اللہ کی طرف سے ان پر ظلم نہیں تھا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ کیونکہ وہ شرک پر قائم رہے، توحید کی دعوت کا انکار کیا اور توحیدی دعوت کی نابودی کے لئے کوشش کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مہلت دی لیکن وہ کفر اور ظلم پر

اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ کے عذاب نے ان کو گھیرے میں لے لیا لہٰذا وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔

فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۴﴾

''پھر انہیں ان کے بد اعمال کے نتیجے مل کر رہے اور جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے وہی کچھ ان پر نازل ہوا''۔

برے اعمال کی سزا

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کافروں اور ظالموں کو جو سزا ملتی ہے وہ ان کے اعمال کا طبعی نتیجہ ہے۔ انہوں نے غلط کام انجام دیے، ظلم کیا، تکبر کیا، شرک کیا، حق کی دعوت کو جھٹلایا، حق کا انکار کیا، عذاب کا انکار کرتے رہے تو جس چیز سے وہ ڈرتے تھے وہ واقع ہو گیا، جس عذاب کا مذاق اڑاتے تھے وہ ان پر آن پہنچا اور وہ اس سے اپنے آپ کو بچا بھی نہ سکے اور اس سے فرار بھی نہ کر سکے۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَىۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۚ فَهَلۡ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۳۵﴾

''اور مشرک کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور اس کے حکم کے سوا ہم کسی چیز کو حرام نہ ٹھہراتے، اسی طرح کیا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، پھر رسولوں کے ذمہ تو صرف صاف بات پہنچا دینا ہے''۔

کافروں کی بے تکی بات

یہ آیت نبوت کے خلاف بت پرستوں اور مشرکین کے استدلال کو بیان کر رہی ہے جس میں انہوں نے اللہ کی عبادت کی نفی اور اللہ کے حلال کو حرام بنانے کو اللہ کی مشیت اور مرضی پر معلق کر دیا ہےاور کہا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہی ہمارے آباء کوئی بھی اللہ کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کرتے! کیونکہ اللہ نے ایسا چاہا ہی نہیں ہے اسی لئے ہم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی چیز حرام نہیں ہو سکتی اس لیے اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم حرام نہ کرتے۔ مشیت سے اُن کی مراد اللہ تعالیٰ کا تکوینی ارادہ ہے۔ کیونکہ اللہ کا تکوینی ارادہ تخلف ناپذیر ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چیز فوراً وجود میں آجاتی ہے۔

گویا مشرکین اور بت پرست کہنا چاہتے ہیں کہ اگر انبیاء کی رسالت برحق ہوتی اور انبیاء کے لائے ہوئے احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے جن میں وہ لوگوں کو بتوں کی پرستش سے منع کرتے ہیں اور کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں تو اس صورت محال ہوتا کہ ہم اللہ کے ارادے کے خلاف کوئی عمل انجام دیتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی ارادے کے خلاف کوئی کام انجام دینا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہم جن اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ کی طرف سے کوئی امر و نہی نہیں آئی۔ رسالت اور شریعت اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی۔

انہوں نے اپنی بات میں اپنے آباء واجداد کو بھی شامل کیا ہے اور کہتے ہیں کہ ان اعمال میں اُنہوں نے اپنے آباء واجداد کی پیروی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا ہے کہ اے ہمارے رسول! ان کے آباء واجداد بھی اس قسم کے اعمال

انجام دیتے رہے ہیں لہٰذا تم ان کی بات کا اعتناء نہ کریں۔ آپ اللہ کے پیغام کو بڑے واضح انداز سے پہنچا دیں تاکہ ان پر حجت تمام ہوجائے۔ الٰہی رسولوں کی ذمہ داری فقط واضح انداز سے پیغام رسانی کرنا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی دعوت کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ کیونکہ وہ بھی باقی انسانوں کی طرح بشر ہیں اور ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے تکوینی ارادے کا اختیار نہیں ہے تاکہ وہ جو بھی کام انجام دینا چاہیں انجام دیں اور گناہگاروں کو اللہ کی اطاعت پر مجبور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو سارے لوگوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔ (سورہ مائدہ، آیت: ۴۸) ۔اللہ تعالیٰ نے تو بس یہ ارادہ کیا ہے کہ ان کو جو کچھ عطا کیا ہے اس کے ذریعے اُن کا امتحان لیا جائے۔ جو اللہ کی نعمتوں کا شکرگذار ہوگا تو یہ اسی کے فائدے میں ہے اور اگر کوئی کفر کرتا ہے تو خود اسی کے نقصان میں ہے۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝۳۶

"اور البتہ تحقیق ہم نے ہر امت میں یہ پیغام دے کر رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض پر گمراہی ثابت ہوئی، پھر ملک میں پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا"۔

رسولوں کا بھیجا جانا الٰہی سُنت

اس آیت میں تاکید کی جا رہی ہے کہ رسولوں کا بھیجاجانا الٰہی سنت ہے جو تمام اُمتوں میں جاری ہے۔ لوگ انبیاء کی دعوت قبول کرنے پر تکوینی اعتبار سے مجبور نہیں بلکہ انبیاء کاکام فقط لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دینا اور غیر اللہ کی عبادت سے منع کرنا ہے۔ پھر اس بات کی طرف اشارہ کیاگیا ہے کہ سابقہ اُمتوں میں سے بعض نے الٰہی توفیق سے ہدایت پائی اور انبیاء کی دعوت کو قبول کیا۔ البتہ یقینی طور پر حقیقی ہادی اللہ تعالیٰ ہے جو ہدایت کے اسباب مہیا کرتا ہے اور انہیں توفیق دیتا ہے کہ وہ انبیاء کی دعوت کو قبول کریں۔ لیکن الٰہی دعوت کو قبول کرنا ایک جبری اور اضطراری امر نہیں ہے جس میں بندے کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ بلکہ انسان اپنی اندرونی صلاحیتوں اور ذاتی آمادگی کی بنیاد پر ہدایت پا لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہدایت کے مقدمات خود بندے کے اختیار میں ہیں۔ اور ہدایت کا مقدمہ عمل میں اچھائی اور احسان ہے، اللہ تعالیٰ محسن کے ہاتھ کو پکڑتا ہے اور اسے گمراہ نہیں ہونے دیتا۔

دوسری طرف بعض اُمتوں کے لیے ضلالت اور گمراہی حتمی ہو گئی، اس ضلالت کے بارے میں کئی بار توضیح دی گئی ہے کہ اس ضلالت و گمراہی کو انسان نے اپنے برے اعمال کے ذریعے خود انتخاب کیا ہے۔ کیونکہ جب انسان فسق وفجور اور تکذیب کے سمندر میں غوطہ ور ہوتا ہے تو خداوند تبارک و تعالیٰ سزا کے طور پر اس سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ وگرنہ خدا کسی کو ابتداء میں گمراہ نہیں کرتا۔

اس بارے (سورہ صف، آیت: ۵) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

ترجمہ ''جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا''۔

یعنی پہلے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کا رخ اپنے آپ سے موڑ دیا۔ لہٰذا ان دو گروہوں میں سے کوئی بھی خواہ وہ ہدایت پانے والے ہوں یا گمراہ ہونے والے؛ اللہ کی مشیت سے باہر نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہدایت یا ضلالت پر کسی کو مجبور نہیں کیا بلکہ ہر شخص اپنے اختیاری اعمال کے طبیعی نتیجہ کو پہنچا ہے۔ پھر مشرکین کو خطاب ہے کہ زمین پر گھومو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا تھا؟ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ نبوی دعوت اور رسالت الٰہی تکوینی ارادے کے دائرے میں نہیں آتے تاکہ بت پرست یہ استدلال کر سکیں کہ اگر خدا چاہتا تو وہ لوگ بتوں کی عبادت ترک کرنے پر مجبور ہوتے یا اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام قرار نہ دیتے۔ اور وہ لوگ اس استدلال سے رسالت اور نبوت کے اللہ کی طرف سے نہ ہونے کا نتیجہ لیتے۔ رسالت اور نبوت وعدہ اور وعید پر مبنی دعوت ہے، انذار اور بشارت دینا ہے، اسے قبول کرنا یا نہ کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سارے لوگوں کو ایک ہی اُمت بناتا اور سب مومن بن جاتے لیکن اللہ نے ایسا نہیں چاہا بلکہ لوگوں کو اختیار دیا ہے کہ جو چاہیں ایمان لائیں اور اگر کوئی نہ چاہے تو ایمان نہ لائے۔ لیکن ایمان نہ لانے والوں کا انجام ہلاکت ہے اور یہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ انبیاء کی دعوت برحق ہے۔

اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی هُدٰىهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِىۡ مَنۡ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۳۷﴾

''اگر تو انہیں ہدایت پر لانے کی طمع کرے تو اللہ ہدایت نہیں دیتا اس شخص کو جسے گمراہ کر دے، اور نہ ان کے لیے کوئی مددگار ہوگا''۔

ہدایت دینے کا اختیار پیغمبر کے پاس نہیں

اس آیت میں پچھلی آیت کے مضمون کی تاکید میں کہا گیا ہے کہ اے ہمارے رسول! ہدایت فقط اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ لہٰذا اگر تم کسی کو ہدایت دینے کی طمع بھی کرو تو اگر اللہ اسے گمراہ کرنا چاہے تو تم اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔ تمہارا اسے ہدایت دینے کا اشتیاق کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گمراہی کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے اور اب یہ لوگ ہدایت نہیں پا سکتے ہیں۔ ہدایت اور ضلالت کبھی بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ نہ فقط اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دیتا بلکہ ان کے پاس کوئی ایسا مددگار بھی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کو انہیں ہدایت دینے پر مجبور کرے۔ (لہٰذا ان کا کفر، شرک اور ان کا آیات الٰہی کو جھٹلانا اس بات کا سبب بنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی یقینی اور ابدی گمراہی کا فیصلہ کرے، ان کا کفر، شرک اور الٰہی آیات کا جھٹلانے کا سبب بنا کہ ان کی ہمیشہ کی گمراہی کو حتمی قرار دیا جائے)۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳۸﴾

"اور اللہ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ اسے نہیں اٹھائے گا جو مر جائے گا، ہاں اس نے اپنے ذمہ پکا وعدہ کر لیا ہے (کہ اللہ انہیں مرنے کے بعد ضرور اٹھائے گا) لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے"۔

مشرکین کی جھوٹی قسمیں

کفار بڑی ڈھٹائی کے ساتھ قسمیں اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محشر اور قیامت نہیں ہیں، موت نابودی اور فنا ہونے کا نام ہے، موت کے بعد کوئی نئی زندگی نہیں ہے۔ البتہ ان کی یہ بات تناسخ کے عقیدے کے ساتھ منافات نہیں رکھتی، کیونکہ تناسخ کا

مطلب مرے ہوئے شخص کی رُوح کا کسی دوسرے بدن میں منتقل ہو جانا ہے اور وہ اسی دنیا میں زندگی کو جاری رکھتی ہے۔ قیامت کا مطلب مُردوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا اور ان کو ایک خاص وقت پر محشور کیا جانا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قیامت کا وعدہ برحق ہے۔اس میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے متعلق اپنے اس وعدے کو پورا کرے گا۔ ان کی نادانی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ان آیات سے منہ موڑ لیا ہے، رُخ پھیر لیا ہے جو اس وعدہ کے محقق ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ آیات آسمانوں کی خلقت، ظلم اور عدل میں لوگوں کا مختلف ہونا، اور ان پر نازل ہونے والی شریعت ہے جس کے مطابق ان کو چلنا تھا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت ساری نشانیاں قرار دی ہیں اور ان میں غور کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ جو بھی ان آیات میں غور کرلے گا وہ اللہ کے اس وعدے کو نہیں جھٹلائے گا۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كٰذِبِينَ ﴿٣٩﴾

''تاکہ ان پر ظاہر کر دے وہ بات جس میں یہ جھگڑتے ہیں اور یہ کہ کافروں کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے''۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا مقصد

اس آیت میں بعث اور مُردوں کو اٹھائے جانے کا ہدف بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اللہ جسے مارتا ہے ایک دن اسے دوبارہ مبعوث کرے گا تاکہ اُنہیں آپس کے اختلاف کے متعلق معلوم ہو جائے۔ لوگوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا

مقصد یہ ہے کہ ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات جن میں دین حق کے متعلق اختلاف، عقیدے اور عمل کے متعلق اختلاف یہ سب ان پر آشکار ہو جائے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے وہ جھوٹ تھا اور اللہ کا دین برحق تھا، اللہ کے پیغامات برحق تھے، اللہ کے رسولوں کی دعوت برحق تھی۔ معاد اور قیامت کی نفی کرنے والوں کی بات صحیح نہیں تھی۔ کیونکہ قیامت میں مُردوں کے حساب و جزاء کے لئے زندہ ہو جانے اور اللہ کے حضور حاضر ہونے پر سب کے سامنے سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

''ہم جس کام کے کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہم اسے کہہ دیں کہ ہو جا پھر وہ ہو جاتا ہے''۔

اللہ کا ارادہ

یہ آیت سورہ یٰسین کی آیت ۸۲ کی مانند ہے جس میں کہا گیا ہے: '' اللہ کا امر اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ اللہ جس چیز ا ارادہ کرتا ہے تو اسے ''کُن'' کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے''۔ ان دو آیتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ قول خدا سے اللہ کا امر مراد ہے اور اللہ کا قول اور اس کا امر حق اور ثابت ہے اور یہ حقیقت ثبوت کے معنی میں ہے جو بعینہٖ خارجی حقیقت ہے۔ اس جگہ اللہ کے امر سے اس کا عمل مراد ہے۔ لہٰذا اس کے تخلف اور اس کے مطابق عمل نہ ہونا یا اس کے جھوٹ یا باطل ہونے کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا کیونکہ یہ ایک بدیہی اور واضح امر ہے کہ ہر واقع اور ثابت ہونے والی چیز اپنی ہیئت سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔

پس اللہ تعالیٰ کا قول عین فعل ہے اور اس میں خطاء اور غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ امر الٰہی ہرگز رد نہیں ہوتا، اللہ کا قول کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا اور اللہ کے

وعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اس آیت سے آشکار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کی دو قسمیں ہیں ایک ارادہ تکوینی ہے جس میں تخلف ممکن نہیں ہے اور دوسرا ارادہ تشریعی ہے جس کی خلاف ورزی بھی ہو سکتی ہے اور اطاعت بھی ہو سکتی ہے۔

ارادہ تشریعی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بنایا ہے اور اس قانون پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ لوگ نماز پڑھیں، اب اگر کوئی پڑھے گا تو اطاعت ہو گی اور اگر نہیں پڑھے گا تو نافرمانی ہو گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ارادہ تشریعی کی نافرمانی ممکن ہے اور ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تشریعی متحقق نہ ہو۔ ارادہ تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ تکوینی ارادے میں تخلف ناممکن ہے۔

وَ الَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَـنُبَوِّئَنَّهُمۡ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً‌ ؕ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ اَكۡبَرُ‌ ۘ لَوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ‏ ﴿۴۱﴾

”اور جنہوں نے اللہ کے واسطے گھر چھوڑا اس کے بعد جبکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا تو البتہ ہم انہیں دنیا میں اچھی جگہ دیں گے، اور آخرت کا ثواب تو بہت ہی بڑا ہے، کاش یہ لوگ سمجھ جاتے“۔

اللہ کی راہ میں ہجرت کا ثمر

اسلام کے آغاز میں مومنین نے دو ہجرتیں کی ہیں؛ ایک ہجرت مکہ سے حبشہ کی جانب تھی اور دوسری ہجرت کہ مکہ سے مدینہ کی طرف۔ اس آیت میں مکہ سے مدینہ کی جانب کی جانے والی ہجرت مراد ہے۔ بہر حال یہ وہ لوگ تھے جن پر ظلم ہوا تو انہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دُنیا میں بھی اچھا بدلہ دیا جب

انہوں نے خداوند تبارک و تعالیٰ کے لئے اپنا وطن چھوڑا، گھر چھوڑا، رشتہ دار چھوڑے تو اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں ان کے لئے رہائش کا بندوبست کیا اور ان کے لیے ایک اچھا معاشرہ اور سوسائٹی مہیا کی، اچھے دوست دیے۔

بعض نے کہا ہے کہ "حَسَنَةً" سے وہ کامیابی اور فتح مراد ہے جو بعد میں مومنین کو نصیب ہوئی۔ لیکن دونوں باتوں کی بازگشت ایک ہی بات کی طرف ہے کیونکہ راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کا مقصد بھی اچھے معاشرے کو وجود میں لانا ہے۔ جہاں سوائے اللہ کے کسی اور کی پرستش نہ ہو اور الٰہی قانون کے علاوہ کوئی اور حکم اور قانون نہ ہو۔ اللہ کا حکم عدل و احسان کی بنیاد پر جاری ہو۔ آخر میں فرمایا کہ یہ بات طے ہے کہ آخرت کا اجر دنیاوی اجر سے عظیم تر ہو گا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ خدا نے آخرت میں کون کون سی نعمتیں ان کے لئے مہیا کر رکھی ہیں کیونکہ اخروی نعمتیں اور سعادتیں درد اور رنج کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہیں، ان میں ہمیشگی ہے، فناء نہیں ہے اور ان لذتوں میں ناکامی نہیں ہے اور وہ رحمتیں حق تعالیٰ کی ہمسائیگی سے عبارت ہیں۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

"جو لوگ ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا"۔

صبر کرنے والے

اس آیت میں صبر اور توکل کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ دو صفات اچھے مقصد تک پہنچنے میں انسان کی مدد کر سکتی ہیں۔ جو صبر کرے گا، اللہ اسے کمال تک پہنچائے گا۔ جو لوگ جہاد کی تلخی میں صبر نہ کریں یا مصائب آنے پر اللہ پر توکل نہ کریں اور سارا اعتماد کمزور جہات پر ہو تو وہ شکست سے دوچار ہوں گے اور دشمن ان کا گھیرا تنگ

کرے گا اور انہیں متفرق کرے گا۔ اور ایک صالح معاشرہ جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے وہ متحقق نہیں ہو گا۔ ایک صالح معاشرہ کے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ صبر سے کام لیا جائے، حوصلہ و برداشت ہونی چاہیے اور پھر اللہ پر توکل ہونا چاہیے اور اپنے امور اللہ کے سپرد کرنے چاہئیں کیونکہ جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنے سارے امور اللہ کے حوالے کرتا ہے تو اللہ اس کے سارے امور کو پورا کرتا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَۙ ﴿۴۳﴾

"اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی تو انسان ہی بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے، سو اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ لو"۔

اہل ذکر سے سوال

اللہ تعالیٰ اس آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمارہاہے کہ اے ہمارے رسول! تجھ سے پہلے بھی پیغمبروں نے لوگوں کو دین خدا کی جانب دعوت دی ہے۔ تجھ سے پہلے آنے والے پیغمبر بھی عام انسانوں کی طرح ہی تھے جو لوگوں کو دُنیا و آخرت کی بہتری تک پہنچانے کے لئے دین الٰہی کی دعوت دیتے تھے۔ ان کے پاس غیبی طاقت نہیں تھی تاکہ وہ عالم میں جاری نظام کو توڑ کر باطل کے راستوں کو ختم کردیں اور حق اور عدل پر مبنی حکومت بنائیں۔

پھر مشرکین کو خطاب کیا گیا ہے کہ اگر نبوی دعوت کی حقیقت کے بارے تم خبر نہیں رکھتے ہو تو اہل ذکر (یہاں اہل ذکر سے اہل کتاب مراد ہیں یعنی تورات اور انجیل کو ماننے والے) کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو تاکہ آسمانی کتابوں کا علم رکھنے

والے تمہیں سارا ماجرا بتائیں۔ لیکن پیغمبر اکرم ﷺ اور مومنین جو آپ کی دعوت کی حقانیت پر ایمان لائے ہیں، ان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ اہل ذکر اور تورات اور انجیل والوں کی طرف رجوع کریں۔ اس لئے کہ انہیں پیغمبر اکرم ﷺ کی رسالت کی حقیقت کا علم ہے اور انہوں نے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرلی ہیں۔ لہٰذا یہ بات مشرکین کے لئے کہی جا رہی ہے۔[1]

بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''ہم نے انہیں معجزات اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور ہم نے تیری طرف قرآن نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو اس بارے واضح بتادو جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تاکہ وہ اس کے بارے سوچیں اور غور وفکر کریں''۔

قرآن کے نزول کا سبب

اس آیت میں مذکور '' بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ '' کا مضمون پچھلی آیت میں ذکر شدہ '' اَرْسَلْنَا '' سے متعلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انبیاء کو روشن دلائل اور

---

[1]۔ تفسیر عیاشی میں محمد بن مسلم نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم اہل ذکر ہیں، لوگوں کو چاہیے کہ ہم سے سوال کریں۔ اس کے بعد فرمایا: ذکر سے قرآن مراد ہے۔ البتہ ہم نے کئی بار بتایا ہے کہ اس قسم کی روایات عام مفہوم کا ایک مصداق ہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ اس کے دوسرے مصادیق بھی ہوں۔ یعنی اہل ذکر سے اہل قرآن بھی مراد ہوں اور دوسری آسمانی کتابوں کے ماننے والے بھی مراد ہوں۔ اس آیت سے یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ مشرکین سے کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں پیغمبر کی دعوت اور ان کی نبوت پر شک ہے تو اہل ذکر، جن کے پاس آسمانی کتابیں آتی رہیں ان سے پوچھ لو وہ تمہیں بتائیں گے کہ یہ دعوت حق ہے۔ اور اگر اہل ذکر سے اہل قرآن مراد ہوں تو وہ آئمہ اہل البیت علیہم السلام ہیں جو نبوی دعوت کی حقانیت کے گواہ ہیں۔

آسمانی کتابیں دے کر بھیجا جو ان کی رسالت اور پیغمبری کی حقانیت کا ثبوت تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا کہ ہم نے قرآن میں جو دستورات دیئے ہیں یہ سب انسانوں کے لئے ہیں کہ وہ ان پر عمل پیرا ہوں۔ اگر ہم نے آپ کو مورد خطاب قرار دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کے پاس غیبی قدرت اور تکوینی ارادہ ہو جس کے ذریعے آپ ان پر ہر چیز مسلط کر دیں۔ بلکہ آپ کے وسیلے سے لوگوں تک پیغام پہنچانے کا مقصد دو امر تھے:۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے تجھ پر اتارا ہے آپ اسے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کرکے لوگوں تک پہنچا دو۔ کیونکہ الٰہی معارف کو وحی کے واسطہ کے بغیر لوگوں تک نہیں پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے کسی پیغمبر کا ہونا ضروری ہے جو وحی کو وصول کرے اور اسے آگے پہنچائے۔ اسی لیے ہم نے آپ پر وحی اتاری ہے اور آپ کے ذمہ لگایا کہ یہ بات لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں تعلیم دیں اور ان کے لیے واضح طور اسے بیان کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگ غور و فکر کریں اور جان لیں کہ جو کچھ تو لے کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور برحق ہے۔ کیونکہ تیری زندگی کے حالات جن سے تو گزرا ہے جیسے یتیمی کا زمانہ، ان پڑھ ہونا، غربت اور آپ کا ایک جاہل قوم کے درمیان ہونا؛ یہ سارے اسباب اس طرح کے نہ تھے کہ تم کمال کے چشمے سے ایک قطرہ بھی لے سکو اور سعادت حاصل کر سکو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر تیرے اوپر نازل کیا جس کے ذریعے تجھے یہ اختیار دیا کہ جنوں اور انسانوں کو چیلنج کرو کہ اس سے برتر کوئی کتاب نہیں ہے، یہ کتاب ساری کتابوں سے برتر ہے اور اس میں موجود ہر چیز انسانوں کے فائدے میں ہے۔اس میں انسانوں کے لئے ہدایت ہے، رحمت ہے، برہان اور نور ہے۔ ہم نے یہ سب تجھے دیا ہے تاکہ لوگوں کو آگاہی دے سکو۔ جیسا کہ (سورۂ نساء، آیت : ۱۷۴) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

ترجمہ: "اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور نازل کیا ہے"۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ ہم نے یہ قرآن آپ کو اس لئے دیا ہے تاکہ اس میں جو معارف ہیں انہیں لوگوں تک پہنچاؤ تاکہ لوگ آگاہی پائیں اور حق کے راستے پر آجائیں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾

"پس کیا وہ لوگ نڈر ہو گئے ہیں جو برے فریب کرتے ہیں اس سے کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے یا ان پر ایسی جگہ سے عذاب آئے کہ جہاں سے انہیں خبر تک نہ ہو"۔

سازشیوں کو دھمکی

اس آیت اور بعد والی آیت میں مشرکین کو دھمکایا گیا ہے۔ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرتے ہیں اور اپنے لیے خود سے قوانین اور احکام گھڑ لیتے ہیں، جاہلانہ روایت پر عمل کرتے ہیں، اللہ کی شریعت کا انکار کرتے ہیں، تکبر کرتے ہیں، اللہ کے پیغمبروں سے دشمنی کرتے ہیں، اتنے سارے گناہ کئے جا رہے ہو اور اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف سازشیں کر رہے ہو تو کیا تم ایسا سمجھتے ہو کہ تمہاری پکڑ نہیں ہو گی؟ "السَّيِّاٰتِ" فعل "مَكَرُوا" کا مفعول ہے۔

بہرحال اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب آشکار اور واضح نشانیاں اور

آیات، رب تعالیٰ کی توحید پر ثبوت تھیں اور اُنہی آیات میں انبیاء کی رسالت اور اُن کی دعوت کی حقانیت کے ثبوت بھی موجود تھے اور جس دعوت میں ان کے لیے دُنیا و آخرت کی بہتری بھی تھی اور اس پیغام کو ایسے مردان حق کے توسط سے لوگوں تک پہنچایا گیا ہے جن کو اللہ نے چُن لیا ہے اور ان کے پاس وحی بھیجی ہے۔اب یہ لوگ ان کے مقابلے میں آئے اور ان کے خلاف سازشیں کیں اور اللہ کے دین کو جھٹلایا تو کیا انہیں اس بات کا خوف نہیں ہے کہ خدا ان پر عذاب نازل کرے اور وہ زمین میں دھنس جائیں یا ان کے اوپر اچانک عذاب آجائے، یہ کیا سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہونے والا؟ اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور ایسے اعمال کا ارتکاب کر رہے ہیں ؟ جبکہ ایسا نہیں ہو گا، ان کو اچانک عذاب آلے گا۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾

"یا انہیں چلتے پھرتے پکڑے پس وہ عاجز کرنے والے نہیں ہیں"۔

سرکشوں کے لیے عذاب الٰہی

کیا اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھنے والے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے والے اپنے آپ کو اس عذاب الٰہی سے محفوظ سمجھتے ہیں جو ان کو ایک حالت سے دوسری حالت بدلتے ہوئے یا الٰہی نعمتوں سے بہرہ مند ہوتے ہوئے یا اپنے پلید اعمال میں غرق ہوتے ہوئے، ان کو اپنے گھیرے میں لے لے؟ یا انہیں دی گئی نعمتوں کو نقمت اور عذاب میں بدل دے؟ وہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ پر غالب نہیں ہو سکتے یا اس کے حکم سے فرار کر کے اس کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

''یا انہیں ڈرانے کے بعد پکڑے، پس تحقیق تمہارا رب نہایت ہی شفیق رحم کرنے والا ہے''۔

ظالم عذابِ الٰہی سے بچ نہیں سکتے

''یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ'' ایسے عذاب کو کہتے ہیں جس کا خوف پہلے سے ہو اور وہ عذاب آ پہنچے، ایسا عذاب جس کی نشانیاں پہلے ظاہر ہوئی ہوں اور ان نشانیوں کو دیکھ کر توبہ کرنے والے توبہ کریں، اور توبہ اور ندامت کے ذریعے اس عذاب کو اپنے سے ٹال دے۔ اس قسم کا عذاب، اچانک آنے والے عذاب کے مقابلے میں ہے جس کے متعلق سابقہ آیت میں اشارہ ہوا اور کہا گیا کہ یہ عذاب ''مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ'' آتا ہے یعنی اس قسم کے عذاب کے آنے کی کوئی نشانی پہلے سے ظاہر نہیں ہوتی، جسے دیکھ کر انسان توبہ کرلے اور عذاب کو آپ سے ٹال دے، لہٰذا اس قسم کے عذاب سے بچنے کا امکان نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں مذکورہ آیت میں جس عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس میں توبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے رحمت اور مہربانی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ روؤف و رحیم ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ'' سے ایسا عذاب مراد ہے جو خوف تو دلائے لیکن ہلاکت کا موجب نہ ہو جیسے زلزلہ، طوفان اور سیلاب وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے ''تَخَوُّفٍ''، ''تَنَقص'' کے معنی میں ہے جس سے مراد حاصل شدہ نعمتوں میں تدریجاً کمی آجانا۔ مثلاً امن و سکون کا ختم ہو جانا، بارشوں کا کم ہونا، مختلف قسم کی بیماریوں کا آجانا، غرض یہ کہ آہستہ آہستہ نعمتیں ہاتھ سے جاتی رہیں۔ البتہ نعمتوں کا کم کرنا بھی ایک مہلت ہے جس میں گناہگار اور بدکردار کو موقع دیا جاتا ہے کہ توبہ کرلے اور توبہ کے ذریعے جو چیز ہاتھ سے جا رہی ہے اس کی تلافی کرلے۔ اس لیے ''فَاِنَّ

رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ " والا جملہ اس آیت کے مضمون کی علت اور وجہ کے طور پر بیان ہوا ہے کہ اس عذاب کا ڈر اور خوف انسان کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ توبہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آئے۔ کیونکہ جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ اپنی رحمت سے اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔

اَوَ لَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

"کیا وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں طرف جھکے جارہے ہیں اور نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ کو سجدہ کر رہے ہیں"۔

مخلوقات کا اللہ کو سجدہ

اس آیت میں "رَؤیت" آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں ہے (رَؤیت حسی مراد ہے)۔" تَفَيّو" ظہر کے بعد سائے کے پلٹنے کو کہتے ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے (البتہ خداوند تبارک و تعالیٰ زیادہ دانا ہے) کہ کیا اللہ تعالیٰ کی توحید ربوبی اور اللہ کے پیغمبروں کی دعوت کے منکر مشرکین زمین پر پائی جانے والی خداوند تبارک و تعالیٰ کی مخلوقات کو نہیں دیکھتے جن میں پہاڑ، درخت، عمارتیں اور زراعت شامل ہیں جب ان کا سایہ بڑھنے کے بعد کم ہو رہا ہوتا ہے تو اُن کے اطراف میں ہر چیز اللہ کے آگے عاجزی کے ساتھ سجدے کی حالت میں ہوتی ہے؟ کیا وہ ان اشیا پر نظر نہیں ڈالتے جو حق تعالیٰ کے سامنے بندگی، ذلت اور پستی و حقارت کا اظہار کر رہی ہوتی ہیں؟

لہٰذا تمام جسمانی موجودات اللہ کے حضور خضوع اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں

اور اللہ کے امر کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اور اپنی بندگی اور ذلت کو تکوینی عبادات کے ذریعے ظاہر کررہے ہوتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (سورۃ النور، آیت :۴۱)

ترجمہ ''کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی؟ ان میں سے ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے اور اللہ کو ان کے اعمال کا بخوبی علم ہے''۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۴۹

''اور جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں سے اور فرشتے سب اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے''۔

ہر شئے کا اللہ کے حضور سجدہ کرنا

سجدہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی و عظمت کے سامنے انتہا درجے کے تواضع و انکساری کے اظہار کو کہتے ہیں۔ اللہ جو کہ تمام موجودات کا خالق اور یکتا ہے اس کے سامنے یہ تذلل اور انکساری تمام موجودات کی ذات میں موجود ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی حرکت کرنے والا ہے وہ اللہ کے حضور خاضع (جھکا ہوا) ہے اور اس کا اللہ کے سامنے جھکنا ذاتی ہے یعنی یہ بات اس کی خلقت میں شامل ہے۔ فقط خداوند تبارک و تعالیٰ کی ذات ہی اس لائق ہے کہ اس کی پرستش کی جائے اور اسی کو سجدہ کیا جائے۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کرۂ ارض کے علاوہ دوسرے آسمانی کرات میں بھی حرکت کرنے والے موجودات پائے جاتے ہیں اور وہاں پر بھی سکونت اور زندگی ہے۔ پھر فرمایا: فرشتے بھی اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت کرنے سے تکبر نہیں کرتے۔ جبکہ مشرکین کی حالت یہ ہے کہ وہ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے اور انہیں اپنا معبود قرار دیتے تھے۔

استکبار کا معنی ہوتا ہے کہ انسان خود کو ایسے مقام پر بٹھا دے جس کی اس میں لیاقت نہیں ہے اور اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرے۔ استکبار ہمیشہ قابل مذمت ہے چاہے مخلوق کے سامنے ہو اور اپنے جیسوں کے آگے شیخی بکھیرے یا استکبار خالق کے مقابلے میں ہو، یعنی خالق کی اطاعت نہ کرے۔ لیکن تکبر اگر بندہ کرے تو قابل مذمت ہے لیکن کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کبریائی کی مستحق ہے اس لیے تکبر اس کا حق ہے کیونکہ کوئی بھی موجود عظمت اور کبریائی کے حوالے سے اس کے ساتھ برابری نہیں کر سکتا۔ مخلوقات کا تکبر کرنا ناپسندیدہ ہے کیونکہ ساری مخلوقات خداوند تبارک و تعالیٰ کی محتاج اور فقیر ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہے۔ ایک کا دوسرے پر تکبر کرنا اس لیے ناپسندیدہ ہے۔ کیونکہ یہ حد سے آگے بڑھنا اور ظلم و سرکشی کا مصداق ہے۔ اسی طرح مخلوق کا اللہ کے حضور تکبر اس لیے مکروہ اور ناپسندیدہ ہے کیونکہ تکبر اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی موجود ذاتی طور پر بے نیاز اور مستقل ہو جبکہ کوئی بھی موجود مستقل اور بے نیاز نہیں ہے، سب محتاج ہیں۔

لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور تکبر کرنا اس کے مقام عظمت سے غفلت کی وجہ سے ہے۔ عبد اور رب تعالیٰ کے درمیان فقر و غنی، عزت و ذلت کی نسبت ہے، عبد فقیر ہے، رب غنی ہے، عبد ذلیل ہے اور رب تعالیٰ عزیز ہے، پس کبریائی، عظمت اور عالی مقام اور بلند شان اللہ سے مخصوص ہے۔ بندے کی جانب سے اللہ کے

مقابلے میں تکبر کا دعویٰ کرنا سرکشی ہے۔ یہ وہی تکبر ہے جو ذاتی طور پر عمل میں بھی تکبر کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے میں انسان رب تعالیٰ کی اطاعت ترک کرتا ہے۔ رب تعالیٰ نے جس چیز سے منع کیا ہے اس سے نہیں رکتا۔ فرشتوں پر یہ بات صدق نہیں کرتی ہے کیونکہ وہ کبھی بھی رب تعالیٰ کے مقام سے غافل نہیں ہیں اور نہ ہی کبھی اللہ کے ذکر اور یاد سے غافل ہوتے۔ وہ ہمیشہ اللہ کی یاد میں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مستکبر نہیں ہیں۔

يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۩ ﴿٥٠﴾

''وہ اپنے بالادست رب سے ڈرتے ہیں اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ بجا لاتے ہیں''۔

فرشتوں کی حالتِ اطاعت

پچھلی آیت میں وضاحت کی گئی کہ فرشتے اپنی ذات کے اعتبار سے کسی بھی لحاظ سے اللہ کے سامنے اپنی بڑائی کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی یاد سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتے، اللہ کی عبادت سے انحراف نہیں کرتے۔ اس آیت میں ان کے عدم استکبار یعنی متکبر نہ ہونے کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے اللہ کے سامنے متکبر نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے مقام سے خوف میں رہتے ہیں۔اس لیے انہیں جو دستور دیا جاتا ہے وہ اسے انجام دیتے ہیں۔

فرشتوں کے حوالے سے پہلی بات یہ تھی کہ وہ ذاتی طور پر استکبار، تکبر اور بڑائی کا اظہار نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان سے عمل کے اعتبار سے بھی تکبر کی نفی کی گئی ہے۔ فرشتوں کا اللہ تعالیٰ سے ڈر اس حوالے سے نہیں ہے کہ اس سے کسی شر یا ضرر پہنچنے کا احتمال ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ خیر محض ہے۔ اس ڈر کا مطلب یہ ہے کہ وہ

ایک بڑی اور غالب طاقت اور قدرت کے سامنے اپنی پستی اور کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ فرشتے رب تعالیٰ کے مقام کی معرفت رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ہر شے پر غالب ہے اور ہر شئی سے برتر ہے۔ لہٰذا ایسی ذات کے سامنے ایک قسم کا خوف ہوتا ہے جو عمل کے مقام پر استکبار کی نفی کرتا ہے۔ اسی لیے فرشتے اللہ تعالیٰ کی ہر گز معصیت نہیں کرتے اور جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا ہے اسے انجام دیتے ہیں۔

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

”اللہ نے کہا ہے دو معبود نہ بناؤ، وہ ایک ہی معبود ہے، پھر مجھ ہی سے ڈرو“۔

بخشش کی اُمید اور عذاب کا خوف

”رھبہ“ خوف کو کہتے ہیں جس کے مقابلے میں ”رغبت“ ہے جو چاہت کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں ایک خدا کے علاوہ دوسرے معبودوں کی عبادت سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا دو معبودوں کی عبادت سے منع کرنا، اللہ کے علاوہ کسی بھی معبود کی عبادت کو شامل ہے۔ معبود فقط ایک اللہ ہے اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ایک خدا کے علاوہ کسی کی پرستش مت کرو۔ خلقت کے معبود، تدبیر کے معبود، ستاروں کے اور ہر شئے کے الگ الگ معبود مت بناؤ۔ اللہ یکتا معبود اور الٰہ ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ میں نے اکیلے ہر شئے کو خلق کیا ہے اور پورے عالم کا مدبر میں ہی ہوں۔ پس اس لحاظ سے لازم ہے کہ تم صرف میری عبادت کرو، مجھ سے ڈرو اور میری ربوبیت کے مقام اور میری جلالت کا خوف

کھاؤ۔

وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَهُ الدِّیۡنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیۡرَ اللّٰهِ تَتَّقُوۡنَ ﴿۵۲﴾

''اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور عبادت اسی کی لازم ہے، پھر کیا اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو''۔

آسمانوں اور زمین کی مالکیت

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں موجود ساری چیزیں اللہ کی ملکیت ہیں۔ اور دائمی اور لازمی اطاعت بھی اللہ ہی کی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ حقیقتاً تمام حالات میں اللہ کی اطاعت کرے۔ کیونکہ الٰہی قوانین اور الٰہی سنتیں ہی اسے سعادت تک پہنچا سکتی ہیں۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے خاضع ہے۔ سارے امور کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے، ربوبیت اسی کی ہے وہ اس میں مستقل ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کی جائے۔ تقویٰ و ترس اور ڈر صرف اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہیے۔ آیت کے آخر میں استفہام انکاری کے ذریعے تعجب سے پوچھا ہے کہ اللہ کے غیر سے کیوں ڈرتے ہو؟ غیر خدا میں تو یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ اس کی عبادت کی جائے کیونکہ وہ نہ تو کسی کو بچا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے پاس قانون بنانے کا اختیار ہے۔ قانون اللہ کا بنایا ہوا ہے، جس کا قانون ہے اسی کی اطاعت کرو۔

وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيۡهِ تَجۡـَٔرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ۚ

''اور تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے سو اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب

تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے فریاد کرتے ہو"۔

ساری نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں

یہ آیت بھی ربوبیت میں اللہ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ "ضُرٌّ" اس بری حالت کو کہتے ہیں جو کسی نعمت کے فقدان سے انسان کے لیے پیش آتی ہے جس میں اس کی خیر و فلاح اور بہتری ہو۔ یعنی کسی نعمت کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے پیش آنے والی بری حالت کو ضُرّ کہا جاتا ہے۔ "جوار" جنگلی جانوروں کے آواز بلند کرنے اور شور مچانے کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر رب تعالیٰ کے حضور استغاثہ اور تضرع و زاری کرنے کو حیوانات کی چیخ و پکار سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہارے پاس جتنی بھی نعمتیں ہیں وہ ساری اللہ کی طرف سے ہیں۔ کیونکہ وہی ہستی کا مالک ہے۔ جب کوئی نعمت تمہارے ہاتھ سے جاتی ہے تو تم غمگین ہو جاتے ہو اور اللہ کے حضور تضرع و گریہ و زاری اور نالہ و فریاد کی آوازیں بلند کرتے ہو کیونکہ نعمت دینے والا اور مصیبتوں کو ٹالنے والا اللہ ہی ہے۔ اس سب کے باوجود پھر اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟

اس آیت میں جس دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ایک بدیہی اور واضح امر ہے۔ کوئی بھی عاقل انسان اس کے بارے ذرا سا سوچے تو اس میں شک و تردید نہیں کرے گا۔ کیونکہ جب انسان کے ظاہری سارے اسباب منقطع ہو جائیں اور اس کے پاس کوئی بھی چارہ نہ رہے تو وہ ایک ذات کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کا وجدان اور ضمیر اسے کہتا ہے کہ ایک ذات ایسی ہے جو تمہاری مشکل حل کر سکتی ہے۔ تمام انسان حتی وہ لوگ جو کسی دین پر عقیدہ نہیں رکھتے جب مشکلات ہر طرف سے انہیں گھیر لیتی ہیں، ہر طرف سے اُمیدیں ختم ہو جاتی ہیں، ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی

چارہ نظر نہیں آتا تو ان کے دل کی تہہ اور گہرائی سے کسی طاقت اور قدرت پر اعتماد اور اطمینان کرنے اور اسے پکارنے کی آواز آتی ہے جس سے اُمید لگاتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے اسے پکارتے ہیں تاکہ وہ طاقت ان کی مشکل حل کرلے۔

اصولی طور پر یہ جو دل کی حالت ہے اور یہ جو اُمید کی کرن دل میں پیدا ہوتی ہے یہ خدا کے ثبوت پر وجدانی دلیل ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر پیدا ہونے والی ہر حالت کے مقابلے میں اس کا کوئی نہ کوئی خارجی متعلق ہوا کرتا ہے۔ خارج اور واقعیت میں کسی چیز کے تحقق کے بغیر اس حالت کا انسان کے اندر پیدا ہونا عقلی طور پر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا مشکلات اور سختیوں کے عالم میں جب سارے ظاہری اسباب سے امیدیں ختم ہو جاتی ہیں تو اس موقع پر قلب کی یہ حالت اور دل کی اُمید اس بات کی دلیل ہے کوئی ہستی اور ذات ایسی ہے جو سارے ظاہری اسباب کے کٹ جانے کے باوجود بھی آدمی کی مدد کر سکتی ہے۔ یہ ذات کسی بھی حالت میں انسان سے جدا نہیں ہوتی، یہ ایسا سبب ہے جسے زوال اور فنا نہیں، اس میں بھول چوک نہیں اور یہ سبب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو انسان کی ساری مشکلات کو حل کرتا ہے۔

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

”پھر جب تم سے تکلیف دور کر دیتا ہے تو فوراً تم میں سے ایک جماعت اپنے رب کے ساتھ شریک بنانے لگتی ہے“۔

تکلیف دور ہونے پر انسان کی ناسپاسی

اس آیت میں مشرکین کی سرزنش اور ملامت کی گئی ہے اور آخر میں انہیں سخت دھمکی دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ایسا رویہ اپنانے میں حق بجانب ہے۔ کیونکہ جب ان پر سختیاں آجاتی ہیں تو وہ اللہ کے حضور نالہ و فریاد کرتے ہیں اور فطرت کے تحت

رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ سب کا رب فقط اللہ ہی ہے اور سب کی مشکلیں وہی حل کرتا ہے۔ لیکن جیسے ہی مصائب ٹل گئے تو جس غیبی طاقت سے انہوں نے تعلق باندھا تھا، اسے بھول جاتے ہیں۔ اور دوبارہ شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں پھر سے اخلاقی رذائل اور کمینگیاں بیدار ہو جاتی ہیں اور طاقت پکڑتی ہیں اور اپنے رب کا شریک بنا لیتے ہیں۔ یہ بہت ہی بری اور ناقابل تسلیم روش ہے۔ کیونکہ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ مسبّب الاسباب، اللہ تعالیٰ ہے، سب کا رب اللہ تعالیٰ ہے، اس کے باوجود جب مشکلات حل ہو جاتی ہیں تو وہ پھر شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۪ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۵۵

"تاکہ جو نعمتیں ہم نے انہیں دی تھیں ان کی ناشکری کریں، تم ان نعمات سے خیر و نفع تو اُٹھالو، آگے چل کر معلوم کرلو گے (کہ اس ناشکری کا کیا نتیجہ ہوا)"۔

نعمات الٰہی کی ناسپاسی کا انجام

اللہ تعالیٰ مشرکین سے مخاطب ہو کہ فرمارہا ہے کہ ہم نے تمہیں یہ ساری نعمتیں دیں اور مصائب و مشکلات کو تم سے دُور کیا لیکن اس کے باوجود تم نے ناشکری کی اور اپنی زندگی کے سفر میں کفر کے سوا کوئی غرض نہیں رکھتے ہو، انکار کو ہی اپنی غرض بنا لیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہارے دلوں میں مادیات اور محسوسات نے رسوخ کر رکھا ہے اور اسی میں ہی مصروف ہو۔ تم ظاہری اسباب کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہو اور خیال کرتے ہو کہ یہ الٰہی نعمتیں انہی ظاہری اسباب کے تحت تمہیں ملی ہیں۔ تمہاری پست اخلاقی صفات تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک بہت بڑا بھاری

بھر کم حجاب ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے رب کو بھلا دیا ہے اور اس کی طرف سے ملنے والی نعمتوں پر شکر کرنے اور اس کی یاد میں رہنے کی بجائے ان نعمتوں کے ظاہری اسباب و علل کے بارے میں سوچنے لگ جاتے ہیں اور حقیقی نعمت دینے والے سے غافل ہو جاتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا ہدف اللہ کی نعمتوں کا کفران کے سوا کچھ نہیں اور انہوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ترک کرنے کو ہی اپنا مقصد بنا لیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ اپنے ان اعمال میں سرگرم اور مصروف رہو! بہت جلدی جان لو گے کہ تمہاراانجام کیا گا۔ یعنی جو کچھ تمہارا دل چاہتا ہے کرتے رہو، مادی نعمتوں سے فائدے اٹھاتے رہو، لیکن بہت جلد قیامت آئے گی اور تمہاری پکڑ ہو گی اور یہ ظاہری اسباب تمہارے لئے کوئی فائدہ نہیں دیں گے۔ یہاں پر امر کو مبہم رکھنے کا مقصد ان کو دی گئی دھمکی اور سزا کے حوالے سے انہیں ڈرانا اور اس میں سختی اور تاکید پیدا کرنا ہے تاکہ وہ پریشانی اور حیرانگی میں رہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو گا، نہ جانے وہ کون سی عاقبت ہے جو ہماری انتظار میں ہے۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

”اور جنہیں وہ جانتے بھی نہیں ان کے لیے ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے ایک حصہ مقرر کرتے ہیں، اللہ کی قسم البتہ تم سے ان بہتانوں کی ضرور باز پرس ہوگی“۔

رزق کے معاملے میں مشرکین کا شرک

مشرکین اپنی روزی کے ایک حصے کی نسبت ظاہری اسباب کی طرف دیتے تھے،

اس طرح وہ ان ظاہری اسباب کو رزق و روزی کے معاملے میں خدا کا شریک بناتے تھے۔ اور ان ظاہری اسباب کو رزاق کا عنوان دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہی ظاہری اسباب ہی ان کو روزی دینے والے ہیں۔ اس طرح وہ رب تعالیٰ پر افتراء باندھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ تمہارے اس افترا باندھنے کے متعلق سوال ہو گا۔

یہ بات معلوم رہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر رزق کی نسبت ان معبودوں کی طرف دیتے تھے جنہیں انہوں نے اپنا ولی بنایا ہوا تھا اور اصولی طور پر وہ اللہ تعالیٰ کو رزق و روزی دینے میں موثر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن فطری علم کے تحت، خاص کر جب مصیبت اور پریشانی میں ہوں تو درگاہ خدا میں پناہ لیتے ہیں اور اُس وقت یہ جان جاتے ہیں کہ رزق دینے میں اللہ تعالیٰ ہی مؤثر ہے، اس حوالے سے اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے غیر خدا کو رزق کے امر میں اللہ کا شریک قرار دے دیا۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا معنی اس طرح بیان کیا ہے کہ مشرکین بتوں کے لئے نذر مانتے تھے اور اپنی روزی کا ایک حصہ ان بتوں کو دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کے بارے میں فرمایا ہے کہ بہت جلد اس بارے ان سے سوال کیا جائے گا۔ لیکن یہ معنی تکلف سے خالی نہیں ہے کیونکہ آیت کے معنی کو اس طرح بیان کرنے کے لئے توجیہ کی ضرورت ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ اس سے پاک ہے، اور اپنے لیے وہ کچھ قرار دیتے ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے"۔

اللہ کے لیے بیٹیاں قرار دینا

مشرکین اپنے بعض معبودوں کو مؤنث خیال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ

اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ بعض مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بت پرست اور صابئی فرشتوں اور جنات کی پرستش کرتے تھے اور ساری خیرات اور اچھائیوں کی نسبت فرشتوں کی طرف دیتے تھے جبکہ تمام شرور اور برائیوں کو جنات کی طرف نسبت دیتے تھے۔ لہٰذا وہ خیر کی طمع اور شر کے ڈر سے فرشتوں اور جنات کی عبادت کرتے تھے۔ اور ان سب کو مؤنث اور مادہ خیال کرتے تھے۔ بعض مشرکین کا عقیدہ تھا کہ فرشتوں اور جنات کی ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں ہوئیں ہیں اور ان کی اولاد کے بھی قائل تھے۔ان میں سے بعض اتنے بے ادب تھے کہ جب بیٹے پیدا ہوتے تھے تو انہیں اپنا بیٹا قرار دیتے لیکن اگر بیٹی پیدا ہوتی تو اسے اپنے لیے پسند کرتے اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے اور اسے زندہ درگور کر دیتے تھے۔ جس چیز کو خود پسند نہیں کرتے تھے اس کی نسبت اللہ کی طرف دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ عجیب بات ہے، اپنے لئے تو لڑکے پسند کرتے ہو اور خدا کے لئے لڑکیاں پسند کرتے ہو! جو چیز تمہیں اپنے لئے پسند نہیں اسے خدا کے لئے قرار دیتے ہو؟! ان کا ایسا رویہ قابل مذمت ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۚ﴿۵۸﴾

"اور جب ان میں سے کسی کی بیٹی کی خوشخبری دی جائے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے جبکہ وہ اس خبر کی وجہ سے سخت غمگین ہوتا ہے"۔

مشرکین کی بیٹیوں سے نفرت

یہی مشرکین جو اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، جب انہیں بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تھی تو غصے اور غم سے ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے پر کنٹرول کر پاتے ہیں۔

یَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَیُمْسِکُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اس خوشخبری کی برائی کے باعث لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، آیا اسے ذلت قبول کر کے رہنے دے یا اس کو مٹی میں دفن کر دے، دیکھو وہ کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں''۔

یہ آیت بھی پچھلی آیت کے مضمون کا تسلسل ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب مشرکین میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہوتی تو وہ اسے بری خبر سمجھتا کیونکہ عمومی افکار کے دباؤ کے تحت وہ لڑکی کو برا سمجھتا تھا اور بیٹی پیدا ہونے پر اپنی قوم سے چھپتا پھرتا تھا اور اس سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ بیٹی ہونے کی ذلت و رسوائی کو قبول کرے یا اسے زندہ درگور کر دے۔ خدا کی طرف لڑکیوں کی نسبت دینے کا ان کا فیصلہ کتنا برا ہے کہ وہ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹیوں کی نسبت دیتے ہیں۔

بعض مفسرین کے نزدیک ان کے فیصلے کے برے ہونے کا مطلب، بیٹیوں کو مارنا ہے ان کا بیٹیوں کو مارنے کا فیصلہ بہت برا فیصلہ ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔ بیٹیوں کو مارنے کی روایت ایران کے بادشاہ کسریٰ کے ساتھ بنی تمیم کی جنگ سے شروع ہوتی ہے۔ اس جنگ کے دوران بنی تمیم کی کچھ عورتوں کو بادشاہ ایران کے لشکر نے قیدی بنالیا اور وہ بڑا عرصہ ان کے دربار میں کنیزی کرتی رہیں۔ بعد میں جب صلح ہو گئی تو بادشاہ کے دربار میں اُن کو اختیار دیا گیا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں ہی رہیں یا واپس چلی جائیں۔ ان میں سے کچھ عورتوں نے واپس جانے سے انکار کیا جس پر قبیلے کے مرد بہت غصہ ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے بعد اگر بیٹی پیدا ہوئی تو اسے زندہ درگور کر دیں گے۔ یہ غلط روایت آہستہ آہستہ تمام عرب قبائل میں

عام ہو گئی۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

”جو آخرت کو نہیں مانتے ان کی بری مثال ہے، اور اللہ کی شان سب سے بلند ہے، اور وہی زبردست حکمت والا ہے“۔

آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کی مثال

”مَثَلُ“ صفت کے معنی میں ہے۔ آخرت اور حساب وکتاب اور جزاء و سزا کے دن پر عقیدہ ایک ایسی بنیادی چیز ہے جو انسان کو برے اعمال انجام دینے سے روکتی ہے اور اسے ہر قسم کے گھٹیا پن سے بچاتی ہے۔ اس آیت کے مطابق آخرت پر ایمان نہ رکھنا اور حساب وکتاب اور جزا اور سزا اور احتساب کے امر کو ہلکا سمجھنا؛ تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ ہر بری صفت اور عیب اور ننگ و عار جس سے انسان آلودہ ہوتا ہے اس کی وجہ آخرت سے غفلت ہے۔ لہٰذا آخرت پر ایمان نہ رکھنا تمام پلید اور گندی صفات کی جڑ ہے۔ مومنین میں سے بعض کا ان بری صفات اور رذائل اخلاقی میں آلودہ ہونے کی وجہ بھی روز آخرت کو بھول جانا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ ہر قسم کی بری صفات سے منزہ، مقدس اور برتر و بالاتر ہے۔سارے کمالات اسی سے ہیں اور اسی کے لیے ہیں۔ تمام صفات کمالیہ بدرجہ اتم اس میں موجود ہیں۔ لہٰذا ساری اچھی صفات اللہ کے لئے ہیں۔ اس بارے (سورۂ طٰہٰ، آیت:۸) میں فرمایا:

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴿۸﴾

ترجمہ: ''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بہترین نام اسی کے لیے ہیں''۔
اسی طرح (سورۂ روم، آیت :۲۷):
وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾
ترجمہ: ''اعلیٰ صفات اور اعلیٰ مثالیں آسمانوں اور زمین میں اللہ کے لئے خاص ہیں۔''

صفات کمالیہ کا اللہ کے ساتھ خاص ہونا

لہٰذا ''مثل اعلیٰ'' کا مطلب ساری صفات کمالیہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا اور تمام بری صفات کو اس ذات سے دُور کرنا ہے۔ پھر ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾'' میں سابقہ بات کی وجہ بیان کی جا رہی ہے۔ یعنی تمام عزتیں اور عظمتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ اس کی عزت کو ذلت میں نہیں بدلا جا سکتا کیونکہ ذلت کا معنی ہی عزت کا مفقود ہونا ہے اور وہ ذات جس کے لئے تمام عزتیں ہوں، وہاں کسی عزت کے فقدان اور نہ ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح تمام حکمتیں بھی اسی کے لئے ہیں، لہٰذا اس ذات میں جہل کا کوئی تصور نہیں ہے۔ کیونکہ جہل، حکمت اور دانائی کے فقدان کو کہتے ہیں۔ جس کے پاس ساری حکمتیں اور ساری دانائیاں ہوں، وہاں پر جہل کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

وہ ذات جو جہل اور ذلت سے دُور ہو وہ کبھی بھی کسی نقص یا مذمت سے متصف نہیں ہوتی۔ مومن کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ولایت میں داخل ہے (اگرچہ اپنے نفس کے اعتبار سے جاہل اور ذلیل ہے) لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنی عزت سے اسے محترم بنا دیا ہے، اپنی روح اور ولایت سے اسے جہالت کی قید سے رہائی دی ہے۔ جیسا کہ اس بارے (سورہ آل عمران، آیت :۶۸) میں فرماتا ہے: وَ اللّٰهُ وَلِيُّ

الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۸﴾ "اللہ مومنوں کا یاور و مددگار ہے"۔ اسی طرح (سورۃ المنافقون، آیت :۸) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَلِرَسُوۡلِہٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔۔۔ "اللہ کے لئے، اللہ کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے عزت ہے"۔

(سورۃ مجادلہ، آیت :۲۲) میں فرمایا:

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَہُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ ؕ۔۔۔

ترجمہ: "مومنین وہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے اور اس نے اپنی طرف سے ایک روح سے ان کی تائید کی ہے۔۔۔"۔

یہ سب اس وجہ سے ہے کہ اللہ جو کہ عزیز ہے، اسی نے مومنین کو عزت دی ہے اور ان سے ذلت کو دُور کرتا ہے۔ جبکہ کفار اپنی ذات میں بھی ذلیل اور جاہل ہیں اور ان میں صفات کے اعتبار سے بھی نقص اور عیب پایا جاتا ہے جو ان کی ذات کا لازمہ ہے۔ اس وجہ سے ان کے لیے "مثل سوء" یعنی بری مثال ہے اور ان کا کوئی یاور و مددگار اور ولی و وارث نہیں ہے لہٰذا ذلت ان کی ذات کا حصہ ہے۔

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِہِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

"اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بے انصافی پر پکڑے تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑے لیکن ایک مدت مقرر تک انہیں مہلت دیتا ہے، پھر جب ان کا وقت آتا ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں"۔

گناہگاروں کو معین مدت تک مہلت

اگر اللہ تعالیٰ ستمگاروں کے ظلم کی وجہ سے ان کی پکڑ کرتا تو زمین پر کوئی بھی جاندار باقی نہ رہتا اور انسان اور دوسرے تمام جاندار سب ہلاک ہو جاتے۔ جب انسان کی ایک نسل ختم ہو جائے گی تو انبیاء، اولیاء اور نیک لوگ بھی اپنے آبا واجداد کے ہلاک ہونے کی وجہ سے متولد نہیں ہوں گے۔ جب انسان کی نسل ہی نہیں رہے گی تو باقی جاندار بھی ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ اُنہیں انسان کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق (سورۂ البقرہ، آیت :۲۹) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

ترجمہ: "وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے اور ستمگاروں کو پکڑنے اور انہیں سزا دینے میں جلدی نہیں کرتے بلکہ انہیں مہلت دیتے ہیں اور اُن کی پکڑ اور گرفت ایک معین مدت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔ اور یہ معین مدت اور مہلت انسانوں کی موت کا وقت ہے۔ اور امتوں کی مدت معین ان کے خاتمے کا وقت ہے اور عام لوگوں اور پوری بشریت کے لئے مہلت کا وقت قیامت کا واقع ہونا ہے۔ جب حتمی مدت کا وقت آجاتا ہے خواہ وہ موت کا وقت ہو یا قیامت کی گھڑی یا کسی امت کے انقراض اور ختم ہونے کا وقت تو نہ ایک گھڑی آگے ہو گی نہ ایک گھڑی پیچھے، جو طے شدہ وقت ہے اسی میں وہ ختم ہو جائیں گے۔ موت طے شدہ وقت میں آنی ہے۔ مرنے کے بعد اٹھنے کا وقت طے شدہ ہے وہ تو اسی وقت ہونا ہے۔ قیامت نے بپا ہونا ہے تو قیامت اپنے وقت پر ہی بپا ہو گی۔

وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ مَا یَکۡرَہُوۡنَ وَ تَصِفُ اَلۡسِنَتُہُمُ الۡکَذِبَ اَنَّ لَہُمُ الۡحُسۡنٰی ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَہُمُ النَّارَ وَ اَنَّہُمۡ مُّفۡرَطُوۡنَ ﴿۶۲﴾

"اور اللہ کے لیے وہ چیزیں تجویز کرتے ہیں جنہیں وہ خود بھی پسند نہیں کرتے اور زبان سے جھوٹے دعوے کرتے ہیں کہ آخرت کی بھلائی انہیں کے لیے ہے، اس میں شک نہیں کہ ان کے لیے آگ ہے اور بے شک وہ سب سے پہلے دوزخ میں بھیجے جائیں گے"۔

مشرکین کا غلط فیصلہ

اس آیت کا مضمون پہلے بھی بیان ہو چکا ہے اور یہاں اسے دوسرے انداز میں دہرایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ مشرکین بیٹوں کی نسبت اپنی طرف دیتے ہیں، جبکہ بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں اس لیے انہیں خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں اور اپنی زبان سے جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ نیک اور اچھے انجام کو اپنے لئے قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کا بیٹا ہے اور بیٹے نے ان کا جانشین بننا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں کہ اچھی عاقبت اور اچھا سرانجام بہشت میں ان کے لئے ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرما رہا ہے کہ ان کے عقائد اور اعمال یقینی طور پر انہیں آتش جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ خود ہی اپنے لئے عذاب تیار کرکے اس کی طرف تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کا یہ عذاب مکمل طور پر اُن کے اعمال سے ہم آہنگ ہے، جیسے ان کے اعمال تھے ویسا ہی عذاب ان کو ملا ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦٣﴾

''اللہ کی قسم ہے ہم نے تجھ سے پہلے بھی قوموں میں رسول بھیجے تھے پھر شیطان نے لوگوں کو ان کی بد اعمالیاں اچھی کر دکھائیں سو آج بھی ان کا وہی دوست ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

سابقہ اُمتوں میں اللہ کے رسول

اس آیت میں اللہ تعالیٰ قسم اُٹھا کر فرمارہا ہے کہ ہم نے سابقہ امتوں میں بھی رسول بھیجے تھے۔ جن میں سے کچھ امتیں اب بھی باقی ہیں جیسے یہودی، مسیحی اور زرتشتی۔ شیطان نے ان کے اعمال اور ان کے ظلم کو ان کے لیے آراستہ کیا اور انہوں نے شیطان کی پیروی کی اور اللہ کے رسولوں سے منہ موڑا۔ لہٰذا جب وحی کے نازل ہونے کے موقع پر شیطان ان کا سربراہ تھا اور وہ سب اس کی سربراہی پر متفق تھے تو قیامت کے دن ان کے لیے دردناک عذاب ہے، جس کا وعدہ اسی دنیا میں انہیں دیا گیا ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٦٤﴾

''اور ہم نے اسی لیے تجھ پر کتاب اتاری ہے کہ تو انہیں وہ چیز کھول کر سنا دے جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں، اور ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت بھی ہے''۔

قرآن نازل کرنے کا مقصد

جیسا کہ اس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے، اس آیت میں بھی قرآن کے نزول کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اے ہمارے رسول! ہم نے تجھ پر قرآن اس لیے نازل کیا ہے تاکہ مشرکین پر حجت تمام ہو۔ اور معارف حقہ اور الٰہی احکام کے بارے میں ان کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی حقیقت ان کے لیے روشن ہو جائے۔ تاکہ اُن کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔اور خداوند تبارک و تعالیٰ ایمان لانے والے مومنین کے لئے حق کی راہنمائی ہو اور ایمان اور عمل کے نتیجے میں وہ اللہ کی رحمت وصول کرسکیں۔ پس مومنین اپنے ایمان کی وجہ سے ہدایت اور رحمت پائیں گے۔ یہ قرآن کو بھیجنے کا مقصد ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۟ ۧ ﴿۶۵﴾

"اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھراس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا، اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سنتے ہیں"۔

آسمان سے پانی کا اُتارا جانا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کا تذکرہ کیا ہے جسے انسان اور دوسرے جانداروں کی روزی کا وسیلہ اور سبب بنایا ہے۔ کیونکہ جب بارش برستی ہے تو زمین کو سیراب کرتی ہے اور زمین سے پھر فصلیں اور نباتات اُگتی ہیں۔ سردی اور خزاں کے موسم میں زمین پر موجود سارے نباتات خشک ہو جاتے ہیں، پودوں کی جڑیں خشک ہو جاتی ہیں پھر اُن کا بیج زمین کے اندر موجود ہوتا ہے۔ لیکن ایک عرصہ خاموشی اور

سکون کے بعد پھر اس بیج سے نباتات نکلنا شروع ہو جاتی ہیں اور نباتاتی حیات نئے مرحلے میں آجاتی ہے۔ اس طرح نباتات نئے سرے سے سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں اور انسان اور دوسرے حیوانات کی روزی اور زندگی کا سبب بنتے ہیں۔ موسم خزاں اور موسم سرما کے بعد پانی کی وجہ سے فصل بہار میں نباتات میں نئی زندگی کا آجانا قیامت کے دن مردوں کو پھر سے اُٹھائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔

اگر مردہ زمین کو بارش بھیج کر آباد کیا جاتا ہے اور اس کا سبزہ دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے تو اسی طرح قیامت کے دن بھی مردے دوبارہ زندہ ہوں گے۔ خدا جس طرح مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اسی طرح قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کرے گا۔ اس امر میں حق جو اور طالب حقیقت انسان کے لیے عبرت اور درس ہے، وہ اس امر سے معاد اور قیامت کی حقانیت پر یقین پا لیتے ہیں اور اس امر کو مان لیتے ہیں۔ جیسا کہ (سورۂ زمر، آیت :۱۸) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدٰىہُمُ اللّٰہُ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۸﴾ " ترجمہ: "میرے بندوں کو بتا دو جو غور سے سنتے ہیں اور سننے کے بعد جو بہترین بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں ان کو بشارت دے دو"۔

وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾

"اور بے شک تمہارے لیے چارپایوں میں سوچنے کی جگہ ہے، ہم ان کے جسم سے خون اور گوبر کے درمیان خالص دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے"۔

جانوروں میں معاد کی نشانی

اس آیت میں اللہ عالیٰ نے مختلف قسم کے جانوروں کا تذکرہ کیا ہے جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ ''اَنۡعَام'' سے گائے، بھینس، اونٹ ، بھیڑ اور بکری جیسے جانوروں کو کہا جاتا ہے ''فَرۡث'' گوبر کو کہتے ہیں جو حیوان کی انتڑیوں میں جمع ہوتا ہے۔ ''سَآئِغ'' میٹھے اور گوارا کے معنی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ان جانوروں میں تمہارے لئے عبرت ہے کہ اُن کے پیٹ میں گوبر اور خون سے تمہارے لئے کیسا صاف ستھرا دُودھ نکلتا ہے۔ یہ تمہارے لئے معجزہ ہے۔ تمہیں عبرت حاصل کرنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ تم غور کرو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے حیوانات کے بدن سے خون اور دوسری غلاظتوں کے درمیان سے تمہارے لیے بہترین اور پاکیزہ لذیذ دودھ مہیا کیا ہے، جو خون اور ان غلاظتوں کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے لیکن اُس کی بو اور اس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا ہے۔ ہم ہی ہیں جو گوبر اور خون سے دُودھ نکالتے ہیں اور تمہیں پلاتے ہیں۔ ایسا دودھ جو تمہاری صحت کے لئے بہترین اور گوارا ہے۔ تم اسی وسیلے سے رب تعالیٰ کے ارادے کا نفوذ اور اس کی قدرت کو سمجھو۔ وہ ذات جو گوبر اور خون کے درمیان سے بہترین، صحت مند اور گوارا دودھ نکالتی ہے تو وہی ذات انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر نے اور اُس کی بوسیدہ ہڈیاں کو دوبارہ حیات دینے پر بھی قادر ہے۔

وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡہُ سَکَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾

''اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے نشہ اور اچھی غذا بھی بناتے ہو، اس میں

لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سمجھتے ہیں"۔

پھلدار درختوں میں اللہ کی نشانیاں

یہ آیت، آیت ٦٥ کے اس جملے "وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" پر عطف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے تمہارے لیے پھلدار درخت خلق کئے ہیں۔ جن سے تم کھانے پینے اور روزی کے اسباب فراہم کرتے ہو۔ انگور کو نچوڑتے ہو، اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انگور سے شراب بنانا جائز ہے، بلکہ اس کے نجس اور حرام ہونے پر بھی دلیل موجود ہے۔ اسی لئے کہا کہ تم اس سے "رزق حسن" اچھی روزی حاصل کرتے ہو؛ اس سے یہ سمجھایا ہے کہ شراب نیک اور اچھی روزی نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔

خرما اور انگور سے بننے والی اچھی روزی سے تمام پاکیزہ چیزیں مراد ہیں جیسے کشمش، انگور کا شیرہ خشک کھجور۔ یہ ساری چیزیں تمہارے لئے غذا کا ذریعہ ہیں اور تمہاری ان تمام ضروریات کو پوری کرتی ہیں جو تمہارے جسم کے لئے ضروری ہیں۔ ان میں عقل مندوں کے لئے اللہ کی نشانیاں ہیں۔ نباتات اور پھلوں کے حوالے سے تعقل اور غور وفکر کرنے والے نظام ہستی میں اللہ تعالیٰ کی عمومی قدرت کو سمجھ لیں گے کہ یہ سب امور ایک مدبر کے تحت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نشانی کے ذریعے بھی لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ غور کریں۔

وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ﴿٦٨﴾

"اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان میں اپنے لیے چھتے بنائے جس طرح وہ اپنے لیے گھر بناتے ہیں"۔

شہد کی مکھی

عربی زبان میں ''وحی'' تیزی سے اشارہ کرنے اور پوشیدہ طریقے سے کوئی مطلب دوسرے تک پہنچانے کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں وحی سے مراد غریزے (فطرتی طریقہ سے) کے ذریعے حیوان کو کوئی مطلب سمجھانا اور الہام کرنا ہے۔۔ دوسری آیات میں بھی وحی کا لفظ الہام کے معنی میں لیا گیا ہے۔ جیسے سورۂ قصص، آیت ۷:

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰۤی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ

ترجمہ: ''اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ انہیں دودھ پلائیں''۔

''وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤی اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ'' (سورۂ انعام، آیت ۱۲۱)

ترجمہ: '' شیطان اپنے اولیاء (کو الہام کرتے ہیں) کی طرف اپنی بات پہنچاتے ہیں''۔

''فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ۝۱۱'' (سورۂ مریم، آیت ۱۱)

ترجمہ: ''پھر وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے اشارتاً کہا: صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو''۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں وحی کا لفظ انبیاء اور رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے تکلم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے (سورۂ شوریٰ، آیت :۵۱) میں آیا ہے:

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ۝۵۱

ترجمہ: ''اور کسی بشر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے ماسوائے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ کوئی پیام رساں بھیجے پس وہ اس کے حکم سے جو چاہے

وحی کرے، بے شک وہ بلند مرتبہ، حکمت والا ہے "۔

آداب دینی کا تقاضا یہ ہے کہ وحی کے لفظ کو فقط انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے تکلم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

اس بناپر پہلی قسم کی آیات میں وحی، الہام کے معنی میں ہے۔ جبکہ سورہ شوریٰ میں ذکر شدہ لفظ وحی کا تعلق اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے ساتھ تکلم کرنے سے ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو الہام کیا ہے کہ وہ کس طرح بلندیوں اور پہاڑوں پر چھتا بنائے۔ اور اس کے بعد کس طرح پھولوں اور درختوں پر جا کر وہاں سے رس نکال کر یہاں لے آئے۔ اس آیت میں شہد بنانے والی مکھیوں کے مؤنث ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ قرآنی معجزات میں سے ہے۔

ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

"پھر ہر قسم کے میوؤں سے کھا پھر اپنے رب کی تجویز کردہ آسان راہوں پر چل، ان کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سوچتے ہیں"۔

شہد کی مکھی کو شہد بنانے کی ہدایت

اس آیت میں شہد کی مکھی کی حیرت انگیز زندگی اور اس کے شہد بنانے کے طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے

سے الہام لے کر پھولوں اور پھلوں سے رس چوس کر لے آتی ہے اور پھر اسے اٹھا کر چھتے میں ذخیرہ کر لیتی ہے۔ مکھیوں کے آنے جانے کا یہ سلسلہ اور پھولوں سے رس لینا اور اسے اٹھا کر لانا؛ یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ ہدایت شدہ ہے۔اسی لیے اس عمل کو "سُبُلَ رَبِّكِ" تیرے رب کے راستے سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد نئے جملے میں مکھی کی محنت اور اس کے عمل کے ثمر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اُس نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے امر کی پیروی اور اطاعت کی اور اس کے مطابق چلی جس کے نتیجے میں مختلف رنگوں میں جن میں زرد ، سفید، سرخ اور سرخ مائل یہ سیاہ مکھی کے شکم سے نکلتا ہے اور لوگوں کی بہت ساری بیماریوں کے لئے شفاء ہے۔[1] شہد کی مکھی کی اجتماعی زندگی بڑی حیرت انگیز ،اس کا گھر بنانا پھر ان کی ایک ملکہ کا ہونا، ساری مکھیوں کا ملکہ کی اطاعت میں ہونا اور پھر ملکہ کا ہر آنے والی مکھی کو سونگھنا کہ اگر کوئی بدبودار پھول سے رس لے کر آئی ہو تو اسے وہیں دو ٹکڑے کر دینا، پاکیزگی کا لحاظ رکھنا۔ ان ساری چیزوں کو اہل فکر ہی صحیح طریقے سے سمجھ سکتے ہیں اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا ہے: شہد کی مکھی کے معاملے میں اہل فکر کے لیے عبرت ہے۔ [2]

[1]۔ خصوصاً شہد سلطنتی جو مکھیوں کی ملکہ کی مخصوص غذا ہے اس کے بڑے خواص اور اثرات ہیں خاص طور پر رشد کے لیے، اسے زندگی کے لئے اکسیر بھی کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

[2]۔ حشرات کے بارے میں تحقیق کرنے والے بہت سارے لوگوں نے اپنی پوری زندگی شہد کی مکھی کے متعلق تحقیق میں گزاری ہے اور اس بارے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں وہ سب بتاتے ہیں کہ اس کی زندگی غیر معمولی اور عجیب ہے۔ اہل تفکر اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھیں، اور رب تعالیٰ کی قدرت کے آثار کا مشاہدہ کریں اور اللہ کی عظمت کے قائل ہو جائیں اور اللہ پر ایمان لے آئیں۔ (مترجم)

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ ۙ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾

"اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہی تمہیں مارتا ہے، اور کوئی تم میں سے نکمّی عمر تک پہنچایا جاتا ہے جو سمجھ دار ہونے کے بعد نادان ہو جاتا ہے، بے شک اللہ جاننے والا قدرت والا ہے"۔

انسان کی زندگی کے مراحل

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی زندگی کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرمایا ہے کہ اللہ ہی نے تم انسانوں کو خلق کیا ہے اور پھر وہی اللہ تمہاری جان لیتا ہے۔ تم میں سے اکثر انسانوں کو درمیانی عمر میں ہی موت آجاتی ہے۔ لیکن کچھ بڑھاپے کو پہنچتے ہیں جس میں تمہاری بدنی اور فکری قوت ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ایک عمر عالم ہونے کے بعد اسے کچھ یاد بھی نہیں رہتا اور وہ اپنی اصلی حالت (یعنی بچپن کی حالت جس میں ان کے پاس کچھ بھی علم نہ تھا) میں لوٹ جاتے ہیں۔ یہ ایک اور دلیل ہے کہ زندگی، موت، شعور، علم اور قدرت یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ اگر علم اور قدرت انسان کے اپنے اختیار میں ہوتے تو وہ ہمیشہ اس کے پاس ہوتے اور وہ انہیں ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ انسان کے اس عجیب و غریب نظام زندگی کے سارے امور اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کے تحت ہیں اور اسی کی طرف سب نے پلٹنا ہے، وہی دانا اور مقتدر ہے لہٰذا اسی کی ذات پر ایمان لانا چاہیے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

"اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی، پھر جنہیں فضیلت دی گئی وہ اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو دینے والے نہیں کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں، پھر کیا اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں"۔

رزق میں بعض انسانوں کی برتری کی حکمت

"رِزق"[1] سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے زندگی کی بقاء ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے روزی کے مسئلے میں تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر برتری دی ہے۔ یہ برتری کبھی کمیت کے لحاظ سے ہے جیسے امیر شخص غریب کے مقابلے میں اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے ہے جیسے مولیٰ اور آقا اپنے اموال میں تصرف میں آزاد ہے جبکہ غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اپنے اموال میں تصرف نہیں کرسکتا۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کے ولی اور سرپرست، جن پر اس کی ولایت ہے انہیں برتری حاصل ہے۔ نیز انسان کو اپنے اموال اور جانوروں اور دیگر املاک پر ولایت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ وہ لوگ جنہیں کیفیت کے اعتبار سے روزی میں برتری دی گئی ہے، جیسے مالک، متصرف اور مولا، ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں اور

---

[1]۔ حدیث میں آیا ہے "الرزق رزقان، رزق یطلبك و رزق تطلبه" روزی دو قسم کی ہے، ایک روزی وہ ہے جو تمہارے پیچھے آتی ہے جس کا وعدہ آسمان سے دیا گیا ہے۔ اور ایک روزی وہ ہے جس کے پیچھے تم جاتے ہو اور یہ روزی معارف الٰہیہ کو حاصل کرنا ہے تاکہ تمہاری بعد والی منزل یعنی آخرت کے مقامات آسان ہوں۔

غلاموں کو روزی دے رہے ہوں۔ کیونکہ ساری نعمتیں اور ساری روزی اللہ کی طرف منسوب ہیں اور سب کو اللہ تعالیٰ ہی روزی دیتا ہے۔ غلام اور مولا دونوں اللہ تعالیٰ کی روزی کے دسترخوان سے کھاتے ہیں۔[1]

یہ بات معلوم رہے کہ مولویت اور عبودیت یعنی مولا یا غلام ہونا یہ دونوں ایسے امور ہیں جنہیں مولا بندے کی طرف منتقل نہیں کرسکتا تاکہ دونوں اس اعتبار سے برابر ہو جائیں اور مولا کا مولا ہونا ختم ہو جائے بلکہ یہ امر اللہ کی جانب سے ایک فضیلت اور نعمت ہے۔ عبد اور مولا کا مسئلہ اگرچہ سابقہ معاشروں میں جاری و ساری تھا لیکن اس دور میں ختم ہو چکا ہے لیکن حقیقت میں ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا ظاہر تبدیل ہوا ہے، اس کا مضمون باقی ہے۔ آج بھی چھوٹی اقوام، سامراجی اقوام اور استعماری ملتوں کی غلامی میں ہیں اور بڑی طاقتیں، چھوٹی ملتوں کو اپنا نوآبادیاتی بناتی ہیں۔ اور یہ معاملہ آخر تک اسی طرح رہے گا کیونکہ انسان برتری طلبی اور قدرت حاصل کرنے کے معاملے میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

آخر میں استفہام توبیخی کے ساتھ انسان کی سرزنش کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کیا تم اللہ کی نعمت کے انکاری ہو؟ اس نعمت سے برتری کی نعمت مراد ہے جو معاشرتی زندگی میں کچھ انسانوں کو حاصل ہے ۔ معاشرے میں کوئی بڑا ہے، کوئی چھوٹا ہے، کسی کے اختیارات زیادہ ہیں کسی کے کم ہیں، کسی کے پاس مال زیادہ ہے کسی کے پاس کم ہے۔ کوئی آقا و سردار ہے، کوئی غلام ہے، کوئی نوکر ہے کوئی افسر ہے، کوئی ماتحت ہے کوئی بالادست ہے۔ یہ سب معاشرے کے نظام کو چلانے کے لئے اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر تکبر کرنا اور اللہ کی آیات کا انکار کرنا، اللہ کی

---

[1] ۔ یہ تفسیر مجمع البیان جلد ۶ صفحہ ۳۷۳ کے مطابق ہے، اس بارے علامہ طباطبائی کا نظریہ بعد میں بیان ہوگا۔

نعمتوں کا کفران کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾

"اور اللہ نے تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں پیدا کیں اور تمہیں تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے دیے اور تمہیں کھانے کے لیے اچھی چیزیں دیں، پھر کیا جھوٹی باتیں تو مان لیتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں"۔

بیویاں اور اولاد اللہ کی نعمتیں

"حَفَدَةً" ان خدمتگاروں اور مددگاروں کو کہتے ہیں جو انسان کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور انسان سے ناپسندیدہ امور کو دُور کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے "حَفَدَةً" سے نواسے اور پوتے مراد لیے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے بیویاں قرار دیں، اولاد قرار دی، تمہارے لیے مددگار بنائے، تمہیں عمدہ روزی عطا کی، پانی دیا، قسم قسم کے میوے اور پھل دیے جن کو پیدا کرنے میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اسے غذائیں اور لباس دیا جن کو حاصل کرنے میں انسان کی سعی و تدبیر تاثیر رکھتی ہے۔

پھر فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کے بارے میں علم رکھنے کے باوجود باطل کے مصادیق پر ایمان لاتے ہو اور بتوں کی پوجا کرتے ہو، گھڑے ہوئے معبود وں کو

اللہ کا شریک بناتے ہو اور یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اپنے لئے بیٹے قرار دیتے ہو؟ کیا تم ان باطل کے مصادیق پر ایمان لاتے ہو اور ان کے آگے سجدہ اور خضوع کرتے ہو؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا کفران کرتے ہو جن میں بیوی، اولاد، پوتے اور یار و مددگار شامل ہیں؟ کیونکہ کسی بھی انسانی معاشرے کی تکوینی اساس اور اس کی بقاء بیوی اور شوہر اور اولاد کے وجود سے وابستہ ہے۔ اور ان کے درمیان باہمی تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کا قانون جاری ہے۔ اس نعمت کا کفران انسانی معاشرے کی تباہی اور خاتمہ کا سبب ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی اس نعمت (گھرانے) کا کفران کرے اور اس کی جگہ زندگی کے لئے دوسری روشیں اپنا لے تو پھر کوئی چیز بھی اس کی جگہ نہیں لے سکتی اور انسانی آبادی ختم ہو جائے گی اور اس طرح انسانی نوع کی ہلاکت قطعی اور حتمی ہو جائے گی۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

"اور اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین سے انہیں رزق پہنچانے میں کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ رکھ سکتے ہیں"۔

خودساختہ معبودوں کے پاس کسی چیز کا اختیار نہیں

یہ آیت پچھلی آیت پر عطف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مشرکین اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں۔ اللہ کی نعمتوں کا کفران کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور انہیں روزی دینے پر قادر نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اُن کی کوئی مالکیت نہیں ہے، وہ کسی بھی موجود کو روزی دینے

پر قدرت نہیں رکھتے۔ اس آیت میں نعمتوں کے تذکرے سے توحید ربوبی کے اثبات پر استدلال کیا گیا ہے۔ اگر انسان ان ساری نعمتوں پر غور کرے تو بڑی آسانی سے سمجھ آجائے گی کہ اس پوری کائنات کا رب اور اس کے سارے نظام کو چلانے والا اور اسے نظم دینے والا اور اس پورے نظم کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رکھنے والا ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

"پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

اللہ کے لیے مثالیں پیش کرنا

اب جبکہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا خالق اور رب اللہ ہے اور وہ اپنے علم اور قدرت سے تمہیں قسم قسم کی نعمتوں سے نوازتا ہے تو پس تم اللہ کے لیے مثالیں مت گھڑو، اور اسے غیر سے تشبیہ مت دو کیونکہ اللہ کا مقابلہ اس کی مخلوق کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تشبیہ اور تمثیل سے لوگوں کی گفتگو کی ساری انواع و اقسام مراد ہیں جو اللہ کے بارے میں کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں یا اپنی قدرت کا اللہ کی قدرت سے مقابلہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کر دے۔ اس قسم کی باتیں خالق اور مخلوق کو آپس میں ملانے کے زمرے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دانای مطلق ہے وہ ہر چیز کے حقائق اور ان کی اصلیت کو جانتا ہے جبکہ تم نہیں جانتے ہو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

"اللہ ایک مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام ہے کسی دوسرے کی ملک میں جو کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا اور ایک دوسرا آدمی ہے جسے ہم نے اچھی روزی دے رکھی ہے اور وہ ظاہر اور پوشیدہ اس سے خرچ کرتا ہے، کیا دونوں برابر ہیں، سب تعریف اللہ کے لیے ہے، مگر اکثر ان میں سے نہیں جانتے "۔

ایک غلام کی مثال

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس مطلب کی وضاحت کے لئے ایک مثال دی ہے۔ ایک ایسا غلام جو کسی دوسرے کی ملکیت میں ہے اور خود بھی کوئی کام نہیں کر سکتا کیا وہ اس مالک جیسا ہو سکتا ہے جو کثیر مال کا مالک ہے، جیسے چاہے وہ اپنے مال میں تصرف کرتا ہے؟ معلوم ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ پس خداوند جو سارے عالم کے موجودات کا خالق اور مالک ہے، کائنات کے تمام موجودات کو روزی بھی وہی دیتا ہے اور انواع و اقسام کی نعمتیں ان کے اختیار میں دی ہیں تو کبھی بھی اور کسی بھی عنوان سے اس کی مخلوقات اس کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، کیونکہ ساری نعمتیں اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور ہر وہ صفت جو تعریف کے لائق ہو اس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے۔ پس تمام حمد اور ساری جمیل ثنائیں اور اچھی تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوا کہ حمد، ایسے اختیاری عمل پر کی جاتی ہے جو اچھا

ہو۔

لیکن بہت سارے لوگ مشرک ہیں اور وہ اس مطلب کو نہیں جانتے کی ساری نعمتیں اللہ کی ملکیت ہیں۔ اسی بناء پر مشرکین اپنے شرکاء کو نعمتوں کا مالک قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے ان کو نعمتوں کا اختیار دے رکھا ہے اور مختلف کام ان کے سپرد کر رکھے ہیں۔ وہ خیر کی لالچ اور شر سے بچنے کے لئے ان شرکاء کی عبادت کرتے ہیں۔ حالانکہ یگانہ و یکتا خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہی سب کا رب، مالک اور منعم ہے اور سارا اختیار اور مالکیت اسی کی ہے۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

"اور اللہ ایک اور مثال دو آدمیوں کی بیان فرماتا ہے کہ ایک ان میں سے گونگا ہے کچھ بھی نہیں کر سکتا اور اپنے آقا پر بوجھ ہے، جہاں کہیں اسے بھیجے اس سے کوئی خوبی کی بات بن نہ آئے، کیا یہ اور وہ برابر ہے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے، اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہے"۔

دو آدمیوں کی مثال

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور تشبیہ دی ہے۔ ایک گونگا، بہرا اور سمجھنے سمجھانے سے محروم فرد، جو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے پر قادر نہیں اور اس کی ساری معلومات بصری امور تک محدود ہیں فقط آنکھ اور اشاروں سے دوسروں کو باتیں سمجھاتا اور اشاروں سے ہی سمجھتا ہے اور وہ اپنے امور کو چلانے پر بھی قادر نہیں بلکہ

اپنے ولی اور سرپرست پر بوجھ ہے۔ مولا اسے جس کام کے لیے بھیجتا ہے وہ ناکام واپس آتا ہے، اس کو پورا نہیں کر سکتا۔[1] کیا یہ فرد اس شخص کی مانند ہے جو اچھے اخلاقی کمالات کا مالک ہے اور خود بھی عدل وانصاف کی صفت کا حامل ہے اور اچھی صفات سے دوسروں کو بھی بہرہ ور کرتا ہے؟ اصولی طور پر وہی شخص عدل کا حکم دے سکتا ہے جو خود عادل ہو اپنے نفس کی بہتری اور اصلاح کو جانتا ہو تو وہ ہی دوسروں کو اعمال کی اصلاح کرنے کا کہہ سکتا ہے۔

عدل کا مطلب ہی افراط و تفریط سے پرہیز کرنا اور حد وسط کا خیال رکھنا ہے۔

دوسرے شخص کے بارے میں کہا کہ وہ راہ مستقیم اور سیدھے راستے پر ہے۔ راہ مستقیم ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والے کو ہدف کی جانب ہدایت دیتا ہے اور اسے انحراف سے بچاتا ہے۔ جو بھی اس راستے پر ہے وہ اپنے اعمال کو فطرت کے مطابق انجام دیتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس کا ایک عمل اس کے دوسرے عمل کے ساتھ منافات رکھتا ہو یا وہ حق سے پیچھے ہٹے۔ ایسا شخص عمل کے مرحلے میں نہ تو خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے اعمال میں کوئی اختلاف ہوتا ہے۔ یقینی طور پر یہ دو آدمی آپس میں برابر نہیں ہیں۔

اس تشبیہ کا مقصد نبوت اور قانون سازی کے مسئلہ کو ثابت کرنا ہے۔ اور یہ بتانا مقصود ہے کہ عام انسان جن پر وحی کا دروازہ بند ہے اور وہ غیبی امور سے آگاہ نہیں اور اپنی ہدایت اور سعادت کے لئے دوسروں کا محتاج ہے وہ "ابکم" گونگے بہرے شخص کی مانند ہے

---

[1]۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے گونگے اور بہرے اسی طرح ہوتے ہیں بلکہ قرآن میں یہ قیود اس شخص کے ناتواں ہونے کے طور پر بیان کی ہیں۔ اگر کچھ افراد اشاراتی زبان سیکھ کر کچھ کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں تو یہ استثنائی امر ہے۔ عمومی طور پر ایسا ہی ہے کہ ایسی صفت والا اپنے امور تک کو صحیح طور پر انجام دینے پر قادر نہیں ہوتا۔ (مترجم)

، جو ایسے شخص کے محتاج ہیں جو نہ صرف خود عادل ہو بلکہ دوسروں کو بھی عدالت کا حکم دے اور دوسروں کو صراط مستقیم پر لے کر چلے، اور یہ شخص نبی اور رسول ہی ہے جس پر وحی اُترتی ہے۔

یہ آیت (سورۂ یونس، آیت ۳۵) کی طرح ہے:

اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى ۚ . . .

ترجمہ: ''پھر (بتاؤ کہ) جو حق کی راہ دکھاتا ہے وہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود اپنی راہ نہیں پاتا جب تک اس کی راہنمائی نہ کی جائے؟''

اس بیان کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین نے جن چیزوں کو اپنا ولی بنایا ان میں اپنی راہنمائی کرنے کی توانائی اور قدرت نہیں ہے۔ جو اپنی راہنمائی پر قادر نہ ہوں وہ دوسروں کو کیا ہدایت دیں گے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ خود صراط مستقیم پر ہے اور پیغمبروں کو بھیج کر اپنی مخلوق کی بھی راہ مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے۔ اس آیت کا مقصد توحید پر دلیل قائم کرنا، نبوت اور قانون سازی کے مسئلے سے آگاہی دینا ہے۔

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

''اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، اور قیامت کا معاملہ تو ایسا ہے جیسا آنکھ کا جھپکنا یا اس سے بھی قریب تر، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

پوشیدہ امور کے بارے علم الٰہی

متعدد بار یہ بات کہی گئی ہے کہ غیب اور حضور؛ دو نسبی امور ہیں کیونکہ

ممکن ہے کہ ایک امر ایک لحاظ سے مخفی ہو لیکن دوسرے لحاظ سے آشکار ہو۔ آسمان اور زمین کے دو رُخ ہیں۔ لوگوں کے لیے ان کا ایک رخ ظاہری ہے اور دوسرا رخ غیبی ہے لیکن اللہ کے واسطے دونوں آشکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی غیبی جہت سے بھی آگاہ ہے جو بشر کے لئے پوشیدہ ہے۔

پھر فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کے غیبی امور میں سے ایک قیامت کا امر ہے جس سے اللہ کے سوا کوئی اور آگاہ نہیں ہے۔ یہ امر فقط اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کو برپا کرنا اللہ کے لئے بالکل دشوار نہیں ہے بلکہ بہت ہی آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ عمل پلک جھپکنے سے بھی آسان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام امور پر قادر ہے۔ اللہ کی قدرت مطلقہ کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے سارے امور برابر ہوں، وہاں آسان اور دشوار والا تصور نہیں ہے۔ پس اللہ کی قدرت اس کی عین ذات ہے، وہاں عدم کا وجود نہیں ہے، وہاں عدم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شرائط اور موانع اور رکاوٹوں کے نہ ہونے کی کوئی قید و شرط نہیں ہے۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

"اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا تم کسی چیز کو نہ جانتے تھے اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تاکہ تم شکر کرو"۔

عالَم جہل میں انسان کی ولادت

اس آیت میں انسان کی ولادت کا تذکرہ ہے کہ جب وہ پیدا ہوتا ہے تو ہر قسم کی معلومات سے خالی ہوتا ہے۔ اللہ کے عطا کیے ہوئے حواس کے ذریعے وہ تدریجاً

معلومات حاصل کر لیتا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ اے انسان! تمہیں ماؤں کے شکموں سے ہم نے پیدا کیا ہے۔ اور جب تم پیدا ہوئے تو کچھ بھی نہیں جانتے تھے، ہم نے تمہارے لئے کان، ناک اور آنکھ اور حواس عطا کئے، جن کے ذریعے تم نے علم حاصل کرلیا۔

انسان کے حواس میں دو چیزیں بہت اہم ہیں، شنوائی اور بینائی۔ دیکھنے اور سننے کی قوت۔ اور دل قرار دیا ہے جو تصدیق اور تفکر کا مبداء ہے۔انسان کے لئے یہ ساری نعمتیں ہم نے قرار دی ہیں تاکہ وہ شکر بجا لائے۔ اس انسان کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ جو رب تعالیٰ یہ سب نعمتیں دینے والا ہے، اس پر ایمان لایا جائے، اس کی دعوت کو قبول کیا جائے، کسی کو اس کا شریک نہ بنایا جائے اور فقط اسی کی پرستش کی جائے۔

اَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمۡسِکُہُنَّ اِلَّا اللّٰہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾

''کیا پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ آسمان کی فضا میں تھمے ہوئے ہیں، انہیں اللہ کے سوا کون تھامے ہوئے ہے، بے شک اس میں بھی ایمانداروں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں''۔

---

[1]۔ حکماء کے بقول انسان کی عقل چار تکاملی مراحل کو طے کرتی ہے:۔ پہلا مرحلہ: عقل ھیولائی کا ہے، وہ مرحلہ جو انسان کی پیدائش کے وقت ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں عقل کے پاس کچھ معلومات نہیں ہوتیں لیکن اس میں معلومات لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ دوسرا مرحلہ: عقل بالملکہ کا ہے؛ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں انسان ظاہری حواس کو استعمال کرکے کائنات اور موجودات کی جزئیات کو سمجھتا ہے اور بدیہی ادراکات اور معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ تیسرا مرحلہ: عقل بالفعل: یہ وہ مرحلہ ہے جس میں انسان عالم وجود کی کلیات کو سمجھتا ہے اور نظریات کا ادراک کرتا ہے۔ چوتھا مرحلہ: عقل مستفاد: یہ عقل کا بلندترین مقام ہے اور یہ انبیاء اور آئمہ اطہار اور اوصیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ (مترجم)

فضا میں پرندوں کی پرواز اللہ کی نشانی

اس آیت کا معنی بہت ہی واضح ہے۔ البتہ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ تسخیر اس وقت محقق ہوتی ہے جب تسخیر کرنے والا کسی سبب کو کسی کام پر مجبور کرے اور وہ کام اسی طرح ہو جائے جس طرح تسخیر کرنے والا چاہتا ہو۔اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ اس کے لیے مسخر ہےاور اس کے اختیار اور اس کے کنٹرول میں ہے۔ اسی وجہ سے آیت میں فضا میں اڑنے والے پرندوں کی نگہداری کا سبب، اللہ کی ذات میں منحصر کیا گیا ہے، اگرچہ طبیعی اسباب بھی پرندوں کی پرواز میں موثر ہیں لیکن ان سارے طبیعی اسباب کا اختتام اور انتہاء اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے توازن اور تعادل اور فضا میں اڑنے کے قانون کو بنایا ہے۔ اور بدن کو ایسے انداز میں خلق کیا کہ اس میں پرواز کی قدرت ہو۔ پس پرندے اور فضا کے حالات اور دوسری شرائط سب اللہ تعالیٰ کے سامنے مقہور ہیں۔

آسمان میں پرندوں کی پرواز اور ان کی حرکت اہل ایمان کے لیے نشانی ہے۔ اگرچہ روئے زمین پر موجود سارے اجسام اپنی جگہ پر نشانی اور معجزہ ہیں۔ جو کشش کے عمومی قانون کے تحت آتے ہیں۔ لیکن کیونکہ روزمرہ کے موجودات سے انسان مانوس ہو چکا ہےاور ہر روز ان کا مشاہدہ کرتا ہے، لہٰذا ان کے مشاہدے سے تعجب نہیں کرتا لیکن جب وہ پرندوں کی حیرت انگیز پرواز دیکھتا ہے تو وہاں پر تعجب کرتا ہے اور اللہ کی قدرت کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔البتہ قدرت الٰہی کے لحاظ سے یہ دونوں یکساں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خالقیت بھی اللہ کی ہے، مالکیت بھی اللہ کی ہے، قدرت بھی اللہ کی ہے اور وہی ذات ہے جس نے سب کو تیار کیا ہے۔اسی نے پرندوں کو قدرت پرواز دی ہےاور فضا میں ایسی حالت قرار دی ہے جس سے پرندے اڑ سکیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ
بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا
وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾

''اور اللہ نے تمہارے گھروں کو تمہارے لیے آرام کی جگہ بنایا ہے اور تمہارے لیے چارپایوں کی کھالوں سے خیمے بنائے جنہیں تم اپنے سفر اور قیام کے دن ہلکے پاتے ہو، اور بھیڑوں کی اون سے اور اونٹوں کی روؤں سے اور بکریوں کے بالوں سے کتنے ہی سامان اور مفید چیزیں وقت مقرر تک کے لیے بنا دیں''۔

انسان کی ضروریات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے جو انسان کے لئے ضروری ہیں۔ فرمایا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے رہائش گاہیں بنائی ہیں اور انہیں تمہارا ٹھکانہ قرار دیا ہے۔ سفر میں ہوں تو حیوانوں کی چمڑیوں سے خیمے بناتے ہو، شامیانے بناتے ہو جو تمہارے آرام و سکون کا سبب بنتے ہیں۔ جانوروں کے چمڑے اور ان کے اون اور بالوں سے لباس، جوتے، خیمے اور زینت کی چیزیں بناتے ہو۔ تمہاری زندگی کی ضرورت کے ان سارے وسائل کی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ پس جان لو کہ یہ ساری چیزیں دُنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود ہیں اور ان ساری نعمتوں نے فنا ہو جانا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس فانی متاع اور فنا ہونے والی معیشت کے اسباب کی خاطر تم اپنی آخرت کی نعمتوں کو ہاتھ سے دے بیٹھو اور دُنیا کو آخرت پر ترجیح دو۔ تمہیں چاہیے کہ دُنیا کو آخرت کی کھیتی بناؤ اور دنیا کو آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کا وسیلہ بناؤ۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ
جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ
كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اور اللہ نے تمہارے لیے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے سائے بنا دیے اور تمہارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنا دیں اور تمہارے لیے کرتے بنا دیے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور زرہیں جو تمہیں لڑائی میں بچاتی ہیں، اسی طرح اللہ اپنا احسان تم پر پورا کرتا ہے تاکہ تم فرمانبردار ہو جاؤ"۔

اللہ کی بے حساب نعمتیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سائے کا تذکرہ کیا ہے۔اگرچہ سایہ ایک عدمی امر ہے جو اجسام کے نور اور روشنی کے مقابلے میں واقع ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت میں سایہ کا وجود سایہ دار چیز یا سایہ والے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن یہی تبعی وجود بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے۔ کیونکہ اگر ان اجسام جیسے درخت، پہاڑ، مکان کا سایہ نہ ہوتا اور ہمیشہ دھوپ ہوتی تو روئے زمین پر کوئی بھی جاندار باقی نہ رہتا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک اور نعمت پہاڑوں میں موجود غار ہیں جو انسانوں کو اپنی پناہ میں لیتے ہیں۔اسے سردی اور گرمی سے بچاتے ہیں اور درندوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک اور الٰہی نعمت انسان کا لباس ہے جو اسے دھوپ کی حرارت اور گرمی سے اور سرما سے بچاتا ہے۔ اگرچہ آیت میں فقط موسم گرما کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن اس میں سرما بھی شامل ہے کیونکہ جو چیز انسان کو گرمی سے محفوظ رکھ سکتی ہے وہ اسے سردی

سے بچا سکتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس نہیں ہے کہ ہر گرمی سے بچانے والے لباس کو سردی سے بچنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن سردی سے بچانے والے لباس کو گرمی سے بچنے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں قرآن کے مخاطب اہل حجاز تھے جو گرم علاقہ ہے۔

اس کے بعد جنگی زرہ کا تذکرہ کیا ہے جو میدان جنگ میں انسان کی حفاظت کرتی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ سب الٰہی نعمتیں ہیں۔

آخر میں احسان جتانے کے لئے فرمایا ہے کہ یہ سب نعمتیں اس طرح ہم نے تمہارے اوپر مکمل کی ہیں تاکہ تم اللہ کے حضور تسلیم ہو جاؤ۔ کیونکہ جو نعمت کو پہچان لیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ نعمت دینے والے نے اس کے لئے نعمتیں پوری کی ہیں تو پھر وہ نعمت دینے والے کے حق میں کوتاہی اور غفلت نہیں کرے گا۔ یقینی طور پر نعمت دینے والے کے ارادے کے سامنے تسلیم ہو جائے گا اور کبھی بھی اس کے سامنے اپنے آپ کو بڑا نہیں بنائے گا۔

جیسا کہ ہم نے سابقہ آیات میں بھی بیان کیا ہے کہ جہان ہستی کے تمام موجودات نعمت شمار ہوتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ انسان کی سعادت اور خوشبختی کے لئے خلق کیا گیا ہے اور یہ سب انسان کی خدمت میں اور اس کے اختیار میں ہیں۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (سورۂ بقرہ، آیت ۲۹)

ترجمہ: "وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا"۔

اللہ تعالیٰ نے لباس، زرہ اور سپر کو اس لیے اپنی طرف نسبت دی ہے حالانکہ بظاہر خود انسان ان کو بناتا ہے۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے خام مال کو اللہ تعالیٰ

نے خلق کیا ہے۔[1]

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۸۲﴾

''اگر وہ پھر گئے اور روگردانی کر دی تو تنہا آپ کا ذمہ واضح بات کو پہنچانا ہے اور بس!''۔

رسول اللہؐ کی ذمہ داری

نعمات الٰہی کو ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کافروں کو دھمکی دی ہے اور دعوت الٰہی سے منہ موڑنے پر ان کی سرزنش اور ملامت کی ہے۔آیت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے فرمارہا ہے کہ اگر یہ لوگ تیری دعوت کو قبول کرلیں تو اس میں ان کی دنیا و آخرت کی بہتری ہے۔ دین کو قبول کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ اور اگر اس دعوت سے منہ موڑ لیں اور آپ کی بات نہ مانیں تو تیری ذمہ داری واضح طریقے سے اللہ کا پیغام ان تک پہنچانا ہے۔اس کے سواِ تیری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی بھی رسول اور پیغام پہنچانے والے کی ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مولا کا پیغام کسی ابہام کے بغیر، واضح طریقے سے پہنچادے۔اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کی دلجوئی بھی کی گئی ہے تاکہ لوگوں کے ایمان نہ لانے پر آپ کی حوصلہ شکنی نہ ہو اور آپؐ غمگین نہ ہوں۔

یَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنۡکِرُوۡنَہَا وَ اَکۡثَرُہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸۳﴾

[1]۔ زرہ اور لباس بنانے کا طریقہ یا تو اللہ ہی نے انسان کو تعلیم دیا ہے۔ یا پیغمبروں کے واسطے سے سکھایا ہے جیسے حضرت ادریس نے انسانوں کو لباس بنانے کا طریقہ سکھایا اور حضرت داؤدؑ نے زرہ بنانا سکھایا۔ (مصحح)

"وہ اللہ کی نعمتیں پہچانتے ہیں پھر منکر ہو جاتے ہیں اور اکثر ان میں سے ناشکرے گزار ہیں"۔

نعمات الٰہی کا انکار

جب انسان کو پتہ چل جائے کہ ساری نعمتیں اللہ کی جانب سے ہیں تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے سامنے تسلیم ہو جائے اور نعمت دینے والے کے لیے شکر بجا لائے۔ لیکن زیادہ تر انسان عمل کے مرحلے میں انکار کرتے ہیں جبکہ معرفت کا لازمہ تو یہ ہے کہ اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔ اور بہت سارے تو عملی انکار کے علاوہ کفر بھی کرتے ہیں اور حق کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں اور حق کے انکار پر اصرار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت کے آنے پر اتنے سارے واضح ثبوت کے باوجود ان سب کا انکار کر دیتے ہیں۔ وہ دو قسم کے انکار کے مرتکب ہوئے ہیں، ایک معرفتی انکار یعنی اللہ کے حضور تسلیم نہ ہونا اور دوسرا عملی انکار یعنی سب کچھ جاننے کے بعد کفر کر لینا اور ان نعمات پر شکر بجالانے کی بجائے اللہ کی توحید کا انکار کرنا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٨٤﴾

"اور جس دن ہم ہر قوم میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے پھر نہ کافروں کو اجازت دی جائے گی اور نہ ان کا کوئی عذر قبول کیا جائے گا"۔

روز قیامت، روز جزا

یہاں پر "یَوْمَ" سے قیامت کا دن مراد ہے اور "شَهِيدًا" سے جیسا کہ پہلے

بھی کہا گیا ہے اعمال کے گواہ مراد ہیں[1] جو قیامت کے دن اس کے اعمال کی گواہی کے لئے پیش ہوں گے اور اپنی امت کے اعمال کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے دنیا میں کیا کیا کام کئے ہیں۔ وہاں پر نہ تو کافروں کو بات کرنے کی اجازت ہو گی اور نہ ہی توحید کے انکار کا عذر پیش کر سکیں گے اور نہ ہی اعمال کے گواہوں کو گواہی دینے سے روک سکیں گے۔ اس دن کافروں کو اجازت نہیں ہو گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کوئی اقدام اُٹھائیں اور نہ ہی عمل صالح بجا لانے کی اجازت ہو گی۔ جو کچھ ان کے ہاتھ سے چلا گیا اس کی تلافی بھی نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ وہاں سے دنیا میں واپسی نہیں ہو سکتی ہے، آخرت دار العمل نہیں ہے بلکہ دار جزاء ہے، مکافات کی جگہ ہے۔ عمل کا گھر دنیا ہے، دنیا میں جو عمل کیا ہے اس کا بدلہ وہاں ملنا ہے، دنیا میں انجام دئے گئے انسان کے اعمال کا نتیجہ اسے وہاں ملے گا۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوا الۡعَذَابَ فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمۡ وَ لَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

''اور جب ظالم عذاب دیکھیں گے پھر عذاب نہ تو ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی''۔

گناہگاروں کے عذاب میں تخفیف نہیں

قیامت کے دن جب ستمگاروں اور ظالمین کے اعمال کی سزا کا حتمی فیصلہ دیا جائے گا اور انہیں آتش جہنم میں ڈالنے کا حکم سنایا جائے گا تو ان کے عذاب میں نہ تو تاخیر ہو گی اور نہ ہی ان کا عذاب کم ہو گا۔ انہیں ایسی جگہ عذاب دیا جائے گا جہاں سے رہائی نہیں ملے

---

[1]۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں بیان ہوا کہ قیامت کے دن انبیاء، آئمہ، صدیقین، شہداء اور خود انسان کے بدن کے اعضاء اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ (مترجم)

گی اور نجات بھی نہیں پا سکیں گے۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا شُرَکَآءَهُمۡ قَالُوۡا رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَکَآؤُنَا الَّذِیۡنَ کُنَّا نَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِکَ ۚ فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡهِمُ الۡقَوۡلَ اِنَّکُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۸۶﴾

"اور جب مشرک اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے رب! یہی ہمارے شریک ہیں جنہیں ہم تیرے سواء پکارتے تھے، پھر وہ انہیں جواب دیں گے کہ تم سراسر جھوٹے ہو"۔

خیالی معبودوں کی عبادت کرنے والوں کو جواب

قیامت کے دن کی بات ہی آگے بڑھ رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ وہ ایسا دن ہو گا جب مشرکین وہاں پر اپنے خیالی معبودوں کو دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! یہ وہی معبود ہیں جنہیں ہم نے تمہارا شریک بنایا ہوا تھا۔ تاکہ اپنے لئے چھٹکارے کا راستہ ڈھونڈھیں اور اس طرح اپنے گناہ کو ہلکا کرنے کی کوشش کریں اور اپنے جرم کا شریک تلاش کریں۔اس موقع پر وہ فرضی شرکاء ان کی بات کو جھٹلائیں گے اور کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ ہم تو اللہ کے شریک تھے ہی نہیں، تم نے خود ہمیں اللہ تعالیٰ کا شریک فرض کر لیا تھا اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہم اللہ کے شریک ہیں اور اللہ کی بجائے ہماری عبادت شروع کر دی تھی۔ ہم نے تو ایسا نہیں کہا تھا۔اس بارے (سورۂ فاطر، آیت : ۱۴) میں ارشاد ہے:

وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یَکۡفُرُوۡنَ بِشِرۡکِکُمۡ ؕ

ترجمہ: "اور قیامت کے دن وہ تمہارے اس شرک کا انکار کریں گے"۔

یہاں پر بتایا جا رہا ہے کہ قیامت کا دن تمہارے لئے بڑا سخت ہو گا لہٰذا ابھی سے اپنے

لئے انتظام کرلو۔

وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ۣالسَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

"اور وہ اس دن اللہ کے سامنے سر جھکا دیں گے، اور بھول جائیں گے جو وہ جھوٹ بناتے تھے"۔

قیامت میں کفار و مشرکین کی حالت

جو کفار و مشرکین دُنیا میں اسلام کی دعوت کے مقابلے میں استکبار کرتے تھے، اتراتے تھے؛ قیامت کے دن قہر الٰہی کے آگے مجبوراً تسلیم ہوں گے، جھک جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے غلبہ اور تسلط کو قبول کرلیں گے کیونکہ وہ مجبوری کی حالت میں تسلیم ہوئے ہیں لہٰذا ان کا یہ تسلیم ہونا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ جو کچھ وہ خیال کرتے تھے اور جو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ رکھا تھا وہ سب باطل ہو چکا ہو گا اور ان کے خیالات کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا۔ وہ دُنیا میں خدا کی الوہیت کے بھی قائل تھے اور اپنے بنائے ہوئے شرکاء کو بھی الٰہ مانتے تھے لیکن وہ اللہ کو چھوڑ کر صرف اپنے بنائے ہوئے شرکاء کے آگے تسلیم ہوتے تھے۔جب قیامت کے دن ان کے بنائے ہوئے شرکاء انہیں جھٹلائیں گے تو ان کے سارے خیالات باطل ہو چکے ہوں گے اور ان کا کچھ بھی اثر باقی نہیں رہے گا۔اس وقت یقینی طور پر حق کے آگے تسلیم ہونے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہو گا، لیکن ان کا اس وقت تسلیم ہونے کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

"جو لوگ منکر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکتے رہے ہم ان پر عذاب پر

عذاب بڑھاتے جائیں گے بسبب اس کے کہ وہ فساد کرتے تھے"۔

کفر کے سربراہوں کے لیے دگنا عذاب

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن کفر کے سربراہوں کو دگنا عذاب ملے گا۔ یعنی جو خود کافر تھے اور دوسروں کو بھی کفر کی جانب لے جاتے تھے، خود راہ خدا سے بھٹکے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھٹکاتے تھے، دوسروں کے لئے ایمان کا راستہ بند کرتے تھے تو ان کے لئے ڈبل عذاب ہو گا۔ ایک عذاب ان کے کفر اختیار کرنے کااور دوسرا عذاب اس وجہ سے کہ انہوں نے دوسروں کو کفر پر آمادہ کیا۔ کیونکہ وہ خود بھی فساد پھیلاتے تھے اور فسادیوں کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ خود فاسد تھے اور دوسروں کو فاسد بناتے تھے، خود کافر تھے اور دوسروں کو کافر بناتے تھے، خود گناہگار تھے اور دوسروں کو گناہ پر اُبھارتے تھے؛ اسی وجہ سے انہیں دوبرابر سزا ملے گی۔

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

"اور جس دن ہر ایک گروہ میں سے ان پر انہیں میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، اور تجھے ان پر گواہ بنائیں گے، اور ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا کافی بیان موجود ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے"۔

ہر اُمت کا گواہ

سابقہ آیت میں یہ بات بیان ہوئی کہ ہر اُمت کا شہید اور گواہ ہو گا جو اُس کے اعمال کی گواہی دے گا۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ہم آپ کو بھی اٹھائیں گے کہ آپؐ اس اُمت اور اس امت کے بعد آنے والی تمام اُمتوں کے اعمال کی گواہی دیں۔ ہر اُمت کے لئے اسی امت سے ایک گواہ اٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ اس اُمت پر حجت تمام ہو اور ان کے پاس کوئی عذر نہ ہو۔

اکثر مفسرین نے اس آیت کا معنی اسی طرح بیان کیا ہے۔ لیکن یہاں پر "هٰۤؤُلَآءِ" سے عام لوگ مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے شہداء مراد ہیں۔ یعنی ہر اُمت کے گواہ اس امت کے بارے گواہی دیں گے اور رسول اللہ ﷺ اُن شہداء پر شاہد ہیں تاکہ اُن کی شہادت اور گواہی کی توثیق کریں۔

پھر حضور اکرم ﷺ کا وصف بیان کیا ہے کہ ہم تجھے ان سب پر شاہد اور گواہ بنا کر لے آئیں گے۔ اس بناء پر "نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ" حال ہے "جِئْنَا بِكَ" کی ضمیر کے لیے۔ ہم تجھے ان سب پر شاہد اور گواہ بنا کر لے آئیں گے حالانکہ اس سے پہلے ہم نے دنیا میں تجھ پر کتاب قرآن نازل کی جس میں ہدایت کے متعلق ہر شئے کا بیان اور توضیح موجود ہے، مبداء و معاد کے حقیقی معارف ہیں اور اخلاق اور الٰہی قوانین اور نصائح ہیں جن کے ذریعہ حق و باطل کی تشخیص دی جاسکتی ہے اور لوگ صراط مستقیم کی طرف ہدایت پاتے ہیں۔

لہٰذا اے ہمارے رسول! تم دُنیا میں ان کے اعمال کی نظارت کرو اور قیامت کے دن ظالموں کے ظلم اور مسلمانوں کے تسلیم ہونے کی گواہی دو گے۔ قرآن ہدایت کی کتاب ہے جو مسلمانوں کے لئے بشارت، ہدایت اور رحمت کا وسیلہ ہے۔ قرآن اس حوالے

سے رحمت ہے کہ جو اس کے احکام اور قوانین کے مطابق عمل کرے گا قرآن اس کے لیے دنیا و آخرت کی خیر کا ذریعہ بنے گا۔ اور قرآن کا بشارت ہونا اس اعتبار سے ہے کہ قرآن پر ایمان لانے والوں کے گناہ بخشے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بہشت میں جگہ دے گا جہاں پر وہ ہمیشہ نعمتوں میں رہیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

”بے شک اللہ انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی اور بری بات اور ظلم سے منع کرتا ہے، تمہیں سمجھاتا ہے تاکہ تم سمجھو“۔

انصاف، بھلائی اور نیکی کا حکم

اس آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کے لئے بہترین اور مہم ترین احکام کو ترتیب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اسلام کی نظر میں ہر شخص کے لیے فردی اعتبار سے خیر اور شر اور سعادت و شقاوت ہے۔ لیکن ہر شخص کی فردی سعادت و شقاوت کے علاوہ اس کی اجتماعی سعادت و شقاوت بھی ہے جس معاشرے میں وہ زندگی گزارتا ہے۔ ان آیات میں ذکر شدہ احکام کے ذریعے اسلام نے معاشرے کی اصلاح اور بہتری کا اہتمام کیا ہے۔ تاکہ انسان اپنی ذات کے علاوہ اپنے اجتماع اور معاشرے کو بھی صالح بنائے۔

اس حوالے سے پہلی بات عدل کے متعلق ہے؛ عدل، بدلہ دینے اور تلافی کرنے میں مساوات اور برابری کا لحاظ رکھنے کو کہتے ہیں۔ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ شر سے

دینا۔ لیکن خیر کو اس سے بہتر خیر کے ذریعہ تلافی کرنا اور شر کا جواب اس سے کم شر کے ذریعہ دینے کو احسان کہتے ہیں۔ یعنی کسی نے نیکی کی ہے تو آپ اس کا بدلہ اس سے بڑھ کر دیں اور کسی نے برائی کی ہے تو اس کا بدلہ کم دیں۔

عدالت کی دو قسمیں ہیں ایک فردی عدالت ہے اور دوسری اجتماعی عدالت ہے۔ یہاں پر اجتماعی عدالت مراد ہے۔ اجتماعی عدالت کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جس کا وہ مستحق ہے اور جس جگہ اور مقام کا وہ لائق ہے اسی مقام پر اسے بٹھایا جائے۔ عدال وانصاف کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تمام انسانوں کے لئے ہے۔ سارے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ عدالت کا پاس رکھیں۔ اسی طرح معاشرہ اور سوسائٹی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بھی عدل وانصاف کا خیال رکھیں۔ نیز اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی اس کا لحاظ رکھے۔ کیونکہ اسلامی معاشرے کی باگ ڈور اسلامی حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

احسان سے مراد دوسروں پر بھلائی و نیکی کرنا ہے۔ احسان، فقیروں اور بے چارہ افراد کی حالت بہتر بنانے کا سبب ہوتی ہے۔ اسی لیے جس معاشرے میں احسان کرنے کا رجحان ہو، وہاں پر رحمت پھیلتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں دولت کی گردش کا سبب بنتی ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں امن وامان قائم ہوتا ہے۔

تیسرا: ذوی القربیٰ کے ساتھ تعلق داری؛ رشتہ دار بھی احسان کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہیں۔ لیکن عام کے بعد خاص کا ذکر اس نقطے کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے کہ گھرانہ اور آپس کی رشتہ داریوں کی اصلاح، پورے معاشرے کی اصلاح کا سبب بنتی ہے۔ یقینی طور پر اگر ہر فرد اپنے خاندان کے افراد کی اصلاح کے درپے ہو

گا تو تدریجاً پورے معاشرے کی اصلاح ہو گی۔[1] لہٰذا اس سے رشتہ دار بھی مراد ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم پر حق ہے تو ان کے رشتہ دار اور ان کی اولاد بھی مراد ہے۔

اس کے بعد تین غلط کاموں سے منع کیا گیا ہے جو معاشرے کے اندر گہرے شگاف کا سبب بنتے ہیں اور معاشرہ کو تباہی پر پہنچاتے ہیں۔ جن سے نظام فاسد ہو جاتا ہے اور پوری سوسائٹی بے امن ہو جاتی ہے اور ہلاکت میں پہنچ جاتی ہے، سعادت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ بدبختی آجاتی ہے:۔

"فَحْشَآءِ" ایسا بُرا کردار یا گفتار جس کو برداشت کرنا اور اس پر صبر یا سکوت کرنا مشکل ہو۔ "مُنْكَرِ" ایسے ناپسندیدہ امر کو کہتے ہیں جو معاشرے میں ناپسندیدہ اور بُرا ہونے کی وجہ سے متروک ہو چکا ہو۔ جیسے شرمگاہ کو ظاہر کرنا یا فسق و فجور کا اظہار کرنا۔ "بَغْيِ" لغوی اعتبار سے طلب کرنے کے معنی میں ہے۔ لیکن معمولاً اس سے دوسروں کا حق چھیننا، دوسروں پر ظلم اور تعدی کرنا، برتری جتانا مراد لیا جاتا ہے۔

لہٰذا فحشا، منکر اور بغی سے نہی کرنے کا مقصد معاشرے کی وحدت کو مستحکم کرنا ہے۔ تاکہ معاشرہ افراتفری اور ہرج مرج سے محفوظ رہ سکے اور معاشرے کا نظام درہم برھم نہ ہو۔ جب ایک معاشرے میں فحاشی اور منکرات نہیں ہوں گے اور ایک دوسرے کے حق سے تجاوز نہیں کریں گے تو ان کے درمیان رحمت ہو گی، پیار ہو گی، اس میں دشمنی اور نفرتیں نہیں ہوں گی جو ہر برائی اور تفرقہ کا باعث ہیں۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب

---

[1]۔ تفسیر مجمع البیان میں بیان ہوا ہے کہ ذوی القربیٰ سے سادات مراد ہیں۔ اور ایتاء ذوی القربیٰ سے مراد یہ ہے کہ سادات کو خمس دیا جائے ان کے ساتھ بھلائی کی جائے ان کی مشکلات حل کی جائیں کیونکہ وہ بھی سوسائٹی کا ایک حصہ ہیں۔

تمہاری حیات کی سعادت کے لیے ہے۔ فحاشی سے روکا ہے، بری گفتگو، برا عمل اور منکر سے روکا ہے، بغض سے روکا ہے تو یہ وہ برائیاں ہیں جو معاشرے کو تباہ کر دیتی ہیں۔ زنا، بدکاری، جھوٹ، فساد، بغی، کھلے عام گناہ، فسق و فجور سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں معاشرے کے امن و سکون کو برباد کر دیتی ہیں۔

وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِ اللّٰہِ اِذَا عٰہَدۡتُّمۡ وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَیۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡکِیۡدِہَا وَ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰہَ عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۹۱﴾

"اور اللہ کا عہد پورا کرو جب آپس میں عہد کرو اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو حالانکہ تم نے اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنایا ہے، بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم انجام دیتے ہو"۔

عہد و پیمان کی وفاداری

"عَہۡدِ" کسی چیز کی حفاظت کرنے اور اس کا لحاظ رکھنے کو کہتے ہیں؛ ایسا پیمان جس کا لحاظ رکھنا اور حفاظت ضروری ہو؛ اس کو عہد کہتے ہیں۔ "عَہۡدِ اللّٰہِ" سے مراد وہ پیمان ہے جو انسان اللہ سے باندھتا ہے۔ "اَیۡمَانَ" یمین کی جمع ہے؛ جو قسم کے معنی میں ہے اللہ کی قسم کھانا مراد ہے اور قسم کی تاکید کا مطلب یہ ہے کہ جس عمل کو انجام دینے اور اس کو مضبوط کرنے اور اس کے مضمون کے مطابق عمل کرنے کے لیے قسم کھائی جائے اس کی پابندی کی جائے لہٰذا یہ بے ہودہ اور بے مقصد قسموں کو شامل نہیں ہے۔ قسم کا حقیقی معنی یہ ہے کہ اس بات اور امر مہم کے درمیان ایک خاص رابطہ قائم ہوتا ہے جس کی قسم کھائی جا رہی ہوتی ہے اور اس بات کا جھوٹا ہونا اس شریف اور مہم امر کی توہین شمار ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کی قسم اٹھاتا ہے تو گویا وہ اپنی گفتگو کو ایک طرح

سے اللہ سے ربط دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کے مضمون کی سچائی اور وفاداری کا ضامن بناتا ہے۔ اگر وہ اس قسم کو توڑے گا اور اپنے عہد کی وفا نہیں کرے گا تو خدا اسے سزا دے گا کیونکہ قسم کو توڑنا اللہ کی عظمت اور جلالت کی توہین ہے۔ قسم توڑنا ایک طرح سے خود کو اللہ سے جدا کرنا ہے۔ جبکہ قسم کے ذریعہ خود کو اللہ سے متصل کیا تھا۔ آخر میں پھر اس نہی کی تاکید کی گئی ہے کہ پیمان شکنی مت کرو، قسمیں مت توڑو، خدا کے ساتھ جو عہد کیا ہے اس کے پابند رہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے اور وہ بد عہدی کو پسند نہیں فرماتا۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور اس عورت جیسے نہ بنو جو اپنا کاتا ہوا سوت محنت کے بعد کاٹ کر توڑ ڈالے، کہ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ بنانے لگو محض اس لیے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے، اللہ اس میں تمہاری آزمائش کرتا ہے، اور جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اللہ اسے ضرور قیامت کے دن ظاہر کردے گا"۔

قسمیں توڑنے والوں کی مثال

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسم توڑنے والے کو اس عورت سے تشبیہ دی ہے

جو پہلے سوت کاتتی ہے، کپاس سے دھاگہ بناتی ہے اور پھر اسے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ نقل ہوا ہے کہ قریش کی ایک احمق عورت تھی جو اپنی کنیزوں کے ساتھ آدھا دن دھاگہ بناتی تھی اور آدھے دن بعد کہتی تھی کہ اسے ریزہ ریزہ کر دو۔ یہ عمرو بن کعب کی بیٹی ربطہ تھی جسے خرفاء بھی کہا جاتا تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تم اپنی قسموں کو خیانت، مکر و فریب اور دھوکہ کا ذریعہ مت بناؤ۔ تاکہ ایک جماعت دنیا کی رنگینیوں کو ظاہر کرکے دوسری جماعت پر برتری اور بالادستی قائم کرے۔ تاکیدی قسمیں اٹھا کر ایک گروہ کا دوسرے گروہ کے ساتھ خیانت کرنا اور اس کے خلاف سازش کرنے کی مثال اسی عورت کی ہے جو دھاگہ بناتی ہے اور دھاگے کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ تم نے شروع میں قسم اٹھا کر اپنے آپ کو اللہ سے ربط دیا۔ لیکن اس کے بعد دھوکہ اور خیانت سے اسے توڑ دیا۔ یہ الٰہی امتحان ہے جس کے ذریعے خداوند تبارک و تعالیٰ تمہاری آزمائش کرتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں اس اختلاف کے بارے میں آگاہ کرے گا۔ اور وہاں سمجھو گے کہ دنیا میں تمہارے جھگڑوں کی کیا حیثیت تھی۔ تم درندوں کی طرح ایک دوسرے کی جان پر پڑے ہوئے تھے۔ حق کو مٹانے اور باطل کا راستہ طے کرنے کے درپے تھے۔ قیامت کے دن تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

"اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا اور لیکن وہ جسے چاہتا

---

[1] ۔ مجمع البیان، جلد ٦۔

ہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور البتہ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے"۔

لوگوں کے اختلافات کی حکمت

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی مشیت کا حوالہ دیا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہارے درمیان سے تمہارے سارے اختلافات کو ختم کر دیتا اور تمہیں ایک ہی گروہ بنا دیتا اور تم سب ایک ہی نظریہ پر ہوتے۔ نہ تو تمہارے اختلافات غرض الٰہی کو توڑ سکتے ہیں اور نہ ہی تم خدا کو عاجز کر سکتے ہو۔ خدا نے خود تمہیں مختلف خلق کیا ہے اور گروہ گروہ بنایا ہے۔ ایک گروہ کو اس کے فسق و فجور کی وجہ سے گمراہ کیا ہے۔ البتہ اس کی گمراہی ان کے برے اعمال اور فسق و فجور کی سزا کے طور پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ابتدائی طور پر کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ اور دوسرے گروہ کو سے ہدایت کی توفیق دی ہے اور وہ ہدایت پا گئے کیونکہ اُنھوں نے فطری ہدایت کو ضائع نہیں کیا اور اللہ کے اوامر کی روشنی میں نیک اعمال انجام دیے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو اس کے اختیار کی بنیاد پر سعادت و شقاوت ملے۔ جس راستے کو خود انسان اختیار کرے خواہ صحیح راستہ ہو یا انحرافی راستہ؛ اسی کے مطابق اسے سعادت یا شقاوت ملے۔ جیسا کہ (سورۂ دھر، آیت :۳) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا ۝٣''

ترجمہ: ''ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی ہے خواہ وہ شکر گزار بنے اور خواہ ناشکرا''۔

اس کے بعد ہدایت اور ضلالت و گمراہی کے جبری ہونے کے توہم کو ختم کرنے کے لیے فرمایا کہ بہت جلد تمہارے اعمال کا مواخذہ ہو گا، ان اعمال پر پکڑ اور بازپرس ہو

گی۔ ہدایت اور گمراہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دینے کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ انسان کے اعمال میں اس کے ارادے کی تاثیر ختم ہو جائے۔ کیونکہ اگر انسان کے اختیاری اعمال میں اس کے ارادے کی تاثیر ختم ہو جاتی تو پھر انبیاء کا دعوت دینا اور پیام رسانی کرنا باطل ہو جاتا۔ لہٰذا انسان جو بھی راستہ انتخاب کرتا ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے ان کا انتخاب کرتا ہے۔ البتہ خدا اس کے انتخاب کرنے میں مدد دیتا ہے اور اسے آگے لے جاتا ہے۔ جیسا کہ (سورۂ اسراء، آیت: ۲۰) میں اس بارے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰

"ہم (دنیا میں) ان کی بھی (جو نیک اعمال کرتے ہیں) اور ان کی بھی (جو برے اعمال کرتے ہیں) آپ کے رب کے عطیے کے وسیلہ سے مدد کرتے ہیں اور آپ کے رب کا عطیہ (کسی کے لیے بھی) ممنوع نہیں ہے"۔

اگر کوئی نیکی کے راستے میں ہے تو اس میں مدد ملے گی اور اگر کوئی برائی کے راستے میں ہے تو اللہ تعالیٰ ان اسباب کی تاثیر کو ختم نہیں کرتا۔ انسان جس راستے کا انتخاب کرے گا وہ اپنی تاثیر چھوڑے گا اور اس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۹۴

"اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کبھی قدم جمنے کے بعد پھسل نہ جائے پھر تمہیں اس سبب سے کہ تم نے راہِ خدا سے روکا

تکلیف اٹھانی پڑے، اور تمہیں بڑا عذاب ہو"۔

قسموں سے سوءِ استفادہ کرنے کی ممانعت

اس آیت میں قسموں کے ذریعے دھوکہ دہی سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ امر سبب بنتا ہے کہ ثابت قدمی کے بعد انسان کے قدموں میں وہ ثابت قدمی نہ رہے اور اس کے قدم پھسل جائیں۔ اگر کوئی خدا کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرے تو اسے بڑا دردناک عذاب چکھنا ہوگا۔ ثابت قدمی کے بعد پاؤں کے پھسل جانے کو تاکید کے ساتھ قسم کھا کر اسے توڑنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کسی چیز کا عزم اور فیصلہ کرنے اور اس کے لیے قسم اٹھانے کے بعد قسم کو توڑنا؛ انسانی کرامت کے خلاف ہے جس کے اوپر دین الٰہی کی بنیاد ہے۔

"صَدِّ سَبِيۡلِ اللّٰهِ" اللہ کی فطری سنت سے پیچھے ہٹنے کے معنی میں ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول بھی انسانوں کو اسی چیز کی دعوت دیتے ہیں۔ تاکہ انسان اس عہد پر قائم رہے اور اسی پر استقامت کرے جس پر چلنے کا کہا گیا ہے۔ اور قسموں، مکر و حیلہ، جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی کے ذریعے اس عہد کو پامال نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر اس برے عمل کا ارتکاب کرو گے، قسم کو توڑو گے اور قسم کے ذریعہ خیانت کرو گے اور دوسروں کو نقصان پہنچاؤ گے تو پھر سخت عذاب کے آثار تمہیں ملیں گے۔ اسی دنیا میں بھی گمراہی کی سزا بھگتنا ہو گی اور آخرت میں بھی زمین پر فساد پھیلانے کی سزا دردناک عذاب کی شکل میں تمہیں ملے گی۔

وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۵﴾

"اور اللہ سے عہد کو تھوڑے سے داموں پر نہ بیچو، جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو"۔

عہد الٰہی کو تھوڑے داموں بیچنے سے منع

یہ آیت پچھلی آیات کے مضمون کی تاکید ہے جن میں قسمیں اور عہد توڑنے سے منع کیا گیا تھا۔ اس آیت میں اسی مطلب کی اہمیت کو اور واضح کر دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اللہ کے اس عہد کو وفا کرو جو اس نے عالم ذر میں اپنے بندوں سے باندھا ہے۔[1] "اشْتَرا" الٰہی میثاق پر تھوڑے سے دنیاوی مال کو ترجیح دینا۔ عہد الٰہی کو پورا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان، اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارے اور اللہ کے قوانین پر عمل کرنے کی وجہ سے جو تکالیف آتی ہیں انہیں برداشت کرے۔ عہد الٰہی کو بیچنے کا معنی یہ ہے کہ انسان دنیا کے چند روزہ فائدے کی خاطر، اللہ کے عہد کو توڑ دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ان کو پتہ ہوتا کہ خدا کے پاس جو ہے وہ ان کے لیے کتنا بہتر ہے تو یہ معمولی معاوضے کے عوض، اللہ سے کیے ہوئے عہد کو نہ توڑتے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

1۔ عالم ذر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں سے اپنی بندگی کا عہد لیا اور فرمایا "الست بربکم قالوا بلی" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے جواب میں کہا جی ہاں! آپ ہمارے پروردگار ہیں۔ (خلقت کا لباس پہننے سے پہلے تمام انسانوں سے یہ عہد لیا گیا اور اس عالم کو عالم ذر کہا گیا ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو سوال کیا اسے سب نے سمجھا اور پھر سب نے سمجھ کر اس کا جواب دیا۔ گویہ سب کا اللہ سے عہد تھا کہ ہمارے رب تعالیٰ آپ ہی ہو۔ اسی عہد کو یاد دلایا گیا ہے۔ (مترجم)

"جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا، اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہوگا، اور ہم صبر کرنے والوں کو ضرور بدلہ دیں گے ان کے اچھے کاموں کا جو کرتے تھے"۔

اللہ کے ہاں نیک عمل کا اس سے بہتر اجر

اس آیت کا پہلے حصے میں سابقہ آیت کے اس جملے "اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ" کی علت اور وجہ بیان کی گئی ہے۔ سابقہ آیت میں کہا گیا کہ اللہ کے عہد کو معمولی معاوضے میں مت بیچو؛ اس لئے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اللہ کے ہاں جو کچھ ہے اس کے بہتر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ سب زوال پذیر ہے، اور ایک دن اس نے ختم ہو جانا ہے کیونکہ اصولی طور پر مادی زندگی حرکت اور زوال پر قائم ہے۔ لیکن جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے اس کو بقاء ہے اور کبھی بھی اس نے ختم نہیں ہونا کیونکہ آخرت کے سارے مظاہر ہمیشہ باقی رہیں گے، وہاں زوال بالکل نہیں ہے۔ عقلمند آدمی باقی رہنے والی نعمت کو ختم ہونے والی نعمت پر فدا نہیں کرتا؛ بلکہ باقی رہنے والی نعمت کو فانی نعمت پر ترجیح دیتا ہے۔

اس کے بعد اللہ کی راہ میں صبر کرنے والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ جو صبر کرتے ہیں خواہ اطاعت پر صبر ہو یا مصیبت پر صبر ہو یا گناہ کو ترک کرنے پر صبر ہو، خدا ان کو ایسا بہترین اجر دے گا جس کی کوئی مثال نہیں۔ یعنی دنیا میں ان کے صبر کی پاداش کے طور پر اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کی معمولی خطاؤں کو نظر انداز کر دے گا اور انہیں معافی دے دے گا۔ جیسا کہ (سورۂ زمر، آیت: ۱۰) میں آیا ہے: "اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۱۰" ترجمہ "یقیناً بے شمار ثواب تو صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا"۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

"جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہے تو ہم اسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے، اور ان کا حق انہیں بدلے میں دیں گے ان کے اچھے کاموں کے عوض میں جو وہ کرتے تھے"۔

صالحین کے لیے بہترین زندگی

یہ آیت ہر مومن کے لیے ایک وعدہ جمیل اور کلی حکم ہے جس نے عمل صالح انجام دیا ہے۔ اس کی ایک ہی شرط ہے کہ وہ مومن ہو، خواہ مرد ہو یا عورت۔ کیونکہ بغیر ایمان کے انجام دیا گیا عمل باطل اور بے اجر ہے اور اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہر نیک عمل انجام دینے والے مومن کو ایک نئی زندگی ملے گی جو عمومی زندگی کے علاوہ ہے جو دوسروں کو عطا ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اس نئی زندگی میں ایسا علم و ادراک عطا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ حق کو زندہ کرنے اور باطل کو مٹانے پر قادر ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اس قدرت سے محروم ہیں۔ یہ علم و قدرت مومن کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اشیاء کو ان کی حقیقی شکل میں دیکھ لے، جس طرح وہ حقیقت میں ہیں۔ حق و باطل کی تشخیص دے سکے۔ جس کے نتیجے میں وہ دنیا اور اس کے مظاہر کا فریفتہ نہیں ہوگا۔ شیطان اس کو دھوکہ نہیں دے سکتا اور نہ ہی اس کو وسوسہ کر سکتا ہے۔ وہ اللہ کی عزت سے عزیز ہو جائے گا، اس کا دل رب تعالیٰ سے متعلق ہو جائے گا۔ اس صورت میں وہ اللہ کی رضا کے سواء کچھ بھی نہیں چاہے گا۔ اس کے لیے پروردگار کے ہاں جو نیک ہے اس کے علاوہ کوئی چیز نیک

نظر نہیں آئے گی اور جو اللہ کی نظر میں قبیح اور بری ہے اس کے علاوہ اسے کوئی چیز قبیح نظر نہیں آئے گی؛ وہ اسی کو قبیح سمجھے گا جس کو اللہ نے قبیح جانا ہے۔ اس کے نفس میں ایسا نور اور سرور آجائے گا جس کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ اسے ایسی دائمی حیات ملے گی جو زوال ناپذیر ہے۔ یہ سب، حقیقی زندگی کے آثار ہیں۔ جس کے پاس ایسی زندگی ہو اس میں دو قسم کی زندگیاں نہیں ہیں (ایک مجازی اور دوسری حقیقی) بلکہ وہ ایک بالاتر اور قوی تر درجے پر فائز ہے۔ جیسا کہ انبیاء کے بارے میں ہے کہ ان کی زندگی عام انسانوں کی زندگی سے بالاتر ہے کیونکہ ان کو اللہ کی طرف سے روح قدسی کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

جیسا کہ پچھلی آیت میں بھی بیان کیا گیا کہ انہیں ان کے عمل سے بہتر اجر ملے گا۔ ان کے اجر میں کمی نہیں کی جائے گی بلکہ ان کے عمل کے مقابلے میں انہیں بہترین قسم کا اجر دیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں ان کے اعمال کا اجر دینے میں ان کے اعمال کا شائستہ ہونا، کامل ہونا، ایمان کا کامل ہونے کو لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ (سورۂ مومن ،آیت ۴۰) کے مطابق انہیں بے حساب اجر دیا جائے گا۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۴۰

ترجمہ: ''اور جو نیکی کرے گا وہ مرد ہو یا عورت اگر صاحب ایمان بھی ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے جس میں انہیں بے شمار رزق ملے گا''۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝۹۸

''سو جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ لے لو''۔

تلاوت قرآن کے وقت شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا

اس آیت میں قرآن پڑھنے کے آداب میں سے ایک ادب کو بیان کیا گیا ہے۔"اسْتِعاذہ" پناہ مانگنے کو کہتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو شیطان راندہ درگاہ الٰہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔ تاکہ تمہیں اپنی پناہ میں رکھے اور شیطان کے مقابلے میں آپ کی حمایت کرے۔لہٰذا اس آیت میں جس "اسْتِعاذہ " کا حکم دیا گیا ہے اس سے دل کی کیفیت اور حالت مراد ہے۔قرآن کی تلاوت کے وقت قاری نہ فقط زبان سے " اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ " کہے، بلکہ زبانی پڑھنا، نفسانی حالت اور کیفیت کے پیدا ہونے کے لیے مقدمہ ہے۔ زبانی قول کو بطور مجاز "اسْتِعاذہ" کہا گیا ہے۔"اسْتِعاذہ " کا حقیقی معنی یہ ہے کہ انسان قلبی طور پر اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں قرار دے تاکہ وہ اسے شیطان کے شر اور شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھے۔

اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

"اس کا زور ان پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

مومنین پر شیطان کا تسلط نہیں

یہ جملہ پچھلی آیت میں ذکر شدہ "اسْتِعاذہ " کی علت کے طور پر بیان ہوا ہے۔ قرآن کی تلاوت کے وقت شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ شیطان کے شر سے وہی محفوظ رہتے ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ شیطان ایسے افراد میں تصرف کرنے اور تاثیر گذاری کی قدرت نہیں

رکھتا کیونکہ مومنین اور اہل توکل نے اپنے تمام امور کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ وہ خدا کی رضا میں راضی ہیں، اللہ کے سامنے تسلیم ہیں۔ یہ امر عبودیت اور بندگی کے آثار میں سے ہے۔ اس آیت سے دو نقطے سمجھے جا سکتے ہیں: (۱) شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا بعینہٖ خدا پر توکل کرنا ہے۔ (۲) ایمان اور توکل، سچی عبودیت اور بندگی کے دوملاک ہیں۔ ایمان اور توکل کے بغیر بندگی کا دعویٰ جھوٹ ہے؛ ایمان اور توکل ہو گا تو بندگی کا دعویٰ سچ ہو گا۔

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اس کا زور تو انہیں پر ہے جو اسے دوست بناتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہیں''۔

مشرکین پر شیطان کا غلبہ

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کن لوگوں پر شیطان کا تسلط اور غلبہ ہے۔ شیطان کا غلبہ اور تسلط انہی لوگوں پر ہے جو شیطان کو اپنا سرپرست بناتے ہیں اور اپنے امور کی تدبیر شیطان کے سپرد کر دیتے ہیں اور اللہ کا شرک کرتے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے شیطان کو اپنا رب بنایا ہوا ہے کیونکہ شیطان کی اطاعت اس کی عبادت کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ (سورۂ یٰسٓ، آیت :۶۰) میں ارشاد ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾

''اے اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا؟ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

اس آیت سے دو نقطے اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

پہلا نقطہ: آیت کے پہلا حصہ اس کے آخری حصے کی تفسیر اور توضیح ہے۔ اس معنی میں کہ جو اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا ولی اور سرپرست بنائے جس کو ولی بنانے کا خدا نے اذن نہیں دیا تو یہ اللہ کا شرک ہے۔ اور یہ غیر اللہ کی اطاعت اور عبادت شمار ہوتی ہے۔

دوسرا نقطہ: خدا پر توکل نہ کرنے اور شیطان کو اپنا سرپرست بنانے کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جو خدا پر توکل نہیں کرتا وہ شیطان کے اولیاء میں سے ہو گا۔

وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

"اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تو باتیں اپنی طرف سے بنا لاتا ہے، بلکہ ایسا نہیں ہے لیکن اس بات کو اکثر ان میں سے نہیں سمجھتے"۔

نسخ آیت کی حکمت

اس آیت میں آیات کو نسخ کرنے کی حکمت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری بدلتے ہیں تو یہ برحق ہوتا ہے اور یہ اپنے مورد سے تجاوز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جو بھی آیت نازل فرماتا ہے تو اسے اس کے مناسب وقت پر نازل فرماتا ہے۔ خدا جو کچھ نازل کرتا ہے تو اسے پتہ ہے کہ اسے کب نازل کرنا ہے اور کس لیے نازل کرنا ہے۔ ان مشرکین کو کچھ پتہ نہیں۔ اللہ ان سے زیادہ واقف و آگاہ ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی آیت کو تبدیل کر لیتے ہیں تو مشرکین اور یہودی آپؐ پر افتراء باندھنے کی تہمت لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی طرف سے آیت بدل دی ہے؛ پروردگار کے کلام میں تبدیلی اور نسخ ممکن نہیں ہے۔ گویا وہ کہنا چاہتے تھے کہ آپؐ کا کام سوائے افتراء باندھنے کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرما رہا ہے ان میں سے بیشتر کسی آیت کے تبدیل کرنے کی حکمت کے متعلق علم و آگاہی نہیں رکھتے۔ وہ نہیں جانتے کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ عنقریب انہیں معلوم ہوگا کہ الٰہی احکام بندوں کے مصالح اور فوائد کے تابع ہیں۔ جب بندوں کے مصالح اور حالات میں تبدیلی آجاتی ہے اور تقاضے بدل جاتے ہیں تو اللہ اسی کے مطابق نئے احکام نازل فرماتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے نئے حکم میں نئی مصلحت ہوتی ہے جس کے لئے وہ حکم بنایا گیا ہے۔ لیکن بہت سارے مشرکین اس بات کو نہیں جانتے۔ اس کی وجہ ان کا استکبار، ان کی ہٹ دھرمی اور حق کے ساتھ ان کی دشمنی اور ان کا حقائق سے غافل ہونا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"تو کہہ دے کہ اسے تیرے رب کی طرف سے پاک فرشتے نے سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ ایمان والوں کے دلوں کو مضبوط کر دے اور یہ امر فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے"۔

رُوح القدس کا قرآن لانا

اس جگہ رُوح القدس سے جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

وحی لاتے تھے۔ جبرئیل علیہ السلام، رسول اللہ ﷺ کو تعلیم دے رہے ہیں کہ جو مشرکین آپؐ پر افتراء باندھنے کی تہمت لگاتے ہیں ان سے کہہ دو کہ قرآن کریم کو رب تعالیٰ کی طرف سے روح القدس نے حق کے ساتھ اتارا ہے۔ اس سے قرآن کا تدریجی نزول مراد ہے۔[1] قرآن کریم کے تدریجی نزول کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور روز قیامت پر ایمان لانے والے ثابت قدم رہیں۔ کیونکہ لوگوں کی مصلحتوں کے مطابق الٰہی قوانین کے بدلنے سے مومنین کو دلی سکون ملتا ہے اور ان کے ثابت قدم رہنے کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح یہ قرآن ان لوگوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے تسلیم محض ہیں اور احکام الٰہی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کرتے۔

قرآن کریم ان لوگوں کو سعادت کے راستے کی جانب ہدایت دیتا ہے اور انہیں بہشت اور جوار رحمت الٰہی کی بشارت دیتا ہے۔ قرآن کے نزول کی غایت اور اس کے ہدف کے متعلق مومنین اور مسلمانوں کے درمیان اس لیے فرق رکھا ہے کیونکہ ایمان اور اسلام دو الگ چیزیں ہیں اور ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ ایمان ایک قلبی حالت ہے۔ لہٰذا آیات الٰہی کے نسخ ہونے کے نتیجے میں مومن کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے، اس کا علم اور مستحکم ہو جاتا ہے اور اللہ کے سامنے اس کا اعتراف زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے ہے، وہ اعمال جن کا تعلق اس کے بدن سے ہے۔ لہٰذا اسلام پر قرآن کے نزول اور اس کی آیات کے نسخ ہونے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان ان سے واجب اعمال کی راہنمائی لیتا ہے جس کے نتیجے میں اسے بہشت اور سعادت کی بشارت ملتی ہے۔

---

[1]۔ کیونکہ قرآن دو مرتبہ نازل ہوا ہے ایک مرتبہ پورا قرآن کریم قلب مبارک پیغمبر ﷺ پر اُترا اور دوسری مرتبہ تدریجاً نازل ہوا ہے۔

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ اَعۡجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۰۳﴾

''اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے، حالانکہ جس کی طرف نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے''۔

پیغمبر اکرمؐ پر مشرکین کی تہمت

پیغمبر اکرم ﷺ پر مشرکین کی تہمتوں میں سے ایک تہمت یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ کوئی دوسرا آدمی آپؐ کو قرآن کی تعلیم دیتا ہے۔ بظاہر اس سے ان کی مراد ایک غیر عرب عالم تھا جو عربی زبان اچھی طرح جانتا تھا اور ان کے خیال میں رسول اللہ ﷺ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ کوئی غیر عرب، قرآن کے مطالب رسول خدا ﷺ کو املاء دیتا ہے اور لکھواتا ہے؛ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ممکن تھا کہ غیر عرب مرد نے عجمی زبان میں رسول خدا ﷺ کو مطالب بتائے ہوں اور پیغمبر اکرم ﷺ نے ان کو عربی زبان میں ڈھال دیا ہو۔ اس شبہے اور اعتراض کا پورا جواب قرآن مجید کی اس آیت میں نہیں دیا گیا بلکہ بعد والی آیات کو ملا کر پورا جواب مکمل ہوتا ہے، جو کل تین آیات ہیں۔

اگر پیغمبر اکرم ﷺ پر تمہاری تہمت کا مطلب یہ ہے کہ غیر عرب شخص نے آپؐ کو قرآن کے الفاظ تلقین کئے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کی طرف تم نسبت دے رہے ہو وہ عرب نہیں ہے، جبکہ قرآن فصیح عربی میں ہے۔ اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ قرآن کے معانی اس مرد کی طرف سے ہیں اور وہ شخص قرآنی معارف رسول

اللہ ﷺ کو تعلیم دیتا ہے لیکن قرآن کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہیں اور وہ ان الفاظ کو خود ترتیب دیتے ہیں تو اس بات کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے معارف نے تمام بشر کی عقلوں کو متحیر کر دیا ہے۔ کوئی بھی عاقل ان کے حقیقی ہونے کے بارے میں تردید نہیں کرتا۔ اگر پیغمبر اکرم ﷺ نے ان معارف کو غیر خدا سے سیکھ لیا ہوتا تو ان کا اللہ پر ایمان نہ ہوتا اور اللہ پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ انہیں ہدایت نہ دیتا۔ جبکہ پیغمبر اکرمؐ قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ اس لیے وہ ہر گز قرآن پر افتراء نہیں باندھ سکتے۔ کیونکہ وہی اللہ پر افتراء باندھتا ہے جو بے ایمان ہے اور اس کا اللہ پر ایمان نہیں، آیات قرآنی پر ایمان نہیں اور جھوٹا ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یہ آخری جواب بعد والی دو آیات میں آیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهۡدِیۡهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۰۴﴾

''وہ لوگ جنہیں اللہ کی باتوں پر یقین نہیں اللہ بھی انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

کفار قابل ہدایت نہیں

جو آیات الٰہی کا کفر کرتے ہیں، اللہ کی نشانیوں کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، معارف حقہ پر ایمان نہیں لاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی انہیں ہدایت نہیں دیتا۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کا الٰہی آیات پر ایمان ہے اس وجہ سے خداوند تبارک و تعالیٰ نے انہیں عالی اور بلند معارف کی ہدایت دی ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

”جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جنہیں اللہ کی باتوں پر یقین نہیں، اور وہی لوگ جھوٹے ہیں“۔

جھوٹی تہمتیں لگانے والے بے ایمان لوگ

اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمتیں وہ لگاتا ہے جس کا اللہ کی آیات پر ایمان نہ ہو اور یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ جو اللہ کی آیات پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کی نشانیوں کا مومن ہو تو وہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے؟ وہ کیسے خدا پر تہمت لگا سکتا ہے؟ وہ کس طرح اپنی یا دوسرے کی بات کو خدا کی طرف نسبت دے سکتا ہے؟ جیسا کہ ہم نے بتایا کہ یہ تین آیتیں کافروں کے اس اعتراض کا جواب ہیں جس میں وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی اور شخص تعلیم دیتا ہے اور یہ معارف اللہ پر افتراء ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وہ جو تعلیم دینے والا ہے وہ تو غیر عرب ہے اور یہ قرآن واضح و روشن اور فصیح عربی میں ہے۔ اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص رسول خدا ﷺ کو معانی سکھاتا ہے اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان الفاظ کی ترکیب ایسی ہے کہ کوئی بھی غیبی طاقت کے بغیر ایسی ترکیب نہیں بنا سکتا۔ رسول خدا ﷺ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ اللہ پر جھوٹ کس طرح باندھ سکتا ہے؟ جھوٹ بولنے والا کبھی اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لا سکتا۔ جو اللہ کی آیات پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ پر جھوٹ نہیں باندھ سکتا۔

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰۶﴾

''جو کوئی ایمان لانے کے بعد اللہ سے منکر ہوا مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور لیکن وہ جو دل کھول کر منکر ہوا تو ان پر اللہ کا غضب ہے، اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''۔

ایمان کے بعد کافر ہونے والوں پر غضب الٰہی

اس آیت کا معنی بڑا واضح ہے۔ ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ کوئی اپنے اختیار سے اور بغیر کسی جبر کے کفر اختیار کرلے۔ ایسے شخص کو دینی اصطلاح میں مرتد کہا جاتا ہے کیونکہ کسی نے اسے کفر اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کے دل میں ایمان موجود ہے، اس کا دل ایمان سے مطمئن ہے، لیکن اسے کفر اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ایسے شخص کا حکم پہلے شخص سے مختلف ہے۔ جو جانتے ہوئے اور اپنی مرضی سے کفر اختیار کرے اور اس کے دل میں ایمان سے نفرت ہو تو وہ کافر اور مرتد ہو گیا ہے؛ جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا بڑا عذاب ہے۔ کیونکہ اس شخص نے ایمان کی عظیم نعمت پر شکر کرنے کی بجائے اس بڑی نعمت کا انکار کر دیا ہے تو اس کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ ''اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ

مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ"[1] والا جملہ عمومی شرط سے استثناء ہے؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے مجبوری کی حالت میں کفر کا اظہار کیا ہو لیکن اس کا دل اللہ پر ایمان سے مطمئن ہو تو اس صورت میں اس کے لئے غضب الٰہی اور دردناک عذاب نہیں ہے۔ غضب الٰہی اور دردناک عذاب اس کے لیے ہے جو اختیاری طور پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۷﴾

"یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر محبوب بنایا اور نیز اس لیے کہ اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

غضب الٰہی کی وجہ

یہ آیت پچھلی آیت میں بیان ہونے والے حکم کی دلیل کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ مرتد پر غضب الٰہی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی پست اور فانی زندگی اور حیوانی لذتوں کو حق تعالیٰ کی ہمسائیگی میں ملنے والی آخرت کی دائمی زندگی پر ترجیح دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے انسان کی خلقت کی غرض سے انحراف کیا ہے۔ ان کا ہدف فقط دُنیاوی زندگی ہے اور آخرت سے بالکل منقطع ہو گئے ہیں اور کفر اختیار کرلیا ہے۔ خداوند کافروں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ وہ ہدایت الٰہی سے محروم ہوجانے کی وجہ سے سعادت اور بہشت سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور غضب الٰہی کے

---

[1]۔ تفسیر درالمنثور میں ہے کہ یہ آیت جناب عمار یاسر کے بارے میں اتری ہے۔ جب ابوجہل نے ان کے ماں اور باپ کو شہید کر دیا تو انہوں نے تقیہ کے طور پر کفر کا اظہار کرلیا، جبکہ ان کا دل مومن تھا۔

مستحق ٹھہرے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے گناہ کا راستہ اختیار کیا اور اللہ کی آیات کا انکار کیا اور اس انکار کی وجہ سے وہ غضب الٰہی اور عذاب کے مستحق ٹھہرے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿١٠٨﴾

"یہ وہی ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر کر دی اور وہی غافل بھی ہیں"۔

دُنیا پرستوں کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہریں

جو لوگ دنیا کی معمولی چیزوں کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور ہدایت الٰہی سے محروم ہو جاتے ہیں یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور یہی لوگ حقیقت سے غافل ہیں۔ انہوں نے چونکہ مادیات سے دل لگا لیا ہے اور معنویات سے دل توڑ لیا ہے، ان کا ادراک اور حس و شعور مادیات کے چوکھٹ میں اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا وہ حقیقت کا صحیح ادراک نہیں رکھتے۔ عبرتیں اور نصیحتیں انہیں آخرت کی طرف نہیں لے جاتیں۔ گویا ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر ثبت ہو چکی ہے۔اس لیے وہ حق کے راستے کو نہیں پاتے اور کلی طور پر حق سے غافل ہیں۔ ان کے دلوں پر مہر لگانے کا عمل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے جو ان کے برے اعمال کی سزا کے طور پر انہیں ملا ہے۔ لیکن غفلت کی نسبت خود انسان کی طرف دی گئی ہے کیونکہ اس کے اسباب ،انسان خود فراہم کرتا ہے اور وہ خود اپنے ہاتھوں سے غفلت میں گرا رہتا ہے۔

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٠٩﴾

"ضرور وہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں"۔

آخرت کا گھاٹا

جنھوں نے دنیا میں ملنے والا اپنا سرمایہ ضائع کر دیا اور آخرت کے لیے کوئی زاد راہ اور توشہ فراہم نہیں کیا اور خالی ہاتھ آخرت میں پہنچے تو ایسے لوگ ہی آخرت میں گھاٹے میں ہوں گے۔ جیسا کہ بیان ہوا آخرت کا توشہ ایمان اور احسان یعنی رشتہ داروں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ نیک سلوک اور اچھا تعلق رکھنا ہے۔ اس آیت کی مانند سورہ ھود میں بھی ایک آیت آئی ہے لیکن وہاں پر یہ تھا کہ خود بھی کافر ہوئے اور دوسروں کے ایمان لانے کی راہ میں بھی رکاوٹ بنے اس لیے وہاں پر اَخۡسَرُوۡنَ "سب زیادہ خسارے والے" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے:

لَا جَرَمَ اَنَّهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ هُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ﴿۲۲﴾ (سورۂ ھود، آیت ۲۲)

ترجمہ: "لازمی بات ہے آخرت میں یہ لوگ سب سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے"۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا فُتِنُوۡا ثُمَّ جٰهَدُوۡا وَ صَبَرُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۱۰﴾

"پھر بے شک تیرا رب ان کے لیے جنھوں نے مصیبت میں پڑنے کے بعد ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے"۔

اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کا اجر

"فتنہ" لغت میں سونے کو آگ میں ڈالنے کو کہتے ہیں تاکہ سونا ملاوٹوں سے پاک اور خالص ہو جائے۔ لیکن یہ لفظ بتدریج آزمائش اور شکنجے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں فتنہ سے مراد وہ تکالیف اور اذیتیں ہیں جو اسلام کے آغاز میں مشرکین، مومنین کو دیا کرتے تھے تاکہ مومنین دین اسلام چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان مومنین کو وعدہ جمیل دے رہا ہے جنہوں نے ان ساری مشقتوں اور تکالیف اٹھانے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، جہاد کیا، راہ خدا میں آنے والی تکالیف پر صبر کیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی خطاؤں سے در گزر کرے گا اور انہیں اپنی رحمت میں قرار دے گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ مجبوری کی حالت میں بظاہر کفر اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ ان سے اس وقت تک راضی نہیں ہوتا جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں اور ان کی ہجرت سے بھی اللہ راضی نہیں ہو گا مگر یہ کہ وہ جہاد کریں اور صبر کریں۔ اگر انسان ایسے علاقے میں رہ رہا ہے جہاں ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ شخص اس جگہ کو چھوڑ دے اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے اور اس راستے میں آنے والی تکالیف پر صبر کرے۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"جس دن ہر شخص اپنے ہی لیے جھگڑتا ہوا آئے گا اور ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کچھ بھی ظلم نہ ہوگا"۔

روزِ قیامت، روزِ جزاء

قیامت کا دن روز جزاء ہے۔ اس دن ہر شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گا اور اپنا دفاع کر رہا ہوگا اور اپنے اعمال کے لئے عذر پیش کر رہا ہو گا اور اپنے سواء سب کو بھول چکا ہو گا۔ جبکہ اس کے برعکس دنیا میں اسے ہر چیز کی خبر تھی سوائے اپنی ذات کے؛ وہ دنیا میں اپنے آپ کو بھولا ہوا تھا اور اسے اپنی اصلاح کی کوئی فکر نہ تھی۔ قیامت ایسا دن ہے جس میں ہر ایک کو اس کا پورا حق دیا جائے گا، کسی کے حق سے ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اسے ملے گا۔ اصولی طور پر اس کا عمل بعینہ اپنی حقیقی شکل میں اس کے سامنے حاضر ہو گا اور جو کچھ اس نے انجام دیا ہے اسے دریافت کرے گا۔ اور یہ عدالت کی دقیق ترین شکل ہے جس میں کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہو گا۔

اس آیت سے دو مطلب استفادہ کئے جاسکتے ہیں:۔

ا۔ قیامت کے دن کوئی بھی دوسرے کا دفاع نہیں کرے گا۔ کیونکہ ہر کسی کو اپنی فکر ہوگی لہٰذا کسی اور کے امور میں مصروف رہنے کا کسی کے پاس موقع ہی نہیں ہوگا۔ جیساکہ (سورۂ دخان، آیت :۴۱) میں آیا ہے:

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۱

ترجمہ: ''اس دن کوئی قریبی کسی قریبی کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

۲۔ اپنے اعمال کے متعلق اس کا جھگڑا اور بحث مباحثہ اور عذر پیش کرنا اسے کوئی فائدہ نہ دے گا کیونکہ اس کا عمل بعینہٖ اس کی سزا کے طور پر اسے ملا ہو گا لہٰذا اس میں ذرہ برابر بھی ظلم کا شائبہ نہیں ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور اللہ ایک ایسی بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جہاں ہر طرح کا امن چین تھا اس کی روزی با فراغت ہر جگہ سے چلی آتی تھی پھر اللہ کے احسانوں کی ناشکری کی پھر اللہ نے ان کے برے کاموں کے سبب سے جو وہ کیا کرتے تھے یہ مزہ چکھایا کہ ان پر فاقہ اور خوف چھا گیا''۔

پرامن بستی کی مثال

اس آیت میں اللہ نے اس بستی کی مثال دی ہے جو اشرار اور غارت گروں کے حملے سے محفوظ تھی، اس میں بے گناہ کسی کا خون نہیں بہایا جاتا تھا، وہاں کی عورتوں اور بچوں کو قیدی نہیں بنایا جاتا تھا، ان کا مال نہیں لوٹا جاتا تھا، وہ بستی طبیعی حادثات سے محفوظ تھی اور اس میں بڑا سکون تھا، ہر طرح کا رزق فراوان تھا اور ہر چیز سستی ملتی تھی اور تمام مادی سہولیات ان کے لئے موجود تھیں۔

جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان کیا جائے گا، خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان تمام مادی نعمتوں کے بعد ان کے لیے معنوی نعمت کا بھی اضافہ کیا اور ایک پیغمبر ان کے لئے مبعوث کر دیا، جو انہیں دنیا و آخرت کی خیر و صلاح کی جانب دعوت دیتا تھا۔ لیکن اس بستی والوں نے اللہ کی نعمتوں کا کفر کیا، خداوند تبارک و تعالیٰ کی ناشکری کی تو اللہ نے انہیں اپنے عذاب کا مزہ چکھایا، انہیں بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا کیا۔ انہیں ذلت کا لباس پہنایا اور وہ غضب الٰہی کا شکار ہوئے۔ ڈر، بھوک اور بدامنی کی شکل میں

ان پر آنے والے عذاب کی وجہ ان کی ناشکری تھی۔ جس نے ان کو پست اور ذلیل و خوار کر دیا اور وہ بے امن ہو کر رہ گئے۔ لہٰذا کفران نعمت کرنے والوں کو سزا دینے کی الٰہی سنت ہمیشہ جاری رہی ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور البتہ ان کے پاس انہیں میں سے رسول بھی آیا مگر انہوں نے اسے جھٹلایا پھر انہیں عذاب نے آ پکڑا ایسے حال میں کہ وہ ظالم تھے"۔

ظلم اور کفران نعمت کا نتیجہ

اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کو مادی نعمتوں کے بعد معنوی نعمت سے نوازا اور ان کی دنیا و آخرت کی بہتری کے لئے رسول بھیج دیا۔ لیکن انہوں نے رسول کی قدر نہ کی اور معرفت رکھتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دیا، الٰہی دعوت کو ٹھکرایا اور اس طرح سعادت اور رشد کا راستہ اپنے اوپر بند کر دیا۔ ان کا یہ عمل کھلا اور آشکار ظلم تھا۔ جب وہ ظلم کے مرتکب ہوئے اور کفران نعمت کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت عذاب میں مبتلا کر دیا۔[1]

---

[1]۔ تفسیر قمی جلد اول صفحہ ۳۹۱ میں آئمہ اطہار علیہم السلام سے نقل ہوا ہے کہ یہ ایسی قوم کی مثال ہے جو ثرثار نامی دریا کے کنارے پر رہتے تھے اور وہ اس قدر نعمتوں میں غرق تھے کہ روٹی کے لیے گوندھے ہوئے آٹے سے استنجا کرنے لگ گئے اور اللہ کی نعمتوں کو اتنا ہلکا شمار کیا تو اللہ تعالیٰ نے قحط کی صورت میں انہیں عذاب دیا۔ جب ان پر قحط آگیا تو وہ ان آلودہ روٹیوں کو کھانے پر مجبور ہوئے یہاں تک کہ وہ ان گندگی سے آلودہ روٹیوں پر جھگڑا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھی عذاب دیا اور آخرت کا عذاب اس سے بڑھ کر ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

”پھر تمہیں جو اللہ نے حلال طیب روزی دی ہے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم صرف اسی کو پوجتے ہو“۔

حلال و طیب روزی پر اللہ کا شکر

یہ آیت پچھلی دو آیات کی فرع ہے۔ اگر تم بھی کفران نعمت کرو گے تو عذاب الٰہی میں مبتلا ہو جاوگے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حلال و طیب روزی سے استفادہ کرو گے اور اللہ تعالیٰ کے حرام کئے ہوئے سے رک جاؤ گے اور اللہ کی پرستش کرو گے، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو پھر تمہارے لئے یہ سب نعمتیں خیر و برکت کا باعث بنیں گی۔اور جاری رہیں گی۔ اس آیت سے چند نکات سمجھے جا سکتے ہیں:

ا۔ آیت شریفہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ساری پاکیزہ اور طیب روزی، حلال ہے۔

۲۔ روزی کے حلال اور طیب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس انداز میں ہو جس سے انسان کی طبیعت لذت اٹھائے اور اس سے متنفر نہ ہو۔ شرعی اعتبار سے حلال ہونے کا معنی بھی یہی ہے۔جو چیز شرعی اعتبار سے حلال ہوتی ہے وہ فطری حلیت کے تابع ہے یعنی فطرت اسی کو چاہ رہی ہوتی ہے۔

۳۔ ”كُلُوْا“ یعنی کھانے کا حکم، ”وَّ اشْكُرُوْا“ کے لیے مقدمہ ہے کھاؤ اور پھر اللہ کا شکر بجا لاؤ کہ اللہ نے تمہیں یہ نعمت عطا کی ہے۔

۴۔ آخری جملہ یعنی ”اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾“ میں مومنین کو خطاب ہے

جو غیر خدا کی پرستش نہیں کرتے۔ کیونکہ مومنین ہی ہیں جو فقط اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ‌ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾

"تم پر صرف مردار اور خون اور سوّر کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ چیز بھی جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے پکاری گئی ہو، پھر جو بھوک کے مارے بے تاب ہو جائے نہ وہ باغی ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

کھانے پینے کی حرام چیزیں

قرآن کریم کی دوسری سورتوں میں بھی اس آیت کے مانند آیات آئی ہیں جیسے سورہ بقرہ، آیت: ۱۷۳، سورہ مائدہ آیت ۳ اور سورہ انعام آیت ۱۴۵۔ جیساکہ اس سے پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ "اَلْمَيْتَةَ" مردار اس حیوان کو کہتے ہیں جس کا تزکیہ نہ ہوا ہو اور اسے شرعی طریقے سے ذبح نہ کیا گیا ہو۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ کھانے پینے کی حرام چیزیں بنیادی طور پر یہی چار چیزیں ہیں، (۱) مردار، (۲) خون (۳) خنزیر کا گوشت (۴) وہ جسے غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ لیکن سنت نبویؐ میں کچھ اور چیزیں بھی حرام کی گئی ہیں۔ چونکہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام کی پابندی کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے جیساکہ (سورۂ حشر، آیت: ۷) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۚ

ترجمہ: "اور رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ"۔

اس کے بعد فرمایا کہ جو مجبوری کی حالت میں ضرورت کو پوری کرنے کی حد تک ان حرام کی ہوئی چیزوں کو کھائے اور اس کا مقصد بھی حدود الٰہی سے تجاوز کرنا نہ ہو تو اللہ اسے بخش دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ یہ اضطراری حکم کلی حکم ہے، اضطرار اور مجبوری کی حالت میں کوئی بھی چیز حرام نہیں رہتی، اللہ تعالیٰ نے مضطر اور مجبور شخص کے لئے ساری حرام چیزوں کو حلال قرار دے دیا ہے۔[1]

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۶﴾

"اور اپنی زبانوں سے جھوٹ بنا کر نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ پر بہتان باندھو، بے شک جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں ان کا بھلا نہ ہوگا"۔

بغیر دلیل کسی چیز کو حلال یا حرام کہنے سے منع

اس آیت میں مومنوں سے کہا جارہا ہے کہ اللہ کے دین میں بدعت نہ ڈالو، اپنی

---

[1]۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "میری امت سے نو چیزیں اٹھا لی گئی ہیں: (۱) نسیان (۲) بھول چوک، (۳) وہ جو منہ سے بول نہیں سکتے (۴) وہ جس کی طاقت نہیں رکھتے (۵) جس پر تمہیں مجبور کیا جائے (۶) خود مضطر ہوئے ہوں (۷) حسد (۸) طیرۃ (۹) جو نہیں جانتے۔

طرف سے حلال اور حرام کو دین میں داخل مت کرو۔ جو چیز وحی کے ذریعے تم تک نہیں آئی اسے رواج نہ دو؛ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنے کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کام کو معاشرے میں رواج دینا اگرچہ بدعت گذار اپنی زبان سے اسے خدا کی طرف نسبت نہ بھی دے یہ بدعت کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ قرآنی عرف میں دین ،سنت اور زندگی کی روش ہی کو کہتے ہیں۔ اور دین کلی طور پر خدا کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا کوئی بھی اپنی طرف سے نہ تو دین میں کسی چیز کا اضافہ کر سکتا ہے اور نہ ہی دین میں بیان کی گئی کسی چیز کو کم کر سکتا ہے۔ اگر کچھ بڑھائیں گے یا کم کریں گے تو یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء ہو گا؛ اگرچہ زبان اسے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہ دیں یا چپ رہیں۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

”تھوڑا سا فائدہ اٹھا لیں، اوران کے لیے دردناک عذاب ہے“۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ بدعت گذار ممکن ہے دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اٹھا لیں لیکن ان کا فائدہ بہت ہی تھوڑا اور دُنیاوی فائدہ ہے۔ آخرت میں انہیں اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنے کا دردناک عذاب ملے گا۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

”اور جو لوگ یہودی ہیں ہم نے ان پر حرام کی تھیں جو تجھے پہلے سنا چکے ہیں، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے“۔

یہودیوں پر حرام چیزیں

اس آیت میں سورۂ انعام کی آیت ۱۴۶ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جس میں اللہ

تعالیٰ نے ناخن والے جانوروں کو یہودیوں پر حرام کر لیا تھا۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ

ترجمہ: ''اور ہم نے یہود پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا تھا''۔

یہ آیت درحقیقت اس اشکال اور شبہہ احتمالی کا جواب ہے کہ اگر کوئی کہے کہ اگر حرام غذائیں یہی چار چیزیں ہیں: (۱) مردار (۲) خون (۳) خنزیر کا گوشت (۴) وہ حیوان جسے اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیا گیا ہو؛ ان کے علاوہ ساری چیزیں حلال ہیں تو جو چیزیں یہودیوں پر حرام کی گئی تھیں؛ کیا یہ ظلم اور الٰہی احکام کو نسخ کرنا نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم نے بنی اسرائیل پر کچھ چیزیں حرام کی تھیں تو یہ ان کے حق میں ظلم نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا اور پروردگار کی نافرمانی کی؛ جس کی سزا کے طور پر ہم نے بھی ان پر حلال کی ہوئی بعض چیزیں حرام کر دیں۔ جیسا کہ (سورۂ نساء آیت ۱۶۰) میں آیا ہے:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ: ''یہود کے ظلم اور راہ خدا سے بہت روکنے کے سبب بہت سی پاک چیزیں جو (پہلے) ان پر حلال تھیں ہم نے ان پر حرام کر دیں''۔

اگر وہ عصیان اور نافرمانی کے بعد توبہ کر لیتے تو خدا بھی ان سے درگزر کرتا اور جو چیزیں ان کے لئے حرام کر دی تھیں، انہیں دوبارہ ان کے لیے حلال کر دیتا۔ کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۱۹﴾

''پھر تیرا رب ان کے لیے جو جہالت سے برے کام کرتے رہے پھر اس کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور سدھر گئے، بے شک تیرا رب اس کے بعد البتہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

بخشنے والا اور مہربان اللہ

''جہل''واقعیت کے مکمل طور پر ظاہر اور واضح نہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ ان موارد میں بھی استعمال ہوتا ہے جہاں ایک شخص کلی طور پر لا علم نہیں ہوتا، کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ یا شرعی تکلیف کے بارے میں علم رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ فلاں عمل معصیت ہے لیکن نفسانی خواہشات اس پر غالب آجاتی ہیں اور اسے معصیت پر آمادہ کرتی ہیں۔ اگرچہ اسے اس عمل کے معصیت ہونے کا علم ہوتا ہے لیکن اس کی مخالفت کے خطرناک نتائج اور اس کے نتیجے میں آنے والے عذاب کے متعلق اسے علم نہیں ہے۔ یہ شخص جانتا تھا کہ یہ عمل معصیت ہے اور وہ مکلّف ہے اسی وجہ سے اس عمل پر اس کی پکڑ اور اس کا مؤاخذہ ہوگا۔ لیکن وہ اس کی حقیقت سے جاہل تھا اور وہ اس کی پوری بصیرت نہیں رکھتا تھا، اسی بنیاد پر وہ گناہ کر بیٹھتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص گناہ کی حقیقت کو جانے تو کبھی بھی اس گناہ کا مرتکب نہیں ہوگا۔

لیکن اگر کوئی شخص معصیت کے حکم یا موضوع سے جاہل ہو تو اس صورت میں اس کا عمل معصیت ہی شمار نہیں ہوتا، تاکہ اس کی توبہ اور استغفار کی ضرورت پڑے۔ اللہ تعالیٰ سابقہ آیت کے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے کہ بنی اسرائیل کو معلوم تھا کہ یہ عمل معصیت ہے اور وہ اس عمل کے گناہ ہونے کا علم رکھتے ہوئے اس کے مرتکب ہوئے اور اس گناہ پر اصرار کیا۔ مغفرت اور رحمت الٰہی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے جنہوں نے گناہ پر اصرار نہیں کیا اور جہالت کی رو سے گناہ کر بیٹھے۔ لیکن جنہوں

نے گناہ پر اصرار کیا اور ان کا گناہ جہالت کی بنا پر نہ تھا تو ان کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہے۔ کیونکہ توبہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اپنی اصلاح کرنا ہے۔ جو اپنی اصلاح کرے گا اور حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے، اس کی توبہ قبول کرے گا۔ اصلاح سے مراد توبہ پر قائم رہنا اور سنجیدہ ہونا ہے۔ اس سے خالی الفاظ مراد نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت ان کو ملتی ہے جو سچی توبہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی، حقیقی توبہ کے آثار میں سے ہیں۔[1]

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۝۱۲۰

"بے شک ابراہیم ایک پوری امت تھا[2] اللہ کا فرمانبردار تمام راہوں سے ہٹا ہوا، اور مشرکوں میں سے نہ تھا"۔

---

[1] ۔ توبہ اور استغفار کے بارے میں امیر المومنین علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: استغفار ثابت ہونے کے لئے سات چیزیں چاہئیں:

۱۔ گناہ سے حقیقی پشیمانی۔

۲۔ گناہ ترک کرنے کا پختہ ارادہ۔

۳۔ دوسروں کے ضائع کئے گئے حقوق کی ادائیگی۔

۴۔ فوت شدہ فرائض اور واجبات کو ادا کرنا۔

۵۔ جسم پر حرام غذاوں سے بنے ہوئے گوشت کو پگھلا دینا۔

۶۔ عبادات میں اپنے آپ کو اس طرح سختی اور تکلیف میں ڈالنا جس طرح اس سے پہلے معصیت کی لذتیں اٹھائی ہیں۔

۷۔ آخر میں "استغفر اللہ" کہنا۔ پھر اس کا استغفار قبول ہے۔

2۔ تفسیر روح المعانی میں امت کا معنی پیشوا بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا تعارف

''اُمَّۃً'' خدا کی عبادت کرنے والی جماعت کو کہا جاتا ہے۔ اس جگہ مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اکیلے ایک اُمت تھے۔ یہ تفسیر ابن عباس کی روایت کے مطابق ہے۔امت پیشوا اور رہبر کے معنی میں بھی ہے۔ شاید اس سے مراد یہ ہو کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے زمانے کے اکیلے توحید پرست تھے اور بڑے عرصہ تک ان کے علاوہ کوئی موحّد (توحید پرست) نہ تھا۔

''قَانِت'' عبادت کرنے والے اور عابد کو کہتے ہیں جو ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ ''حَنِیْف'' معتدل اور افراط و تفریط نہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہو گا (البتہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اللہ کی عبادت کرنے والی ایک جماعت کے قائم مقام تھے۔ کیونکہ انہوں نے اکیلے پوری ملت کا کام انجام دیا جس کا اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں سے ارادہ کیا تھا۔انہوں نے اکیلے دین اور ملت کے خبائث کو حرام شمار کیا۔جو کوئی اس پر عمل کرے اسے دنیا وآخرت کا فائدہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا انتخاب کیا، صراط مستقیم کی ہدایت دی اور دین حنیف کے وسیلہ سے ان کے اور ان کے پیروکاروں کے دنیا اور آخرت کے امور کی اصلاح فرمائی۔

ابراہیم علیہ السلام ایسے شخص تھے جو ہمیشہ اپنے رب کی اطاعت اور عبادت میں مشغول رہتے تھے اور کبھی اعتدال اور صراط مستقیم سے منحرف نہیں ہوئے۔ وہ ہرگز مشرکین کے گروہ میں سے نہیں تھے۔انہوں نے احکام الٰہی کو کبھی تبدیل نہیں کیا، غیر خدا کی کبھی عبادت نہیں کی۔ یہ عبارتیں اُمت اسلام کی اُمت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تقابل کے طور پر آئیں ہیں۔ گویا کہا گیا ہے کہ اُمت موسیٰ علیہ السلام پر ان

کے ظلم کی وجہ سے بعض طیبات حرام کی گئی تھیں لیکن اے رسول! یہ مذہب اور آئین جو تیرے اوپر اتارا ہے یہ وہی معتدل آئین اور دستور ہے جو اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام پر اتارا گیا تھا جو فطرت کے مطابق تھا؛ اور اس میں ساری پاکیزہ چیزیں حلال تھیں جبکہ پلیدیاں اور نجاسات حرام تھیں۔ اور اس پر عمل کرنے میں دنیا و آخرت کی سعادت کی ضمانت موجود ہے۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾

''اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا، اسے اللہ نے چن لیا اور اسے سیدھی راہ پر چلایا''۔

ابراہیمؑ کا شکر

''اِجْتَبَاء'' خالص کرنے اور چن لینے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اس لیے انتخاب کیا کیونکہ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر گذار تھا۔[1] اللہ تعالیٰ نے انہیں صراط مستقیم اور سیدھے اور مضبوط راستے کی ہدایت دی جس پر چلنے والا کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ اور انہیں مختلف مذاہب میں بٹ جانے سے محفوظ رکھا۔

وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ؕ

''اور ہم نے اسے دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوگا''۔

---

[1]۔ سورہ اعراف کی اس آیت '' وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ '' کے ذیل میں ہم نے وضاحت کی ہے کہ حقیقی شکر کا مطلب، عبادت میں اخلاص کا ہونا ہے۔

ابراہیمؑ کے لیے دُنیا و آخرت کی خوبی

"الدُّنۡیَا حَسَنَةً" سے اچھی اور خوشحال زندگی اور اچھا روزگار مراد ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بہت مال تھا اور وہ بہت ہی بامروّت اور وضع دار انسان تھے۔ " وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۳﴾ " کی توضیح پہلے بتائی گئی ہے کہ اس سے پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کی ذریہ (آئمہ طاہرین) مراد ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے دعا کی تھی "والحقنی بالصالحین" مجھے صالحین کے ساتھ ملحق کر دے۔ خدا وند تبارک و تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے کہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور ابراہیمؑ کو صالحین میں سے قرار دے دیا لہٰذا وہ آخرت میں صالحین کے ساتھ ہوں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ صفات دین حنیف کے نیک آثار میں سے ہیں۔ اگر انسان اس دین پر چلے گا تو اسے ہدایت اور سعادت ملے گی۔ جو دنیا میں صراط مستقیم پر چلے گا اسے دنیا و آخرت کے اچھے ثمرات ملیں گے۔ اور وہ بہشت کا مستحق ٹھہرے گا جو کہ انسان کی خلقت کی غرض اور مقصد ہے۔

ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾

"پھر ہم نے تیرے پاس وحی بھیجی کہ تمام راہوں سے ہٹنے والے ابراہیم کے دین پر چل، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا"۔

پیغمبر اکرمؐ کو ابراہیمؑ کی پیروی کا حکم

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے آپ پر وحی کی کہ آپؐ ابراہیمؑ کے آئین کی پیروی کریں جو کہ دین فطرت اور دین حنیف ہے، جس میں

شرک نہیں ہے۔ اس آیت میں بھی ان دو صفات یعنی حنیف ہونا اور مشرک نہ ہونا کو ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان دو صفات کی تاکید کی جائے اور ان پر توجہ زیادہ ہو۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾

"ہفتہ کا دن انہیں پر مقرر کیا گیا تھا جو اس میں اختلاف کرتے تھے، اور تیرا رب ان میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے"۔

یہودیوں کا رویہ

"سَبْت" کٹنے کے معنی میں ہے۔ ہفتے کے دن کو اس لئے سبت کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کو اتوار کے دن شروع کیا اور چھ دن یہ سلسلہ جاری رہا اور ساتویں دن یعنی ہفتہ کے دن خلقت کا عمل ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو حکم دیا تھا کہ ہفتے کے دن کام نہ کریں اور اس دن شکار مت کریں۔

ہفتے کے دن کی چھٹی ان کے آسائش و آرام کے لیے نہ تھی بلکہ اس کا مقصد ان سے امتحان لینا تھا جس میں وہ ناکام رہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اللہ کی طے شدہ حد کو پھلانگ گئے۔ بنی اسرائیل نے اس بارے اختلاف کیا، کچھ لوگوں نے اس قانون کو قبول کیا اور کچھ نے اس کو رَد کر دیا اور کچھ نے حیلہ اور مکاری کی اور بظاہر تو یہ کہہ دیا کہ ہم ہفتے والے دن کام نہیں کرتے لیکن حقیقی معنوں میں وہ الٰہی وحی کی پابندی نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ مچھلی پکڑنے کے لیے ہفتے کے دن پانی اپنے گڑھوں میں کھول دیتے تھے اور شام کو بند کر دیتے تھے پھر اتوار کے دن جاکر شکار کر لیتے

تھے۔اس بارے سورہ بقرہ، آیت ٦٥ اور سورہ نساء ، آیت ٤٧ میں ذکر ہوا ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے کس طرح انہیں بندر کی شکل میں مسخ کر دیا۔اس کے بعد فرمایا کہ خدا قیامت کے دن اُن کے اس اختلاف کا فیصلہ کرے گا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝١٢٥

"اپنے رب کے راستے کی طرف دانشمندی اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ، اور ان سے پسندیدہ طریقہ سے بحث کرو، بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے، اور ہدایت یافتہ کو بھی خوب جانتا ہے"۔

رب کی طرف دانشمندی سے بلانے کا حکم

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو دعوت کے تین طریقے بتائے گئے ہیں اور یہ تین طریقے وہی ہیں جن کو علم منطق میں برہان، خطابت اور جدل کہا جاتا ہے اور اس آیت میں انہیں حکمت، موعظہ اور مجادلہ کہا گیا ہے۔

"حِکْمَۃ" علم اور عقل کے ذریعے حق تک پہنچنے کو کہتے ہیں؛ یہ منطقی لحاظ سے برہان یا حجت ہے جو بغیر شک اور ابہام کے مخاطب کو حق کی ہدایت دیتا ہے اور عقلی مقدمات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق "مَوْعِظَۃ" ہے۔ موعظہ کا معنی ہوتا ہے نیک اعمال کو اس انداز میں ذکر کرنا کہ سننے والے کے دل پر اثر ہو اور اس میں رقت طاری ہو اور وہ حق کے آگے تسلیم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے

موعظہ کو حسنہ کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ موعظہ اور نصیحت کی دو قسمیں ہیں بعض مواعظ اچھے اور حسنہ ہیں اور کچھ اچھے نہیں ہیں۔ جی ہاں ! خطیب اپنے خطاب اور مواعظ کے ذریعے لوگوں کے سامنے حق کو ناحق بنا کر پیش کر سکتا ہے اور باطل کو حق بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ لیکن موعظہ حسنہ وہ ہوتا ہے جہاں پر حق کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ سننے والوں کے دلوں میں حق جگہ بنا لے اور واعظ اور خطیب خود بھی اس حق کا پابند ہو، جو واعظ خود پابند نہیں ہے اس کی بات کا اثر بھی نہیں ہے۔

"جدل" غلبہ حاصل کرنے کے لیے جھگڑنے اور بحث مباحثہ کرنے کے معنی میں ہے۔ منطقی مجادلہ ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو دشمن کو اس چیز سے دستبردار کر دیتی ہے جس پر وہ اصرار کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا مقصد حق کو ظاہر اور آشکار کرنا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن "مجادلہ احسن" جس کی قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کو سفارش کر رہا ہے اس میں دشمن سے ایسی بات کرنے سے منع کیا گیا ہے جو اس کی ہٹ دھرمی میں اضافے کا باعث بنے۔ یعنی کلام میں ایسے الفاظ اور بری تعبیر نہ ہو جو سامنے والے کے مقدسات کی توہین شمار ہوتے ہوں۔ کیونکہ اگر ان چیزوں کا خیال نہ رکھا جائے تو گویا ایک حق کو ثابت کرنے کے لیے دوسرے حق کو باطل کیا گیا ہے۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ حکمت، موعظہ اور جدل احسن کی اہمیت اور ان سے استفادہ کرنے کی ترتیب افراد کے حوالے سے مختلف ہے۔ حکمت اور برہان کی اقسام اچھی ہیں لہذا اسے سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ موعظہ کی دو قسمیں ہیں ایک قسم اچھی اور دوسری قسم بری ہے۔ لہذا موعظہ حسنہ دوسرے نمبر پر ذکر ہوا ہے اور جدل تین قسم کا ہے :برا، اچھا اور بہت اچھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے "جدال احسن" بہت زیادہ اچھے جدال کو تیسرے نمبر پر ذکر کیا ہے۔ دعوت کی ان تین قسموں میں سے کونسی قسم کہاں

استعمال کرنی چاہیے، یہ دعوت دینے والے کی ذمہ داری ہے کہ مقام، موقع اور افراد کی مناسبت سے ایسا طریقہ استعمال کرے جس سے اس کے مدمقابل کو قائل کرنے میں مدد ملے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ تمہارا پروردگار گمراہ ہونے والوں اور ہدایت پانے والوں سب کو جانتا ہے۔ لہٰذا اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہدایت دینے والے کے لیے حکمت، موعظہ حسنہ اور جدال احسن میں سے کون سی چیز دعوت دینے میں مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جانتا ہے جو گمراہ ہوئے ہیں اور مغالطہ کے ذریعے دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں اور باطل کو حق بناتے ہیں۔[1]

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

"اور اگر بدلہ لو تو اتنا بدلہ لو جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے، اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے"۔

تکلیف کے برابر بدلہ

"عقوبت" کسی عمل کے بدلے ملنے والی سزا اور عذاب کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرما رہا ہے کہ اگر تم کفار کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں اور سختیوں کا بدلہ لینا چاہو تو ان سے بدلہ لینے میں انصاف کی رعایت کرو۔ اگر انہوں نے ایمان لانے کی وجہ سے تمہیں تکلیف دی ہے، تمہارے ساتھ جنگ کی ہے، تمہیں اذیتیں دی ہیں؛ اور اب تم

---

[1]۔ مغالطہ، منطق میں بحث کرنے کا چوتھا طریقہ ہے جس میں جھوٹے مقدمات ترتیب دے کر ناحق کو حق بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے مغالطے کو رد کیا ہے اور اسے گمراہوں کا راستہ قرار دیا ہے۔

ان پر مسلط ہو گئے ہو اور ان سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو انصاف کا لحاظ رکھو؛ انہوں نے تمہارے ساتھ جیسا برتاؤ کیا ہے، ان کے ساتھ اس سے سخت اور شدید برتاؤ نہ کرو۔ لیکن اگر تم ان کی سختیوں اور اذیتوں پر صبر کرو اور اس کی تلافی نہ کرو، تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ کیونکہ تمہارا صبر حقیقت میں رضائے الٰہی کو اپنی رضا اور تشفی قلب پر ترجیح دینا ہے۔ اس صورت میں تمہارا عمل خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ عفو و درگزر کرنا جوانمردی ہے اور معاشرے پر اس کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾

"اور صبر کرو اور تیرا صبر کرنا اللہ ہی کی توفیق سے ہے، اور ان پر غم نہ کھاؤ اور ان کی مکاریوں (سازشوں) سے تنگ دل نہ ہو"۔

رسول اللہؐ کو صبر کی تلقین

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کسی کو امر کرنے اور حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ جس کو حکم دیا جارہا ہے وہ اس کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لیے حقیقت میں یہ بات رسول اللہ ﷺ کے لئے ایک بشارت ہے اور آپؐ کو سمجھایا گیا ہے کہ آپؐ کے پاس صبر کی قدرت ہے اور آپؐ نامناسب حالات میں راہ خدا میں صبر کر سکتے ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے انہیں صبر کی قدرت اور طاقت دی ہے۔ کیونکہ ہر طاقت اور قوت، رب تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

پھر فرمایا کہ ان کفار کی ہٹ دھرمی، حق کے ساتھ ان کی دشمنی اور تیری بات کو

نہ ماننے پر آپؐ غمگین نہ ہوں۔ اس مضمون کو بارہا کہا جا چکا ہے۔ آپؐ کی ذمہ داری فقط بات کو پہنچا دینا اور انہیں عذاب سے ڈرانا ہے۔ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کیونکہ حقیقی ھادی وہی ہے۔ لہٰذا پیغمبر اکرم ﷺ کو ان کے ایمان نہ لانے پر غمزدہ نہیں ہونا چاہیے۔

آخر میں فرمایا کہ اے ہمارے رسول! آپؐ ان کی سازشوں اور شرارتوں سے حوصلہ نہ ہاریں اور صبر کا دامن نہ چھوڑیں۔ نہ ابھی اور نہ ہی آئندہ، کبھی بھی ان کے عمل سے مایوس اور بے حوصلہ نہ ہوں۔ اپنی ذمہ داری کو انجام دینے میں سستی نہ کریں۔ پھر فرمایا کہ بتحقیق اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ اور نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

”بے شک اللہ ان کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں“۔

یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔ گویا رسول خدا ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ تقویٰ اور احسان، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کی نعمتوں کے حصول اور دشمنوں کی مکاریوں اور سازشوں کو باطل کرنے کا سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جملہ کے ذریعے پچھلی آیت کے آخری حصے کی علت بیان کی ہے اور گویا اپنے پیغمبرؐ کو کفار کی سازشوں کے مقابلے میں مدد اور نصرت کا وعدہ دیا ہے۔

اللہ کی توفیق پر اظہار تشکر

الحمد للہ رب العالمین۔ اللہ کا بے حساب شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق دی کہ میں خلاصہ تفسیر المیزان جلد دوم، سورہ الاعراف، آیت: ۱۵۷ کے بعد جو ترجمہ بیماری کی وجہ سے باقی رہ گیا تھا اور مکمل نہیں کر سکا تھا اس کی ریکارڈنگ آج مکمل کردی ہے۔ آج ۳ اپریل ۹ بج کر ۲۰ منٹ میں جامعۃ السیدہ خدیجۃ الکبریٰؑ مدرسہ پکی

شاہ مردان ضلع میانوالی کے دفتر میں موجود ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر انعام ہے کہ اس نے مجھے اس کتاب کے ترجمہ کو مکمل کرنے کی توفیق دی۔ میری اللہ تعالیٰ سے یہی درخواست ہے کہ اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ اور ان کی آلؑ کے صدقے میں خلاصہ تفسیر المیزان کے پورے ترجمہ کو مکمل کرنے کی میری اس کوشش کو پایہ تکمیل تک پہنچائے اور ایسے حالات پیدا کر دے کہ یہ کتاب شائع ہو اور مومنین کے استفادہ کے لئے ان کے ہاتھوں میں پہنچے۔ اس کا اجر و ثواب میرے ماں باپ اور ہر اس فرد کو پہنچے جس کا میرے اوپر کوئی نہ کوئی حق ہے؛ تعلیم کے حوالے سے، میری راہنمائی کے حوالے سے، میرے لئے حالات اور اسباب مہیا کرنے کے حوالے سے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ میری اولاد کو بھی اس تفسیر سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے۔ بالخصوص ہمارے عزیز شیخ امین صاحب، جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے کہ وہ نیک کام کر رہے ہیں اور معراج کمپنی سے سستے داموں کتاب کو چھاپ کرنے کی سہولت مہیا کر رہے ہیں۔ البتہ انہوں نے اس سے پہلے بھی بہت سارے جید علماء کرام کی کتابیں جیسے آیت اللہ شہید مطہری کی کتابیں جو اسلام شناسی کے لیے انتہائی مفید ہیں؛ کو چھاپ کیا ہے۔ اسی طرح آیت اللہ محمد تقی بہجت رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے بیانات اور ان کے ملفوظات اور ان کے بیانات کا بھی پورا سیٹ تیار کر دیا ہے۔ اس کا کریڈٹ انہی کو جاتا ہے اور انہی کو یہ توفیق ملی ہوئی ہے۔ ان کے لئے بھی ہم دعا گو ہیں کہ انشاء اللہ وہ اس سلسلے کو جاری و ساری رکھیں گے اور یہ امور ان کے لیے اور ان کے خاندان کے لیے ذخیرہ آخرت ہو۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ ہمارے ولی العصر (عج) کے ظہور میں تعجیل فرما دے! وہ ہم سے راضی رہیں۔ ہماری خطائیں معاف فرما دے! جو توفیق دے رکھی ہے اللہ اسے ہم سے واپس نہ لے۔ جو نعمات میرے اوپر ہیں جن کا میں شکر بجا

نہیں لا سکتا، کیسے بجا لاؤں؟ شکر بجالانے کے لیے بھی ایک توفیق کی ضرورت ہے جس کے لیےایک اور حمد مجھے کرنی پڑے گی جس سے میں عاجز ہوں۔ میری عاجزی کو ہی شکر قرار دیدے اور اسے میری آخرت کا ذخیرہ بنا دے اور مجھے اتنی عمر عطا کر دے کہ میں تیرے ولی (عج) کا دیدار کر سکوں اور تیرے ولی (عج) کے ناصران سے بنوں اور وہ کام کروں جو تیرے ولی (عج) کی خوشنودی کا سبب ہو اور تیرے ولی (عج) کے ظہور کی تعجیل کے اسباب فراہم کرنے میں میرا بھی حصہ ہو۔اے اللہ! مجھے تیرے ولی (عج) کے ظہور کی تعجیل کے لیے مقدمات فراہم کرنے والوں کے محبین میں سے قرار دے، ان کے مخالفین میں سے قرار نہ دے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَافِی الدُّنْیَاحَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِحَسَنَةً وَّقِنَاعَذَابَ النَّارِ۔

سورۃ الاسراء

(مکی۔آیات 111)

سورہ کے مطالب

اللہ کی وحدانیت کا بیان، شرک کی مطلقاً نفی، اللہ کی تسبیح کے اس کی حمد وثناء پر غلبے کا بیان ، اللہ کے بیان کا غلبہ ، بنی اسرائیل کے حالات و واقعات ، بنی اسرائیل کا عروج و زوال ، معراج کا بیان، اسلامی عقائد اور مختلف احکام کا بیان۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾

"وہ پاک ہے جس نے راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی جس کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

سبحان

لفظِ سبحان مصدر ہے جس کا اصل مادہ "تسبیح" ہے یعنی اللہ کی ذات اس سے پاک و منزہ ہے کہ اس کا شریک قرار دیا جائے، اس میں نہ کوئی نقص ہے اور نہ ہی اس کا کوئی شریک ہے، وہ کمالِ مطلق ہے۔

اسراء

اسراء کا معنی "رات کے وقت سفر کرنا" ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب کو معراج کا سفر رات میں کروایا گیا اور اس سفر کا آغاز اور اختتام رات کے وقت ہوا۔ اس کے بعد لفظ "لَیۡلًا" (رات) کا استعمال مزید تاکید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

مسجد الاقصیٰ

اس سے مراد بیت المقدس ہے؛ چونکہ حضور پاکؐ مکہ میں رہتے تھے اور بیت المقدس مکہ سے بہت زیادہ مسافت پر تھا اس لیے بیت المقدس کو مسجد الاقصیٰ (دور ترین مسجد) کا نام دیا ہے۔

معراج کی غرض

اس جملہ (لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ) سے معراج کے سفر کی غرض وغایت کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ سب اس لیے تھا تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں اور اپنی عظمت کے آثار کو اپنے حبیب مصطفیؐ کے لیے نمایاں فرمائے، اور ان نشانیوں کو دکھلانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آواز سنتا ہے، ان کی پکار سے آگاہ ہے اور ان کے حالات کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب کی خواہش اور آرزو کا علم تھا کہ رسولؐ کی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنی عظمت کے تمام آثار اور نشانیوں کا مشاہدہ کروائے؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رات کے وقت ایک سفر کا اہتمام فرمایا جس میں اپنی عظمت کی نشانیوں کو اپنے حبیبؐ پر نمایاں کیا۔

جسمانی معراج

اس آیت میں واضح اشارہ موجود ہے کہ معراج جسمانی اور روحانی دونوں تھی۔ ایک رات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو ان کے جسم کے ساتھ سفر کروایا۔ اس سفر کا آغاز مسجد الحرام سے ہوا، اور اس کا دوسرا پڑاؤ مسجد الاقصیٰ بیت المقدس تھا، وہاں سے پھر اگلا سفر شروع ہوا۔ حضرت جبرائیلؑ آپؐ کے ہمراہ تھے۔ تیز رفتار سواری (براق) پر آپؐ کا سفر شروع ہوا، مسجد الاقصیٰ سے مسجد کوفہ عراق گئے اور پھر وہاں سے آپ کو آسمانوں کی طرف لے جایا گیا؛ آپ اُس مقام تک پہنچے کہ جس سے آگے حضرت جبرئیلؑ بھی نہ جاسکتے تھے،[1] اسی لیے آپؐ اکیلے آگے تشریف لے گئے۔ روایات و تفاسیر میں پیغمبر اکرمؐ کی اس کرامت کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے؛[2] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بلاشبہ معراج پر گئے، آسمانوں کی سیر کی،

1۔ ''لو دنوتُ انملة لاحترقتُ''۔

2۔ تفسیر قمی، جلد ۱، ۲، ابن ابی عمیر کی ہشام بن سالم کے ذریعہ امام صادقؑ سے روایت؛ اور دیگر تفسیری اور روائی کتب۔

انبیاء، عرش، سدرۃ المنتھی اور جنت و جہنم کو دیکھا، بہشتیوں اور جہنمیوں کے حالات (اللہ تعالیٰ کے انعامات اور پروردگار کی سزاؤں کی کیفیت) کا مشاہدہ کیا۔ اس بارے میں نقل ہونے والی تمام روایات ایک غیر مادی معاملہ کو تمثیلی طریقہ سے اس طرح بیان کرنے کے درپے ہیں کہ جسے دوسرے لوگ محسوس کر سکیں۔[1]

وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ؕ﴿۲﴾

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔"

الکتاب

یہاں کتاب سے مراد توریت ہے۔ بطور کلی اس سے مراد آسمانی کتاب یا وہ تحریر شدہ مواد ہے جو اللہ کی طرف سے اپنے انبیاء کو دیا جاتا ہے جس میں لوگوں کے لیے تمام قوانین لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس میں اعتقادی، نظریاتی، علمی، اخلاقی سب احکام موجود ہوتے ہیں۔ جن کی مدد سے لوگوں کے اختلافات کو دور کیا جاتا ہے۔

کتاب وسیلہ ہدایت

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ کتاب بنواسرائیل کے لیے راہنمائی اور ہدایت کا وسیلہ تھی، اس کے ذریعہ لوگوں کو الٰہی قوانین اور شریعت کے ضابطوں سے آگاہ کیا گیا۔ لوگ اس سے راہنمائی حاصل کرتے تھے اور اس پر عقیدہ رکھتے ہوئے اس کی روشنی میں اعمال بجا

---

[1]۔ "رسالہ معراجیہ" تالیف: مرحوم آیت اللہ رفیعی قزوینی)

لاتے تھے۔ لوگوں نے حق کے مطابق عمل کیا اور اپنے لیے دُنیا اور آخرت کی سعادت و کامیابی کو حاصل کیا۔

کتاب بھیجنے کا ہدف

اس کتاب کو بھیجنے کا ہدف یہ تھا کہ لوگ اللہ کے سوا کسی کو اپنا وکیل نہ بنائیں۔ یعنی اس کتاب میں جو معارف موجود ہیں اور جن کی طرف یہ کتاب لوگوں کو ہدایت کرتی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور یہ کہ وہ اللہ کے سوا کسی پر اعتماد و بھروسہ نہ کریں اور اپنے تمام اُمور اور معاملات میں اللہ کے سوا کسی کو وکیل نہ قرار دیں۔

وکیل سے مراد

وکیل وہ ہوتا ہے جو اپنے موکل کے تمام ضروری امور کی اصلاح کرتا ہے اور اس کی حاجات کو پورا کرتا ہے، اس کے سارے مسائل کا حل پیش کرتا ہے، جبکہ یہ لیاقت اور صلاحیت بدرجہ اتم اللہ کے سوا کسی اور کے پاس موجود نہیں ہے لہٰذا یہودیت کے سربراہوں اور حکمرانوں کو اپنا وکیل قرار دینا اس لحاظ سے کہ وہ ان لوگوں کے مسائل کو حل کر دیں گے یا انہیں کچھ فائدہ دیں گے تو ایسا خیال اور سوچ اللہ کا شریک قرار دینا ہے جس سے عوام کو بچنا چاہیے اور یہ غلط سوچ اپنے اذہان سے نکال دینی چاہیے۔

پیغام: ہر شخص کو اپنے تمام معاملات اللہ تعالی کے سپرد کر دینے چاہئیں، اللہ ہی کارساز ہے اور وہی اپنے بندوں کا بہترین وکیل ہے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③

"اے ان کی نسل جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، بے شک وہ شکر گزار بندہ تھا۔"

ذریت

ذریت سے مراد انسان کے چھوٹے بچے ہیں چاہے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں؛ یہ لفظ اولاد پر بولا جاتا ہے۔

نوحؑ کی کشتی

عذابِ نوحؑ کے بعد جتنے بھی انسان پھیلے وہ سب اُنہی لوگوں کی اولاد تھے جو حضرت نوحؑ کے ساتھ اُن کی کشتی پر سوار ہوئے تھے اور جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے نجات کا وعدہ کیا تھا۔ یہ خوبصورت وعدہ الٰہی تھا جو پورا ہوا اور وہ لوگ غرق ہونے سے بچ گئے۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے سورہ ہود آیت ۴۸ میں اس طرح خطاب فرمایا:

''اے نوحؑ! کشتی سے اتر آؤ کہ ہماری سلامتی، ہماری برکات اور ہماری خیرات تیرے لیے ہے اور ان اُمتوں کے لیے بھی جو تیرے ساتھ کشتی میں سوار ہیں۔''

یہ وہی افراد تھے جنہیں اللہ کی توحید کے بارے دعوت دی گئی تھی۔ حضرت نوحؑ کے بعد اُن کے آئین اور شریعت کی پیروی کرنے والوں کو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ دعوت دی گئی اور انہوں نے راہ ہدایت کو پایا تھا۔

وفائے عہد

حضرت موسیٰؑ پر جو کتاب اُتاری گئی اور بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا سامان مہیا کیا گیا؛ یہ در حقیقت اس وعدہ کو پورا کیا گیا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار لوگوں سے کیا تھا اور اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ حضرت نوحؑ اللہ کے اطاعت گزار اور شکر گذار بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی کے سواروں کے لیے کہا تھا کہ اللہ کی برکات و خیرات تمہارے لیے ہیں۔ بنی اسرائیل بھی انہی کی اولاد و ذریت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے ذریعہ کتاب اتاری کہ انہیں ہدایت دے اور توحید پرستی پر قائم رکھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت و روش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں توحید کی دعوت اپنے بندے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دی تاکہ وہ بھٹکنے سے بچ جائیں اور گمراہ نہ ہوں۔ یہ اللہ کا حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار لوگوں کی اولاد پر بڑا احسان و فضل ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلادی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی کروگے اور بڑی سرکشی کروگے"۔

اللہ کا حتمی فیصلہ

قضاو قدر کا معنی اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کے بارے پلان اور منصوبہ بندی ہے۔ بنی اسرائیل کو توریت میں یہ یقینی خبر دی گئی ہے اور اُنہیں خبر دی گئی ہے کہ تم لوگ بہت جلد (اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے) زمین پر (فلسطین اور اس سرزمین کے اطراف میں) فساد اور بدامنی پھیلاؤگے، اور یکے بعد دیگرے دو مرحلوں میں اس فساد کے مرتکب ہو گے؛[1] اور سرکشی کرتے ہوئے تکبر کے ساتھ زمین میں ظلم و ستم انجام دوگے۔

---

[1]۔ روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کا پہلا فساد، حضرت شعیبؑ کے قتل کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا فساد حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کے قتل کی طرف اشارہ ہے۔ جبکہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ایک روایت میں اُمتِ اسلامیہ کے حوادث و واقعات کی بنی اسرائیل کی امت کے ساتھ مطابقت و مشابہت کو عیاں کرتے ہوئے فرمایا: دو فساد اُمت اسلامیہ نے کیے ہیں؛ پہلا فساد حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے قتل پر ہوا اور دوسرا بڑا فساد اُمت مسلمہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے قتل پر ہوا؛ پہلا انتقام ان فسادی مسلمانوں سے مختار ثقفی کے قیام کے ذریعہ لیا گیا اور دوسرا بڑا انتقام جو تمام فسادیوں سے لیا جائے گا وہ حضرت امام مہدی (عج) کے قیام سے ہوگا۔ یہ اس آیت کی تاویل ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵

''پھر جب پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے بھیجے پھر وہ تمہارے گھروں میں گھس گئے، اور اللہ کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا۔''

بنی اسرائیل کا فساد

ان آیات میں بنی اسرائیل کی طرف سے اللہ کی نافرمانیاں اور زمین پر ان کے فتنہ و فساد کو بیان کیا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل تمہارے لیے ہدایت کا سامان مہیا کیا گیا، تمہیں کتابِ ہدایت دی گئی، تمہارے پاس ہدایت دینے والے ہمارے نمائندے بھیجے گئے؛ لیکن تم نے اس زمین میں دو بڑے فساد بپا کیے۔ ہم نے تم سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم فساد کروگے اور ہم تمہیں ان کی سزا دیں گے۔ تمہارے دونوں فسادات پر تم سے انتقام لیا گیا، تم نے پہلی مرتبہ جو فساد کیا ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی، تکبر و بڑائی کا مظاہرہ کیا تو ہم نے تم سے اس کا بدلہ لیا اور طاقتور جنگجوؤں نے تمہارے اوپر چڑھائی کی اور تمہیں تہس نہس کرکے رکھ دیا۔

بنی اسرائیل پر پہلا حملہ بخت النصر کی افواج نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ بعض دفعہ ظالموں سے ظالموں کے ذریعہ انتقام لیتا ہے؛ چنانچہ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح ہوا کہ بخت النصر والوں نے انہیں ذلیل و خوار کیا، ان کا قتل عام کیا ان کی عورتوں، بچوں کو قیدی بنایا، ان کو گھروں سے نکال نکال کر مارا۔ یہ الٰہی وعدہ تھا کہ جس سے فرار ممکن نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حتمی ہے جس میں ردوبدل نہیں ہوتا۔

ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ۝۶

”پھر ہم نے تمہیں دشمنوں پر غلبہ دیا اور تمہیں مال اور اولاد میں ترقی دی اور تمہیں بڑی جماعت والا بنا دیا۔“

بنی اسرائیل کا دوبارہ اقتدار

(اَلْكَرَّةَ) سے مراد پلٹنا اور حکومت ہے اور (نَفِيْرًا) سے مراد افراد اور مَردوں کی تعداد ہے۔ (گویا بنی اسرائیل کو ان کے فتنہ و فساد کا جواب دیا گیا ہے کہ ان کو سزا ملی، ان کی حکومت ختم ہو گئی اور وہ دربدر ہو گئے)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری دربدری کے بعد ہم نے ایک دفعہ پھر تمہیں مواقع فراہم کیے اور تمہاری حکومت کے اسباب مہیا کیے، تمہیں بہت مال دیا گیا، تمہاری اولاد اور مردوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ اس طرح تمہارے پاس بڑی تعداد میں جنگجوؤں کی تعداد آ گئی۔ اس طرح تم نے اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل کر لیا اور تمہاری حکومت ایک دفعہ پھر قائم ہو گئی۔ یہ ایک واقعاتی امر ہے جس سے مسلمانوں کو آگہی دی گئی ہے اور مسلمانوں کے درمیان موجود یہودیوں کو ان کے سابقہ حالات و واقعات یاد دلائے گئے ہیں اور اللہ نے ان پر جو احسانات و انعامات کیے اور ان کی طرف سے جس طرح عہد شکنی ہوتی رہی اسے بھی بیان کیا گیا ہے۔

إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ﴿٧﴾

”اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے ہی لیے کی، اور اگر برائی کی تو وہ بھی اپنے ہی لیے کی، پھر جب دوسرا وعدہ آیا تاکہ تمہارے چہروں پر رسوائی پھیر دیں گے اور مسجد میں

گھس جائیں گے جس طرح پہلی بار گھس گئے تھے اور جس چیز پر قابو پائیں اس کا ستیاناس کر دیں۔"

بنی اسرائیل کی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کا سبب

اس آیت میں پچھلی بات کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اے بنی اسرائیل تمہاری حکومت دوبارہ اس لیے قائم ہوئی کہ تم نے کفر سے توبہ کی، اللہ کے احکام کی پیروی کی، فتنہ و فساد کی روش ترک کر دی، تم لوگ نیک بن گئے تو اس کا فائدہ تمہیں یہ ملا کہ تمہیں دوبارہ اقتدار مل گیا۔ لہٰذا فرمایا کہ اگر تم اچھا کام کرتے ہو تو اس کا فائدہ خود تمہیں ہی ہوتا ہے اور اگر برا کرو گے تو اس برائی کا برا انجام بھی خود تمہارے لیے ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے یہ الٰہی قانون ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اچھائی کا بدلہ اچھائی، برائی کا بدلہ برائی۔

چنانچہ سورہ زلزال آیت ۸ میں ہے:

"جو شخص رائی کے ذرہ برابر نیک کام کرے گا تو اپنے اس نیک عمل (کا نتیجہ) دیکھے گا اور جو برا عمل کرے گا تو اس برائی (کا نتیجہ) دیکھے گا۔

بنی اسرائیل کا دوسرا فساد

پھر فرمایا: اے بنی اسرائیل! جب تم نے دوسری مرتبہ فساد کیا اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی میں حد سے بڑھ گے تو پھر ہمارے دوسرے وعدہ کے پورا ہونے کا وقت ہو گیا؛ اور ہم اپنے انہیں طاقتور بندوں کو اٹھائیں گے تاکہ ذلت و رسوائی اور غلامی کی بنا پر تمہارے چہروں پر غم و اندوہ کے آثار نمایاں کریں؛ تمہاری اولاد اور تمہارے مردوں کو قتل کریں اور پہلی مرتبہ کی طرح مسجد اقصیٰ میں داخل ہوں اور لوگوں کو قتل کریں، اموال جلا ڈالیں، گھروں کو تباہ اور شہروں کو ویران کر دیں۔ یہ سب کچھ اُن ناپسند اعمال کی وجہ سے ہوا جن کے وہ لوگ مرتکب ہوئے اور اللہ تعالیٰ اس طرح مجرموں سے انتقام لیتا ہے۔ (شاید یہ اشارہ ہے

جب مسلمان افواج بیت المقدس میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوئیں اور بنی اسرائیل کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا)

عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَ جَعَلۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ﴿۸﴾

" تمہارا رب قریب ہے کہ تم پر رحم کرے، اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے، اور ہم نے دوزخ کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے۔"

بنی اسرائیل کے لیے اُمید کی ایک کرن

اس آیت میں (گویا بنی اسرائیل کو اُمید کی ایک کرن دکھاتے ہوئے) فرمایا ہے کہ الٰہی انتقام اور دوسرے وعدے کے بعد اگر تم نے توبہ کرتے ہوئے نیکی اور عملِ صالح کی طرف رجوع کرو (یعنی اگر تم نے نیک کام کیے، ظلم سے رُک گئے، فساد چھوڑ دیا) تو اللہ پھر تم پر رحم کردے گا اور اگر تم نے پھر بھی فساد کیا تو اللہ کا انتقام دوبارہ تمہارے لیے تیار ہے اور (چونکہ فساد فی الارض کی سزا بہت سخت ہے لہٰذا) کافروں کو جہنم میں محبوس کیا جائے گا جس سے وہ فرار نہیں کرسکیں گے۔

بنی اسرائیل کی موجودہ حکومت جو فلسطین کی سرزمین پر موجود ہے اُن (یہود) کے پاس مال بھی ہے، اقتدار بھی ہے، حمایتی بھی ہیں، ان کی تعداد بھی بہت ہے اور ان کا فساد بھی جاری ہے، پوری دُنیا کو بے امن کر رکھا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کا آخری انتقام بنی اسرائیل سے ہوگا کہ ان کا نام تک باقی نہ رہے گا اور تیسرا انتقام حضرت امام مہدی (عج) کے ناصران کے ذریعہ گا اور حضرت امام مہدی (عج) مسجد اقصیٰ میں فاتحانہ انداز سے آئیں گے اور یہودیوں کا روئے زمین سے خاتمہ ہوگا۔ یہ انتقام بہت جلد ہونے والا ہے، اس کی وجہ خود بنی اسرائیل

یعنی۔ ان کا کفر اور ان کا فساد ہو گا (مترجم)۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹

"بے شک یہ قرآن وہ راہ بتاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے اور ایمان والوں کو جو نیک کام کرتے ہیں اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا ثواب ہے۔"

قرآن کی خصوصیت

قرآن ایسی کتاب ہے جو لوگوں کو دین کی ہدایت دیتی ہے؛ یہ دین بندوں کے اُخروی اور دُنیاوی حالات کی اصلاح کرتا ہے، دُنیاو آخرت کی سعادت کی ضمانت دیتا ہے۔ چونکہ یہ دین انسانی فطرت کے عین مطابق قانون سازی کرتا ہے۔ گذشتہ شریعتیں انسانی مفادات کے صرف بعض حصوں کو پورا کرتی تھیں لیکن شریعتِ اسلام میں تمام بھلائیوں اور انسانی مفادات کو مدنظر رکھا گیا ہے اور کسی بھلائی کو نظرانداز نہیں کیا گیا؛ اسی لیے تمام شریعتوں سے زیادہ مضبوط واستوار ہے اور سب سے کامل ترین خدائی دین ہے جو انسانی ضروریات کے تمام قوانین کو ابدی نظام کے طور پر پیش کرتا ہے اور جس میں کسی ضروری چیز کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ (یہیں سے دینِ اسلام کی اہمیت وجامعیت واضح ہوتی ہے)

قرآن کا وعدہ

چنانچہ قرآن مجید خدا کی طرف سے مومنوں کے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ جو بھی نیک عمل کرے گا اس کے عقیدہ اور عمل کی اچھائی اور خوبصورتی کا اللہ کی طرف سے بڑا اجر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ فصلت کی آیت ۸ میں فرمایا:

"بتحقیق جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک اعمال بجالائے تو ان کے لیے

بے حساب اجر و ثواب ہے"۔

جیسا کہ پہلے وضاحت کی ہے کہ جو لوگ عمل اور عقیدہ کے مرحلہ میں استوار اور برحق ہوں تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں بہشت کی طرف ہدایت کرتا ہے اور جو لوگ عقیدہ اور عمل میں کافر ہوں اللہ کی جانب سے ان کی سزا اقرار دی گئی ہے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے؛ لیکن جن مومنوں کے لیے (عقیدہ اور عمل میں سے) کوئی ایک رکن مفقود ہو اور عقیدہ یا عمل کے سلسلہ میں مشکل میں گرفتار ہوں تو اُن کی کیفیت حتمی نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کا معاملہ توبہ اور شفاعت سے مربوط ہے۔

اسی حوالہ سے سورہ توبہ آیت ۱۰۶ میں ہے:

"کچھ اور ہیں جو اللہ کے امر سے امید لگائے بیٹھے ہیں یا تو ان کو عذاب دیا جائے گا یا ان کی غلطیوں اور گناہوں سے درگذر کر دیا جائے گا۔"

وَّ اَنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ اَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۰﴾

"اور یہ بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔"

عمل صالح بجالانے والے

قرآن مجید نے نیک عمل بجالانے والے مومنین کو بڑے اجر کی نوید سنائی ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اگر کافروں کے عذاب کی خبر کو مومنین کے لیے بشارت قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کافروں پر عذاب اُن سے الٰہی انتقام ہے جس کے ذریعہ مومنوں کے دلوں پر موجود زخم پر مرہم رکھی گئی ہے اور اُس کی خوشی اور سرور کا باعث ہے (کیونکہ وہ لوگ اللہ کا انکار کرکے، مومنوں کو دُکھ پہنچاتے ہیں)۔

آخرت پر ایمان کی اہمیت

کافروں کی مختلف صفات میں سے صرف آخرت پر ایمان نہ لانے کو ذکر کیا گیا ہے، (کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے لہٰذا فقط آخرت پر ایمان نہ لانا کافروں کا بڑا جرم قرار دیا ہے) جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمام مفاسد کی جڑ، آخرت کو فراموش کرنا اور اس سے غافل ہونا ہے۔ نیز یہ کہ قیامت کے انکار کے بعد اللہ کے مضبوط دین کا اثر باقی نہیں رہتا، اگرچہ معاد کا انکار کرنے والا نبوت یا توحید یا دوسرے حقیقی اسلامی معارف کا قائل ہو۔[1]

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾

"اور انسان برائی مانگتا ہے جس طرح وہ بھلائی مانگتا ہے، اور انسان جلد باز ہے۔"

انسان کی کمزوری

انسان اپنی جہالت اور جلد بازی کی وجہ سے صبر و حوصلہ سے کام نہیں لیتا لہٰذا جب کوئی اقدام کرنا چاہتا ہے تو اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے اور نتیجہ سے متعلق غور و فکر نہیں کرتا تاکہ وہ ہمیشہ بھلائی کو پائے، بلکہ وہ جس کام کے ظاہر کو فائدہ مند دیکھتا ہے اسے انجام دینے میں جلدی کرتا اگرچہ وہی کام (جسے وہ اپنے لیے خیر اور بہتری سمجھ رہا تھا) اس کے واسطے شر اور برائی میں بدل جائے جس کا نتیجہ سوائے خسارہ اور نقصان کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، (چنانچہ اس کی ساری محنت و مشقت ضائع ہو جاتی ہے؛ پس انسان میں کمزوری ہے کہ وہ جلد باز ہے)۔

---

[1]۔ (کیونکہ آخرت کا انکار حقیقت میں باقی تمام عقائد کا انکار ہو جاتا ہے اگرچہ وہ شخص اس کا اظہار نہ بھی کرے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کافروں کے بارے فرمایا کہ انہوں نے آخرت (معاد) کا انکار کیا ہے ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے)۔

انسان کی بہتری

انسان کے لیے اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ کائنات میں موجود حوادث اور حالات و واقعات میں خیر و شر دونوں ملے ہوئے ہیں؛ لہٰذا یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ شر کو پہچانے اور اس سے دور رہے، خیر کو پہچانے اور اسے حاصل کرے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیات میں فرمایا ہے:

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ رات (شر) کو ختم کرتا ہے اور دن کو (خیر) روشن ظاہر کرتا ہے“۔

جس طرح اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی کا خاتمہ کرتا ہے اور روشن دن کو لے آتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ شر کو مٹاتا ہے اور اس کی جگہ خیر کو لے آتا ہے۔

انسان کو تنبیہ

اس آیت اور بعد والی آیت میں انسان کی سرزنش کی گئی ہے کہ وہ مضبوط الٰہی دین کی قدر نہیں سمجھتا اور جس طرح اُسے خیر کی تلاش میں رہنا چاہیے اُسی طرح (جلد بازی کی وجہ سے) شر اور شقاوت کے پیچھے چلا جاتا ہے۔

واضح رہے اس جگہ انسان سے مراد کچھ خاص افراد نہیں ہیں بلکہ نوعِ انسانی مراد ہے (کیونکہ افراد میں غور و فکر سے کام کرنے والے سنجیدہ اور دُور اندیش بھی موجود ہیں اور جلد باز، جاہل، بغیر سوچے سمجھے کام کرنے والے افراد بھی موجود ہیں)۔

اور انسان کے جلد باز ہونے سے مراد اُس کی لجاجت یا عذاب کی درخواست نہیں ہے یہ ہے کہ انسان میں یہ رغبت پائی جاتی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے جلد انجام پائے (اور اسے کام کا نتیجہ جلدی ملے جو کہ انسان کی کمزوری ہے جسے دور کرنے کے لیے الٰہی ہدایات وفرامین پر عمل کرنا ہوگا)۔

وَ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیۡنِ فَمَحَوۡنَاۤ اٰیَةَ الَّیۡلِ وَ جَعَلۡنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبۡصِرَةً لِّتَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَ الۡحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیۡءٍ فَصَّلۡنٰهُ تَفۡصِیۡلًا ﴿۱۲﴾

"اور ہم نے رات اور دن کے دو نمونے بنا دیے، پھر رات کے نمونے کو دھندلا کر دیا اور دن کا نمونہ نظر آنے کے لیے روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلو، اور ہم نے ہر چیز کی تفصیل کر دی۔"

دن اور رات اللہ کی نشانیاں

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے دن رات اور تاریکی و نور کو یوں خلق کیا کہ ہماری قدرت کی ایک نشانی رہیں (تاریکی کو رات سے تعبیر کیا ہے اور دن کو نور سے)۔ اور تمام موجودات اپنے وجود کے اعتبار سے اپنے خالق پر دلالت کرتی ہیں؛ پھر رات کو تاریک اور آنکھوں سے اوجھل قرار دیا اور دن کو روشن و نورانی بنایا تاکہ اپنے پروردگار کی جانب سے عطا کیے جانے والے رزق و روزی کمانے میں مصروف ہو جاؤ؛ نیز اس لیے کہ اوقات اور سالوں کا حساب رکھو، کیونکہ اگر دن رات ایکدوسرے کے پیچھے نہ ہوتے اور نور و ظلمت کے اعتبار سے فرق نہ رکھتے تو انسان کے لیے زمانے کا حساب رکھنا ممکن نہ ہوتا۔

(دن کا بیان روزی تلاش کرنے کے لیے ہے اور رات آرام کے لیے ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے اور عطیہ الٰہی ہے اپنے بندوں کے لیے۔ رات اور دن کا بڑا مربوط اور مستحکم نظام ہے اس سے شماریات کا علم بنتا ہے کہ انسان اپنا حساب رکھتا ہے۔ دن رات سے ہفتہ، مہینہ اور سال کا حساب بنتا ہے۔ زندگی کا پورا نظام اسی سے ترتیب پاتا ہے۔ اگر رات اور دن

ایک دوسرے کے پیچھے نہ آتے اور ان میں فرق نہ ہوتا تو کام کا حساب ناممکن ہو جاتا اور روزی کمانے میں دشواری ہوتی۔ معیشت کا نظام نہ چل پاتا۔ انسان اپنے اوقات کا حساب نہ رکھ سکتا۔) مترجم

زمین کی اپنے گرد وضعی حرکت سے دن اور رات وجود میں آتے ہیں، اور اسی زمین کی سورج کے گرد ارتقائی حرکت سے موسم اور سال کی فصول وجود میں آتی ہیں جو دنوں، مہینوں اور سالوں کو شمار کرنے اور اس کا حساب رکھنے کا سبب بنتے ہیں۔

آخر میں بیان فرمایا کہ یہ سب اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہر امر کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی خلقت میں کوئی ابہام و پیچیدگی نہیں ہے اور تمام موجودات ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

(گویا اللہ تعالی نے ہر امر کو واضح طور پر بیان کیا ہے، اور تمام مخلوقات جدا بھی ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہیں، ہر موجود اپنے ہدف کو پورا کر رہا ہے۔ تمام مخلوقات کا ایک مربوط اور منظّم سسٹم ہے، کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ کی پہچان ہے۔ دن اور رات ایسی نشانی ہے جو انسان کو اللہ تک پہنچاتی ہے جسے ہر شخص محسوس و مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی وابہام نہیں ہے)۔ مترجم

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳

”اور ہم نے ہر آدمی کا نامۂ اعمال اس کی گردن کے ساتھ لگا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال نکال کر سامنے کر دیں گے۔“

طائر اور انسان کا عمل

اس کا معنی پرندہ ہے۔ عربوں میں ایسا تھا کہ اگر پرندہ دائیں جانب اڑ جائے تو اسے

نیک فال قرار دیا جاتا اور اگر بائیں جانب اڑ جائے تو اسے بری فال قرار دیا جاتا۔

چونکہ انسان کا عمل ہی اس کی سعادت و نیک بختی یا شقاوت و بد بختی کا باعث بنتا ہے اسی مناسبت سے قرآن مجید میں انسان کے عمل کو طائر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی مشیت اس پر قائم ہوئی ہے کہ جو چیز انسان کی سعادت یا بد بختی کا باعث ہے وہ ہمیشہ انسان کے ساتھ ہو اور گلوبند کی طرح اس کی گردن میں موجود رہے؛ چونکہ گردن انسان کا ایسا عضو ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں رہتا اور گردن کی جدائی اس کی موت ہے؛ اور انسان کی یہ تقدیر اس کا عمل ہی ہے۔

سورہ نجم آیت ۴۱ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''انسان کے لیے اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں مگر وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی ہے''۔

پس کسی بھی شخص کے پاس عمل کے سوا کوئی اور سرمایہ نہیں ہے؛ لہٰذا اطاعت الٰہی اور نیک عمل ہی انسان کے لیے بہشت کا ضامن ہے اور گناہ و نافرمانی آتشِ جہنم کا موجب ہے۔

یہ تحریر شدہ اعمال نامہ قیامت کے دن کھول کر انسان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس کتاب کی خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ یہ کتاب انسان کے اپنے ہی اعمال کا حقائق نامہ ہو گی۔

۲۔ اس کتاب میں انسان کا کوئی معمولی سا عمل بھی کم نہیں ہو گا، (قلم قدرت سے ہر عمل اس میں درج ہو گا)۔

۳۔ اس میں کچھ بھی ابہام و پیچیدگی نہیں ہے اور کسی کے لیے کوئی عذر و بہانہ موجود نہ ہو گا اور کوئی اپنے عمل کی نفی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو گا، اور مکمل طور پر انسان کے لیے کھلی اور واضح کتاب ہو گی۔

۴۔ یہ ایسی کتاب ہو گی جس میں اعمال کے حقائق موجود ہوں گے اور اعمال کے اچھے

یا برے نتائج بھی درج ہوں گے، لہٰذا یہ کتاب عام کتابوں کی مانند نہ ہو گی۔ اس بنا پر کتاب اور طائر، دونوں سے مراد انسان کے نیک اور برے اعمال ہیں۔

دوسری جگہ بھی قرآن مجید میں اس حوالے سے ذکر موجود ہے جیسا کہ سورہ کہف آیت ۴۹ میں ہے:

ترجمہ: ''یہ کیسا نامۂ اعمال ہے؟ اس نے کسی چھوٹی اور بڑی بات کو نہیں چھوڑا (بلکہ) سب کو درج کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ ان سب کو حاضر پائیں گے۔''

چونکہ کسی چیز کے اثبات کے لیے اس کے مشاہدہ سے بہتر اور کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا قیامت کے دن اپنے اعمال نامہ کو دیکھنے کے بعد انسان کے پاس کوئی عذر اور بہانہ موجود نہ رہے گا جسے وہ پیش کرکے خود کو اپنے اعمال کے نتائج سے بچا سکے۔

اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا ؕ‏ ﴿۱۴﴾

''اپنا نامہ اعمال پڑھ لے، آج اپنا حساب لینے کے لیے تو ہی کافی ہے۔''

قیامت کے دن اعمال نامہ

اس آیت کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اعمال نامہ ایک ایسی حتمی دلیل اور ثبوت ہو گا کہ اس کو پڑھنے والا اس میں درج شدہ مطالب کا انکار نہ کر سکے گا کیونکہ گناہگار شخص اسی طرح نیک اعمال بجالانے والا اپنے عمل کو بعینہٖ مشاہدہ کرے گا تو اس کے انکار کی گنجائش موجود نہ ہو گی۔ اس کا بدلہ یا سزا بھی خود وہی عمل ہے۔ اسی مطلب کو سورہ تحریم آیت ۷ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ترجمہ: ''آج تم بہانہ و معذرت نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارا بدلہ وہی ہے جو تمہارا عمل ہے۔''

ان آیات کا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو امت کی ہدایت کے لیے مضبوط ترین

ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو ہدایت پا جائے تو وہ اپنے نیک عقیدہ اور عمل صالح کے نتیجہ کو مشاہدہ کرے گا اور جو گمراہ ہوگا تو وہ اپنے برے اعمال اور فاسد عقائد کا نتیجہ دیکھے گا لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرے بلکہ اپنے تمام اعمال اور خواہشات کو اللہ کے قوانین کے تابع بنائے، اپنی خواہشات پر عمل کرنے میں جلدی نہ کرے بلکہ ہر عمل کرنے سے پہلے وہ سوچ و بچار سے کام لے تاکہ اس عمل کے اچھے یا برے ہونے کا پتہ چل جائے، خیر کا انتخاب کرے اور شر کو چھوڑ دے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

"جو سیدھے راستے پر چلا تو اپنے ہی لیے چلا، اور جو بھٹک گیا تو بھٹکنے کا نقصان بھی وہی اٹھائے گا، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور ہم سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔"

ہدایت و گمراہی کا نتیجہ

ہدایت یا گمراہی کے نتیجہ کا تعلق خود آدمی سے ہے اور اس کی سعادت یا بدبختی خود انسان کے اپنے دامن گیر ہوگی۔ ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے اور ہر ایک کے عمل کا بوجھ خود اسی کو ہی اٹھانا پڑے گا جس کا عمل ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جیسے گناہگاروں کا خیال ہے کہ گناہوں کا بوجھ اپنے پیشواؤں اور لیڈروں کے سر ہوگا اور وہ اپنا گناہ اپنے آباء و اجداد پر نہیں ڈال سکتے؛ البتہ جو آئمہ کفر ہیں اور جنہوں نے کفر کو پھیلایا اور اسے تقویت دی تو انہیں اپنے پیروکاروں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا کہ ان کی وجہ سے دوسرے لوگ گمراہ ہوئے۔ چنانچہ گمراہ

پیشوا اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ ان کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جن کو انہوں نے گمراہ کیا لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ان کے پیروکار اپنے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے یا وہ بچ جائیں گے؛ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے گناہ کا بوجھ خود اٹھائے گا البتہ جس نے دوسرے شخص کو گناہ کی تعلیم دی یا اسے ترغیب دلائی تو وہ اس جرم کو بھی بھگتے گا اور اسے دوگنا سزا ملے گی؛ ایک سزا اپنے گناہ کی اور دوسری سزا گناہ کو عام کرنے کا باعث ہونے کی وجہ سے۔

اللہ کا قانون

آخر میں اللہ نے اپنا قانون بیان کیا ہے کہ اللہ پہلے اپنا رسول اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ انہیں ہدایت اور گمراہی کا راستہ سمجھا دے۔ جب رسول معاشرہ میں آجاتا ہے تو پھر اس کے بعد اللہ تعالی ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو دنیوی عذاب نہیں دیتا یہ اللہ کی رحمت کے مظاہر میں سے ہے۔ جب حجت تمام ہو جاتی ہے اور انسان اس کے باوجود گناہ کرتا ہے اور اپنی گمراہی پر قائم رہتا ہے اور اللہ کے رسول کی بات کو نہیں مانتا تو اس صورت میں پھر دُنیاوی عذاب بھی اُسے شامل ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت اور مہربانی کے پیشِ نظر اپنے عذاب کے لیے اس شرط کو بیان کیا ہے کہ اللہ پہلے اپنا نمائندہ بھیجتا ہے، ہدایت کا انتظام کرتا ہے اور اتمامِ حجت کے بعد بندوں کو ان کے اعمال کی سزا دیتا ہے۔

عقل کی اہمیت

یہ بات معلوم رہے کہ اصول دین (توحید، نبوت، قیامت) عقل کے وسیلہ سے ثابت ہوں گے۔ ان کا اثبات، رسالت و نبوت پر موقوف نہیں ہے، اللہ کی طرف سے اس حوالے سے گرفت اس صورت میں ہو گی جب لوگ عقل کی راہنمائی نہ لیں گے؛ لیکن فروع دین میں جب تک نبی یا رسول بیان نہ کر دے اُسوقت تک حجت تمام نہیں ہوتی اور آخرت کا

عذاب بھی حتمی نہیں ہوتا، اور فروعات میں صرف حکمِ عقل کافی نہیں ہے اور اس سے حجت تمام نہیں ہوتی، البتہ یہ بات آخرت کے عذاب کے لیے ہے؛ لیکن دُنیاوی مؤاخذہ اور عذاب دینے کو اگرچہ عقل محال قرار نہیں دیتی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و مہربانی کی وجہ سے رسول بھیجنے کے ذریعہ اتمام حجت کے بغیر دنیوی عذاب نہیں دیتا۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿١٦﴾

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولت مندوں کو کوئی حکم دیتے ہیں پھر وہ وہاں نافرمانی کرتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم اسے برباد کر دیتے ہیں۔"

کسی قوم کی ہلاکت کے اسباب

جب کسی قوم کی ہلاکت کا وقت آگیا تو کفرانِ نعمت اور گناہ انجام دینے کی بنا پر ہلاکت کے اسباب مہیا ہو گئے اور اللہ کا ارادہ محقق ہو گیا، اس دوران پروردگار نے اُس قوم کے ثروتمندوں اور آسائش پرستوں پر نعمات کی فراوانی کی، تدریجی پکڑ اور مہلت دینے کے تحت اُن کی روزی کو بڑھا دیا تاکہ یوں وہ لوگ گناہ اور فساد میں اور زیادہ گڑھ جائیں اور ان پر عذاب حتمی ہو جائے۔[1]

گناہ حقیقت میں بندگی کے راستے سے نکلنے کا سبب بنتا ہے کہ جس کے ذریعہ اُن پر

[1]۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہیں گناہ کا حکم دیا گیا اور نہ ہی یہ مراد ہے کہ اُنہیں تکوینی طور پر گناہ کرنے کے لیے خلق کیا گیا ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انہیں نعمات دیں، ان پر اپنی خیرات و برکات کا سلسلہ نہ روکا، چنانچہ ان کی سزا کا سبب کفرانِ نعمت ہے۔

عذاب نازل ہوتا ہے؛ لیکن اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب تک کسی آبادی کے سارے لوگ فسق و فجور میں غرق نہ ہو جائیں اس وقت تک عمومی عذاب نہیں اتارا جاتا، جبکہ اس آیت میں سب بستی والوں کو ہلاک کرنے کی بات ہے تو اس بارے یہ کہا گیا ہے کہ اس بستی یا قوم میں موجود نیک لوگوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ جابروں کو روکتے اور اُن کی برائیوں کے راستے میں مانع بنتے، لیکن چونکہ انہوں نے اپنی اس ذمہ داری کو نہیں نبھایا (اس طرح اپنے فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کرنے والوں سے قرار پائے جو خود بہت بڑا گناہ ہے) اس وجہ سے وہ بھی گناہگاروں کے ساتھ عذاب کے مستحق ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی اور ہلاکت کا فیصلہ حتمی کر دیا اور انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ لہٰذا فساد میں مبتلا خوشحال طبقہ کا وجود اُس معاشرے میں اجتماعی نظام میں خلل واقع ہونے اور اُس معاشرے کے تباہی کی طرف بڑھنے کی دلیل ہے۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

”اور نوح کے بعد ہم نے قوموں کے کئی دور ہلاک کر دیے ہیں، اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں کا جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے۔“

قَرن سے مراد

لفظ قَرن ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ایک زمانہ میں اکٹھے زندگی بسر کرتے ہیں۔

اللہ کا قانون

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد کے زمانوں میں

یہ قانون بنا دیا ہے کہ آبادیوں کو ان کے گناہوں اور فساد کی بنیاد پر ہلاک کر دیتے ہیں؛ (بڑے بڑے انسانی معاشرے قائم ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا) اور ان کی تباہی کے لیے اللہ ہی کافی ہے؛ کیونکہ وہ اپنی مخلوق کے اعمال سے بخوبی آگاہ ہے اور اُن کے گناہوں کا بھی شاہد و ناظر ہے اور کسی کے حق میں ظلم نہیں کرتا (اور کسی کو بلاوجہ سزا نہیں دیتا، اپنے فضل و کرم سے اپنی مخلوق کو نعمتِ وجود عطا کرنے کے بعد ہر قسم کی سہولیات اور نعمات سے نوازتا ہے۔ جب مخلوق اپنے رب کی نعمات پر ناشکری اور کفران کرتے ہیں تو ان کی بداعمالیوں کی انہیں سزا دیتا ہے)؛ بلکہ اُن لوگوں نے خود اپنے پلید اعمال کی بنا پر اپنے حق میں ستم کیا ہے اور خود کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنایا ہے۔

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلٰىهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ۝١٨

”جو کوئی دنیا چاہتا ہے تو ہم اسے سر دست دنیا میں سے جس قدر چاہتے ہیں دے دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ ذلیل و خوار ہو کر رہے گا۔“

عاجلہ سے مراد

عاجلہ کا لفظ جلد گزرنے والی اور زائل ہونے والی دنیا کی صفت ہے، وہی دنیا جس کی نعمتیں اور زینتیں ابھی ایسے ہی زائل ہونے والی ہیں اور انہیں دوام نہیں ہے۔

دُنیا کی خواہش

اللہ نے فرمایا کہ جو بھی دُنیا چاہتا ہے اور زوال پذیر نعمات کا خواہاں ہوتا ہے اور

آخرت سے منہ موڑ لیتا ہے جس کی نعمات دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں تو ہم اسے دُنیا کی نعمات دینے سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ ایسا شخص اپنے لیے فانی دُنیا اور مادی زندگی کے علاوہ دوسری زندگی کا قائل ہی نہیں اور حقیقت میں آخرت کا منکر ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ عطا اور بخشش ہمارے ارادہ کے تابع ہے لہٰذا ہم جسے جتنا چاہیں عطا کر دیتے ہیں اور اس میں غیرِ خدا کا دخل نہیں ہے بلکہ اللہ کا ارادہ ہی ہر چیز پر غالب ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا کا طلبگار شخص دُنیا کو آخرت کا مقدمہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ دنیا ہی کو اپنا مقصود اور ہدف بنالیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو دُنیا تو دے دیتا ہے لیکن آخرت میں اس کے لیے جزا کے طور پر جہنم قرار دیتا ہے تاکہ اس کی حرارت کو چکھے جو کہ مذموم اور پروردگار کی رحمت و مغفرت سے دور ہے۔

(دنیا دھتکاری ہوئی چیز ہے اور دنیا کا طلبگار اس کے ذریعہ خود ہی جہنم سبب مہیا کرتا ہے جبکہ اللہ کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا، بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا گروی ہے۔ دُنیا کے طالب کے لیے دُنیا ہی ہے اور آخرت میں اس کے لیے کچھ نہیں ہے، جبکہ اِس دُنیا نے بھی فنا ہونا ہے اور اس کے لیے بقا نہیں ہے) (مترجم)۔

وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

"اور جو آخرت چاہتا ہے اور اس کے لیے مناسب کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوگی۔"

آخرت کے طالب

سابقہ آیت میں دُنیا طلب لوگوں کی بات کی گئی اور اس آیت میں آخرت طلب

لوگوں کے متعلق بات کی جارہی ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے جو شخص کسی چیز کی خواہش رکھتا ہے تو اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے صرف خواہش ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے جدوجہد اور سعی و کوشش بھی کرنا ہوگی۔

اس آیت میں ایسے لوگوں کا بیان ہے کہ جن کی زندگی کا اصل مقصد اور بنیادی فکر آخرت کا حصول ہے۔ یہ ایسا انسان ہے جو اپنی پوری زندگی کے اعمال کو اخروی زندگی کے حصول کے لیے منظّم کرتا ہے اور اس کے مطابق اعمال انجام دیتا ہے۔ جہاں پر وہ شخص آخرت کے حصول کی خاطر پوری سنجیدگی سے اعمال بجالاتا ہے وہاں توحید، نبوت اور قیامت پر ایمان بھی رکھتا ہے؛[1] لہٰذا جو شخص اللہ کے بیان کردہ دستورات کے مطابق اپنے اعمال کو انجام دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی سعی و کوشش کو ضائع نہیں کرتا اور اسے عمل کے مقابلہ میں اجر دیا جائے گا۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے وگرنہ اللہ کی بندگی کرنا تو بندے کی ذمہ داری ہے، چنانچہ اسے حق نہیں کہ وہ اپنے مالک اور مولا سے بندگی کا بدلہ طلب کرے، کیونکہ غلام کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، وہ تو اپنی جان کا مالک بھی نہیں ہوتا تو پھر اپنے اعمال کا مالک کیسے ہوگیا؟!

اس بناپر عمل کے بدلے میں ثواب دینا اللہ کا تفضل و کرم ہے اور اللہ کا اپنے بندے کے عمل پر تعریف و ستائش کرنا بھی اللہ کا ایک اور فضل و کرم ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ہی فضلِ عظیم کا مالک ہے۔ ''وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾''۔

یہ دو آیات اس بات پر واضح ثبوت ہیں کہ اُخروی ثمرات لینے کے اسباب اعمال ہیں اور یہ اعمال جو اپنے نتائج اور اثرات سے جدا نہیں ہوتے بلکہ ہر عمل کے پیچھے اس کا نتیجہ بھی ہے، لہٰذا ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی عمل ہو لیکن اس کا نتیجہ نہ ہو۔

---

[1] ۔ البتہ ایمان کی تکمیل عدالت اور امامت کے نظریہ کو قبول کرنے پر ہی ہوگی۔ چونکہ امامت کا عقیدہ، نبوت کے تسلسل میں ہے اور عدالت کا نظریہ، توحید کے نظریہ سے متصل ہے لہٰذا ان دو کا علیحدہ ذکر کرنا ضروری نہیں جانا گیا۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

''ہم ہر فریق کو اپنی پروردگاری بخششوں سے مدد دیتے ہیں اِن کو بھی اور اُن کو بھی، اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔''

اللہ کی امداد

انسان کے پاس جو موجود ہو اس پر مزید کچھ دے دیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو امداد دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو امداد دیتا ہے چاہے اس کا عمل دُنیاوی ہو یا اُخروی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے ایسے تمام اسباب فراہم کر دیتا ہے جن پر کسی کا عمل کرنا موقوف ہوتا ہے، جیسے علم، ارادہ، بدنی وسائل، خارجی وسائل، کہ خود انسان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ ہی ان تمام امور کو انسان کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ ہوا، پانی، آگ، غذائی مواد، سورج، چاند، زمین اور زمین پر رہنے کے وسائل، معلومات لینے کا ذریعہ، رسولوں کی شکل میں یا کتاب کی شکل میں دین کی معلومات لینے کا انتظام وغیرہ، یہ سب اللہ کا عطیہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال بجا لانے کے لیے ضروری چیزیں عطا کر دی ہیں اور تمام اسباب فراہم کر دیئے ہیں۔ اگر ان اسباب میں سے ایک چیز بھی موجود نہ ہو تو عمل وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا ہی ہے جو اپنا فضل عطا کرتا ہے، سب کو امداد دیتا ہے تاکہ ہر شخص کا عمل تحقق پذیر ہو۔ اگر اللہ کی عطا انسان سے کٹ جائے تو اس کا عمل ختم ہو جائے گا یا نامکمل رہے گا۔ پس عمل کی انجام دہی کے لیے ہر انسان کو (چاہے مومن ہو یا کافر) اللہ کے فضل و کرم سے امداد کی ضرورت ہے۔ یہ اللہ کا ایسا قانون ہے جو ہر صورت نافذ رہتا ہے۔

لہٰذا مومن جب اپنا عمل اللہ کی رضا کے لیے انجام دیتا ہے تو اسے اس کا نتیجہ ملتا ہے

لیکن جب ایک مومن شخص گناہ کرتا ہے تو وہ اللہ کی امداد اور عطا کو ایسے راستے میں خرچ کرتا ہے جس میں اللہ کی مرضی نہیں ہے تو اس صورت میں اس نے ناحق اقدام کیا لہٰذا اس کے بدلے میں ملنے والی سزا پر خود کو برا جانے اور اپنی سرزنش کرے کیونکہ وہ خود ہی قصوروار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو عمل کے سارے اسباب اس کے اختیار میں دے دیئے لیکن اس نے ان اسباب کو غلط طریقہ سے استعمال کیا۔ اللہ کی عطا لا محدود اور اتنی وسیع ہے کہ اس کی حد بندی کوئی نہیں کر سکتا۔ مومن ان اسباب اور وسائل کو منعم اور عطا کرنے والے کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے نیک بدلہ دیتا ہے اور اس کی سعی و کوشش کو قبول کرتا ہے لیکن جب نافرمان اور گناہگار شخص اللہ کے عطیات اور نعمات کو فانی دُنیا کی طلب میں لگا دیتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے تو اس کی سعی و کوشش کا نتیجہ سوائے بدبختی اور شقاوت کے اور کچھ نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ نے آخر میں فرمایا کہ تیرے رب کی عطا محظور نہیں، یعنی اسے روکا نہیں جا سکتا، لہٰذا دُنیادار اور آخرت کے طالب دونوں اللہ ہی سے مدد وصول کرتے ہیں اور دونوں اللہ ہی کے انعامات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ عطا اور امداد دینا اللہ کی شانِ ربوبی ہے اور بعض لوگوں نے اللہ کی بجائے جنہیں فرضی شرکا بنایا ہوا ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی انہیں انعامات دینے پر قادر نہیں ہے، اللہ کے علاوہ کسی کے اختیار میں لوگوں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔

آیت میں دوبارہ عطا تکرار ہوا ہے؛ یہ اس لیے کہ اس مطلب کی تائید کی جائے کہ عطا اور امداد دینا اللہ کی شان ربوبی ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اللہ کی بخشش اور عطا لا محدود ہے۔ اللہ کی عطا مطلق ہے جو ہر ایک کے لیے ہے۔ اگر کسی جگہ محدودیت یا ممنوعیت آجائے تو اس کا سبب اللہ نہیں بلکہ خود وہ شخص ہے جس تک وہ بخشش نہیں پہنچی؛ گویا اس شخص میں اللہ کی امداد وصول کرنے کی قابلیت موجود نہ تھی ورنہ اللہ کی

عطا میں نہ کمی ہے اور نہ ہی محدودیت ہے۔

اُنۡظُرۡ کَیۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ وَ لَلۡاٰخِرَةُ اَکۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَکۡبَرُ تَفۡضِیۡلًا ﴿۲۱﴾

"دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کیسی فضیلت دی ہے، اور آخرت کے تو بڑے درجے اور بڑی فضیلت ہے۔"

بعض لوگوں کی بعض پر برتری کا قانون

ہم نے دُنیا میں لوگوں کے درمیان ان کے عمل اور سعی و کوشش کی بنیاد پر بعض کو بعض پر برتری دی ہے۔ لہٰذا شب و روز کام کرنے والا اور آرام سے بیٹھا نکھٹو کبھی بھی برابر اور یکساں نہیں ہو سکتے۔ کم عمل کرنے والے اور زیادہ عمل کرنے والے، اچھا عمل کرنے والے اور بہت اچھا عمل کرنے والے کے درمیان اگر پروردگار فرق نہ کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اضافی عمل انجام دینے والے کے عمل یا جس عمل کی خوبصورتی زیادہ ہے اسے قبول نہیں کیا اور یہ چیز اللہ کے کرم بلکہ عدل کے منافی ہے۔

دُنیا کی برتری دُنیاوی اُمور میں ہے جیسے مال و متاع، جاہ و منصب، آل و اولاد، قدرت و شہرت، ریاست و سلطنت، یہ سب دُنیاوی امور ہیں اور ان کا تعلق بھی عمل سے ہے جس میں سب لوگ مساوی نہیں ہیں؛ لیکن آخرت کی برتری کے موارد اُسی طرح وسیع اور عظیم ہیں جس طرح اخروی زندگی دنیاوی زندگی سے عظیم اور وسیع ہے؛ لہٰذا کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اُخروی درجات و مراتب دُنیاوی درجات اور مراتب کی مانند ہیں؛ کیونکہ دُنیاوی برتری کا سبب مادی اسباب ہیں جن میں فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ اسباب کسی کے پاس کم ہیں اور کسی کے پاس زیادہ، اور چونکہ دُنیاوی اسباب محدود ہیں لہٰذا ان اسباب کی بنا پر برتری

بھی محدود ہے؛اخروی مراتب اور امتیازات میں فرق کے اسباب مادی نہیں ہیں، بلکہ معنوی ہیں کیونکہ اس کا معیار دلوں میں ایمان اور اخلاص کی مقدار ہے۔ معنوی اسباب کا دائرہ وسیع ہے جو جسمانی وبدنی اور مادی اختلافات سے بہت زیادہ وسیع اور عظیم تر ہیں۔

عقیدہ ایک لحاظ سے شخصی اور ذاتی مسئلہ ہے لہٰذا عقیدہ کی ذمہ داری اور مسئولیت بھی فردی و شخصی مسئلہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ سے فرمایا ہے کہ دنیاوالوں کے درمیان موجود عارضی فضائل کو وسیلہ قرار دے کر ان کے ذریعہ اخروری فضائل و درجات حاصل کرو؛ کیونکہ یہی دنیاوی فضائل (قدرت، علم، جاہ و منصب وغیرہ) آخرت کے درجات میں فرق کا باعث ہوں گے۔

(دُنیاوی اسباب جب آخرت کے لیے استعمال ہوں گے تو اُخروی درجات و مراتب میں بڑا واضح فرق وجود میں آئے گا۔ بات یہ ہے کہ جب تمام اعمال کی کیفیت و کمیت میں فرق ہوتا ہے تو ان پر مرتب ہونے والے نتائج اور ثمرات میں بھی واضح فرق ہوگا) (مترجم)۔

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ﴿۲۲﴾

''اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود نہ بناورنہ توں ذلیل بے کس ہو کر بیٹھے گا۔''

غیر اللہ کو معبود بنانے کا نتیجہ

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اپنے حبیبؐ کو خطاب کیا ہے، لیکن درحقیقت تمام انسانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ کیونکہ غیر اللہ کو معبود والہ بنانے سے تم پر پھٹکار اور ملامت ہوگی اور تمہارا کوئی بھی یاور ومددگار نہ ہوگا اور اللہ کے سوا کون ہے جو کسی کی مدد کرسکے؟۔ اللہ ہی سب کا مالک، سب کا خالق ورازق اور سب کا ناصر ومددگار ہے۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

"اور تیرا رب فیصلہ کر چکا ہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف بھی نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے ادب سے بات کرو۔"

عبادت کے بارے الٰہی قانون

اس جگہ اللہ نے (قَضٰى رَبُّكَ)[1] کے الفاظ کے ساتھ اپنا قانون پیش کیا ہے کہ شریعت مقدسہ کا قانون و حکم یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک اور مقام پر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی قانون ہے کہ وہ ہر گناہ معاف کر دے گا، لیکن اللہ کے ساتھ شریک بنانے والا گناہ معاف نہ کرے گا؛ کیونکہ اللہ کا شریک ٹھہرانا سب

---

[1]۔ عالم امکان میں جتنے بھی حوادث رونما ہوتے ہیں ان کے متحقق ہونے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وجود میں آنے سے پہلے اس کے لیے جتنے علل و اسباب اور ذرائع ہیں وہ سب مکمل اور پورے ہوں اور اس کے تحقق پذیر ہونے میں جو رکاوٹیں اور موانع ہیں وہ بر طرف ہوں؛ کیونکہ کسی بھی حادثہ، واقعہ اور حالت کے تحقق پذیر ہونے کے لیے اس کے علل و اسباب اور ذرائع کے مہیا ہونے اور موانع دور ہونے سے پہلے اس کا وجود اور عدم وجود مساوی ہوتا ہے؛ جیسے ہی شرائط مکمل ہوتی ہیں تو وہ فوراً موجود ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر شرائط نہ ہوں گی تو اس کا وجود محقق نہ ہو گا۔ قضاء الٰہی کا معنی یہی ہے البتہ ایک قضاء الٰہی تکوینی ہے، لیکن شرعی احکام و قوانین میں قانون سازی اللہ کا فعل ہے۔ قضاء تشریعی (کسی قانون کا بنا دینا) کو حق کا نام دیا جاتا ہے جس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ مولا کا حکم و فیصلہ حتمی ہے اور قانون اس طرح ہے جو تمام واجبات و فرائض میں اہم ترین اور برترین واجب و فریضہ ہے۔

سے بڑا گناہ ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کے بیان کو باقی گناہوں پر مقدم رکھا ہے۔

والدین کے ساتھ احسان

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ نیکی، بھلائی اور احسان کرنے کا حکم دیا ہے؛ کیونکہ والدین کی نافرمانی کرنے والا بھی بڑے گناہ کا ارتکاب کرنے والا ہوتا ہے۔ والدین کی اہانت کرنا، ان کی بے احترامی کرنا، ان کو اذیت دینا، ان کی شان میں گستاخی کرنا، (والدین کا عاق ہونا) شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔

توحید عبادی کے بعد والدین کے ساتھ احسان کرنا، واجب ترین واجبات میں سے ہے، چنانچہ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر بھی توحید اور والدین کے ساتھ احسان کرنے کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ انعام آیت ۱۵۱ میں ہے کہ: (اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔـا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ) ” یہ کہ تم کسی چیز کو اللہ کا شریک مت بناؤ اور والدین کے ساتھ احسان، نیکی اور بھلائی کرو۔“

خاندانی تعلقات کی اہمیت

انسان معاشرہ کی تشکیل میں بنیادی عنصر ماں اور باپ ہیں جس سے اولاد کا وجود تحقق پذیر ہوتا ہے۔ والدین کے ساتھ احسان اور بھلائی کے مسئلہ پر خصوصی توجہ کی حکمت یہ ہے کہ خاندانی روابط کی بنیاد کو مستحکم کر دیا جائے کیونکہ پورے معاشرہ کی عمارت اسی پر استوار ہے۔ اگر یہ رابطہ گڑبڑ ہو جائے تو پھر پورا انسانی معاشرہ تباہ ہو جائے گا اور انسانوں کے درمیان مہربانی کا عنصر ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اسلام نے ہمیشہ اس رابطہ اور تعلق کو مضبوط بنانے پر توجہ دی ہے کیونکہ گھرانہ ہی ایک صالح اور نیک معاشرہ کی تشکیل کا بنیادی عنصر ہے۔ اسی سے

---

[1] ۔ سورہ نساء، آیت ۴۸۔

اُمت واحدہ کا تصور تحقق پذیر ہوتا ہے۔ غیر مسلم قوتیں، مسلمانوں کے درمیان خاندانی روابط اور تعلقات کو ویران کرنے اور تباہ کرنے کے درپے ہیں تاکہ لوگ بجائے اس کے کہ وہ ایک اصل اور بنیاد کے گرد جمع ہوں، بکھر کر ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جائیں، ان کے درمیان وحدت تحقق پذیر نہ ہو؛ کیونکہ مسلمانوں کی وحدت سے دشمنوں کو خطرہ ہے۔

بڑھاپے میں احترامِ والدین کی تاکید

اس قانون میں والدین کے بڑھاپے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جب والدین بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ اپنی زندگی کے سخت ترین حالات گزار رہے ہوتے ہیں لہٰذا انہیں مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حالت میں انہیں اولاد سے پیار کی توقع ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے متوجہ کیا ہے کہ اولاد والدین کے بڑھاپے میں ان پر خاص توجہ رکھیں اور ان کو یہ بات معلوم رہے کہ آج تم جوان ہو، طاقتور ہو، جسمانی اور روحانی توانائی تمہارے پاس ہے اور والدین جسمانی اور روحانی طور پر کمزور ہو چکے ہیں لیکن تم نے بھی بہت جلد اسی کیفیت میں آجانا ہے۔ اپنے بچپن کو یاد کرو جب تم کمزور و ناتواں تھے، لیکن تمہارے والدین طاقتور تھے تو انہوں نے کس طرح تمہاری دیکھ بھال کی اور تمہیں پالا، تمہاری ہر آرزو کو پورا کی؛ لیکن آج وہ کمزور ہیں، تم طاقت میں ہو، ان کی خدمت کرو، انہیں پیار دو، ان کی غلطی پر انہیں سرزنش نہ کرو۔ اف تک کہنا بھی جرم و گناہ ہے۔ روایت میں ہے کہ گستاخی کے لیے اف سے کمتر کوئی لفظ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے ذکر کرتا۔ والدین کو اُف تک سے منع کیا ہے، اُن کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو، والدین کے آگے نہ چلو، والدین کھڑے ہوں تو ان کا احترام اس انداز سے کرو کہ تم ان کے پیچھے رہو۔ برابری کا احساس نہ ہو، ان کی ہر خواہش کو پورا کرو، معاشرہ میں انہیں عزت واحترام دو اور ان کے لیے دُعا کرو۔

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

”اور ان کے سامنے شفقت سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو اور کہو اے میرے رب جس طرح انہوں نے مجھے بچپن سے پالا ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما۔“

ماں باپ کے لیے دُعا

ماں باپ کے ساتھ عملی اور زبانی تواضع وانکساری کے بارے بیان ہے کہ انتہاء درجہ کا احترام ان کے لیے ہے۔ تواضع وانکساری کے لیے پرندہ جس طرح اپنے بچوں کو پروں کے نیچے رکھ لیتا ہے اور انہیں آرام وآسائش پہنچاتا ہے، اولاد کو بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ والدین کو غذا کی ضرورت ہو تو غذا دیں، آرام کی ضرورت ہو تو آرام پہنچائیں، حفاظت کی ضرورت ہو تو ان کی حفاظت کریں، یعنی تواضع وانکساری کی آخری حد تک ان کے لیے اپنائیں۔ جس طرح جب تم چھوٹے بچے تھے، کمزور تھے، اپنے لیے کچھ بھی کرنے کے قابل نہ تھے تو ماں باپ تمہیں آرام پہنچاتے تھے، تمہاری ضروریات کو پورا کرتے تھے، تم ان کے بڑھاپے میں ان کے ساتھ وہی طریقہ اپناؤ، مہربانی سے پیش آؤ، انتہا درجہ کا پیار دو، البتہ یہ سب عملی اقدام ہے؛ اس کے ساتھ ان کے حق میں اللہ سے دُعا کرو، اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرماتا ہے۔ والدین کے لیے ایسے ادب واحترام اور ان کے لیے دُعا کرنے کا اولاد کو بھی فائدہ ہوگا۔ یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے۔

پروردگار نے پہلے والدین سے احسان کا حکم دیا، پھر ان کی توہین اور اذیت سے منع کیا گیا اور اس کے بعد والدین کے احترام اور ان کے لیے حکمِ دُعا ہے اور والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ یہ اللہ کا اپنے بندوں پر خاص فضل اور مہربانی ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝۲۵

"جو تمہارے دلوں میں ہے تمہارا رب خوب جانتا ہے، اگر تم نیک ہوگے تو وہ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔"

بندوں پر اللہ کی مہربانی

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہاء درجہ کا مہربان ہے۔ اس آیت میں ایک بات یہ سمجھائی گئی ہے کہ اللہ سے تمہاری کسی نفسانی کیفیت کا تعلق نہیں، مگر یہ کہ اللہ خود تم سے زیادہ تمہارے ان خیالات سے واقف ہے جو تم سوچتے ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کی بات کی ہے۔

سابقہ آیت میں اولاد کو ماں باپ سے احترام سے پیش آنے کا حکم دیا اور یہ اولاد پر واجب ہے؛ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم سے کوتاہی ہو جائے اور ماں باپ کے حق میں نافرمانی کر بیٹھو تو اس غلطی پر اللہ سے رجوع کر لینا اور جب تم معافی مانگ لوگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری معافی قبول کر لے گا؛ کیونکہ وہ توبہ کو بہت زیادہ قبول کرنے والا ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ صالح بنو، نیک بنو، تمہارے ہر عمل سے اللہ آگاہ ہے اور تمہاری نیتوں سے خوب واقف ہے اور تم سے بہتر جانتا ہے کہ تم کیسے عمل کے مرتکب ہوئے ہو۔

اس بیان میں عام کو (ایسا جملہ جس کا معنی وسیع ہے) استعمال کرکے اس سے خاص (محدود معنی) معنی مراد لیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمام بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ ان کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا اور ان پر مہربان ہے۔ اس عمومی حکم میں ایسی اولاد جو

اپنے ماں باپ کے حق میں واجبات ادا نہیں کرتی بلکہ ان کی توہین کا ارتکاب کرتی ہے تو اللہ فرمارہا ہے کہ یہ ایک بڑا گناہ ہے لیکن گناہ کے بعد توبہ کر لوگے تو اللہ تمہاری توبہ قبول کر لے گا۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾

"اور رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو اور مال کو بے جا خرچ نہ کرو۔"

حق اور تفضل کا فرق

حق وہ ہوتا ہے جسے ادا کرنا واجب ہوتا ہے، جبکہ تفضل مہربانی ہوتی ہے جو کسی واجب کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

تین گروہوں کا حق

اس آیت میں معاشرہ میں تین گروہ معین کرکے بیان کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا آپ پر حق ہے، لہٰذا ان کا حق ادا کرو؛ وہ تین گروہ یہ ہیں:۔

ا۔ ذوی القربیٰ: اس سے مراد رشتہ دار ہیں چاہے پدری ہو یا مادری، یا فقط مادری ہوں یا فقط پدری ہوں۔ اسی طرح نسبتی رشتہ بھی، یعنی شوہر اور بیوی کے تعلق سے جو رشتہ داریاں وجود میں آتی ہیں؛ ایسے تمام رشتہ داروں کا انسان پر حق ہے۔ وہ حق احترام کے علاوہ مالی معاونت کرنا بھی ہے اور اس جگہ معالی معاونت مراد لی گئی ہے کیونکہ آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ مال میں فضول خرچی سے بچو اور مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرو اسراف اور زیادہ روی نہ ہو۔

۲۔ مسکین: ایسا شخص جس کے پاس اپنے ضروری اخراجات کے لیے کچھ نہ ہو، وہ بیچارہ ہوا ہو، مالی پریشانی کا شکار ہو۔

۳۔ابن سبیل: ایسا شخص جو سفر میں ہو، راستہ کے اخراجات اس کے پاس ختم ہو جائیں اور اس کے پاس کچھ وسیلہ بھی نہ ہو کہ وہ اس مشکل کو حل کر سکے۔

ان سب کا آپ پر حق یہ ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق ان کی مدد کرو، البتہ امداد دینے میں ایسا انداز نہ اپناؤ کہ اپنا سب کچھ ختم کر بیٹھو اور پھر خود محتاج ہو جاؤ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واجب کا حکم مکہ میں دیا گیا کیونکہ یہ آیت مکی ہے۔ اسلام ایک دوسرے سے ہمدردی اور تعاون کا حکم دیتا ہے اور خود پرستی کی مذمت کرتا اور خود خواہی کا مخالف ہے۔ ایثار کرنے والوں کے لیے بڑا اجر قرار دیتا ہے جو دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں۔

واجب کی ادائیگی میں اسراف سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اسلام کوئی ایسا حکم جاری نہیں کرتا جس سے کسی کا نقصان ہو؛ اسی لیے ایک ضابطہ کلی اور عمومی قانون قرار دیا ہے کہ ہر شخص کی ذمہ داری اتنی ہی ہے جتنی وہ طاقت اور استطاعت رکھتا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

”بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔“

تبذیر

اس سے مراد یہ ہے کہ بغیر کسی حساب کتاب اور شمار کرکے اپنا مال لوٹا دینا اور اس انداز کو اپنانے میں معاشرہ میں فساد عام کرنا منظور ہو۔ کیونکہ فضول خرچ اور

بے مقصد خرچ کرنے والے فسادی ہیں۔

شیطان کے ساتھی

شیطان کی مانند کام کرنے والے انسان شیطانوں کے بھائی ہیں، کیونکہ جو لوگ فسادی ہیں اور مال بے جا خرچ کرکے معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں وہ شیطان کی مانند ہیں، گویا ان کی اصل و بنیاد ایک ہے۔ شیطان نے بھی اللہ کے حکم کو نہ مانا، ابلیس تمام شیطانوں کا باپ ہے۔ تمام شیاطین ابلیس کی اولاد اور اسی کا قوم و قبیلہ ہیں۔ ابلیس نے اللہ کا کفران کیا، تکبر کیا اور اللہ کا حکم نہ مانا، سب سے پہلے اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اگر لفظ شیطان پر (الف، لام عہد) کا ہو تو یہاں ابلیس ہی مراد ہوگا اور اگر لفظ شیطان پر (الف و لام جنس) کا ہو تو اس سے مراد سارے شیاطین ہیں، پس ابلیس سے لے کر جتنے بھی اس کے چیلے ہیں سب مراد ہیں۔ یہ سب کے سب اللہ کے ناشکرے اور نافرمان ہیں۔

اللہ کی جانب سے شیطان کو بندگی کی قدرت و طاقت دی گئی، اس کے لیے اللہ کی اطاعت و عبادت کا ماحول مہیا کیا گیا؛ لیکن اس نے ان تمام صلاحیتوں کو اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کیا اور سب کو اللہ کی نعمات سے محروم کر دیا۔

شیطان بہشت سے راندہ گیا اور قربِ الٰہی سے محروم ہوا کیونکہ اس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کیا، اسی بناء پر اس نے اولادِ آدم سے دشمنی کی ٹھان لی کہ جس طرح اس نے آدمؑ کو بہشت سے نکالا تھا وہ بنی آدمؑ کو بھی بہشت میں داخل نہ ہونے دے گا؛ اسی بنیاد پر وہ انسان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھامتا ہے اور اسے اسراف، فضول خرچی، فساد پھیلانے پر اکساتا ہے اور اسے بہشت کی جانب نہیں جانے دیتا اور اللہ کے قرب سے دُور لے جاتا ہے۔ اسراف اور فضول خرچی کا عمل سبب بنتا ہے کہ اسلامی معاشرہ تباہ ہو جائے اور جو بھی ایسا رویہ اپناتا ہے وہ شیطان ہی کا بھائی ہے اور اسی کے ساتھ اس کا حشر و نشر ہوگا۔

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

''اور اگر تجھے اپنے رب کے فضل کے انتظار میں کہ جس کی تجھے امید ہے منہ پھیرنا پڑے تو ان سے نرم بات کہہ دے۔''

اتفاق نہ کر سکنے کی صورت میں

اس آیت میں ایک استثنائی حکم بیان کیا ہے کہ اگر انسان فقر و تنگدستی کی وجہ سے رشتہ داروں، مساکین اور ابن سبیل کی مدد نہیں کر سکتا تو یہ نیت رکھے کہ جب بھی اس پر اللہ کا کرم ہو گا، حالات بہتر ہوں گے تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ایسی صورتحال ہو تو پھر خوش گفتار بنو، پیار کے انداز میں بات کرو۔ اسی حوالہ سے سورہ والضحیٰ آیت ۱۰ میں فرمایا:

ترجمہ: ''اور بہرحال سوالی کو غضبناک مت کرو، اس کو ناراض نہ کرو، جھڑ کو مت۔''

(اسلام، معاشرہ میں پیار و محبت کا فروغ چاہتا ہے لہٰذا ہر پہلو پر اس مسئلہ کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ جہاں پر نفاق (خرچ کرنے کا) کا حکم دیا تو اس کی دوسری حالت کو بیان کر دیا کہ اگر تم نفاق کی پوزیشن میں نہیں تو پھر گفتگو میں نرم رویہ اپناؤ، سخت رویہ نہ ہو، رویہ اچھا ہو) (مترجم)۔

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا ہوا نہ رکھ، اور نہ اسے کھول دے بالکل ہی

کھول دینا، پھر تو پشیمان تہی دست ہو کر بیٹھ رہے گا۔"

بندھے اور کھلے ہاتھوں کا مفہوم

گردن سے ہاتھ باندھنے کا مطلب کنجوسی کی وجہ سے اللہ کی راہ میں انفاق نہ کرنا ہے؛ جبکہ کشادہ دستی سے مراد کھلے ہاتھ رکھنا، بے حساب، کثیر مقدار میں خرچ کرنا ہے؛ اور یہ الفاظ انفاق کے معاملے میں افراط و تفریط سے پرہیز کے لیے نہایت بلیغ ترین تعبیر ہے۔

انفاق میں درمیانہ روی کا حکم

اسلام دین وسط ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور کنجوسی سے بچنے کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ اس انداز سے بھی اپنا مال نہ لوٹاؤ کہ آپ کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے اور پھر خود تنگدست ہو جاؤ۔

اسلام میں افراط و تفریط کی گنجائش نہیں ہے، اسی لیے تاکید کی گئی کہ بے جا خرچ کرنے کی صورت میں تم بعد میں خود بھی پریشان ہوگے اور لوگوں کی طرف سے بھی تمہاری ملامت کی جائے گی اور تمہیں اپنے رویہ پر پشیمانی ہوگی۔

اسلام ایک متوازن دین ہے جو انسان کی بھلائی، فلاح اور ہر میدان میں اسے کمال تک پہنچانے کے لیے ہے۔ اسلام میں کسی پر ظلم نہیں ہے اور نہ ہی کسی پر بے جا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ دینِ اسلام کا ہر قانون انسانی زندگی کی ضروریات کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے اور خالق ہی انسان کی ضروریات و رجحانات کا بہتر علم رکھتا ہے۔ اس لیے فقط اللہ کا بنایا ہوا قانون ہی انسان کی کامیابی کا ضامن ہے؛ اسی سے واضح ہوتا ہے کہ جو قانون خود انسان اپنے لیے بنائے گا اس میں نقص ہوگا اور وہ انسان کی ضروریات کو پورا نہ کرے گا۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ يَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ﴿۳۰﴾

"بے شک تیرا رب جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا ہے۔"

رزق کی وسعت اور تنگی کا معیار

چونکہ اللہ تعالی کی ذات ہی خالقِ اسباب ہے، لہٰذا اُسی نے انسان کے لیے روزی کے اسباب بنائے ہیں۔ انسان کی ذمہ داری ہے کہ ان اسباب اور وسائل کو استعمال کرکے اپنے لیے روزی کمائے؛ چنانچہ اگر ایسے اسباب پیدا ہوں کہ جن کا نتیجہ روزی میں فراوانی ہے تو گویا اللہ ہی نے اس کی روزی میں وسعت چاہی ہے اور اگر وہ ایسے اقدامات اٹھائے اور ایسے اسباب ووسائل کو اپنائے کہ جن کا نتیجہ رزق کی تنگی ہے تو گویا اللہ ہی نے انسان کی روزی کو تنگ کیا ہے۔

اللہ کا قانون ایسا ہی ہے کہ اپنی مشیت کے تحت جس کو چاہتا ہے فراخ روزی بخش دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے؛ لیکن اللہ تعالی کا یہ قانون بلا حساب و کتاب نہیں ہے جس کسی کو بلاوجہ وسیع رزق دے دے اور کسی کے لیے مکمل طور پر بلاوجہ روک ہے؛ بلکہ اللہ تعالی اپنے بندوں کی ضروریات سے آگاہ ہے اور ان کی توانائی کو بھی جانتا ہے اور انسان پر مہربان بھی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے مصالح اور مفادات سے آگاہ بھی ہے لہٰذا وہ جو بھی کرتا ہے وہی اُس کے بندوں کے لیے مفید ہوتا ہے۔

اللہ تعالی کی جس بندے کے بارے چاہے اس سے روزی کو روک لیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے اس کے واسطے روزی کے سارے در کھول دیتا ہے اور اس کا رزق وسیع ہو جاتا

ہے۔

اس بات کو اس تناظر میں بیان کیا کہ اے میرے پیارے حبیب ! جیسی مشیت اور روش تیرے رب کی بندوں کو روزی دینے کے بارے ہے، تم بھی فقراء و مساکین اور پریشان حال لوگوں کی مدد کرنے اور ان پر مال خرچ کرنے میں ویسا ہی انداز اپناؤ اور میانہ روی میں عافیت و بھلائی ہے۔

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

"اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔"

اس آیتِ مبارکہ میں لفظ (اِملاق) استعمال ہوا ہے جس کا معنی فقر و فاقہ اور تنگدستی ہے۔ (خطاء) کا معنی انحراف اور صحیح راستہ سے منحرف ہو جانا ہے، اور یہاں مراد یہ ہے کہ انسان ایسے عمل کا ارادہ کرے جس کا انجام دینا صحیح نہیں ہے۔

تنگ دستی کے خوف سے اولاد کو قتل کرنا

اس آیت میں والدین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تنگدستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کریں۔ واضح رہے کہ یہ آیت بچوں کو قتل کرنے اور حمل ضائع کر دینے کو بھی شامل ہے۔

عام طور پر انسان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ میرے (فرض کرلیں) چار بچے ہیں ان کے لیے میرے پاس کھلانے کو کچھ نہیں، اب ایک اور بچہ ہونے والا ہے تو اسے کہاں سے کھلاؤں گا، لہٰذا انسان اسے قتل کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔

اسلامی قانون تو یہ ہے کہ مالدار لوگ، مالی طور پر کمزور لوگوں کی مدد کریں۔ اس کے لیے خمس، زکات، کفارات جیسے قوانین موجود ہیں جو معاشرہ کے اندر اونچ نیچ کا خاتمہ اور ایک متوازن و معتدل معاشرہ بنانے میں مددگار ہیں۔

روزی دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، چنانچہ اللہ نے تمہیں روزی دی ہے تو تمہاری اولاد کو بھی روزی دے گا؛ لہٰذا فقر و تنگدستی کے ڈر سے اولاد کو مارنے سے منع کیا اور اسلام اس سوچ کی مذمت کرتا ہے اور ایسے عمل کو گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت اور قانون کا حوالہ دیا ہے کہ روزی دینا ہمارا کام ہے، روزی کے اسباب ہم نے بنائے ہیں اور ان اسباب کے استعمال کی طاقت بھی ہم نے دی ہے لہٰذا تنگدستی کا خوف اولاد کو قتل کرنے کا سبب نہیں ہو سکتا ہے اور ایسا اقدام کرنا غلط اور گناہ ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔''

زنا کی ممانعت

اسلام، احترامِ آدمیت کا دین ہے؛ جبکہ زنا انسان کی کرامت اور عفت کے خلاف ہے، اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔ دوسری طرف جنسی خواہشات کی برآوری کے لیے نکاح کا قانون بنایا گیا ہے۔

آیتِ مبارکہ میں زنا کو فاحشہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فاحشہ کا معنی برائی ہے۔ ایسی معصیت جو برائی سے جدا نہیں۔ ایسی بری روش ہے کہ جس سے معاشرہ فاسد ہو جاتا ہے۔ انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، نسب کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان مضبوط رشتے کی تشخیص ختم ہو جاتی ہے۔

اگر عورت اور مرد کے درمیان زوجیت کا رابطہ ختم ہو جائے تو عورت کا مقام ختم ہو جاتا ہے اور وہ صرف شہوت رانی کا آلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں عورت کی حفاظت کا نظام ختم ہو جاتا ہے، اس کے حقوق پامال ہو جاتے ہیں، اس برے عمل کا سب سے زیادہ نقصان عورت کو ہے۔

زنا کی صورت میں انسان اپنی شہوت کی آگ کو بجھانے کے لیے ہر راستہ کا انتخاب کرے گا، اس کی کوئی حد و شرط نہ ہو گی، ایسی صورت میں مرد کبھی بھی شادی کا راستہ اختیار نہیں کرے گا تاکہ اسے بیوی اور اولاد کا خرچ نہ دینا پڑے اور عورتیں بھی اس صورت کو پسند نہ کریں گی کہ ان کی اولاد ہو۔ ایسی صورتحال میں انسانی نسل تباہ ہو جائے گی۔ انہی خطرات سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے نکاح کا قانون بنایا اور زنا سے منع کیا ہے۔

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

"اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کرنا، اور جو کوئی ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے واسطے اختیار دے دیا ہے لہٰذا قصاص میں زیادتی نہ کرے، بے شک اس کی مدد کی گئی ہے۔"

انسان کی جان اور مال کا احترام

اللہ تعالیٰ نے انسان کے جان و مال کو محترم قرار دیا ہے، اس لیے سختی سے منع کر دیا کہ کوئی شخص بھی دوسرے انسان کو قتل نہیں کر سکتا، سوائے یہ کہ اس کے قتل کی وجہ موجود ہو، جیسا کہ وہ خود قاتل ہو اور اسے قتل کے بدلہ کے طور پر قتل کیا جائے؛ یا وہ شخص دوسرے پر حملہ آور ہوا ہو اور دوسرا شخص اپنے دفاع کے لیے خود کو حملہ آور سے بچائے اور کارروائی

میں حملہ آور مارا جائے تو وہ اس ضابطہ میں نہ آئے گا۔

پس کسی کو بے جرم قتل کرنا حرام ہے۔ یہ فقط اسلام میں نہیں بلکہ تمام آسمانی ادیان میں ایسا ہی حکم ہے کہ نفس محترمہ کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی حرمت، کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے۔ سورہ انعام کی آیت ۳۵ اور ۱۵۱ میں بھی اسی قانون کو بیان کیا گیا ہے۔

مقتول کے وارث کا حق

آیتِ مبارکہ میں قتل کی حرمت کا قانون بیان کرنے کے بعد اگلے مرحلہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص قتل ہو جاتا ہے تو پھر اس مقتول کے وراث کا حق بن جاتا ہے کہ وہ قاتل سے قصاص لے؛ البتہ یہ کہ مقتول کا وارث خون بہا لینے کا حق بھی رکھتا ہے اور اگر چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے، اور یہ سب اس کے اختیار میں ہے؛ لیکن وارث خون بہا لینے میں انتقام اور قصاص کے علاوہ دوسروں کو قتل نہ کرے اور نہ ہی قاتل کے متعلقین اور رشتہ داروں سے انتقام لے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ اسے معلوم رہے کہ ہم نے اس کی مدد کی ہے۔ قاتل (خدائی) عدالت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا لہٰذا وہ وارث قصاص لینے میں جلد بازی نہ کرے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اور قاتل کے علاوہ کسی دوسرے سے بدلہ نہ لے۔

زمانہ جاہلیت کا رواج

زمانہ جاہلیت میں جب ایک شخص قتل ہو جاتا تھا تو اس کی وجہ سے قاتل کے قبیلہ اور مقتول کے قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تھی یا دو خاندانوں میں لڑائی چھڑ جاتی اور دونوں اطراف سے کئی جانیں ضائع ہو جاتیں لیکن اسلام نے قصاص کا قانون تیار کرکے عدل و انصاف کو رواج دیا۔ خون کے بدلہ میں ایک ہی خون قرار دیا۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۹ میں ہے:

ترجمہ: ''تمہارے لیے قصاص لینے میں حیات و زندگی ہے''۔

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

''اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر جس طریقہ سے بہتر ہو جب تک وہ اپنی جوانی کو پہنچے، اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کی باز پرس ہو گی۔''

یتیم سے مراد

یتیم سے مراد ایسا نابالغ ہے کہ جس کا باپ مر جائے ہو۔

یتیم کا مال کھانا

یتیم کا مال محترم ہے اس کو ہڑپ کرنے کی اجازت نہیں ہے اس قانون کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب بھی مت جاؤ کہ تم اس پر قبضہ کر لو اور اسے ہڑپ کر جاؤ۔

یتیم کا مال کھانا گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اور ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ نے آتشِ جہنم کا وعدہ کیا ہے۔ سورہ نساء آیت ۱۰ میں یہ حکم بیان ہوا ہے۔

یتیم کے مفادات کا خیال رکھنا

آیتِ مبارکہ میں یتیم کے مال کی حرمت کو بیان کرنے کے بعد اس کا مال کھانے سے منع کیا اور یہاں تک حکم کہ اس کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ؛ اس کے بعد فرمایا: یتیم کے مفادات کے پیشِ نظر اس کے مال میں تصرف کر سکتے ہو۔ اس استثنائی حکم میں سب سے پہلے یہ یقین دہانی ہو کہ یتیم کا مال ضائع نہ ہو گا، اس کی پوری حفاظت کی جائے گی اور پھر اس مال

کو اس طرح استعمال میں لایا جائے گا جو یتیم کے مال میں اضافہ کا سبب بنے۔ جب یتیم بالغ ہو جائے اور اس میں اپنے مال میں تصرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر وہ مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔ ایسی صورتحال میں اُسے اپنے مال کے سلسلہ میں اختیار ہے کہ وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کرے۔

عہد و پیمان کی وفاداری

عہد و پیمان کی پاسداری اسلام میں بہت زیادہ اہم ہے؛ چنانچہ اس سلسلہ میں فرمایا کہ جب کسی سے عہد و پیمان باندھو تو پھر اسے پورا کرو، کیونکہ تم سے اس بارے سوال کیا جائے گا کہ تم نے جو عہد و پیمان باندھا اسے کیوں پورا نہیں کیا؟ عہد شکنی گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اور عہد و پیمان ان اعمال میں سے ہے جو قیامت کے دن مجسم ہو کر انسان کے سامنے ہوں گے اور یہ عمل جسمانی شکل میں آکر عہد و پیمان باندھنے والے کے حق میں یا اس کے مخالف گواہی دے گا۔

وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَ زِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۳۵﴾

”اور ناپ تول کرو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تول کر دو، یہ بہتر ہے اور انجام بھی اس کا اچھا ہے۔“

ناپ تول کا قانون

اسلام کسی سے زیادتی کا قائل نہیں ہے اور ہر ایک کے حق کی بات کرتا ہے۔ مال کی خرید و فروخت کے لیے ضابطے اور قوانین بنائے گئے ہیں، عام طور پر کچھ اشیاء شمار کرکے دی جاتی ہیں، کچھ وزن کرکے فروخت ہوتی ہیں اور کچھ پیمائش کرکے دوسروں کے حوالے کی جاتی

ہیں (جیسے زمینوں کی خرید و فروخت)۔

چنانچہ اس آیتِ مبارکہ میں ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے جس کا ہر جگہ لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں ڈنڈی نہ ماری جائے، عدل و انصاف کا لحاظ رکھا جائے، ناپ تول میں خیانت نہ کی جائے۔ یہی تمہارے حق میں بھی بہتر ہے اور اسی میں معاشرے کا مفاد بھی ہے۔

ناپ تول میں کمی ایک قسم کی چوری ہے۔ ایسی چوری جو بزدلانہ ہے؛ کیونکہ بہت ہی گھٹیا انداز سے دوسرے کے مال کو چرایا جاتا ہے۔

اس حکم کا مثبت پہلو یہ ہے کہ جب ناپ تول میں خیانت نہیں ہو گی تو لوگوں کے درمیان اعتماد بڑھے گا، اور اطمینان حاصل ہو گا جس کا نتیجہ خیر و سلامتی ہے۔ یعنی ناپ تول میں عادلانہ رویہ اپنا کر اپنے لیے بہتری بھی کماؤ گے اور نیک نامی بھی۔

اگر سارے لوگ اس قانون پر عمل کریں، کم فروشی نہ کریں، پورا پورا سودا دیں اور زیادہ رقم وصول نہ کریں، جو حق ہے وہ لیں تو گویا انہوں نے معاشی نظام کا لحاظ کیا ہے؛ کیونکہ سوداگری، کاروبار میں لوگوں کے آپس میں تجارتی معاملات دو بنیادوں پر استوار ہیں:

۱۔ صحیح و سالم جنس حاصل کرنا جو مرغوب ہی ہو۔

۲۔ انسان کی ضرورت سے زائد اجناس کو بازار میں فروخت کے لیے پیش کرنا۔

لہٰذا اگر کم فروشی کا دروازہ کھل جائے تو اس سے عمومی معیشت میں خلل واقع ہو جائے گا۔ معیشت اور اقتصاد کی بنیادیں کمزور پڑ جائیں، پورا معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو گا اور امنیت تباہ، معیشت برباد ہو جائے گی۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾

''اور جس بات کی تجھے خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ، بے شک کان اور آنکھ اور دل ہر ایک سے باز پرس ہوگی۔''

عمل کی بنیاد آگہی پر رکھی جائے

اس آیت میں علم کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے کہ تم جب تک کسی امر کے بارے آگاہی نہ ہو اُس وقت تک صرف اندازے اور تخمینے کی بنیاد پر مت چلو۔

واضح رہے کہ اس حکم میں عمومیت پائی جاتی ہے، لہٰذا عقیدہ کی بنیاد بھی علم و یقین و آگہی پر ہونا چاہیے اور عمل کی بنیاد بھی صحیح معلومات اور علم و آگہی پر ہونی چاہیے جو کہ فطری امر ہے۔ اس میں راز کی بات یہ ہے کہ ہر انسان جب کوئی نظریہ و عقیدہ اختیار کرتا ہے یا کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ واقعیت اور حقیقت کے مطابق اقدام کرے، اور وہ چاہتا ہے کہ اس کا عقیدہ اور اس کا عمل حقیقت اور واقعیت کے مطابق ہو؛ واضح ہے کہ یہ چیز صرف اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنے تمام امور کی اساس و بنیاد علم و یقین کو قرار دے۔ گمان، شک، وہم کی بنیاد پر کچھ بھی اقدام نہ کرے کیونکہ سطحی معلومات و خیالات کی روشنی میں جو بھی اثر لیا جائے گا یا جو کام انجام دیا جائے گا اس سے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہ ہوگا اور انسان واقعیت اور حقیقت کو نہ پا سکے گا۔

علم کے ذرائع

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے محسوسات و معقولات دونوں طرح کے ذرائع بتا دیئے ہیں؛ آنکھ اور کان، مشاہدات و محسوسات کا علم حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں؛ دل و دماغ معقولات کے حصول کا وسیلہ ہیں۔ کان اور آنکھ ظاہری حواس ہیں جو محسوسات و جزئیات کو کشف کرتے ہیں جبکہ دل و دماغ کلیات اور عقلیات کے ادراک کو سمجھنے کا مصدر و منبع ہیں۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمات ہیں جنہیں اسی کام کے لیے استعمال کرنا چاہیے جس کے

لیے اللہ نے انہیں خلق فرمایا ہے۔ اللہ فرمارہا ہے ان کے بارے سوال کیا جائے گا یہ اللہ کی نعمات ہیں ان کے وسیلہ سے انسان حق و باطل میں تمیز کرتا ہے، صحیح و غیر صحیح میں جدائی ڈالتا ہے۔ بہت جلد ان میں سے ہر ایک کے بارے سوال ہو گا کہ تم نے اس نعمت کو کیسے استعمال کیا؟۔ آپ نے جو عمل انجام دیا ہے اس کی بنیاد علم پر رکھی تھی یا شک و وہم پر؟! اور جو کچھ ان ذرائع نے تمہارے لیے بتایا تھا اس کے مطابق عمل بھی کیا یا اس کے خلاف کیا؟! قیامت کے دن ان تینوں اعضاء سے سوال کیا جائے گا اور یہ سب وہی بتائیں گے جو انہوں نے تجھے بتایا تھا، پھر اگر زندگی میں تم اِن کے خلاف چلے تھے تو یہ تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔

اسی بات کو سورہ یسین کی آیت ۶۵ میں بیان کیا ہے:

ترجمہ: ''ان کے ہاتھ پاؤں بات کریں گے (بولیں گے) اور جو عمل انسان نے کیا ہو گا اس پر گواہی دیں گے''۔

وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

''اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل، بے شک تو نہ زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچے گا۔''

متکبرانہ چال کی ممانعت

باطل، غیر واقعی اور فرضی باتوں پر خوش ہونا صحیح نہیں ہے، بلکہ حق بات اور عدل وانصاف پر مبنی خوشی کا اظہار کرنا صحیح عمل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی نعمات کے حصول پر خوشحالی و شادمانی کا اظہار کرے اور اللہ کا شکر بجالائے کہ اس نے اسے ان نعمات سے نوازا ہے؛ لیکن یہ خوشحالی اعتدال سے آگے نہ بڑھے، کیونکہ اس سے انسان کے افعال واقوال میں

ہلکے پن اور کم عقلی ظاہر ہوتی ہے اور اس کی جھلک انسان کی گفتار و کردار میں نظر آتی ہے۔۔ ایسے شخص کی خوشحالی باطل اور نادرست ہے۔

اس آیتِ مبارکہ میں انسان کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ وہ تکبر کی بنا پر خود کو اپنی حقیقت و حیثیت سے زیادہ نہ سمجھے اور دوسروں پر مت اترائے اور ان پر اپنی بڑائی ظاہر نہ کرے؛ کیونکہ انسان کی یہ حالت، خالق و غالب پروردگار کی قدرت سے جہالت اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کے راہ چلنے کے انداز کو بیان کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال میں سب سے واضح اور دوسروں کو دکھائی دینے والا عمل، اُس کی چال ڈھال ہے۔

انسان کے انحراف کا اثر اُس کی چال ڈھال میں بڑا واضح نظر آرہا ہوتا ہے۔ اس تکبر اور جھوٹی بڑائی کی حالت کو توڑنے کے لیے اللہ نے فرمایا کہ راہ چلنے میں متکبرانہ چال نہ چلو، اکڑ اکڑ کر نہ چلو اور خود کو اپنی حیثیت سے زیادہ خیال مت کرو۔ ناشکری، غرور اور بے ہودہ خیالات کی بنیاد پر دوسرے کے سامنے متکبرانہ انداز نہ اپناؤ کیونکہ زمین پر اس انداز کی چال سے نہ تو تم زمین کا سینہ پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی بلندی اور اونچائی میں پہاڑ کی بلندی کو پا سکتے ہو؛ یعنی نہ تم پہار جیسے مستحکم اور اونچے ہو اور نہ ہی تمہارے قدموں میں یہ طاقت ہے کہ انہیں زمین پر مار کر زمین کا سینہ پھاڑ دو۔

ان دونوں مثالوں سے انسان کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ تم اللہ تعالی کی قدرت کے مظاہر کے سامنے انتہائی چھوٹے اور معمولی ہو۔ جو کچھ تیرے پاس ہے یہ سب اللہ تعالی کی عزت و قدرت اور عظمت سے ملا ہے۔ تجھ پر اور کائنات کی ہر شئی پر صرف خدا ہی کا تسلط و غلبہ ہے، و ہی قاہر اور مقتدر ہے۔ تجھے خدا ہی نے وجود عطا کیا، چلنے کی قدرت دی، تجھے بے شمار نعمات عطا کیں۔ ان سب میں تیر اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارا منصب، عہدہ، ظاہری حسن و جمال،

مملکت و سلطنت سب عارضی ہیں۔ انسان ان سب کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا بلکہ اللہ ہی ہے کہ جس نے ان عارضی امور کو انسان کی نظروں میں واقعیت و حقیقت قرار دیا ہے تاکہ وہ عمل کے دوران اور اپنی زندگی میں ان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی دُنیاوی زندگی کے معاملات کو انجام دے سکے۔ یہ سارے امور اللہ کے ارادہ کی سلطنت و قدرت کے تحت ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ آیت ۳۶ میں ارشاد فرمایا:

وَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾

ترجمہ: ''تمہارے لیے زمین پر استقرار، ٹھہراؤ اور آسائش کا مرکز قرار دیا ہے یہ سب ایک معین مدت تک ہے''۔

كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ﴿٣٨﴾

''ان میں سے ہر ایک بات تیرے رب کے ہاں ناپسند ہے۔''

اللہ کی جانب سے ممنوعہ امور

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے انجام دینے سے روکا ہے وہ سب معصیت اور گناہ کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کو انجام دینا انسان کے نقصان میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ اپنے بندوں کی بھلائی اور خیر چاہتا ہے لہٰذا اپنے بندوں کے لیے ان امور کو ناپسند فرماتا ہے جو ان کے نقصان میں ہیں۔ انسان کو خود سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس کے لیے حقیقت میں کیا بہتر ہے اور کیا نقصان دہ ہے، بلکہ ان امور کی حقیقت کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے جو انسان کا خالق ہے۔

ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَدْحُورًا ﴿٣٩﴾

''یہ اس حکمت میں سے ہے جسے تیرے رب نے تیری طرف وحی کیا ہے، اور اللہ کے ساتھ اور کسی کو معبود نہ بنا ورنہ تجھے معلون و مردود بنا کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

فرعی و شرعی احکام

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دین کے تمام فرعی احکام اور قوانین حکمت اور مصلحت کے تحت ہیں۔ ہر قانون کے پیچھے ایک حکمت و فلسفہ ہے جس کو سامنے رکھ کر وہ قانون بنایا گیا ہے اور انسان کی فطرت کے مطابق ان قوانین کو وضع کیا گیا ہے۔ ان کی پابندی کرنا انسان کو کامیابی اور کامرانی سے بہرہ ور کردے گا۔

آخر میں توحید کی عظمت و اہمیت واضح فرمائی کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے، اس کے ساتھ کسی اور کو خدا قرار دینے کا نتیجہ جہنم ہے، اور مشرکین کو ذلت و رسوائی کے ساتھ جہنم میں پھینکا جائے گا؛ چنانچہ یہاں شرک سے منع فرما کر توحید پرستی پر زور دیا گیا ہے۔ یہ آیت اصل میں ابتداء اور انتہاء کے درمیان پیوند و نقطہ وصل ہے جس میں عقیدہ اور عمل دونوں کی بات واضح طور پر بیان کردی گئی ہے۔

اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ۠﴿۴۰﴾

''کیا تمہارے رب نے تمہیں چن کر بیٹے دے دیے اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنالیا، تم بڑی بات کہتے ہو۔''

مشرکین کے متعلق اللہ کا بیان

اس آیت میں اُن مشرکین کو مخاطب قرار دیا گیا ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے جب کہ ان کے نزدیک لڑکیاں اور عورتیں پست اور گھٹیا سمجھی جاتی تھیں؛ اسی لیے وہ بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے۔ آیت نے استفہامِ انکاری کے ذریعہ سوال کیا کہ کیا تمہارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر تمہیں مقدم رکھا ہے اور تمہیں لڑکے دے دیئے لیکن اپنے لیے فرشتوں کی صورت لڑکیاں قرار دی ہیں جو کہ لڑکوں سے پست ہیں؛ جبکہ تمہارا رب پوری کائنات کے وجود کا مالک ہے؟!۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جو مالک ہے وہ اپنے پاس پست اور گھٹیا چیز کو رکھے اور دوسروں کو برتر چیز دے دے جبکہ وہ لوگ خدا کو قبول بھی نہیں کرتے؟!۔ یہ خیال بہت ہی برا اور ناپسندیدہ ہے۔ مشرکین کی یہ بات بہت بڑی جسارت ہے اور دھوکہ ہے، جبکہ وہ خود ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں؛ کیونکہ یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

”اور ہم نے اس قرآن میں کئی طرح سے بیان کیا تاکہ وہ سمجھیں، حالانکہ اس سے انہیں نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے۔“

قرآن کی خصوصیت

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جس مطلب کو بیان کرنا ہوتا ہے اس مطلب کے پیش نظر اس کا تکرار کیا جاتا ہے۔ لفظ ”تصریف“ کا مادہ ”صرف“ ہے جس کا معنی یہ ہے کہ ایک مطلب کو بار بار اور کئی انداز سے بیان کیا جائے تاکہ سامع کے لیے بات واضح ہو جائے جبکہ نفر کا معنی فرار، نفرت اور دور بھاگنا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے قسم اٹھا کر فرمایا ہے کہ ہم نے توحید کے نظریہ کو مستحکم

کرنے اور شرک کی آلودگی کو بیان کرنے میں کئی انداز سے بات کی اور اس مطلب کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا تاکہ انکار کرنے والوں کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے، ان کا شک دور ہو جائے اور وہ توحید پرست بن جائیں، حقائق کو قبول کر لیں؛ لیکن اس کے باوجود انکار کرنے والے مشرکین اپنے انکار پر باقی رہے اور کسی صورت ہٹ دھرمی نہ چھوڑی۔ ان مطالب کے بیان کرنے کے بعد بھی انہیں سوائے گمراہی کے کچھ نہیں ملا، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس ثبوتوں اور دلائل کو سمجھنے اور درک کرنے کی صلاحیت اور لیاقت ہی نہیں ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

"کہہ دو اگر اس کے ساتھ اور بھی معبود ہوتے جیسا وہ کہتے ہیں تب تو انہوں نے عرش والے تک کوئی راستہ نکال لیا ہوتا۔"

مشرکین پر احتجاج

اس آیت میں مشرکین کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے کہ تم کس طرح کہہ رہے ہو کہ اللہ کے علاوہ اور بھی معبود ہیں کیونکہ اگر اللہ تعالی کے علاوہ دوسرے معبود بھی موجود ہوتے تو پھر وہ سارے مل کر عرش کے مالک اللہ تک پہنچنے اور عرش پر براجمان ہونے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرتے، اور پھر ہر معبود اس کائنات کی تدبیر کے لیے اپنا علیحدہ نظام پیش کرتا جیسے زمین کے معبود، آسمان کے معبود وغیرہ۔ اس صورت میں وہ سارے معبود اللہ تعالی کے مدمقابل آجاتے کیونکہ ملک اور مملکت و اقتدار کی ہوس فطری امر ہے، پس یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک خود کو معبود قرار دے اور دوسرے معبود کے ساتھ سلطنت و اقتدار کے حصول

کے لیے مزاحمت نہ کرے اور اپنی قدرت اور دائرہ اختیار کو نہ بڑھائے؟! یہی بات سبب بن جاتی ہے کہ دوسرے بہت سارے معبود مل کر "رب الارباب" خدا سے قدرت اور اقتدار و سلطنت کو چھین لینے اور اپنی مملکت کو وسعت دینے کی کوشش کرتے؛ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتے اور نہ ہی ایسا ہوا ہے، لہٰذا یہ سب جھوٹے اور خیالی معبود ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی تنہا معبود برحق ہے۔

سورہ صافات آیت ۱۵۹ میں ہے:

ترجمہ: "اللہ ان سب باتوں سے منزہ اور پاک ہے، جو کچھ یہ لوگ خدا کے بارے کہتے ہیں"۔

سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا ﴿۴۳﴾

"وہ پاک ہے اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے وہ بہت ہی بلند ہے۔"

اللہ کی عظمت و برتری

اللہ تعالیٰ بے انتہا بلند شان کا مالک ہے؛ بہت ہی بلند، جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ مشرکین کہتے ہیں ان کی باتیں انتہائی پست اور اللہ کی شان کے منافی ہیں۔ اللہ کی ذات ان باطل اور بے ہودہ خیالات و اندازوں سے بالاتر ہے۔ اللہ کی سلطنت، اللہ کا ملک بلند تر اور عظیم تر ہے جس تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ‌ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰـكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۴﴾

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ بردبار بخشنے والا ہے۔''

تمام موجودات کا تسبیح کرنا

یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت کا مضمون قیاسِ استثنائی ہے؛ جو بات آیت ۴۲ میں کہی گئی جس میں فرمایا: ''اگر اللہ کے ساتھ اور معبود اور خدا ہوتے تو یقینی امر ہے کہ وہ معبود اللہ کے ساتھ سلطنت اور مُلک میں جھگڑا کرتے، اللہ کے عرش کی سلطنت پر حملہ آور ہوتے، لیکن آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور جو کچھ ان میں موجود ہے یہ تو اللہ کے شریک ہونے کی نفی کر رہے ہیں اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے اور وہ خدا ہر قسم کے شریک سے منزہ و پاک ہے۔ اس بنا پر سب موجودات گواہی دیتے ہیں کہ اللہ لاشریک ہے، ہر چیز اسی سے وجود میں آئی ہے، اسی کی طرف ہر چیز نے پلٹ کر جانا ہے، سب کی موجودیت اللہ ہی سے ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے، سب اللہ کے حضور سجدہ ریز ہیں اور اللہ کی حمد و تسبیح بیان کر رہے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی میں معبود ہونے کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی موجود ہے وہ محض فقر اور احتیاج ہے، تمام موجودات اپنے وجود سے اللہ کی وحدانیت کو بیان کر رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص سے پاک ہے۔ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے، کیونکہ ہر ممکن الوجود اپنی ذات میں سوائے عدم اور محض فقر و احتیاج کے اور کچھ بھی نہیں ہے؛ لہٰذا تمام موجودات اپنی ذات میں، اپنی صفات میں، اپنے حالات میں، اللہ کے محتاج ہیں۔ اس پورے عالم اور سارے جہانوں میں جاری و ساری نظام اپنے تنوع کے باوجود ایک طرح سے منظّم طور پر ہو رہا ہے تو یہ سب اللہ کی ذات سے

وابستہ و قائم ہے۔ یوں اس حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا ہے کہ اس عجیب اور حیرت انگیز نظام کا خالق ایک ہی ذات ہے۔ گویا تمام موجودات نے اپنی احتیاج اور نقص کی موجودگی کے ذریعہ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ان کا خالق اللہ ہر نقص اور عدم سے مبرا اور پاک ہے۔ سب مخلوقات اللہ تعالی کی بڑائی بیان کرتی ہیں؛ یہاں تک کہ اللہ کے شریک قرار دینے والے اور تدبیر الٰہی کے دائرہ کو منحصر کرنے والے مشرکین بھی اپنے اسی عمل سے اللہ تعالیٰ کے منزہ اور مقدس ہونے کو ثابت کر رہے ہیں۔ جو انسان اپنے خالق کا منکر ہے وہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص بلند آواز لگا رہا ہو کہ اس پورے عالم میں ایک آدمی بھی موجود نہیں؛ جو بول رہا ہے وہ خود اس بات سے غافل ہے کہ خود اس کا یہی آواز دینا اُس کے دعویٰ کے خلاف ثبوت ہے۔

تمام موجودات کا باشعور ہونا

اللہ تعالیٰ کے کلام سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ تمام موجودات میں حیات بھی ہے اور علم و آگہی بھی؛ لہٰذا جو بھی مخلوق ہے اس میں علم اور شعور بھی ہے۔ ہر موجود میں جس قدر اس کے لیے وجود کا حصہ ہے اسی مقدار میں اس کے لیے علم و شعور و آگہی بھی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ موجودات میں سے کوئی ایسا موجود نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اللہ کی تسبیح و حمد بجا لا رہا ہے لیکن تم لوگ اس کی تسبیح و حمد کو سمجھتے نہیں ہو۔

ہر وجود اپنے موجود ہونے کا ادراک رکھتا ہے اور اپنے نقص و کمزوری سے بھی آگاہ ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ محض فقر و احتیاج ہے؛ چنانچہ وہ اپنی زبان سے نقص کا اظہار یوں کرتا ہے کہ اس کا خالق کمالِ مطلق ہے۔ اس کا ادراک ہی ایسا ہے کہ اللہ کے سوا اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اس کا رب اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ موجود اللہ تعالی کو تمام نقائص سے منزہ و پاک قرار دیتا ہے۔

دوسری جانب ہر موجود میں کچھ کمالات بھی ہیں جن کے بارے میں وہ بخوبی سمجھتا ہے کہ یہ کمالات خود اُس کی اپنی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ یہ کمالات بھی اُسی خدا کی طرف سے ہیں جس نے اسے وجود کی نعمت عطا کی ہے؛ یوں وہ اپنے خالق کی صفاتِ جمیلہ اور اچھے افعال کے ذریعہ مدح سرائی کرتا ہے؛ لیکن ہم انسان اس تسبیح و تحمید کو درک نہیں کرتے اور ان مخلوقات کی اپنے بنانے والے پر دلیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اور خدا کے وجود کی ان نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔

اللہ حلیم و غفور ہے

اللہ کی صفت ہے کہ وہ بردبار اور بخشنے والا ہے۔ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ اپنے نافرمان بندوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ جو چاہے وہ توبہ کرکے اللہ کی طرف واپس آجائے اور اللہ اسے معافی دے دے۔ یہ دو صفات حلم اور غفران اس بات کا ثبوت ہیں کہ اللہ تعالی ہر نقص سے منزہ و پاک ہے کیونکہ حلم کا لازمہ ہے کہ جب ایک موقع ہاتھ چلا جاتا ہے تو وہ اس فرصت کے جانے پر خوف میں مبتلا نہیں ہوتا اور غفران کا لازمہ یہ ہے کہ غلطی معاف کرنے والا اس عمل سے کچھ نقصان نہیں کرتا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور مُلک میں نقص موجود نہیں ہے اور یہ زوال پذیر بھی نہیں۔ اس کے لیے ہیشگی و دوام ہے۔ کمال مطلق اس کا خاصہ ہے۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

"اور جب توں قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت کو نہیں مانتے ایک چھپا ہوا پردہ قرار دے دیتے ہیں۔"

روز جزا کا انکار

ہم نے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ روزِ جزا کا انکار کرنا گویا اللہ کی توحید اور رسولؐ کی نبوت کا بھی انکار ہے کیونکہ اگر معاد اور واپسی کا دن نہ ہو تو پوری خلقت کی اساس و بنیاد باطل ہو جاتی ہے اور رسولوں کا بھیجنا بے فائدہ اور بے سود ہے۔ رسول اللہؐ کو خطاب ہے جب تم ان پر قرآن پڑھتے ہو تو جو قیامت کے منکر کافر ہیں ان کے اور تیرے درمیان ایک معنوی حجاب قرار دیتے ہیں کہ ان کی سمجھ ہی جاتی رہتی ہے۔ وہ ذکرِ خدا کو درک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تاکہ تیری پیغمبری پر ایمان لے آئیں اور قیامت و معاد کا عقیدہ قبول کر لیں۔ یہ کافر اس حقیقت کو درک کرنے سے عاجز و ناتواں ہیں یہی وجہ ہے کہ جب قرآن کے کلمات ان کے کانوں میں پہنچتے ہیں تو اس کی سماعت سے منہ موڑ لیتے ہیں۔[1]

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

"اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے کر دیے ہیں تاکہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے، اور جب تو قرآن میں صرف اپنے رب ہی کا ذکر کرتا ہے تو پیٹھ پھیر کر نفرت سے بھاگتے ہیں۔"

---

[1] ۔البتہ یہ حجاب قرار دینا ابتدائی مرحلہ میں نہیں ہے کیونکہ شروع میں تو ہر انسان کے اندر فطری استعداد اور صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک و رب کی معرفت حاصل کر لے اور اللہ کے رسول کو قبول کرے، قیامت پر ایمان لے آئے؛ لیکن انسان کے برے اعمال، غلط عقائد اور حرام خوری اس بات کا سبب ہے کہ ان میں حقائق کا ادراک کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ گویا یہ چیز اللہ تعالی کی طرف سے ان کے لیے سزا ہے کہ جب قرآن کی تلاوت ہو رہی ہوتی ہے تو ان کافروں اور قرآنی کلمات کے درمیان معنوی پردہ آجاتا ہے اور وہ توحید، نبوت اور قیامت کے عقیدہ کو سمجھنے سے عاجز رہتے ہیں اور ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں۔ (مترجم)

قرآن سننے پر کفار کی کیفیت

اس آیت میں کافروں کی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس پر توجہ نہیں دیتے، ایسا لگتا ہے کہ ان کے کان پتھر ہیں اور انہیں آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ یہ سب ان کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب بنائے ہیں، ان اسباب کو اپنانے کی وجہ سے ان کو قرآن کی سمجھ نہیں آتی۔

پہلے بیان کیا کہ جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوتے ہیں، ان کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو، ان کے کان بہرے ہیں اور آنکھیں اندھی۔ یہ لوگ ایمان کی صداقت کو سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ اسے کیسے قبول کریں گے۔ یہ سب ان کی اپنی بداعمالیوں اور برے کردار کا نتیجہ ہے۔ ان کا کفر و فسق اُن کے اپنے گناہ کا نتیجہ ہے جو انہیں ملا ہے۔

قرآن مجید نے اس نتیجہ کو بیان کیا ہے کہ ان کے کفر و فسق و فجور کی وجہ سے ہم نے ان کے کانوں پر بھی پردہ ڈال دیا ہے اور دلوں پر بھی؛ اب وہ قرآن کے حقائق کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا ادراک رکھتے ہیں۔ قرآن اللہ کی یکتائی اور وحدانیت کا ذکر کرتا ہے وہ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں، وہ اللہ کی ذات سے شرک کی نفی نہیں کرتے۔ اللہ کی یکتائی کا بیان سنتے ہی ان کی حالت بدل جاتی ہے۔ اس بیان سے نفرت کرتے ہیں اور پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور قرآن کو غور اور توجہ سے سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾

''ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ سنتے ہیں جب یہ لوگ تیری طرف کان لگاتے ہیں اور جس وقت آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں جب یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم محض ایسے شخص کا ساتھ دیتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔''

کافروں کا قرآن سن کر مسلمانوں کے بارے بیان

یہ آیت اصل میں سابقہ آیات میں کافروں کے بارے میں بیان کردہ مطلب کی دلیل اور وجہ کو بیان کر رہی ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ لوگ جن کانوں سے قرآن کو سنتے ہیں اور ان کا دل و دماغ جس سے وہ سارے کاموں کے بارے غور کرتے ہیں اس سے بخوبی آگاہ اور واقف ہیں؛ کیونکہ ہم نے انہیں خلق کیا ہے اس وجہ سے جو کچھ انہوں نے سنا ہے اور سن کر جو کچھ انہوں نے سوچا ہے، ہم ان کے خیالات کے بارے خود ان سے زیادہ آگاہ ہیں، جب وہ چپکے چپکے قرآن کی آیات سنتے ہیں اور پھر آپس میں مل بیٹھتے ہیں اور جو کچھ سنا ہوتا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہیں؛ خوف سے آہستہ بول رہے ہوتے ہیں کہ ان کی باتوں کا کسی اور کو پتہ نہ چلے۔ ان سمجھتے ہیں کہ مسلمان ایک ایسے شخص کی پیروی کرتے ہیں جو سحر زدہ ہے۔ ان کی یہ گفتگو بتا رہی ہے کہ وہ قرآن کو سمجھتے ہی نہیں اور قرآن کے پیغام کو درک ہی نہیں کرتے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٤٨﴾

''دیکھ تیرے لیے کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں سو گمراہ ہو گئے پھر وہ راستہ نہیں پا سکتے۔''

رسول اللہؐ سے خطاب

اس آیت میں رسول اللہؐ سے خطاب ہے کہ ان کافروں کی باتوں کو سنو اور ان کے خیالات و بیانات کا نظارہ کرو کہ وہ آپ کے لیے کیسی مثالیں لے آتے ہیں اور اپنی صفات کا اللہ

سے تقابل کرتے ہیں!!!۔ یہ لوگ انحراف میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اب ان کے ایمان لانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی، ان کی گمراہی حتمی ہے۔ یہ لوگ ہرگز ہدایت کا راستہ نہیں پا سکتے۔ اسی حوالے سے ایک اور جگہ فرمایا:

"ان کے لیے فرق نہیں کرتا کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے"۔[1]

یہ کافروں کی صورتحال تھی جسے قرآن مجید نے ان آیات میں بیان کیا ہے۔

وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

"اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے پھر نئے بن کر اٹھیں گے۔"

مشرکین کا اپنی طاقت کا اللہ کی قدرت سے تقابل

مشرکین کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنی طاقت و قدرت کا تقابل اللہ کی قدرت سے کرتے ہوئے یوں کہتے: "جب انسان مر جاتا ہے اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جاتی ہیں تو ان کو پھر کیسے اصل شکل میں لایا جا سکتا ہے؟!"۔

یہ لوگ اس مسئلہ کو اپنے اوپر قیاس کرتے کہ ہم تو ایسا نہیں کر سکتے پس اللہ کس طرح کر سکتا ہے؟! جب ہم لوگ مرے ہوئے کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے تو پھر اللہ کیسے اسے زندہ کرے گا؟! لہٰذا موت کے بعد زندگی محال ہے کیونکہ موت سے ہمارا بدن فاسد ہو جاتا ہے۔ اس کا کچھ بھی سالم نہیں رہتا تو پھر ہم کس طرح نئے سرے سے زندہ ہو جائیں گے؟!، لہٰذا قیامت کے دن اٹھایا جانا ناممکن ہے۔

سورہ ق آیت ۳ میں ان کا قول یوں نقل ہوا ہے:

---

[1]۔ سورہ بقرہ، آیت ۶/ سورہ یسین آیت ۱۰۔

ترجمہ: ”کیا جب ہم مر جائیں گے، مٹی ہو جائیں تو پھر واپسی تو دُور کی بات ہے، ایسا نہیں ہو سکتا“۔

جبکہ اللہ کی قدرت کا محدود اختیار اور محدود قدرت سے قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت غیر محدود ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے تمام موجودات کو عدم سے خلق کیا ہے اُسی طرح ان موجودات کو مارنے کے بعد دوبارہ اسی حالت میں زندہ کر سکتا ہے جس طرح وہ پہلے تھے۔

سورہ روم آیت ۲۷ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ”مرے ہوؤں کو دوبارہ زندہ کرنا تو یہ اللہ کے لیے زیادہ آسان ہے“۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾

”کہہ دو تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ۔“

اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

”یا کوئی اور چیز جسے تم اپنے دلوں میں مشکل سمجھتے ہو، پھر وہ کہیں گے ہمیں دوبارہ کون لوٹائے گا، کہہ دو وہی جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے، پھر تمہارے سامنے سروں کو ہلا کر کہیں گے کہ وہ کب ہوگا، کہہ دو شاید وہ وقت بھی قریب آ گیا ہو۔“

معاد کے منکرین کے لیے جواب

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے معاد کے منکرین کو جواب دیا ہے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ ان مشرکین کو اس طرح جواب دو کہ تمہاری نگاہ میں پتھر، لوہا یا اس سے کوئی بڑی چیز ہے تو وہ فرض کرلو اگر اس شکل میں مرنے کے بعد ہو جاؤ تب بھی اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ انسان کو اس کی اصل شکل میں دوبارہ زندہ کرے۔ اللہ قدرت مطلقہ کا مالک ہے۔ جب تم ان مشرکین کو یہ جواب دوگے تو وہ پھر کہیں گے کہ وہ ذات کون ہے جو ہمیں مرنے کے بعد اصلی شکل میں دوبارہ بنادے گی؟ تو ان کا جواب دو: وہی قدرت رکھنے والا خدا ہے جس نے تمہیں پہلے خلق کیا ہے، تمہیں عدم سے وجود دیا، تم کچھ نہ تھے اور اس نے تمہیں خلق کیا۔ وہی قادر ہے کہ موت کے بعد ان بوسیدہ ہڈیوں پر نئے سرے سے گوشت چڑھادے اور پورا بدن و جسم اپنی پہلی شکل میں ہو جائے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو فاطر کی صفت سے یاد کیا گیا ہے تاکہ مشرکین جس بات کو ناممکن سمجھ رہے تھے یا جسے مشکل خیال کرتے تھے، ان کا وہ خیال بدل جائے اور ان کے پاس انکار کی گنجائش نہ رہے۔

لیکن اس واضح ثبوت اور دلیل کے بعد بھی کافر لوگ غرور اور تکبر کی بنا پر کہیں گے کہ یہ واقعہ کب ہوگا؟ تو اے میرے رسولؐ تم ان کو بتادو: ہو سکتا ہے کہ ایسا ہونا قریب ہی ہو، کیونکہ اس وقت کے بارے کسی کو آگہی نہیں ہے۔ یہ امر، غیبی امور سے ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے اور غیبی امور پر فقط اللہ کا ہی علمی احاطہ ہے، کسی اور کو اس تک رسائی نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید وضاحت سے بتایا کہ جو کچھ تم خیال کر رہے ہو اس کا جواب تمہارے لیے موجود ہے لیکن مشرکین اپنی ہٹ دھرمی، غرور اور تکبر کے باعث حقائق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٥٢﴾

''جس دن تمہیں پکارے گا پھر اس کی تعریف کرتے ہوئے چلے آؤ گے اور خیال کرو گے کہ بہت ہی کم ٹھہرے تھے۔''

قیامت کا دن

اس آیت میں پکار اور دعوت سے مراد وہی نفخہ صور اور غیبی ندا ہے کہ جس سے سب زندہ ہو جائیں گے۔ آوازِ استجابت سے مراد مُردوں کا قبروں سے حمد کرتے ہوئے باہر آنا ہے۔ حمد کرنے کی حالت میں اٹھنے کی وجہ یہ ہے کہ مُردوں کا زندہ ہو جانا ایک پسندیدہ عمل ہے جو اللہ کی جانب سے ہوا ہے لہٰذا لوگ زندہ ہوتے ہی اللہ کی حمد اور تعریف کریں گے کیونکہ وہ دن ایسا ہے جس میں سارے حقائق آشکار اور روشن ہو جائیں گے اس وقت انہیں یقین ہو جائے گا کہ مُردوں کا دوبارہ زندہ ہو جانا اور قیامت کا بپا ہونا ایک یقینی امر ہے جو واقع ہو چکا ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں اور نہ ہی انکار کی کوئی گنجائش ہے اور یہ سب کچھ اللہ کی حکمت و مصلحت کے تحت ہے۔

موت اور دوبارہ زندہ ہونے پر لوگوں کا بیان

جب مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے تو وہ اس وقت یہ کہیں گے کہ ان کے مرنے اور اب دوبارہ زندہ ہونے کا درمیانی عرصہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کی یوں تائید کی ہے:

''وہ کہے گا (جی ہاں) تھوڑے عرصہ کے سوا تم زیادہ نہیں ٹھہرے، یعنی تمہارا مرنے کے بعد برزخ میں ٹھہرنا بہت ہی تھوڑا عرصہ تھا''۔[1]

---

[1] ۔ سورہ مؤمنون، آیت: ۱۱۴۔

اس بیان کی روشنی میں آیت کا معنی یہ ہے کہ جس دن تمہیں اٹھایا جائے گا اور اللہ کی دعوت پر تمہیں پکارا جائے گا، تم تو ایسے تھے کہ دُنیا میں قیامت کے دن کا مذاق اڑاتے تھے آج جبکہ تمہارے لیے قیامت کا دن محقق ہو چکا ہے؛ اللہ کی پکار کو قبول کرتے ہوئے اور اس پر حاضر ہونے کی ندا دیتے ہوئے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوگے اور ایسی حالت میں اٹھوگے کہ اس واقعہ کی بابت اللہ کی تعریف کروگے اور تم اس وقت یہ خیال کروگے کہ تم تو قبروں میں تھوڑی دیر رکے ہو، موت اور قیامت کے وقوع پذیر ہونے کا فاصلہ تھوڑا ہے۔ تو یہ ایسا ہی ہو گا۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾

''اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو، بے شک شیطان آپس میں لڑا دیتا ہے، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

مومنین سے خطاب

اس جگہ بندوں سے مراد مومنین ہیں، پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میرے مومن بندوں سے کہو وہ دوسروں کے ساتھ اچھی گفتار کریں، باادب بولیں، بیان میں سختی نہ ہو، ناسزا اور برے الفاظ مت کہیں۔ برے الفاظ کا انجام بھی اسی طرح ہے جس طرح کسی کو گالی دی جاتی ہے کیونکہ ناشائستہ گفتگو شیطان کا ایک دھوکہ ہے، کیونکہ شیطان چاہتا ہے انسانوں کے درمیان فتنہ و فساد ایجاد کرے، وہ تو انسانوں کا دشمن ہے۔ اسے انسانوں کا آپس میں پیار اور دوستی قبول نہیں ہے۔ مومنین اس امر کی طرف متوجہ رہیں۔

رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِكُمۡ ؕ اِنۡ يَّشَاۡ يَرۡحَمۡكُمۡ اَوۡ اِنۡ يَّشَاۡ يُعَذِّبۡكُمۡ ؕ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا ﴿۵۴﴾

''تمہارا رب خوب جانتا ہے، اگر چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تمہیں عذاب دے، اور ہم نے تجھے ان پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔''

اللہ کا رحمت کرنے یا عذاب دینے کا اختیار

یہ آیت، سابقہ آیت کے تسلسل میں ہے جس میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ ہم نے مومنین کو سخت بات نہ کرنے کا حکم دیا ہے، دوسروں کی شقاوت یا سعادت کے بارے بات نہ کریں، دوسرے کے ساتھ سختی سے پیش نہ آئیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کے باطن سے آگاہ ہے؛ لہٰذا جو لوگ ایمان لا چکے ہیں تو وہ دوسروں کی سعادت و شقاوت کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں، کیونکہ وہ اپنے نامحدود علم اور اپنی حکمت کے تحت استحقاق کے معیار کے مطابق جزا و سزا دیتا ہے۔ جزا و سزا کا قانون ایمان اور عمل صالح کی شرط پر ہے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: رسول اللہؐ بندوں پر وکیل نہیں ہیں، ہم نے آپ کو لوگوں کا وکیل و نگہبان قرار نہیں دیا یعنی مومنین صرف رسولِ خداؐ کی ذات کو اپنی نجات اور کامیابی کی دلیل بنانے کی بجائے آپؐ کے لائے ہوئے دین کی پیروی میں اپنی سعادت و شقاوت کو تلاش کریں۔ اگر دین کی پیروی نہ کریں اور یہ سوچیں کہ صرف رسول اللہؐ انہیں بچا لیں گے تو ایسا خیال درست نہیں ہے، لہٰذا اگر پیروی کریں گے تو فائدہ ہوگا۔[1]

[1]۔ چنانچہ سورہ نسا آیت ۱۲۲ میں فرمایا: ''نتیجہ کا دار و مدار تمہاری یا اہل کتاب کی آرزوؤں کے تحت نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کے برے عمل کی سزا دی جائے گی۔''

اللہ تعالیٰ کا واضح قانون ہے کہ کامیابی کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے لہٰذا دونوں کا ہونا ضروری ہے؛ ایمان کے بغیر عمل صالح اُخروی نجات کا ذریعہ نہیں ہے؛ جس طرح عمل صالح کے بغیر، ایمان بے فائدہ اور جھوٹ ہے۔

وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

"اور تیرا رب خوب جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور ہم نے داؤد کو زبور دی تھی۔"

خدا کا سارے حالات سے آگاہ ہونا

اس آیت کے شروع میں سابقہ آیت میں بتائے گئے مطلب کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تمہارے حالات سے، خود تم سے زیادہ آگاہ ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ ان سب کے بارے آگاہ ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر انسان کے بارے بھی اللہ ہی آگاہ ہے۔

انبیاء میں برتری

اس کے بعد بیان کیا کہ انبیاء سب برابر نہیں ہیں بلکہ بعض کو بعض پر برتری حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت داؤدؑ کی برتری کو بیان کیا کہ ہم نے اسے کتاب زبور عطا کی۔ زبور کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بہترین جملوں میں بیان کی گئی تھی اس طرح اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو تشویق کیا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ باادب گفتگو کریں۔ آپس میں بات چیت میں نرم انداز اپنائیں، ترش کلامی سے گریز کریں، بات کرتے ہوئے

اچھے الفاظ کا انتخاب کریں اور اپنی بات کو خوبصورت بنا کر پیش کریں۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

''کہہ دو انہیں پکارو جنہیں تم اس (اللہ) کے سوا سمجھتے ہو، وہ نہ تمہاری تکلیف دور کر سکیں گے اور نہ اسے بدلیں گے۔''

اللہ کے سوا دوسروں سے مدد طلب کرنا

اس جگہ مشرکین کو چیلنج کیا ہے کہ تم نے جو اپنے لیے جھوٹے خدا بنا رکھے ہیں ان سے اپنی حاجات روائی مانگو وہ تمہاری کوئی مدد نہ کریں گے کیونکہ ان میں ایسی لیاقت موجود نہیں، نفع یا نقصان کسی کو دینا یہ فقط اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا کرنا ربوبیت کی خصوصیات سے ہے۔ مشرکین کے خیالی خداؤں میں ایسی قدرت نہیں ہے کیونکہ وہ صفت ربوبیت نہیں رکھتے جہاں کا نظام ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ نہ تو ان مشرکین سے مصیبت کو ٹال سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان کو منفعت میں بدل سکتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ معبود حقیقی اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ وہی سب کا خالق ہے اور وہی سب کے امور کا ادارہ کرنے والا ہے۔ وہ ہی رب ہے جب ایسا ہے تو وہ الہ و معبود ہے، کوئی اور نہیں اللہ کے سوا کسی کے پاس مخلوقات کے امور کے ادارہ کرنے اور انہیں چلانے کا اختیار نہیں ہے۔ سب محتاج اور مخلوق ہیں، خود مخلوق ہونا اعتراف ہے کہ وہ رب نہیں ہے، رب وہی ہے جو خالق ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

''وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں جو ان میں سے زیادہ مقرب ہیں وہ بھی اپنے رب کی طرف نیکیوں کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں اور اس کی مہربانی کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔''

مشرکین کی خواہشات

مشرکین جن فرشتوں، جنات اور انسانوں کی پوجا کرتے ہیں وہ سب خود بھی اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے وسیلہ کی تلاش میں ہیں تاکہ اس طرح اللہ کے نزدیک ہو جائیں اور اس راستہ پر چلیں جو انہیں اللہ کے قریب کردے اور اس وسیلہ کی پیروی کریں جو وسیلہ انہیں اللہ تک پہنچا دے۔ سب کے سب زندگی کی حاجات اور اپنے وجود کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اسی کی امداد چاہتے ہیں اور اسی کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ کے عذاب کے ڈر سے اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی معصیت سے بچتے ہیں، کیونکہ تیرے رب کا عذاب ایسا ہے کہ جس سے حقیقت میں بچنا چاہیے۔

مشرکین اللہ سے توسل کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے فرشتوں اور جنات وغیرہ کی عبادت کرتے ہیں اور انہوں نے دیگر وہمی وسائل بنا رکھے ہیں۔ وہ لوگ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر ان وسائل کی عبادت کرتے ہیں۔ جن وسائل کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے وہ سب خود اللہ کے محتاج ہیں۔ انہوں نے اپنے اس مشرکانہ عمل سے، اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر ان وسائل کو ربوبیت کا عنوان دے دیا اور ان کی عبادت شروع کردی۔ یوں ان وسائل کو اللہ کا شریک بنالیا، جبکہ وسائل کو استقلالی حیثیت دینا اللہ کی ربوبیت کا انکار ہے۔

اسلام میں توسل کا نظریہ

اسلام میں توسل کا عقیدہ موجود ہے اور خاص طور پر مکتب اہل البیتؑ کے پیروکار جنہوں نے اسلام کو اہل بیت علیہم السلام سے لیا ہے، ان کے ہاں توسل کا عقیدہ بڑا واضح ہے۔

وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

" اے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور واپس جانے کے لیے وسیلہ کی جستجو کرو"۔[1]

یہ عقیدہ صحیح و معقول ہے کہ اللہ تک جانے کے لیے وسیلہ بناؤ۔ شیعہ حضرات آئمہ اہل البیت علیہم السلام اور خود حضور پاک ﷺ کو اپنے لیے وسیلہ قرار دیتے ہیں، لیکن ان کے لیے استقلالی حیثیت کے قائل نہیں ہیں، بلکہ انہیں اللہ کے ارادہ کے تحت اپنے لیے وسیلہ مانتے ہیں۔ انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے اور نہ ہی ان کی عبادت کے قائل ہیں۔ وہ اللہ کے نیک بندگان میں سے ہیں۔ شیعہ حضرات اپنی پریشانیوں میں، دعا کے وقت اللہ کی بارگاہ میں ان کی شفاعت کو وسیلہ بناتے ہیں۔ انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ عبادت اور تمام امور کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور سارے جہان کے معاملات اللہ کے ارادہ کے تحت چل رہے ہیں۔ اللہ کے امور ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اللہ کی توحید اور ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اطاعت اللہ کی ہے البتہ اللہ کے مقرب بندے اُسی کے اذن اور اجازت سے گناہگار بندوں کے لیے اللہ کے پاس شفاعت کرتے ہیں اور اللہ اور مخلوق کے درمیان رحمت رسائی کا واسطہ بنتے ہیں۔

وَ اِنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۵۸

"اور ایسی کوئی بستی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا اسے سخت عذاب نہ دیں، یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔"

---

[1]۔ سورہ المائدہ، آیت: ۳۵

قیامت سے پہلے سب کی موت

اس آیت میں اللہ نے اپنا قانون بیان کیا ہے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ہم قیامت سے پہلے تمام اقوام اور آبادیوں کو طبعی موت دیں گے یا ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر ایسا عذاب بھیجیں گے کہ وہ سب ہلاک ہو جائیں گے اور ان پر اچانک باہمی موت آئے گی۔ اس کے بعد قیامت بپا ہو گی، یہ بات لوح محفوظ[1] میں درج شدہ ہے اور ایسا ہونا اللہ کا حتمی فیصلہ ہے۔

"عذاب شدید" قیامت سے پہلے ہے اور اس سے مراد عذابِ الٰہی سے کسی قوم کا بالکل نام و نشان مٹا دینا اور انہیں مکمل طور پر ختم کر دینا ہے جیسا قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط بارے قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔

وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ کَذَّبَ بِہَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ وَ اٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَۃَ مُبۡصِرَۃً فَظَلَمُوۡا بِہَا ؕ وَ مَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ﴿۵۹﴾

"اور ہم نے اس لیے معجزات بھیجنے موقوف کر دیے کہ پہلوؤں نے انہیں جھٹلایا تھا، اور ہم نے ثمود کو اونٹنی کا کھلا ہوا معجزہ دیا تھا پھر بھی انہوں نے اس پر ظلم کیا، اور یہ معجزات تو ہم محض ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔"

---

[1]۔ لوح محفوظ: اس سے پہلے ہم نے لوح محفوظ بارے بیان کیا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا حقیقی وجود ہے وہ خیالی نہیں۔ یہ کتاب اللہ کے علم سے عبارت ہے اور اللہ کے محضر میں ہے جس میں ماضی، حاصل آئندہ کے سب واقعات و حادثات جزئی و کلی سب کے سب موجود ہیں۔ حقیقت میں یہ کتاب مبین الٰہی سے مراد ایمان اور خارجی موجودات کا اپنے تمام حالات و کیفیات و حادثات و واقعات کے مطابق ہونا مراد ہے اور ان کی موجودیت کا حتمی ہونا اس علت تامہ کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے یہ سب موجود ہوئے ہیں۔

اللہ کا معجزات اور آیات کو بھیجنا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کو بیان کیا ہے کہ ہم معجزات اور آیات کو لوگوں کے مطالبے پر بھیجتے رہے۔ اس درخواست سے مراد قریش مکہ یا باقی اقوام کی طرف سے کیے گئے مطالبے ہیں کہ مثلاً مردوں کو زندہ کردیں یا صفا پہاڑ کو سونے میں تبدیل کردیں، وغیرہ۔ اس قسم کے مطالبات میں نہ تو کوئی منفعت و مصلحت مدنظر تھی اور نہ ہی اس سے کسی کا کوئی مادی فائدہ تھا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب اگر ہم نے قریش مکہ کے مطالبے پر معجزہ نہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ہم ایسا کردیتے تب بھی وہ ایمان نہ لاتے، اور جب وہ انکار کردیتے تو پھر ان کو سخت ترین عذاب دیا جاتا اور ان کا مکمل خاتمہ ہو جاتا جیسا سابقہ اُمتوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔

یہ اللہ کی سنت اور طریقہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے پیغمبر سے کسی خاص معجزہ کا تقاضا کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ہم اس کو دیکھنے کے بعد ایمان لائیں گے لیکن ایمان نہیں لاتے تو پھر اس قوم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے؛ جیسا کہ قوم ثمود کے لیے ہوا۔ انہوں نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ پہاڑ سے دودھ دینے والی ایک اونٹنی نکل آئے، ہم نے ایسا ہی کردیا۔ بڑا واضح اور روشن معجزہ تھا جسے ان لوگوں کی بصیرت اور ایمان کا سبب ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ ایمان نہ لائے بلکہ اس اونٹنی پر ظلم کیا اور اسے قتل کردیا۔ اپنے اس عمل سے وہ سخت ترین عذاب کے مستحق ٹھہرے، لہٰذا انہیں اسی وجہ سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

پروردگار نے فرمایا کہ ہم نے اپنے رسول مصطفیٰ ﷺ کو معجزات دے کر بھیجا ہے جو ان کی حقانیت پر دلیل ہیں؛ لیکن جو معجزات یہ امتی مانگ رہے ہیں معلوم ہے کہ وہ ان معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائیں گے اور ایمان نہ لانے کی صورت میں ان پر ہمارا سخت

ترین عذاب اُترے گا اور وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیئے جائیں گے۔

اُمت محمدیہ ﷺ کے لیے پروردگار کا ارادہ ہے کہ انہیں مہلت دی جائے لہٰذا ان کے مطالبہ کیے گئے معجزات کو ہم نے ظاہر نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے رسولؐ کے پاس معجزات نہیں ہیں، لیکن جو وہ درخواست کر رہے ہیں وہ ہم نہیں دکھا رہے۔ یہ ہمارے عجز کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ان کے مطالبے کو پورا کرنا اُن کی مصلحت میں نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ ایسے معجزات کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

معجزات بھیجنے کی غرض اور اس کا اصل مقصد لوگوں کو ڈرانا اور اُنہیں سمجھانا ہوتا ہے کہ یہ رسول، اللہ کا نمائندہ ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سب برحق ہے، اس کی بات کو قبول کرو۔ اگر ایسی نشانی اور معجزہ دیا جائے کہ جس کا انکار تباہ کن عذاب کے آنے کا باعث ہو یعنی جس میں دنیا کی ہلاکت اور آخرت کا عذاب ہو، تو ایسے معجزے کو اُمت محمدیہ ﷺ کے لیے ظاہر نہیں کیا گیا؛ لیکن ایسے معجزات جن میں ہدایت دینا مقصود ہو اور اگر لوگ اُن معجزات کا انکار بھی کر دیں تو اس پر آخرت کا عذاب ہو لیکن دُنیاوی عذاب سے بچے رہیں، ایسے معجزات اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھیجے گئے۔[1]

---

[1] ۔اس میں ایک واقعہ یہ ہے جب علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کے بعد رسول اللہؐ مدینہ واپس آئے اور حارث فہری نے کہا کہ اگر یہ سچ ہے تو پھر آسمان سے پتھر آئے اور اسے ہلاک کر دے۔ اس نے ایسا معجزہ مانگا وہ سوچ رہا تھا کہ رسول اللہؐ کی موجودگی میں ہلاک کرنے والا عذاب نہ آئے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی خواہش پر عذاب اُتار دیا اور یہ واضح فرما دیا کہ اگر قریش مکہ کے مطالبات پر معجزات بھیجے جاتے اور انکار کرتے تو جیسا کہ اللہ کا طریقہ تھا، پھر سب صفحہ ہستی سے مٹ جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور امت محمدیہ کے لیے ایسے معجزات نہیں بھیجے۔ (مترجم)

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۠﴿۶۰﴾

"اور جب ہم نے تم سے کہہ دیا کہ تیرے رب نے سب کو قابو میں کر رکھا ہے، اور وہ خواب جو ہم نے تمہیں دکھایا اور وہ خبیث درخت جس کا ذکر قرآن میں ہے ان سب کو ان لوگوں کے لیے فتنہ بنا دیا، اور ہم تو انہیں ڈراتے ہیں سو اس سے ان کی شرارت اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔"

پیغمبر اکرمؐ کا خواب اور شجرہ ملعونہ

احتمال یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا خواب اور شجرہ ملعونہ کی داستان، دو انتہائی اہم واقعات ہیں جو بہت جلد انسانوں کے لیے رونما ہوں گے، یا آیات کے نزول کے دوران وقوع پذیر ہو چکے ہیں جن کی بنا پر لوگ فتنہ سے دچار ہوئے اور ان کے درمیان فساد رائج ہوا اور سرکشی واستکبار نے پرورش پائی۔

یہاں پر ایک بات یہ ہے کہ عربی زبان میں نسب نامہ کو شجرہ کہا جاتا ہے (اردو میں بھی شجرہ ہی استعمال ہوتا ہے، سادات کا شجرہ یعنی نسب نامہ) تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسے شجرے، نسب نامے، اقوام و قبائل ہیں جن پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ یہ بات مشرکین، منافقین اور اہل کتاب کے لیے ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی، اس بنا پر یہ بات وقوع پذیر ہو چکی ہے؛ لیکن تاریخ اسلام کا پوری وقت اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مشرکین اور اہل کتاب اس آیت کے مصداق نہیں ہیں، لہٰذا صرف منافقین ہی بچ جاتے ہیں جو اسلام میں تو داخل ہو گئے لیکن انہوں نے تفرقہ ایجاد کیا، تکبر

کیا، تفاخر کیا، اُمت کو فرقہ فرقہ کر دیا۔ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو خواب میں شجرہ ملعونہ (لعنتی نسب نامہ والے افراد یا اقوام) دکھایا۔ اس کے بعد قرآن مجید میں اس کا بیان کر دیا کہ ہم نے جو خواب میں آپ کو دکھایا ہے اور اسلام میں ان کے اعمال کا کچھ حصہ آپ پر نمایاں کیا ہے تو یہ اُمت اسلامی میں ایک فتنہ ہے۔ تو اس صورت میں احاطہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم کا احاطہ ہے یعنی یہ سب اللہ کے علم میں ہے اور اللہ کی قدرت کے دائرہ میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی بیان کیا کہ لوگوں کا شیوہ اور طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلسل فسق و فجور اور گزرے ہوئے لوگوں کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں، ہم نے جو واقعہ آپ کو بیان کیا ہے اور جو شجرہ ملعونہ دکھایا ہے تو ہمارا ان پر احاطہ علم ہے اور وہ ہماری قدرت کے دائرہ میں ہیں۔

اللہ کی سنت

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم لوگوں کو موعظہ کرتے ہیں اور خوف دلانے والی نشانیاں جیسے سیلاب، زلزلہ، وغیرہ بھیجتے ہیں، اس طرح ہم انہیں ڈراتے ہیں، لیکن ان پر ہماری آیات کا اثر الٹا ہوتا ہے، ان کی سرکشی اور بڑھ جاتی ہے، ہمارے موعظہ اور ڈرانے والی آیات سے نہ فقط اثر نہیں لیتے بلکہ پہلے سے زیادہ نافرمانی شروع کر دیتے ہیں اور ان کی حق کے ساتھ دشمنی مزید بڑھ جاتی ہے، وہ حق سے مخالفت کی تمام حدیں عبور کر جاتے ہیں۔

اہل سنت اور شیعہ دونوں کے حدیثی منابع میں یہ بات آئی ہے کہ شجرہ ملعونہ سے مراد بنی اُمیہ ہیں اور ان کا اُمت میں رخنہ ڈالنے کے حوالے سے کردار، ان کے تمام مظالم اور ان کے انحرافات کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دکھا دیا تھا۔ گویا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ ﷺ کو دلاسہ دیا ہے کہ اے میرے پیارے! آپ کو معلوم ہے

کہ یہ شجرہ ملعونہ مسلمانوں کے لیے فتنہ وآزمائش ہے اور یہ سب ہمارے علم میں ہے؛ ان کی سرکشی اور ظلم کی انہیں سخت سزا ملے گی۔[1]

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا ﴿۶۱﴾

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب سجدہ میں گر پڑے، کہا کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے۔"

ابلیس کا انکار

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ابلیس شیاطین کا باپ ہے اور جنات کی نسل سے ہے۔ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور آدم کا سجدہ نہ کیا بلکہ متکبرانہ انداز میں یہ کہہ دیا کہ میں اس کا سجدہ کروں جو مٹی کے گارے سے بنایا ہے؟! اس کا سجدہ سے انکار گمراہی اور ظلم کی وجہ سے تھا اور اللہ کی آیات سے پہلو تہی اور منہ موڑنے کے مترادف تھا۔ اسی طرح وہ بنی آدم کو سرکشی اور نافرمانی پر اکساتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ الٰہی آیات سے رُخ موڑ لیں، اس طرح وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ لہٰذا ایک طرف سے الٰہی امتحانات نے انسان کا احاطہ کر رکھا ہے اور دوسری طرف ابلیس اپنے لشکریوں کے ساتھ انسان پر حملہ آور ہے۔ اس کے شر سے اللہ کے مخلص بندے ہی بچ سکتے ہیں جو ان تمام آزمائشات سے سرخرو ہو کر نکلتے ہیں، وہی سربلند وسرفراز ہیں، حضرت رسول اللہ ﷺ کی تسلیت کی خاطر کہ وہ اپنے زمانہ کے مشرکین کے

[1] ۔کتاب الدر المنثور ج ۴ ص ۱۹ پر روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے حکم بن ابی العاص کی اولاد کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے منبر پر بندروں کی مانند اچھل کود کر رہے ہیں، میں اس سے غمزدہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

رویہ سے پریشان نہ ہوں، یہ بات جان لو کہ انسان کی نسل شروع دن سے ایسے ہی رہی ہے کیونکہ شیطان ابلیس نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرے گا اور انھیں اللہ کا باغی بنائے گا۔ جو لوگ شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر شیطان کو غلبہ دے دیا ہے کیونکہ اس کا سبب خود انسان ہے اور جو اس کے شر سے خود محفوظ رکھتے ہیں میری آیات سے موعظہ و نصیحت لیتے ہیں، حق پر چلتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں تو ان پر شیطان کا تسلط و غلبہ نہیں ہے۔ ان کے لیے ہدایت ہے اور وہی اللہ کے مخلصین بندے ہیں۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾

"(ابلیس نے) کہا بھلا دیکھ تو یہ شخص جسے تو نے مجھ سے بڑھایا ہے اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں بھی سوائے چند لوگوں کے اس کی نسل کو قابو میں کر کے رہوں گا۔"

شیطان کا گستاخانہ انداز

ابلیس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: یہ وہ (آدم) ہے جسے تو نے میرے اوپر برتری دی ہے۔ میں نے اس کا سجدہ نہیں کیا تو تم نے مجھے اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ تم نے مجھے اس کے سجدہ کا حکم دیا تھا؟ میں قسم اُٹھاتا ہوں کہ اگر تم مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دے دے، جس قدر زمین پر انسان کی عمر ہے مجھے اتنی دیر زندہ رکھا جائے، تو میں انسانوں کے ہر ہر شخص کو اسی طرح لگام لگاؤں گا جس طرح حیوانوں کو لگام لگائی جاتی ہے۔ ان کے امور کو اپنے ہاتھ میں لے لوں گا اور انہیں تیری معصیت پر ابھاروں گا، تھوڑے افراد جو مخلصین ہیں وہ میرے شکار سے بچ پائیں گے۔

اس جگہ ابلیس نے اللہ سے یہ کہا کہ تو نے مجھے معصیت پر سزا دی ہے اور انسان کو مجھ پر برتری دی ہے تو اس کے امتحان کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے اس وقت تک زندہ رکھا جائے جب تک انسان نے اس زمین پر رہنا ہے، تاکہ میں انہیں تیری معصیت پر اُکساؤں۔ یوں معلوم ہو جائے گا کہ کون جو مجھ سے برتر ہے؟ کیونکہ مجھ سے برتر وہی ہوں گے جو تیری معصیت نہ کریں گے اور وہ بہت ہی تھوڑے بچ جائیں گے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

"(اللہ نے) فرمایا جا، پھر ان میں سے جو کوئی تیرے ساتھ ہوا تو جہنم تم سب کی پوری سزا ہے۔"

ابلیس کے لیے مہلت

اللہ تعالیٰ کی آواز آئی اے ابلیس! جاؤ تیرے لیے مہلت ہے۔ بنی آدم کو جس قدر بھٹکا سکتے ہو بھٹکاؤ، جو بھی معصیت کرے گا اس کے لیے سزا ہے۔ تیرے لیے بھی سزا اور ہر اس کے لیے بھی سزا ہے جو تیری پیروی کرے گا۔ یہ سزا کسی طرح کی کمی کے بغیر سبھی کو ملے گی۔

وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

”ان میں سے جسے تو اپنی آواز سنا کر بہکا سکتا ہے بہکا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے بھی چڑھا دے اور ان کے مال اور اولاد میں بھی شریک ہو جا اور ان سے وعدے کر، اور شیطان کے وعدے بھی محض فریب ہی تو ہیں۔“

ابلیس کے لیے کھلی چھٹی

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دیا کہ میری معصیت پر مجھے نکالا گیا؛ لیکن جس کے سجدہ کا مجھے کہا گیا اس کے لیے کوئی آزمائش نہیں ہے! گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ اے اللہ! تو مجھے اس وقت تک مہلت دے دے جب تک انسان نے زمین پر رہنا ہے، پھر دیکھنا کہ میں اُنہیں کس طرح تیری معصیت پر اُکساتا ہوں اور کس طرح یہ تیرے نافرمان ہوں گے اور پھر ان کو بھی سزا ملنی چاہیے۔

اللہ نے فرمایا: تیرے لیے مہلت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اے ابلیس! تو جس طرح چاہتا ہے ان کو دھوکہ دے۔ ان کے لیے تیزی سے اپنے دھوکے اور جھوٹے وعدوں کے جال پھینکتا جا؛ ہر انداز اپنا لے، ان کے مال و اولاد میں بھی شراکت کر لے، ان کو معصیت کی طرف اُسی طرح ہانک کر لے جا جس طرح حیوانوں کو ہانکا جاتا ہے، اپنے تمام لشکریوں کو بھی حکمنامہ جاری کر دے کہ وہ بھی ایسا کر کے دیکھ لیں۔

انسان کے مال و اولاد میں شیطان کی شراکت داری

انسان کے مال یا اولاد میں شیطان کی شراکت داری سے مراد یہ ہے کہ وہ حرام کے راستہ سے مال کمائیں اور حرام کے راستہ سے اولاد پیدا کریں یا انہیں اللہ کے راستہ سے ہٹا کر خدا کے مخالف راہ پر چلائیں۔ اس طرح شیطان ان کے منافع میں شراکت دار ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں، حرام کام انجام دیں، یوں وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے۔

اگرچہ انسان خود بھی اپنے مال اور اولاد سے فوائد حاصل کرتا ہے؛ لیکن اسی طرح شیطان بھی اس کے مال اور اولاد سے فائدہ حاصل کرتا ہے، چنانچہ اللہ کی نافرمانی کے نتیجہ میں ہاتھ آنے والا مال حرام ہے اور حرام کی اولاد بھی اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ ہے اور یہ سب ابلیس کی منفعت ہے جو وہ اس انسان سے وصول کرلیتا ہے۔

ابلیس کے وعدے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان، انسانوں کو بڑے بڑے وعدے دے گا اور پھر یہ بھی بتا دیا کہ شیطان جو بھی وعدے دیتا ہے وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ یوں غلط کو صحیح بنا کر اور باطل کو حق بنا کر پیش کرتا ہے، اس طرح وہ دھوکہ ہی دھوکہ دے رہا ہوتا ہے۔

مثال: ابلیس لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کہتا ہے کہ مثلاً سزا و عذاب نہیں ہے، آخرت کا حساب کتاب نہیں ہے، یہی دُنیا ہے اور اسی سے فائدہ اٹھا لو۔ حرام راستے سے کمائی پر وعدہ دیتا ہے کہ تم یوں جلدی مالدار بن جاؤگے؛ پھر کہتا ہے کہ تم کسی بھی طریقہ سے مال کماؤ، جو غلطی کروگے بعد میں اللہ سے معافی مانگ لینا؛ عذاب سے مت ڈرو اللہ ہر قسم کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔گناہ کرلو اور عذاب سے نہ ڈرو۔ بادشاہوں کے اطرافیوں کا بھی یہی طریقہ ہے جو لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں تاکہ لوگوں کو صحیح راستہ سے منحرف کریں۔ یوں لوگوں کو آمادہ کرلیتے ہیں کہ وہ کھلے انداز سے گناہ پر گناہ کرتے جائیں اور خود کو عذاب سے محفوظ جانیں۔ شیطان انہیں مال کی کثرت اور منصب اور عہدہ کے عنوان سے دھوکہ دیتا ہے۔

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا ﴿۶۵﴾

"بے شک میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہوگا، اور تیرا رب کافی کارساز ہے۔"

بندگانِ خدا

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی بات کی ہے کہ جن پر شیطان کا غلبہ نہیں ہو گا؛ اس بنا پر جو ابلیس کے پیروکار ہوں گے وہ ابلیس کے بندگان قرار پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو میرے بندے ہیں، انہیں ابلیس گمراہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنی طرف نسبت دے کر انہیں کرامت و عزت بخشی ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے امور کا نگران ہے۔ شیطان کے شر سے ان کی جانوں اور اموال کی محافظت فرماتا ہے۔ اللہ کی یہ وکالت اور نگہداری ان کے لیے ہے جو اللہ کے اطاعت گذار ہیں۔ پس خدا کے بندوں سے مراد ایسے افراد نہیں ہیں جنہوں نے ابلیس کی اطاعت کا طوق اپنی گردن میں ڈال رکھا ہے۔ سورہ حجر کی آیت ۴۲ میں ایک اور انداز سے اسی بات کو بیان کیا ہے:

ترجمہ: ''بتحقیق (اے ابلیس) تجھے میرے بندگان پر تسلط اور غلبہ نہ ہے، سوائے ان کے جو گمراہ ہیں اور تیری پیروی کرتے ہیں ان پر ہی تیرا تسلط ہے''۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۶۶

''تمہارا رب وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتیاں چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، بے شک وہی تم پر بڑا مہربان ہے۔''

اللہ کا اپنے بندوں پر مہربان ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس لیے ان کی روزی کا انتظام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ انتظام کیا ہے کہ پانی پر

کشتیاں چل سکیں اور کشتیوں پر بیٹھ کر انسان روزی کی تلاش میں نکلیں۔ روزی کے وسائل اللہ نے بنائے ہیں، لیکن ان وسائل کو انسان نے استعمال میں لانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خزانے بے انتہا ہیں لہٰذا ان سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا جائے وہ کم نہیں ہوتے۔ چونکہ کشتیوں پر سفر کرکے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، رزق و روزی کی تلاش کا ایک اہم وسیلہ ہے اس لیے اس کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہی مخلوق کے لیے روزی کا اضافہ کرتا ہے۔

فضل، اپنے خرچ سے زائد کو کہا جاتا ہے، جبکہ اللہ کے خزانے خرچ کرنے سے ختم نہیں ہوتے۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کو سخی الاسخیاء اور اکرم الکرماء کہا گیا ہے، نیز اس لیے مخلوق کی روزی کو فضلِ الٰہی کا نام دیا گیا ہے۔

آیت کے آخر میں اللہ کے مہربان ہونے کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تم پر مہربان ہے، اپنی صفت رحمت کے تحت ہر خیر کو تمہارے لیے مہیا کرتا ہے۔ آیت کا معنی واضح و روشن ہے۔

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

"اور جب تم پر دریا میں کوئی مصیبت آتی ہے تو بھول جاتے ہو جنہیں اللہ کے سوا پکارتے تھے، پھر جب وہ تمہیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ لیتے ہو، اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔"

اللہ کا نافرمانوں کے لیے واضح بیان

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ تم جو میری حکم عدولی کر رہے ہو، تمہیں اندازہ بھی ہے کہ میرا عذاب تمہارے اوپر زلزلہ کی صورت میں

زمین کے پھٹ جانے کی صورت میں، پتھروں کے طوفان کے ذریعہ آسکتا ہے؟! تمہارے پاس کچھ ایسا انتظام ہے کہ خود کو اس عذاب سے بچا سکو؟! اللہ کے سوا کون ہے جو کسی کو عذاب سے بچاسکے؟! ایسا کیوں ہے کہ جب تم غرق ہونے لگو تو اس وقت تمہیں رب یاد آئے؟ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی لامتناہی قدرت کا اظہار کیا ہے اور یہ کہ جب عذاب آتا ہے تو کوئی خود کو نہیں بچاسکتا۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝۶۸

”پھر کیا تم اس بات سے نڈر ہو گئے کہ وہ تمہیں خشکی کی طرف لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے پھر تم کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ۔ “

نافرمانوں کے لیے مزید بیان

سابقہ آیت میں نافرمانی کرنے والوں کو ڈانٹ پلائی گئی اور اب اس آیت میں مزید دھمکایا گیا ہے۔ چنانچہ پروردگار نے اس آیت میں دوبارہ نافرمانوں اور باغیوں سے پوچھا ہے کہ اگر اللہ سب کو ہلاک کر دے، سرد ہوا اتار دے، دریا میں غرق کر دے، تمہارے اپنے جرائم کی وجہ سے اور ناشکری کے نتیجہ میں ایسا طوفان آئے جو کشتیوں اور تمہاری عمارتوں کو ویران کر دے تو اس وقت تمہارے لیے کوئی بھی نہیں ہو گا جو تمہاری حمایت کرے اور تمہیں غرق ہونے سے بچائے یا اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرے کہ ایسا عذاب کیوں آیا؟ کوئی ہے جس میں یہ جرأت یا طاقت ہو کہ وہ اللہ سے جواب طلبی کرے کہ کیوں عذاب دیا ہے؟! جب تم میں ہمارے عذاب سے بچنے کی طاقت نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے اوپر اعتراض کر سکتے ہو تو

پھر تم حق سے غافل کیوں ہو اور حق سے دُور کیوں ہو؟!

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿۶۹﴾

"یا تم اس بات سے بالکل نڈر ہو گئے ہو کہ وہ دوبارہ تمہیں پھر دریا میں لوٹا لائے، پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے، پھر تمہاری ناشکری سے تمہیں غرق کر دے، پھر اپنی طرف سے ہم پر کوئی بازپرس کرنے والا بھی نہ پاؤ۔"

انسان پر اللہ کا انعام اور انسان کی ناشکری

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو یاد دلایا ہے کہ ہم نے تو تمہیں دریاؤں اور سمندروں پر تسلط دیا، تمہیں زمین پر اختیار دیا، بہت ساری مخلوقات پر برتری عطا کی، تمہارے لیے بہترین عمدہ اور خوبصورت غذائیں مہیا کیں۔ اے انسان! تجھے ہم نے عقل و شعور دیا، حق اور باطل کے درمیان امتیاز کی صلاحیت دی، باقی موجودات پر برتری دی، تمام مخلوقات میں تجھے بااختیار بنایا۔ اے انسان تیرے لیے پاکیزہ غذائیں مہیا کیں، بہت عمدہ میوہ جات اور پھل دیے، حیوانات کو تمہارے کنٹرول میں دے دیا، دریاؤں کو تمہارے اختیار میں دیا، فضاؤں میں تجھے بااختیار بنایا؛ مگر پھر بھی ان تمام احسانات اور بھلائیوں کا شکر بجا لانے کی بجائے تم نے ناشکری کی اور کفر اختیار کیا، میرے وجود کا انکار کر دیا اور حق کے مخالف ہو گئے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۠ ﴿۷۰﴾

"اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنی بہت ساری مخلوقات پر انسان کو فضیلت و برتری عطا کی۔ لفظ "مَنّ" سے اسی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ ذوی العقول (عقل رکھنے والی مخلوق) کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ البتہ شاید اس سے مراد حیوانات کی انواع اور جنات بھی ہو ں کہ جو شعور رکھتے ہیں۔ اس سے دو نکتے آشکار ہوتے ہیں:

۱۔ آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے: تفضیل اور تکریم؛ ان میں سے ہر لفظ الٰہی عطیات سے ایک دستہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی خصوصیات ہیں۔ انسان کی تکریم عقل عطا کرنے سے کی گئی۔ تفصیل یہ ہے کہ تمام مخلوقات کو جو کچھ عطا کیا ہے انسانوں کے لیے اس عطا میں سب سے زیادہ حصہ ہے۔ انسان کی خوراک، پوشاک، ازدواج، زندگی کے رہن و سہن، اجتماعی رفتار اور زندگی کے باقی حالات سے واضح ہے کہ انسانوں کو تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے۔

۲۔ یہ آیت انسان کی باقی موجودات پر مادی برتری کو بیان کر رہی ہے، اور چونکہ فرشتوں کا وجود غیر مادی ہے لہٰذا یہاں فرشتوں پر انسان کی برتری کی جانب کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔[1]

[1]۔ شیعہ مکتب فکر میں اور اہل سنت کے بعض محققین کے ہاں انسان فرشتوں سے برتر ہے۔ برتری کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں میں اصلاً معصیت و نافرمانی کی صلاحیت موجود نہیں جبکہ ایک مومن انسان معصیت کرنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود گناہ نہیں کرتا۔ اللہ کی اطاعت کرتا ہے یقیناً انسان فرشتوں سے برتر ہے وہ آیات جن میں فرشتوں کو آدم کے سجدہ کا حکم ہے وہ بھی انسان کی برتری پر تائید کرتی ہیں۔ آیات ملاحظہ ہوں۔ البتہ مصنف نے اس آیت کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ آیت انسان کی

يَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمۡ ۚ فَمَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ فَاُولٰٓـئِكَ يَقۡرَءُوۡنَ كِتٰبَهُمۡ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۷۱﴾

''جس دن ہم ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ بلائیں گے، سو جسے اس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا سو وہ لوگ اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے اور وہ ذرہ برابر ظلم نہیں کیے جائیں گے۔''

قیامت کا منظر نامہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا منظر نامہ بیان کیا ہے کہ وہاں پر سب لوگ اکٹھے ہوں گے، حساب وکتاب کے لیے سب کو پکارا جائے گا۔ اس پکار میں سب کو ان کے رہبر اور ان کی جو کتاب تھی جس کے تحت وہ عمل کرتے تھے اس حوالہ سے ان کی پکار ہو گی۔ قرآن مجید، امام اور پیشوا کے عنوان سے پکارا جانا اس حوالے سے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کا انتظام کیا اور ان کے راہنما مقرر فرمائے۔ چنانچہ سورہ البقرہ آیت ۱۲۴ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ''بتحقیق میں نے آپ کو انسانوں کے لیے امام قرار دیا ہے''۔

نیز ہدایت دینے والے اماموں کے بارے میں فرمایا:

فرشتوں پر برتری کو بیان نہیں کر رہی۔ اس میں یہ بات نہیں کہ انسان فرشتوں پر برتر نہ ہے۔ یہ بات دوسری آیات سے ثابت ہے۔ (مترجم)

ترجمہ: ''اور ہم نے ان کو آئمہ بنایا ہے جو ہمارے امر کی ہدایت فرماتے ہیں''۔[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ راہنما اور ائمہ حق کی طرف لے جاتے ہیں، وہ ہادیان برحق ہیں، جو لوگ ان کی پیروی میں ہوں گے انہیں ان کے ساتھ پکارا جائے گا؛ جبکہ ان کے مقابلہ میں ایسے پیشوا ہیں جو لوگوں کو غلط راستہ پر لے جاتے ہیں اور راہ حق سے انحراف کرتے ہیں، وہ گمراہی کے امام ہیں جن کے خلاف اللہ تعالیٰ نے قیام و قتال کا حکم دیا ہے۔

سورہ توبہ آیت ۱۲ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''جو کفر کے رہبر ہیں ان کے خلاف جنگ کرو''۔

جس طرح ہدایت کے امام و پیشوا ہیں، اُسی طرح صحیح راہ سے بھٹکانے والے امام و پیشوا بھی ہیں۔

جس طرح افراد کے لیے امام کا لفظ بولا گیا ہے، اسی طرح آسمانی کتابوں کے لیے بھی لفظ امام بولا گیا ہے؛ چنانچہ سورہ ھود آیت ۱۷ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اس سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب ہے جو امام اور رحمت تھی''۔

اسی طرح سورہ یٰسین میں قرآن اور لوح محفوظ کو امام مبین کہا گیا ہے:

''پس ہم نے ہر بات کو امام میں (واضح و روشن کتاب میں) شمار کرکے رکھ دیا ہے (ہر شئی اس میں موجود ہے، ہر حکم موجود ہے''۔[2]

امام سے مراد

اس آیت میں امام کی نسبت انسانوں کی طرف دی گئی کہ قیامت کے دن انسانوں کو حساب دینے کے لیے ان کے امام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ اس آیت میں امام سے مراد ہر وہ

---

[1]۔ سورہ الانبیاء، آیت ۷۳۔

[2]۔ سورہ یسین: آیت ۱۲۔

شخص ہے جس کی لوگ پیروی کرتے رہے، جسے انہوں نے حق یا باطل کے راستے پر چلنے کے لیے اپنا راہنما بنایا۔ قیامت کے دن ہر جماعت اپنے راہنما اور پیشوا کی قیادت میں حساب دینے کے لیے عدالتِ الٰہی میں پیش ہو گی۔

ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا نامہ عمل ہو گا۔ یہاں کتاب سے مراد، ہر انسان کا تحریر شدہ عمل نامہ ہے۔ کچھ وہ ہوں گے جن کے دائیں ہاتھ میں نامہ عمل ہو گا، ایسے لوگ خوشحال ہوں گے، کیونکہ دائیں ہاتھ میں نامہ عمل کا ہونا یہ بتا رہا ہو گا کہ یہ لوگ کامیاب ہیں اور یہ ایسی جماعت ہو گی جن کا امام، ہادی برحق ہو گا۔

قیامت میں ظلم کی نفی

اس آیت میں اعلان ہوا کہ قیامت کے دن کسی پر "فتیل" کے برابر بھی ظلم نہیں ہو گا۔ کھجور کی گٹھلی کے درمیان جو باریک سا پردہ ہوتا ہے اسے فتیل کہتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ فرما رہا ہے کہ جن کے دائیں ہاتھ میں ان کا نامہ عمل ہو گا ان کے ساتھ ذرا برابر بھی ظلم نہ ہو گا۔ فتیل کنایہ ہے کہ ایسا ظلم جو انسان کے تصور میں آسکتا ہے اتنا ظلم بھی نہیں ہو گا۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دیا جائے گا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝٧٢

"اور جو کوئی اس جہان میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا اور راستہ سے بہت دور ہٹا ہوا۔"

دُنیا کے اندھے آخرت کے اندھے

اس آیت میں اندھے پن سے مراد بینائی سے محرومیت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد بے بصیرت ہونا، امام حق کی پیروی نہ کرنا، راہ حق کو نہ پہچاننا ہے۔ ایسا شخص جب آخرت میں

آئے گا تو وہاں بھی بے بصیرت ہو گا اور گمراہ تر ہو گا، چنانچہ آخرت میں اس کے واسطے بخشش، سعادت اور کامیابی حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا؛ پس ایسا شخص وہاں بھی اسی طرح ہو گا بلکہ اس سے بدتر ہو گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دنیا میں صحیح راستہ پر چلنے والا ہی آخرت میں کامیاب ہو گا۔ آخرت اسی دُنیا کا اثر ہے جو انسان کو ملے گا۔ آخرت کو انسان نے اپنے عمل سے بنانا ہے۔ دُنیا میں اسے کیا کرنا ہے اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے راہنما بھیجے ہیں اور کتاب ہدایت بھی دے دی اور ہر ایک کو عقل بھی دی جس سے وہ صحیح و غلط میں امتیاز کر سکتا ہے۔ آخرت میں عمل نہیں بلکہ عمل کی جزا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾

"اور بے شک وہ قریب تھے کہ تجھے اس چیز سے بہکا دیں جو ہم نے تجھ پر بذریعہ وحی بھیجی ہے تاکہ توں اس کے سوا ہم پر بہتان باندھنے لگے، اور پھر تجھے اپنا دوست بنا لیں۔"

مشرکین کی آرزو اور شرارتیں

اس آیت میں مشرکین کی خواہشات کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے یہ چاہتے تھے کہ آپ ان کے خداؤں کے خلاف گفتگو کرنا چھوڑ دیں اور جو غلام اور کنیزیں مسلمان ہو چکے ہیں انہیں اپنے سے دُور بھگا دیں گے۔ ان آیات میں پیغمبر اکرم ﷺ کو مشرکین کی آرزوں اور خواہشات سے آگاہ کر دیا گیا ہے اور آپ کو چوکنا کیا گیا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ قریب تھا کہ مشرکین اپنی چپڑی چپٹی باتوں سے آپ کو بھٹکا دیں اور صحیح راستے سے موڑ دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ قرآن کے خلاف بات کریں۔ اس طرح آپ ان کی خاطر اللہ پر افتراء باندھیں اور

اللہ کی طرف غلط نسبت دیں جو اللہ نے نہیں کیا وہ کہہ دیں اور طبقاتی اختلاف کو خدا پسند نہ قرار دیں۔ انہوں نے آپ سے آکر کہا کہ اگر آپ ایسا کرو اور فقیر و نادار اور پست لوگوں کو اپنے سے دُور کر دو تو ہم آپ کے ساتھ رفاقت اور دوستی کرلیں گے اور تجھے اپنا ہمدرد جانیں گے۔

پس اس آیت میں مشرکین کی خواہشات کا تذکرہ ہے جبکہ بعد والی آیت میں مزید بیان ہے کہ آپ نے ایسا نہیں کیا ہے کیونکہ آپ کے لیے ہماری حمایت موجود تھی۔

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدۡتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡـًٔـا قَلِيۡلًا ﴿۷۴﴾

"اور اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو ں کچھ تھوڑا سا ان کی طرف جھکنے کے قریب تھا۔"

عصمت کا انتظام

اس آیت میں "ثبیت" سے مراد ثابت قدم رہنا ہے۔ یہی عصمت کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے لیے قرار دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی حوالے سے خطاب کیا گیا ہے کہ میرے رسول! اگر ہم نے تجھے عصمت کا حفاظتی انتظام نہ دیا ہوتا تو قریب تھا کہ آپ مشرکین کی چوپڑی چپٹی باتوں میں آجاتے۔

اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ مشرکین کی خواہشات کو پورا نہیں کر رہے اور ان کی ہر تجویز کو رد کرتے جا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آپ کو ہر قسم کی خطا، غلطی اور بھول چوک سے محفوظ بنا دیا۔ اسی وجہ سے آپ ذرا برابر بھی انحراف نہیں کرتے بلکہ انحراف کا خیال تک بھی نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی مشرکین کے قریب نہ ہوئے اور نہ ہی ان

کے غلط خیالات کی حمایت کا خیال تک آیا۔[1]

إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾

"اس وقت ہم تجھے زندگی میں اور موت کے بعد دہرا عذاب چکھاتے پھر تو اپنے واسطے ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتا۔"

پیغمبر اکرمؐ کو تنبیہ

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر آپ مشرکین کی باتوں میں آجاتے اور یہ غلطی آپ سے سرزد ہو جاتی تو پھر آپ کو دوسروں کی طرح عام سزا نہ ملتی بلکہ دو برابر سزا ہوتی، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی؛ اور پھر کوئی بھی آپ کو ہمارے غضب سے نہ بچا سکتا۔

اس آیت کے ضمن میں سب کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ جن کا منصب و مقام بلند ہوتا ہے جب اس سے غلطی اور گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کی سزا، عام آدمی کے گناہ کی سزا سے زیادہ ہو گی۔ اس بنا پر ایک عالم کا گناہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ عام آدمی کا گناہ فقط اس کی ذات تک رہتا ہے جبکہ عالم کی پیروی لوگ کر رہے ہوتے ہیں لہٰذا اس کی غلطی کے اثرات وسیع ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے اس کی سزا کئی گنا ہو جاتی ہے؛ پھر اللہ جن پر غضب کرتا ہے تو اللہ

[1]۔ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عصمت علم سے ہے دریافت کرنا، وصول کرنا ہے، انسان علم و ادراک و سمجھ کے اس مقام و مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ برائی کی حقیقت کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس کے اثرات اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ وہ نافرمانی کی طرف توجہ نہیں کرتا لیکن ایسا مقام اختیار اور ارادہ کے منافی نہیں۔ صاحب عصمت اپنے اختیار اور ارادہ سے معصیت اور گناہ کی جانب توجہ نہیں کرتا، چہ رسد کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرے۔

کے غضب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوتا۔

وَ اِنۡ كَادُوۡا لَيَسۡتَفِزُّوۡنَكَ مِنَ الۡاَرۡضِ لِيُخۡرِجُوۡكَ مِنۡهَا وَ اِذًا لَّا يَلۡبَثُوۡنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۷۶﴾

"اور وہ تو تجھے اس زمین سے دھکیل دینے کو تھے تاکہ تجھے اس سے نکال دیں، پھر وہ بھی تیرے بعد بہت ہی کم ٹھہریں گے۔"

رسول اللہؐ کا مکہ سے اخراج کا نتیجہ

اس آیت میں مکہ کے مشرکین مراد ہیں اور پیغمبر اکرم ﷺ کو مستقبل کی خبر بھی دی گئی ہے کہ آپ کو مکہ سے نکالنے کے بعد ان مشرکین کا مکہ میں اقتدار زیادہ عرصہ نہ رہے گا۔

سُنَّةَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِيۡلًا ﴿۷۷﴾ ع

"تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے ہیں ان کا یہی دستور رہا ہے، اور ہمارے دستور میں تم تبدیلی نہیں پاؤگے۔"

اللہ کا قانون

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ اللہ کا قانون ایک ہی ہے جو سابقہ اُمتوں میں بھی تھا اور وہی قانون اس اُمت میں بھی ہے۔ وہ قانون اور اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب بھی کسی قوم نے اپنے درمیان سے اللہ کے رسول کو نکال دیا تو اللہ تعالیٰ اس آبادی کو ہلاک کر دیتا تھا۔

اسی قانون اور سنتِ الٰہی کی بنیاد پر مکہ سے رسول خداؐ کے چلے جانے کے بعد ان

مشرکین کے اقتدار کی مدت زیادہ نہ ہوگی۔ چنانچہ سورہ ابراہیم آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا:

''جو لوگ کافر ہو گئے اُنہوں نے اپنے زمانہ کے رسولوں سے یہ کہا یا تو تم ہمارے دین پر آجاؤ یا پھر ہم تمہیں اپنی سرزمین سے باہر نکال دیں گے اس کے بعد ہم نے اپنے رسولوں کو وحی کی کہ ہم حتمی طور پر ان کافروں کو ہلاک کر دیں گے''۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾

''آفتاب کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نماز پڑھا کرو اور صبح کی نماز بھی، بے شک صبح کی نماز میں مجمع ہوتا ہے۔''

نماز کے اوقات اور نماز کا قیام

''دلوک'' سے آفتاب کا زوال مراد ہے جو کہ ظہر کا اول وقت ہے۔ ''غَسَق اللیل'' سے مراد تاریکی کا چھا جانا ہے۔ روایت کے مطابق یہ لفظ آدھی رات پر بولا جاتا ہے کہ جب مکمل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ آیت اول ظہر سے لے کر رات تک کے وقت کو شامل ہے۔ اس دوران جو نمازیں واجب ہیں وہ چار نمازیں ہیں: ظہر، عصر، مغرب عشاء۔ اور ''قرآن الفجر'' کا اشارہ صبح کی نماز کی طرف ہے۔ اس طرح پنجگانہ نمازوں کے اوقات کا مکمل تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ قرآن الفجر سے مراد صبح کے وقت قرآن پڑھنا ہے اور یہ بات صبح کی نماز کو بیان کر رہی ہے۔

نماز صبح کا مشہود ہونا

اس جگہ بیان کیا گیا ہے کہ نماز صبح مشہود ہے یعنی اسے دیکھا جا رہا ہے۔ اہل سنت اور شیعہ دونوں کے حدیثی منابع میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ نماز صبح کو رات کے فرشتے واپس

جاتے ہوئے اور دن کے فرشتے آتے ہوئے اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ آیت نماز یومیہ کے اوقات کو بیان کر رہی ہے۔[1]

وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

"اور کسی وقت رات میں تہجد پڑھا کرو جو تیرے لیے زائد چیز ہے، قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں پہنچا دے۔"

نماز شب کی اہمیت

واجب نمازوں کے علاوہ نصف شب کے بعد گیارہ رکعت نماز پڑھنا ہوتی ہے۔ آٹھ رکعت نماز شب، دو رکعت نماز شفع، ایک رکعت نماز وتر پڑھی جاتی ہے۔ عام لوگوں کے لیے نماز تہجد پڑھنے کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے اور اس کا بہت زیادہ ثواب بیان کیا گیا ہے؛ لیکن وہی نماز خود رسول اللہ ﷺ پر واجب قرار دی گئی ہے۔

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مقام محمود قرار دیا ہے ایسا مقام جو سب کی طرف سے تعریف شدہ ہے اور لائق حمد ہے یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے شفاعت کبریٰ کا مقام ہے جو قیامت کے دن آپ کو عطا ہوگا۔ اس معنی پر اہل سنت کے حدیثی منابع میں بھی احادیث موجود ہیں۔[2]

---

[1] ۔ اس ضمن میں حضور پاک ﷺ اور امام صادق علیہ السلام سے روایات وارد ہوئی ہیں۔ کتاب نوادر والاصول میں حکیم ترمذی نے اسی طرح ابن جریر، طبرانی ابن مردویہ نے ابی داؤد سے اس روایت کو نقل کیا ہے کہ یہ آیات نماز یومیہ کے اوقات کو بیان کر رہی ہیں اور رات کے جانے والے فرشتے اور دن کے آنے والے فرشتے صبح کی نماز کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح صبح کی نماز کو مشہود کہا گیا ہے۔

[2] ۔ کتاب الدر المنثور ج ۴، ص ۱۹۷، تفسیر عیاشی، ج ۲، ص ۳۱۵۔

وَ قُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ﴿۸۰﴾

''اور کہہ اے میرے رب مجھے خوبی کے ساتھ پہنچا دے اور مجھے خوبی کے ساتھ نکال لے اور میرے لیے اپنی طرف سے غلبہ دے جس کے ساتھ نصرت ہو۔''

رسول اللہؐ کی دُعا

اے اللہ! میرے سارے امور کی اس طرح سرپرستی فرما کہ میرے سارے کام سچائی پر مبنی ہوں جس طرح تو صدیقین کے اعمال میں سرپرستی فرماتا ہے۔

اس کے آخر میں عرض کیا ہے: اے رب میرے لیے ایسی حالت اپنی جانب سے قرار دے کہ جس میں غلبہ و تسلط کی مدد ملی ہوئی ہو۔

اے اللہ! میری مدد فرما کہ میں تمام اہم معاملات میں اور بنیادی و اساسی کاموں میں مغلوب نہ ہوں، ہر مقام پر میرے لیے غلبہ رہے کہ لوگوں کے لیے دعوت دینے میں کبھی شکست نہ کھاؤں، ہر مرحلہ میں کامیاب رہوں، باطل اور جھوٹے دلائل مجھے مرعوب نہ کریں اور شیطانی وسوسے گمراہی نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے یہ دعا مانگی ہے کہ اللہ ان کی ہر مرحلہ میں سرپرستی فرمائے۔ اللہ اپنی طرف سے غلبہ اور تسلط عطا کرے اور ہمیشہ یاور و مددگار رہے تاکہ حق سے کبھی انحراف نہ آئے اور باطل کی طرف توجہ نہ ہو۔

وَ قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ زَہَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا ﴿۸۱﴾

''اور کہہ دو کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے ہی والا تھا۔''

حق کا غلبہ اور باطل کا خاتمہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فرمایا کہ سب لوگوں میں یہ اعلان کر دو کہ حق نے غالب آنا ہے اور یہ بات بتا دو کہ باطل کو بالکل دوام نہیں۔

اس آیت میں مشرکین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اسلام کی دعوت کو غلبہ ملے گا تاکہ وہ مایوس ہو جائیں اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت ہر صورت قائم ہونا ہے اور باطل کے اقتدار کا خاتمہ حتمی ہے، مشرکین کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی دعوت کو شکست دینے کی قدرت نہ ہے، بلکہ باطل کی نابودی یقینی ہے۔[1]

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

''اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمانداروں کے حق میں شفاء اور رحمت ہیں، اور ظالموں کو اس سے اور زیادہ نقصان پہنچتا ہے''۔

قرآن کی خصوصیت

اس جگہ قرآن کی دو صفات کا ذکر ہے:

(۱) قرآن شفاء ہے (۲) قرآن رحمت ہے

کفر و نفاق، شرک و معصیت، یہ سب دل کی مہلک بیماریاں ہیں۔ دل کی بیماریوں کا

---

[1] ۔ روایات میں ہے کہ اس آیت کا عملی مصداق اس وقت سامنے ہو گا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری وصی پورے عالم پر اسلامی حکومت کے قیام کے لیے آئیں گے اور پورے عالم سے ظلم و فسق و فجور کا خاتمہ ہو گا، عدل و انصاف قائم ہو گا، ہر طرف اللہ کے قانون کا نفاذ ہو گا، حق آگیا باطل مٹ گیا یہ نعرہ حضرت امام مہدی عج اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے وقت ہر زبان پر جاری ہو گا۔ (مترجم)

خاتمہ قرآن مجید کے ذریعہ ہی ہونا ہے۔ قرآن دلوں کو نور ایمان دیتا ہے اور کفر و نفاق کی تاریکی سے باہر نکالتا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم اس کو اُتارتے ہیں اور رحمت ہے اور وہ قرآن یہی ہے۔

دلوں کا کمال

جن انسانوں کے دل و قلوب فطرت پر باقی ہیں، مبدأ و معاد اور دوسرے معرفت کے بنیادی اصول سے متعلق عقائد حقہ رکھتے ہیں۔ اصول معرفت مبدء و معاد کے بارے صحیح عقیدہ کا نتیجہ ہیں ایسے لوگ اخلاقی کمالات سے بہرہ ور ہیں۔ یہ قرآن دلوں کی شفاء اور ہدایت کے لیے اُتارا گیا ہے۔ ایسے دل جو غفلت کی وجہ سے اپنی فطرت سے انحراف کر گئے ہیں۔ شک و شبہ، خواہشات نفسانی، لالچ طمع، شیطانی وسوسے کہ جن کے باعث دلوں میں شفافیت نہ رہی، ٹیڑھا پن آگیا تو قرآن مجید نے مضبوط اور اور محکم دلائل اور کھلے بیانات اور مواعظِ حسنہ کے ذریعہ عبرت آموز داستانوں، دلنشیں امثال، اس کے ساتھ خطرات سے آگہی، بشارتیں، احکام و قوانین سب کو بیان کرکے دلوں کو ہدایت دیتا ہے اور علم کی نورانیت سے مالامال کرنا اس طرح قرآن دل کی تمام بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ دوسری طرف قرآن مومنین کے لیے رحمت ہے یعنی مومنین میں جو کمزوریاں رہ جاتی ہیں ان کو دُور کر دیتا ہے اور مومن کی حاجات کو پورا کرتا ہے کیونکہ قرآن نور علم اور یقین سے آدمی کے دل کو روشن کر دیتا ہے اور آدمی کو اخلاقی صفات سے نوازتا ہے۔ جہالت، شکوک و شبہات، ناشائشتہ صفات اور مذموم کیفیات سے محفوظ بنا دیتا ہے۔ مومنین سے بری صفات دُور ہو جاتی ہیں اور اچھی صفات سے وہ آراستہ ہو جاتا ہے۔

قرآن شفا ہے، لوح دل کو ہر قسمی امراض، آفات و بلیات سے پاک کر دیتا ہے اور اسے فضائل کو وصول کرنے اور ان سے آراستہ ہونے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ قرآن رحمت

ہے کہ فطرت صحیح و سالم ہو جاتی ہے اس طرح مومن انسان سعادت اور یقین کی راہنمائی پاتا ہے۔

ایمان سے مراد

ایمان اس وقار اور قلبی سکون اور اطمینان سے ہے جو انسان کو زبان سے توحید اور معارف الٰہی کے اقرار سے نصیب ہوتا ہے اور دل میں یقین و اطمینان کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ ایک مومن انسان کی سعادت و یقین کی جانب قرآن راہنمائی دیتا ہے۔ دل کا یقین اور اعضاء و جوارح سے عمل ایمان ہے۔ مومن انسان کی گفتار اور کردار میں مطابقت ہوتی ہے۔

قرآن ظالموں کے لیے نقصان دہ

اس آیت میں واضح کہا گیا ہے کہ قرآن شفاء اور رحمت ہے، مومنین کے لیے۔ کافروں اور ظالموں کے لیے نقصان دہ ہے کیونکہ ظلم و زیادتی ہی کفر تک لے جاتی ہے۔ جو اپنے خالق کو نہیں مانتے اور نہ ہی اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں تو وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے عذاب ہے۔ کافروں کو خسارۃ و نقصان اس لحاظ سے ہوا کہ انسان کا اصلی سرمایہ اس کی فطرت ہی تھی جیسا انسان اپنی فطرت کے خلاف چل پڑتا ہے تو وہ اپنا اصلی سرمایہ ضائع کرتا ہے۔ جب اُنھوں نے قرآن کا انکار کیا بغیر منطق اور دلیل کے اپنے اوپر ظلم و ستم کرتے ہوئے اللہ کی آیات و نشانیوں کو جھٹلایا، ہٹ دھرمی کی، اس طرح قرآن نے ان کے سابقہ کفر کو دو برابر کر دیا۔ ان کی پہلی کمزوری پر اور اضافہ ہو گیا قرآن آنے سے پہلے کافر تھے، قرآن واضح طور پر آگیا۔ اس کا بھی انکار کر دیا تو گویا قرآن کے آنے سے انہیں کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ ان کے نقصان میں اور اضافہ ہو گیا۔ قرآن تو مفید ہے خسارت کی نسبت قرآن کی طرف مجازی دی ہے جبکہ خود انسانوں کا کفر ہی ان کے خسارے کا سبب ہے نہ کہ قرآن ان کے خسارے کا سبب ہے۔ ان کا برا اختیار اور نفوس کی

بد بختی و شقاوت ان کا اصل خسارہ ہے۔ اس کا سبب وہ خود ہیں نہ کہ قرآن سبب ہے۔[1]

وَ اِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوۡسًا ﴿۸۳﴾

"اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے، اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔"

انسان کا مزاج

اس آیت میں انسان کے مزاج کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو نعمات دیتا ہے، جب انسان کو نعمت ملتی ہے اور حالات اچھے ہوتے ہیں تو شکر گزار ہونے کی بجائے ناشکری کرتا ہے اور اپنے رب کو بھول جاتا ہے۔ نعمات میں غرق ہو جاتا ہے تو سمجھ بیٹھتا ہے کہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور وہ اپنا تعلق اللہ سے کاٹ دیتا ہے، تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے؛ لیکن جب اس سے نعمت چھن جاتی ہے، حالات تبدیل ہو جاتے ہیں، کوئی مصیبت آن

---

[1]۔ اس آیت سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس طرح دل کے لیے قرآن شفا ہے اور دل کی بیماریوں کو دُور کرتا ہے تو اسی طرح جسمانی بیماریوں کا علاج بھی قرآنی آیات میں موجود ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا استعمال وہ آدمی کر سکتا ہو کہ جسے معلوم ہو کہ کون سی آیت کس بیماری کے لیے مفید ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ سورہ یسین میں ایک ایسی آیت موجود ہے جو مردے پر پڑھی جائے تو وہ زندہ ہو جائے تو سننے والے نے کہا اگر پوری سورہ یسین پڑھ دیں تو امام نے فرمایا کہ اگر پنساری کے دکان پر کوئی جائے اور ساری ڈبیوں میں موجود دوائیوں کو ایک جگہ استعمال میں لے آئے بغیر راہنمائی کے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ (یہ بیان اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آیات میں تاثیر ہے کہ وہ بیماری کی شفا کا ذریعہ بن جائیں لیکن کون کسی آیت کس بیماری کے لیے ہے اسے راسخون فی العلم، عارفانِ قرآن اور عاملانِ بالقرآن ہی بتا سکتے ہیں۔ (مترجم)

پڑتی ہے تو پھر یکدم مایوس ہو جاتا ہے۔[1]

انسان کی دو حالتیں ہیں:

(۱) اُمیدوار رہتا ہے۔ (۲) مایوس ہو جاتا ہے۔

مایوسی، کسی مصیبت و پریشانی، بیماری یا ظاہری آرام و آسائش کے اسباب منقطع ہو جانے کی صورت میں آتی ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب مصیبت آئے، مایوسی کی حالت طاری ہو جائے تو اس حالت پر صبر کرنا اس سے بہتر و عظیم تر ہے کہ انسان اچھے اور اُمیدوار کنندہ حالات میں غفلت میں رہے اور اپنے مالک اور منعم کو بھول جائے۔

خیر و شر کی نسبت

اس آیتِ مبارکہ میں نعمت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی گئی ہے، جبکہ شر کو مطلق بیان کیا گیا ہے اور اسے خدا کی طرف نسبت نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر خیر کا منبع اور سرچشمہ ہے اور ہر امر جو خیر ہے وہ مقصود بالذات ہے لیکن شر نسبی امر ہے؛ یعنی ایسا عدم ہے جو اس امر کے لحاظ سے شر ہے۔ کائنات کا عمومی نظام خیر ہے لہٰذا کوئی بھی شر بالاصالۃ اور بالذات شر نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس شر کی نسبت کے حوالے سے بھی خیر کا ارادہ ہے؛ پس دیکھنا یہ ہو گا کہ وہ امر کس نسبت سے شر ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ شر ایک دوسری نسبت کے حوالے سے خیر ہو۔

اللہ اس سے منزہ و پاک ہے کہ شر کی نسبت اس کی طرف دی جائے۔ شر کا وجود نسبی ہے، کوئی بھی شر، بالذات شر نہیں ہوتا، جیسے موت، بیماری، فقر و افلاس، کمزوری وغیرہ۔ اسی قسم کے اور حالات و امور جو انسان کو درپیش ہوتے ہیں یہ ایک لحاظ سے شر ہوتے

[1] ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: مصیبت اور آزمائش کے وقت صبر کرنا، امید اور توقع کی حالت میں غفلت سے زیادہ بہتر ہے۔

ہیں وہ خود اسی موردِ واقعہ کے حوالے سے جس کی طرف اس کی نسبت ہے؛ لیکن جب اس کی نسبت کائنات کے جاری نظام میں دوسرے موجودات کی طرف دی جائے تو یہ خیر سے ہی ہو گا۔ یہ امر عمومی تدبیر کے حوالے سے ہمیشہ خیر ہوتا ہے جس پر اللہ کی عنایت شامل ہے اور وہی مراد بالذات ہے۔ لٰہذا جو چیز شر ہے وہ اس حوالے سے ہے کہ اس کی نسبت اس کے غیر کی طرف دی جائے، جو کہ اس چیز کا بالعرض تقاضا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ فرما رہا ہے جب ہم انسان کو نعمت دیتے ہیں تو انسان اسباب کے تحت جاری ظاہری اسباب میں مصروف ہو جاتا ہے وہ ان میں اس طرح غرق ہوتا ہے کہ وہ ہمیں بھول جاتا ہے اور ہمیں یاد نہیں کرتا اور نہ ہی اس نعمت پر ہمارا شکر بجالاتا ہے اور جب معمولی شر اسے ملے، اور اس سے خیر کو چھین لیا جائے، اور خیر کے اسباب اس کے ہاتھ سے چلے جائیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب اسے خیر نہیں ملے گی۔ وہ خیال کرتا ہے کہ خیر کے اسباب اس کے ہاتھ سے چلے گئے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس کے رب کا ان سب میں اختیار ہے۔

آیت میں عام انسان کے مزاج کو بیان کیا گیا ہے، لیکن جو انسان اپنی فطرت کے تحت مومن ہے اس پر جب مشکلات آتی ہیں وہ مایوس نہیں ہوتا بلکہ اللہ سے اپنی اُمید لگاتا ہے کہ جس اللہ نے اس کے لیے خیر اور خوشحالی، صحت و عافیت کے اسباب مہیا کیے تھے اب ان مشکلات میں بھی اللہ ہی ہے جو ان رکاوٹوں کو دُور کرے گا اور پھر اچھے دن آجائیں گے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۟ؒ ﴿۸۴﴾

”کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے پھر تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ٹھیک راہ پر کون ہے۔“

شَاكِلَتِهٖ: اس کا معنی طبیعت، عادت، اخلاق جو انسان کو محدود اور مقید بنا دیتا ہے اور وہ اسی کے مطابق وہ عمل کرتا ہے۔

اخلاقیات کا تقاضا

ہر شخص اپنی اخلاقیات کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بقول فارسی زبان:

از کوزہ ہماں برون تراود کہ در اوست

"کاسہ سے اسی کی طراوت ہوتی جو اس میں ہے"

"شَاكِلَتِهٖ" کے لفظ کا تعلق عمل کی بہ نسبت رُوح کے ساتھ ہے جو بدن میں جاری و ساری ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان کی اندرونی صفات کا اثر اس کے اعمال پر ہوتا ہے۔ شاکلۃ کی نگاہ خلقت کی نوع اور فرد کی بدنی ترکیب کی خصوصیت پر ہوتی ہے یا اس اخلاقی خصوصیات پر ناظر ہوتا ہے جو خارجی عوامل سے متاثر ہو کر حاصل ہوتے ہیں۔ بہر حال اللہ نے انسان پر ظلم نہیں کیا۔ قرآن سب کے لیے ہدایت ہے، لیکن وہ انسان جس کا مزاج اور طبیعت معتدل و متوازن ہو تو وہ آسانی سے حق کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ہدایت پا جاتا ہے، لیکن جس کا مزاج اور سجیۃ منحرف ہو، حد سے متجاوز ہو، ظالم ہو، تو وہ حق قبول کرنے اور عمل صالح بجالانے میں کوتاہی کرتا ہے اور ایسا نیک کام اُس کے لیے سخت ہوتا ہے۔ حق کی دعوت سے اسے سوائے خسارہ اور نقصان کے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

یہ معلوم رہے کہ شَاكِلَتِهٖ کا یہ تقاضا علت تامہ نہیں کہ اس سے تخلف ناممکن ہو۔ اگر ایسا ہو تو اختیار کی بنیاد ٹوٹ جائے گی اور تکلیف (ذمہ داری) بے معنیٰ ہو جائے گی۔

اللہ کا ظاہر و باطن سے آگاہ ہونا

آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کی شَاكِلَتِهٖ (طبیعت) عادلانہ و متوازن ہے اور کس کی شَاكِلَتِهٖ میں انحراف و ٹیڑھا پن

ہے۔ کون ہے جو حق کو آسانی سے قبول کرلیتا ہے اور کون ہے جو حق سے پہلو تہی کرتا ہے اور حق سے دُور بھاگتا ہے لیکن اگر کوئی شَاكِلَتِهٖ والا ہوا گر وہ ارادہ کرے اور ہدایت لینا چاہے تو وہ ہدایت پا جاتا ہے۔ اگر اس کو دشوار اور مشکل راستہ طے کرنا ہوتا ہے جبکہ جس کی شَاكِلَتِهٖ (طبیعت) متوازن ہے وہ آسانی سے اور بہت جلدی ہدایت کو پالیتا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

''اور یہ لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو روح میرے رب کا امر ہے اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔''

رُوح سے مراد

رُوح مبدءِ حیات ہے جس کے وسیلہ سے تمام جاندار احساس اور ارادی حرکت پر قادر ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید میں رُوح متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض دفعہ اس کی ہدایت کی طرف نسبت دی گئی ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ

ترجمہ: ''جو مردہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا''۔[1]

اس جگہ مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے روح کے ذریعہ ہدایت دی۔

کبھی وحی کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ[2]

---

[1]۔ سورہ انعام، آیت ۱۲۲۔

[2]۔ سورہ نحل آیت ۲۔

ترجمہ: "فرشتے اللہ کے اَمر سے رُوح (وحی) کو لے کر آتے ہیں"۔

بعض مفسرین کے نزدیک رُوح کا لفظ قرآن پر بھی بولا گیا ہے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ رُوح، اللہ کے عالَم امر سے ہے؛ جیسا کہ ہم پہلے اس بارے بیان کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے امر کے بارے اس طرح تعارف کروایا ہے:

(ان امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون)۔[1]

"یقیناً اللہ کا امر اس طرح ہے جس وقت کسی چیز کے بارے ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے ہو جا تو وہ شئی اسی طرح ہو جاتی ہے۔

لہٰذا امر ایسا کلمہ ہے جس سے ہر چیز کا تحقق خارج میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ اس اعتبار سے ہے کہ اللہ کی طرف اس کی نسبت ہے۔ اس کا وجود اللہ کی ذات سے قائم ہے جو موجودات کا ملکوتی عنوان ہے۔

جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے کیونکہ آپ کا وجود الٰہی امر سے پیدا ہوا ہے اور خدا کا قول و کلام ہی اُس کا عین فعل بھی ہے۔ دوسری جانب اس آیت میں دقت سے واضح ہوتا ہے کہ امر الٰہی کے تحقق میں تدریج نہیں ہے بلکہ یہ دفعتاً (ایک ہی مرتبہ) ہوتا ہے۔

سورہ قمر آیت نمبر 50 میں ارشاد ہے:

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ۝

ترجمہ: "اور ہمارا حکم بس ایک ہی ہوتا ہے پلک جھپکنے کی طرح"۔

اگرچہ پوری کائنات کے موجودات مادی اسباب کے تحت تدریجاً وجود میں آتے ہیں

---

[1] ۔ سورہ یٰسین، آیت ۸۲۔

اور زمان و مکان کے دائرہ میں ہیں، لیکن ان کے وجود میں ایسی جہت بھی موجود ہے جو تدریج سے عاری اور زمان و مکان کے دائرہ سے باہر ہے۔ اسی جہت سے اسے امر خدا، قول خدا اور کلمتہ اللہ کا نام دیا جاتا ہے؛ لیکن اس اعتبار سے کہ علل و اسباب کے راستہ میں ہیں اور زمان و مکان کے دائرہ میں ہیں، اللہ کی مخلوق شمار ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رُوح، اپنے وجود میں اسی باب سے ہے، یعنی روح سے مراد امر اور ملکوت ہے۔

رُوح کے بارے میں مخلوق کا علم

آیتِ مبارکہ کے آخر میں آگاہ کیا ہے کہ مخلوق کے پاس بہت ہی تھوڑا علم ہے۔ رُوح سے متعلق جو علم اللہ نے تمہیں دیا ہے بہت تھوڑا ہے۔ سمندر کی نسبت ایک قطرہ ہے، کیونکہ رُوح کی عالمِ وجود میں ایک خاص مقام ہے اور اس سے ایسے مخصوص اثرات ظاہر ہوتے ہیں جو کہ بہت ہی عجیب و غریب ہیں، جبکہ تم ان مخصوص اثرات سے بے خبر ہو۔

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾

''اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تیری طرف وحی کی ہے اسے اٹھالیں پھر تجھے اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ ملے۔''

اللہ کی قدرت

اس آیت میں اللہ کی قدرت مطلقہ کو بیان کیا گیا ہے اور یہ سابقہ آیت کے سیاق میں آیا ہے۔ اس آیت کا معنی پچھلی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ہوگا (اللہ ہی اس کے حقیقی معنی کو جانتا ہے) کہ جو رُوح ہم نے تیرے اوپر نازل کی ہے اور ہم قرآن مجید کو اپنے امر کے ذریعہ

تجھے القاء کرتے ہیں، یہ سب کچھ ہماری قدرت سے باہر نہیں، یہ سب ہمارے اختیار میں ہے اگر ہم چاہیں تو وہی روح کا کلمہ جو تجھے القاء ہو چکا ہے اسے ختم کر دیں اور آپ کے پاس کچھ نہ بچے۔ ایسی صورت میں کوئی بھی آپ کے لیے وکالت کرنے والا نہ ہو گا جو آپ سے دفاع کرے یا ہمیں مجبور کرے کہ ہم نے تجھ سے جو کلمہ واپس لے لیا ہے اسے واپس آپ کے پاس لوٹا دیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ قدرت مطلقہ اور ہر طرح کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ اللہ جب چاہے دے دے جب چاہے واپس لے لے۔ جو کچھ ہم نے آپ کو دیا ہے یہ ہمارا فضل ہے اور الٰہی اختیار سے ہے۔ اسے واپس لینا بھی ہمارا اختیار ہے اور ہمارے اختیار کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اسے دینا اور باقی رکھنا بھی ہمارا اختیار ہے۔

اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَيۡكَ كَبِيۡرًا ﴿۸۷﴾

''مگر یہ صرف تیرے رب کی رحمت ہے، بے شک تجھ پر اس کی بڑی عنایت ہے۔''

قُلۡ لَّٮِٕنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰٓى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا ﴿۸۸﴾

''دو اگر سب آدمی اور سب جن مل کر بھی ایسا قرآن لانا چاہیں تو ایسا نہیں لا سکتے اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔''

قرآن کی برتری

اس آیت میں صراحت اور وضاحت سے کہہ دیا گیا ہے کہ قرآن اپنے تمام اوصاف سمیت اور اس میں الفاظ کے اعتبار سے، معانی کے اعتبار سے، جملہ بندی میں، غیب کی خبریں

دینے میں، ماضی کے حالات بتانے میں جو کمال ہے وہ سب بے مثال ہے۔ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے تمام عربی دانوں کے لیے اور دیگر بہت سارے پہلوؤں کے اعتبار سے سب انسانوں کے لیے چیلنج ہے۔ یہ چیلنج کسی ایک علاقہ یا ایک زمانہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ پورے انسانوں کے لیے ہے اور سارے زمانوں کے واسطے سے ہے۔ اس میں انسانوں، ہر دور کے دانشوروں و صاحبان علم، فصاحت و بلاغت کے میدانوں کے شاہسواروں سب کو چیلنج ہے۔ یہ چیلنج آج بھی موجود ہے۔ اس بات کو قرآن نے صراحت و وضاحت کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ اگر سارے انسان اور سارے جنات اکٹھے ہو جائیں اور ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں، تو وہ سب مل کر بھی قرآن کے مقابلے میں اس جیسا کچھ بھی تیار کر کے نہیں لا سکتے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۸۹

"اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر ایک قسم کی مثال بھی کھول کر بیان کر دی ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار کیے بغیر نہ رہے۔"

قرآن کے بیانات کی خصوصیات

اس آیت میں قرآن کے بیانات کے امتیازی پہلو کو بتایا گیا ہے اس لیے کہا گیا ہے لفظ مثل کا استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے مقصود کو مثل دے کر اس طرح پیش کرنا کہ وہ سننے والے اور دیکھنے والے کے سامنے مجسم ہو جائے۔ اس میں کچھ ابہام نہ رہے، تعریف الامثال سے مراد یہ ہے کہ مثالوں کو مختلف بیانات اور کئی طرح کی کیفیات میں گھما پھیر کر بیان کرنا، ایک مثال پر اکتفاء نہ کرنا۔ اس آیت میں ڈانٹ ڈپٹ کی گئی ان کے لیے جو سب حقائق کو واضح جاننے و دیکھنے کے بعد بھی نہیں مانتے۔ اس لیے فرمایا میں اس بارے قسم اٹھاتا

ہوں۔ اس قرآن میں لوگوں کے لیے مختلف شکلوں میں مثالیں لے آتے ہیں اس طرح لوگوں کے لیے حقائق کو واضح کر دیا جاتا ہے اور لوگوں کو منعم اور نعمات سے نوازنے والے کا شکر بجا لانے پر آمادہ کرتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ کفر کا راستہ اپناتے ہیں اور اللہ فرما رہا ہے سب کچھ جاننے کے باوجود ہمارا شکر بجا نہیں لاتے۔

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾

''اور کہا ہم تمہیں ہرگز نہ مانیں گے یہاں تک کہ تو ہمارے لیے زمین میں سے کوئی چشمہ جاری کر دے۔''

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾

'' یا تیرے لیے کھجور اور انگور کا کوئی باغ ہو پھر تو اس باغ میں بہت سی نہریں جاری کر دے۔''

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾

''یا جیسا تو خیال کرتا ہے ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرا دے یا تو اللہ اور فرشتوں کو روبرو لے آ۔''

اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

”یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر ہو یا توں آسمان پر چڑھ جائے، اور ہم تو تیرے چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ تو ہمارے پاس ایسی کتاب لائے جسے ہم بھی پڑھ سکیں، کہہ دو میرا رب پاک ہے میں تو فقط ایک بھیجا ہوا انسان ہوں۔“

کفار مکہ کے مطالبات

ان آیات میں رسول اللہ ﷺ سے کفار مکہ جو مطالبات کرتے تھے اور وہ جو معجزات طلب کرتے تھے اور قرآن جو کہ معجزہ تھا اسے قبول نہ کرتے تھے اور اسے معمولی سمجھتے تھے تو ان کفار نے کہا، کھلے عام کہا اے محمد ﷺ! ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، سوائے یہ کہ ہمارے لیے وہی کام کریں جو ہم چاہتے ہیں۔

کفار کی جانب سے طلب کیے گئے معجزات

۱۔ مکہ کی سرزمین جس میں پانی کم ہے، اس میں پانی کا ایسا چشمہ نکال دو جس کا پانی خشک نہ ہو۔

۲۔ یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغات ہوں، جن کے درمیان نہریں جاری ہوں۔ یہ سب آپ کے لیے معجزہ ہوگا۔

۳۔ جیسا کہ آپ کا اپنا عقیدہ ہے جس کا بیان سورہ سبا آیت ۹ میں ہوا: ”او تسقط علیھم کسفا“ ”یا آسمان کو ٹکڑوں کی شکل میں ان کے سروں پر اتار دے“؛ لہٰذا آسمان ٹکڑے

ٹکڑے ہو اور اسے ہمارے سروں پر ڈال دو۔

۴۔ یا اللہ اور فرشتے اکٹھے ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں تاکہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

۵۔ یا آپ کے پاس سونے کا گھر ہو۔

۶۔ یا آسمان پر چڑھ جاؤ؛ البتہ یقینی بات ہے کہ آپ کے آسمان پر جانے سے ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ اُس وقت ایمان لائیں گے جب ایک کتاب لے آؤ جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

یہ وہ معجزات ہیں جو قریش مکہ نے مطالبہ کیے، یہ باتیں ان کی جہالت اور ان کی ہٹ دھرمی کی واضح دلیل ہیں۔ ان میں سے بعض باتیں غیر معقول بھی ہیں اور بے فائدہ بھی؛ جبکہ بعض امور بالذات محال ہیں۔ انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک یہ مطالبات پورے نہ کر دیں، بلکہ یہ سب کچھ مانگنے اور چاہنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ہم تو آپ پر ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ان سارے کاموں کو آپ خود ہی انجام دیں، اپنے اختیار سے یہ سب کچھ کریں۔

یہ مطالبہ اُن کی انتہائی نادانی، ہٹ دھرمی اور لجاجت کے سوا کچھ نہیں؛ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے رسولؐ! ان کو جواب دیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی تمام باتوں سے منزہ ہے جو تمہارے وہم و خیال میں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سارے امور سے بالاتر ہے کہ جو تم کہہ رہے ہو کہ اللہ فرشتوں کے ہمراہ انسانوں کے درمیان آجائے تو ایسا ہونا محال ہے، کیونکہ اللہ جسم و جسمانیات سے پاک و منزہ ہے اور ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قسم کے امور کی انجام دہی کا اختیار کسی انسان کو دے دے، کیونکہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے منزہ ہونے کے منافی ہے۔ میں تو اس کا رسول ہوں، اس کا پیغام پہنچانا میرا کام ہ،ے میں تو انسان ہونے میں تمہاری طرح ہوں، لیکن اللہ نے مجھے پیغام رسانی کے لیے چُن لیا ہے۔ یہ

بات تمہیں معلوم رہے کہ ایک پیام رسان کا کام یہ ہوتا ہے وہ اللہ سے لیتا ہے اور لوگوں تک وہ پیغام پہنچاتا ہے۔ رسول ہرگز غیبی قدرت کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا ہے کہ کوئی نبی اللہ تعالی کی مرضی کے بغیر جو ارادہ کرے وہ پورا ہو جائے؛ کیونکہ کفار کہتے تھے کہ آپ خود یہ سب کچھ کرکے دکھاتے نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ میرے اختیار اور میری قدرت کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کا اختیار ہے، میں تو بس اللہ کا رسول ہی ہوں اور کچھ نہیں۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

"اور لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آ گئی صرف اسی چیز نے روکا ہے کہ وہ کہنے لگے کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔"

انسانوں میں سے رسول کا ہونا

اس آیت میں کفار مکہ کے انکار کی ایک وجہ بیان کی ہے کہ وہ کہتے ہیں بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا رسول (پیغام رساں) ایک انسان کو بنا کر بھیج دے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین اللہ کے وجود کو مانتے تھے اور یہ کہ پوری کائنات کا خالق اللہ ہے لیکن وہ نبوت کا انکار کرتے تھے۔ اس جگہ انسانوں سے مراد بت پرست ہیں جو مکہ میں موجود تھے اور ایمان سے مراد رسالت اور نبوت پر ایمان لانا ہے۔

آیت کا معنی اس طرح بنتا ہے اللہ اس بات سے آگاہ تر ہے اور وہ یہ ہے کہ بت پرست ایمان کیوں نہیں لائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سوچتے تھے کہ رسول انسان اور بشر کی نوع سے نہیں ہو سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ رسول کو فرشتوں کی جنس سے ہونا چاہیے۔ اگرچہ وہ اس بات کو بعینہٖ واضح الفاظ میں نہیں کہتے تھے لیکن ان کے اعتقادات اسی طرح کے تھے جس کا

جواب اللہ نے اگلی آیت میں دیا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾

"کہہ دو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم آسمان سے ان پر فرشتہ ہی رسول بنا کر بھیجتے۔"

اللہ کا فیصلہ ہدایت دینے والے کے بارے

مشرکین کے دل کی بات بتا دی کہ وہ اس لیے ایمان نہیں لا رہے کہ اللہ کا رسول انسان کی نوع سے ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ کی نمائندگی میں انسانوں کے درمیان فرشتوں کو آنا چاہیے تھا۔ فرشتہ ہی اللہ کا رسول بن سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب سے فرمایا کہ انہیں اس بات کا جواب دیں اگر فرشتوں کی مادی زندگی ہوتی اور وہ زمین پر رہن سہن رکھتے، زمین پر چلتے پھرتے تو پھر ان کی ہدایت کے لیے آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا جاتا کیونکہ عنایت الٰہی یہ ہے کہ زمین پر بسنے والوں کے لیے خاص ہدایت کا انتظام کیا جائے اور زمین پر رہنے والے انسان ہیں۔ انسان کے پاس اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجتا ہے اور وہ انسان، اللہ کے رسول بن کر انسانوں کے لیے ہدایت دیتے ہیں۔

دو اہم مطلب

اس آیت میں دو مطالب پر تاکید کی گئی ہے:

(۱) نوع بشر کی زندگی مادی اور زمینی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی ہدایت اپنے اوپر لازم قرار دی ہے۔

زمین والوں کی ہدایت کا وسیلہ

زمین پر مادی زندگی گزارنے والوں کی ہدایت کا تنہا وسیلہ وحی الٰہی ہے جو اللہ کی فرشتگان کے وسیلہ سے انجام پائی ہے۔ ایک برگزیدہ فرشتہ اس کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اس وحی کو اللہ کے برگزیدہ اور مصطفیٰ بندے پر لے آتا ہے جو کہ نبی یا رسول ہوتے ہیں۔ یہ ایک مکمل برہان ہے عمومی ثبوت پر۔ اس بیان کے تحت الٰہی عنایت کا تقاضا ہے کہ خداوند مخلوقات کی انواع سے ہر نوع کے لیے اس کے کمال اور سعادت کی خاطر ہدایت کا انتظام کرے۔ انسان اللہ کی مخلوقات سے ہے بلکہ اشرف المخلوقات ہے۔ اس کا کمال اجتماعی زندگی کے بغیر ممکن نہیں اور اجتماع اور معاشہرہ میں مزاحمت اور باہمی مفادات کا ٹکراؤ موجود ہے ہر ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکرارہا ہوتا ہے اور انسان کی عقل تنہا کافی نہیں جو اس مزاحمت سے بچنے کے لیے باہمی تعامل اور توازن کا ماحول قائم کرنے کی خاطر قانون وضع کر سکے اس وجہ سے کہ انسان کے اندر اختلافات کا سبب خود انسان کا عاقل نہ ہونا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ تمام منافع اور مفادات اپنی ذات کے لیے خاص کرے لہٰذا انسان کو وحی کے شعور سے بہرہ ور کریں تاکہ وحی کے سایہ تلے وہ مطلوب کمال کو حاصل کر سکے۔ وہی نبی یا رسول ہوتا ہے کہ جس کے پاس اللہ کے فرشتہ کے ذریعہ وحی الٰہی پہنچتی ہے۔ نبی یا رسول اللہ کی وحی وصول کر کے اس کی روشنی میں انسانی معاشرہ کے لیے قانون پیش کرتا ہے اور انہیں کمال کے راستہ کی ہدایت دیتا ہے۔

بت پرستوں کا خیال اور زمینی حقائق

ان دو آیات کا مفاد یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رسالت اور نبوت پر ایمان نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ بت پرست خیال کرتے تھے اللہ کی جانب سے ایک انسان اللہ کا پیام رساں ہو، ایسا ہونا ناممکن ہے لہٰذا جو یہ کہہ رہا ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں وہ جھوٹ بول رہا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان کیوں لائیں؟ لیکن زمین پر مادی زندگی کا تقاضا کچھ اور ہی ہے۔ زمینی حقیقت کو

دیکھتے ہوئے اور اللہ کی اپنے بندوں پر خصوصی عنایت اور مہربانی کہ وہ اپنے بندگان کے لیے ہدایت کا انتظام کرتا ہے۔ تو ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے انسانوں میں سے ایک انسان کا انتخاب کیا جس میں وحی وصول کرنے کی صلاحیت تھی اس کے پاس وحی دے کر فرشتہ کو بھیجا اور وحی کے ذریعہ انسان کے کمال کے لیے پورا انظام دے دیا اور رسول کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ انسانوں کی راہنمائی کریں اور ان کے پاس اللہ کے پیغامات کو پہنچا دیں۔ بات تو اس قدر حتمی اور ضروری ہے کہ اگر فرض کرلیں کہ فرشتے زمین پر مادی زندگی گزار رہے ہوتے اور ان کی ہدایت مطلوب ہوتی تو ان کے پاس فرشتوں میں سے کسی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ جب انسان زمین پر مادی زندگی گزار رہے ہیں تو ان کی ہدایت کے لیے انسانوں میں سے ان کے لیے ہادی و راہنما ہو گا جس کے پاس اللہ کی وحی آئے گی اور وہ اللہ کے پیغامات وصول کرکے انسانوں کے پاس پہنچائے گا۔ یہ وہ طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے متعین کیا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۹۶

”کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ کافی ہے، بے شک وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور دیکھنے والا ہے۔“

اللہ کی گواہی

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا احتجاج اور حجت و دلیل کو مکمل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو چیلنج کیا کہ قرآن معجزہ ہے اس کا مقابل تم نہیں لا سکتے جس کا مطلب ہے کہ یہ قرآن انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے لیکن کفار مکہ اپنے کفر و شرک پر باقی رہے۔ بعد میں

بت پرستوں کے خیالات کا جواب بھی دے دیا۔ اب جبکہ وہ سب دلائل کے موجود ہونے اور ہر بات کے آشکار ہو جانے کے بعد بھی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں اور ایمان نہیں لاتے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول مکرم ﷺ کو فرماتے ہیں کہ اس امر کو اللہ کی گواہی پر چھوڑ دو کیونکہ اللہ ہی کے پاس تمام بندگان کے امور کی بازگشت ہے اور وہی ذات تنہا امر کی مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے اعمال سے آگاہ ہے اور مشرکین کے اعمال سے واقف ہے لہٰذا اس پر اللہ ہی گواہ ہے اور جانتا ہے کہ اس کے پیامبر نے پیغام کو پہنچا دیا ہے۔ اپنی دعوت اور اس کے دلائل اور ثبوت ان کے سامنے رکھ دیئے ہیں، ان کے پاس عذر باقی نہیں رہا لیکن ان کافروں نے یہ سب کچھ سنا اَن سنا کر دیا۔ اب دلیل اور ثبوت ان پر مکمل ہو گیا لیکن انہوں نے ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کو جاری رکھا ہوا ہے۔

اس کلام کا مفاد یہ ہے کہ اے ہمارے رسول! اب ان کے ساتھ بحث و مباحثہ اور دلائل و ثبوت پیش کرنے کا سلسلہ بند کر دو۔ انہوں نے نہیں ماننا لہٰذا اس امر کو اللہ کے سپرد کر دو کہ اللہ جس طرح چاہے تیرے اور ان کافروں کے درمیان فیصلہ دے؛ کیونکہ اللہ ہی تمہارے حالات کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہے۔ وہی دانا ہے، وہی گواہ ہے اسی نے فیصلہ دینا ہے آپ کا کام مکمل ہو گیا۔

وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾

”اور جسے اللہ راہ دکھا دے وہی راہ پانے والا ہے، اور جسے گمراہ کر دے پھر تو ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست نہیں پائے گا، اور ہم نے انہیں قیامت کے دن مونہوں

کے بل اندھے گونگے بہرے کر کے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب بجھنے لگے گی تو ان پر اور بھڑکا دیں گے۔"

اتمام حجت بر مشرکین

یہ آیت سابقہ بیان کا اتمام ہے۔ رسول اللہ ﷺ مشرکین کو تمام تر دلائل دینے کے بعد واضح فرما رہا ہے اب تمہارے اوپر حجت تمام ہو چکی ہے اور تمہاری گمراہی یقینی ہے اور اب تمہارے ہدایت پانے کی اُمید ختم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کے لیے ہدایت کے اسباب مہیا کرتا ہے اور وہ شخص ان سے بھرپور استفادہ کرتا ہے اور ہدایت پا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اسے ہدایت دی ہے کیونکہ ہدایت کے اسباب مہیا کر دینا ہی توفیق الٰہی ہے۔ ان اسباب کے استعمال کا اختیار خود بندے کے اپنے پاس ہے اور جو شخص ان اسباب کو اپنے استعمال میں نہیں لاتا اور حق کے راستہ کو گم کر بیٹھتا ہے گمراہ ہو جاتا ہے تو اس نے خود ہی ہدایت اور صحیح راستہ کو چھوڑا ہے گویا کہ اللہ نے ہی اس کے لیے گمراہی مقدر کر دی ہے کیونکہ یہ بات طے ہے جو ہدایت کے اسباب کو استعمال میں نہ لائے گا تو وہ گمراہ ہو گا۔ اس نے خود گمراہی کا انتخاب کیا ہے ایسے شخص پر اللہ کی طرف سے حجت تمام ہوئی لہٰذا اب وہ اللہ کے سوا عذاب سے نجات پانے کے لیے کسی کو اپنا یاور اور مددگار نہ پائے گا اب جبکہ خدا نے اسے ہدایت نہیں دی اب قیامت کے دن وہ اُلٹا لٹکایا جائے گا، منہ کے بل پڑا ہوگا، اندھا و بہرہ ہو گا اس نے جو اپنے لیے خیالی یاور فرشتے اور جنات بنا رکھے تھے وہ اس کی مدد نہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ اسے دیئے تھے کہ ان کے ذریعے صحیح راہ پر چلنے کے لیے اللہ سے استفادہ کرے۔ اس نے ایسا نہیں کیا حق کو ان کے وسیلہ سے نہیں سمجھا۔ نعمت دینے والے اپنے محسن کا شکر بجا نہیں لایا تو اب اس کا جہنم کے عذاب میں پڑے رہنا حتمی ہے اور اس سے کوئی چھٹکارا نہ ہے۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں میں

جلے گا، یہ شعلے بڑھتے ہی جائیں گے، ان کی تپش کم نہ ہو گی، آگ کے اوپر اور آگ برسے گی۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوۡۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِيۡدًا ﴿۹۸﴾

"یہ ان کی سزا اس لیے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو پھر نئے سرے سے بنا کر اٹھائے جائیں گے۔"

جہنم کافروں کے لیے کیوں؟

اس آیت میں کفار کے لیے جہنم کی سزا کا سبب بیان کیا جا رہا ہے۔ ہم نے جہنم کے عذاب کی جو توصیف بیان کی ہے یہ کافروں کے لیے ہے اور یہ سزا اس لیے ہے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے، معاد کے منکر تھے، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو قبول نہیں کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ ہم جب بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے تو پھر ہمیں ایک نئی خلقت دے کر کیسے زندہ کیا جائے گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا!۔ ہم نے انہیں دوبارہ پہلی صورت میں زندہ کر دیا ہے اور انہیں ان کے انکار کا مزہ چکھایا جا رہا ہے۔

اَوَ لَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ وَ جَعَلَ لَهُمۡ اَجَلًا لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا كُفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے وہ ان جیسے اور بھی بنا سکتا ہے اور اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس میں کوئی شک نہیں، اس پر بھی ظالم انکار کیے بغیر نہ رہے۔"

معاد کا انکار کرنے والوں کو جواب

اللہ تعالیٰ نے معاد و قیامت کا انکار کرنے والوں سے فرمایا ہے کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے؛ جبکہ مشرکین مکہ بھی اس عقیدہ کو قبول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق اللہ ہے۔ اللہ نے تمہیں عدم سے خلق کیا ہے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دوبارہ تمہیں خلق کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہلی بار آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے، یہ امر محال نہیں کہ وہ دوبارہ انہیں اسی کی مثل خلق کر دے اور تمہیں دوبارہ زندگی دے دے۔

خلقت بعدی کا خلقت اولیٰ کے مثل ہونا

اس جگہ شباہت بدن کے متعلق ہے، نفس کے بارے نہیں ہے۔ وہ اس بدن کا انکار کر رہے تھے تو بدن پہلے کی مثل ہو گا جب کہ نفس وہی ہو گا جو پہلے تھا فنفس انسان کی شخصیت اور ہدایت کا حافظ و نگہبان ہے۔ یہ نفس دُنیا اور آخرت میں ایک ہی جیسا ہو گا۔

خداوند قادر ہے

اللہ کی قدرت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اللہ قادر ہے ان کی مثل خلق کرے اور ان کے لیے مدت کو متعین کر دے اس میں کوئی تردید نہیں ہے یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اَجَل سے مراد موت ہے۔ موت کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ کافر عبرت حاصل کریں ہو سکتا ہے اس طرح اللہ کی آیات کو جھٹلانے کی گستاخی سے رُک جائیں اور اس کو تسلیم کر لیں کہ اللہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں **اَجَل** سے مراد روز قیامت ہے (تفسیر رُوح المعانی)۔

آخر میں فرمایا ہے کہ ہمارے دلائل اور ہماری نشانیاں بڑی واضح اور روشن ہیں ان میں کوئی ابہام نہیں ہے لیکن ان کا ظلم وستم وجہ بنا ہے کہ صحیح سمجھ اور ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ ظلم حقائق کے سامنے حجاب و پردہ ہے۔ اس وجہ سے ان واضح اور روشن نشانیوں کو سامنے دیکھنے کے باوجود ہٹ دھرمی کرتے ہوئے انکار کر دیتے ہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۧ ﴿۱۰۰﴾

”کہہ دو اگر میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم انہیں خرچ ہو جانے کے ڈر سے بند ہی کر رکھتے، اور انسان بڑا تنگ دل ہے۔“

کافروں کی توبیخ

اس جگہ کافروں کو توبیخ اور ڈانٹ پلائی جا رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ، اے کافرو تم بخیل اور کنجوس ہو، مال خرچ کرنے سے تمہارے ہاتھ بندے ہوئے ہیں۔ تمہاری حالت تو ایسی ہے کہ اللہ کی رحمت کے سارے خزانے تمہارے پاس ہوں تب بھی تم اس مال کو خرچ نہ کرو گے کیونکہ انسان کی طبیعت ہی میں بخل اور کنجوسی ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

''اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دی تھیں، پھر بنی اسرائیل سے بھی پوچھ لو جب موسیٰ ان کے پاس آئے تو فرعون نے اسے کہا اے موسیٰ میں تو تجھے جادو کیا ہو (سحر زدہ) خیال کرتا ہوں۔''

حضرت موسیٰؑ کے معجزات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو نو معجزات دیے گئے تھے، ۱۔ عصا، ۲۔ ید بیضا (مٹھی کھولتے تھے تو روشنی نکلتی تھی)، ۳۔ طوفان، ۴۔ مکڑیاں، ۵۔ مینڈک، ۶۔ خون، ۷۔ سوسمار، ۸۔ قحط، ۹۔ پھل و میوہ جات کا نزول۔

مختلف اوقات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں یہ سب نشانیاں لوگوں کے سامنے آتی رہیں۔ فرعون نے عصا کو اژدھا بنتے دیکھا اور موسیٰؑ کے ہاتھ سے نور نکلتے بھی دیکھا۔ اسی طرح خون کی شکل میں عذاب بنی اسرائیل نے دیکھا، قحط سالی کا سامنا آیا۔ مینڈکوں کے لشکر نے تباہی مچائی، مچھروں کے وسیلہ سے عذاب آیا، طرح طرح کی نشانیاں دیکھتے رہے لیکن پھر بھی نہ سدھرے۔

فرعون نے تو موسیٰ علیہ السلام کے بارے کہہ دیا کہ تم سحر زدہ ہو، تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے اور جب مدائن میں جادوگر حقیقت جان کر موسیٰ علیہ السلام کے رب پر ایمان لے آئے تو فرعون نے کہہ دیا کہ تم سب ہی غلط ہو اور موسیٰؑ تو تم سے بڑا ساحر و جادوگر ہے۔ پھر فرعون کو بنی اسرائیل نے سمندر میں غرق ہوتے دیکھا، اللہ تعالیٰ نے یہ حوالہ اس لیے دیا کہ اے میرے رسول تم ان بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ کتنے زیادہ معجزات موسیٰ ان کے لیے لے آئے لیکن اس کے باوجود معجزات کی کثرت 'ہٹ دھرم، ضدی اور منکروں کے دلوں کو ایمان کی طرف مائل نہ کر سکے، سب کچھ جاننے اور دیکھنے کے باوجود بھی منکر ہی رہے، لہٰذا ان مشرکین مکہ پر اتمام حجت ہو چکی، یہ ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ آپ

کو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہیے، آپ نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

''کہا یہ تو تجھے معلوم ہے کہ یہ آسمانوں اور زمین کے مالک ہی نے لوگوں کو سوجھانے کے لیے نازل کی ہیں، اور بے شک میں تجھے اے فرعون ہلاک کیا ہوا خیال کرتا ہوں۔''

موسیٰؑ اور فرعون کا مکالمہ

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرعون سے گفتگو کو بیان کیا گیا ہے۔ فرعون معجزات کا مسلسل انکار کیے جا رہا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا، جادو گر اور مسحور تک کہہ رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تجھے تو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ سب معجزات اللہ تعالیٰ نے نازل کیے ہیں اور ان معجزات کے اُتارنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو سمجھایا جائے کہ موسیٰؑ جو پیغام دے رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ وہ ہدایت پا جائیں اور ان معجزات کے ذریعہ حق اور باطل کے درمیان فرق قائم کر سکیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون! تم سرکشی اور عناد و دشمنی کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے علم و یقین کی بجائے ظن و گمان کا استعمال کیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ حتمی فیصلہ صرف اللہ کے پاس ہے، لہٰذا فرعون کو اپنی مرضی کا جواب دیا۔ اس کے علاوہ بعض دفعہ ظن کا لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ۙ﴿۱۰۳﴾

''پھر اس نے ارادہ کیا کہ انہیں اس زمین سے نکال دے تب ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا۔''

فرعون کا موسیٰؑ کے بارے فیصلہ

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کی حقانیت بارے جتنے دلائل دیے سب کو اس نے رَد کر دیا۔ دوسری جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ مصر میں پھیلتی جارہی تھی۔ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دے رہے تھے ان حالات میں فرعون نے فیصلہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ ان کی قوم بنی اسرائیل کو اور جو بھی ان پر ایمان لائے ہیں ان سب کو زبردستی مصر سے نکال دے۔ اس طرح وہ خود اپنی فوج کے ہمراہ موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کا مقابلہ کرنے اور انہیں مصر کی حدود سے باہر تک پہنچانے کے لیے چڑھائی کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم آگے آگے اور فرعون اور اس کی فوج ان کے پیچھے پیچھے، آگے سمندر آگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ عصا سمندر میں ماریں۔ جیسے ہی عصا مارا، راستہ بن گیا اور وہ سب باہر نکل گئے اور فرعون اور اس کے لشکری بھی ان کے پیچھے پیچھے اسی راستہ پر چل پڑے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو غرق کر دیا۔ راستہ بند ہو گیا اور سب کے سب پانی میں ڈوب گئے۔ فقط فرعون کی لاش محفوظ رہی تاکہ بعد والوں کے لیے عبرت ہو۔ اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے۔

وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

”اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس زمین میں آباد رہو پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا ہم تمہیں سمیٹ کر لے آئیں گے۔“

بنی اسرائیل کے بارے اللہ کا فیصلہ

بنی اسرائیل کو ایک سرزمین پر ٹھہرنے کا حکم دیا، اس سرزمین سے مراد وہ مقدس سرزمین ہے جس میں انہیں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا جیسا کے سورہ مائدہ آیت ۲۱ میں ہے:

ترجمہ: ”مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اسی سرزمین کو مقدر کیا ہے“۔

وعدہ آخرت

اس سے مراد یا تو دوسری بار کا وعدہ ہے یا اس سے مراد آخرت ہے کہ اس دن تم سب اکٹھے ہو گے۔ وعدہ آخرت سے مراد بھی ہو سکتا ہے جیسے سورہ کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی اس طرح ہو گا فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل کو دستور دیا گیا کہ وہ مقدس سرزمین جو کہ فلسطین کی سرزمین تھی اس میں سکونت اختیار کریں اسی جگہ موجود رہیں، یہاں تک کہ دوسرے وعدہ کا وقت آجائے۔ وہ ایسا وعدہ ہے جس پر تمہارے اوپر مصیبتیں آن پڑیں گی، قتل و غارت گری ہو گی، وطن سے دربدر ہو گے۔ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کے نتیجہ پر ان پر بلائیں اور مصائب آئیں گے، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جبکہ اللہ کے انعامات ان پر بہت زیادہ تھے اس بارے دوسری جگہ پر تفصیل سے بیان آیا ہے۔

وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝۱۰۵

”اور ہم نے اس قرآن کو سچائی سے نازل کیا اور وہ سچائی سے ہی نازل ہوا، اور ہم نے تجھے صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔“

قرآن کی خصوصیت

قرآن کو اللہ نے اُتارا ہے۔ قرآن حق ہے اور حق لے کر آیا ہے۔ قرآن میں باطل نہیں ہے اور نہ ہی باطل کی کوئی گنجائش اس میں ہے۔ قرآن کے اندر جو کچھ ہے وہ حق کے مطابق ہے اس کے اندر کچھ بھی بے فائدہ و بے مقصد نہیں۔ اس میں بے ہودہ اور لغویات نہیں، باطل پر مبنی مطالب موجود نہیں۔ اس میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب بامقصد ہے۔

قرآن اُتارنے میں اللہ کے سوا کسی اور کی مداخلت نہیں ہے تاکہ وہ غیر اللہ اسے باطل بنادے یا اس میں باطل اور غلط بات کو لے آئے۔

رسول اللہؐ کی خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دو خصوصیات بیان کی ہیں:۔

۱۔ بشارت دینے والا جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، ہدایت پا لیتے ہیں، صراط مستقیم پر چلتے ہیں تو ان کو جنت الفردوس اور دائمہ خوشحال زندگی کی بشارت دیتا ہے۔

۲۔ دوسری صفت ڈرانا ہے۔ جو معصیت کار ہیں، جنہوں نے اللہ کی دعوت کو قبول نہیں کیا، قرآن اور رسولؐ کی رسالت کا انکار کر دیا ہے، آخرت کو قبول نہیں کیا تو انہیں برے انجام سے ڈرایا ہے کہ ان کے لیے سخت سزا جہنم کی صورت میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن حق ہے، حق کی جانب سے ہے، حق پر مشتمل ہے، اللہ کے سوا اس میں کسی کا عمل دخل نہیں، خود رسول اللہ ﷺ کا بھی کوئی عمل دخل اس میں نہیں ہے۔ ان کے الفاظ متعین ہیں، معانی متعین ہیں، سب کچھ بامقصد ہے اور پس اللہ کی طرف سے ہے۔

وَ قُرۡاٰنًا فَرَقۡنٰهُ لِتَقۡرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكۡثٍ وَّ نَزَّلۡنٰهُ تَنۡزِيۡلًا ﴿۱۰۶﴾

''اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کرکے اتارا تاکہ توں مہلت کے ساتھ اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور ہم نے اسے آہستہ آہستہ اتارا ہے۔''

قرآن کا نزول

اس آیت میں قرآن کے نزول کی بابت بتایا گیا ہے کہ ہم نے پورے قرآن کو یکدم اتارنے کی بجائے اسے آہستہ آہستہ اُتارا ہے۔ ایک ایک آیت اُتاری، کبھی کوئی سورہ پوری اُتار دی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ لوگوں میں قرآنی معارف کو سمجھنے اور انہیں درک کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور ان کے لیے قرآن کو یاد کرنا بھی آسان ہو۔ اس میں یہ بات بھی مد نظر رکھی گئی ہے کہ لوگوں کی ضروریات اور ان کے مفادات کو مد نظر رکھ کر قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے اتار گیا ہے۔ جیسے جیسے لوگوں کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا گیا تو اسی نسبت سے پھر قرآنی آیات اور سورتیں اتاریں گئیں تاکہ علم و عمل کے ساتھ تعلیم و تربیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ (جبکہ توریت کو ایک دفعہ پوری کتاب بنی اسرائیل پر اتار دی گئی۔ انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا جب تک اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو ان کے سروں پر معلق نہ کر دیا۔ اس کے بعد ہی وہ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوئے)

قُلۡ اٰمِنُوۡا بِهٖۤ اَوۡ لَا تُؤۡمِنُوۡا‌ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهٖۤ اِذَا يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ يَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾

''کہہ دو تم اسے مانو یا نہ مانو، بے شک وہ لوگ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے جب ان پر پڑھا جاتا ہے تو تھوڑیوں پر سجدہ میں گرتے ہیں۔''

وَّ یَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ کَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا ﴿۱۰۸﴾

''اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ہو کر رہے گا۔''

وَ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ یَبۡکُوۡنَ وَ یَزِیۡدُہُمۡ خُشُوۡعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدۃ

''اور تھوڑیوں پر روتے ہوئے گرتے ہیں اور ان میں عاجزی زیادہ کر دیتا ہے۔''

قرآن کا اعتراف کرنے والے

اس آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ جن کو علم دیا گیا وہ قرآن کا اعتراف کرتے ہیں وہ صاحبانِ علم کون ہیں جن کو قرآن کے نزول سے پہلے قرآن کے بارے علم تھا اور وہ اس کے معترف تھے؟ تو اس سے مراد یہود و نصاریٰ کے علماء مراد لیے جا سکتے ہیں یا پھر ابراہیمی شریعت پر چلنے والے اور ابراہیمی شریعت کے علماء مراد ہوں۔ اس میں یہ احتمال دیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابو طالب علیہ السلام ہوں کہ اُنھوں نے قرآن کے نزول سے پہلے جو اشعار کہے ان میں بہت سارے اشعار ایسے ہیں کہ بعد میں قرآنی آیات نے ان مضامین کو بیان کیا جو مضامین حضرت ابو طالب علیہ السلام نے اپنے اشعار میں بیان کیے تھے۔ اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے۔

قرآن کے منکروں سے دو ٹوک بات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان منکرین قرآن سے کہہ دو کہ تم قرآن پر ایمان لے آؤ یا قرآن پر ایمان نہ لاؤ، اللہ کو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، اس سے فائدہ ہے تو تمہارا ہی ہے اور اگر اس میں نقصان ہے تو وہ بھی تمہارا ہی ہے البتہ جن میں حق وصول کرنے کی قابلیت ہے اور الٰہی آیات کو پہچانتے اور جانتے ہیں جب ان پر قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان پر ان آیات کا اثر ہوتا ہے، وہ تو ان آیات کو سنتے ہی تواضع و انکساری کی حالت میں

زمین پر گرپڑتے ہیں اور فوراً سجدہ میں چلے جاتے ہیں جو ان آیات کو قبول کرنے کی علامت ہے ۔ جسم کے تمام اعضاء کی بجائے فقط ٹھوڑی کا ذکر کیا ہے کیونکہ ٹھوڑی زمین کے قریب ترین ہے۔ سجدہ میں جب گرتے ہیں تو وہ اللہ کی پاکیزگی کو بیان کرتے ہیں کیونکہ جب انسان سجدہ میں جاتا ہے تو زمین کے قریب ترین ٹھوڑی ہوتی ہے، انسان کے چہرہ کی سب سے نچلی جگہ اس کی تھوڑی ہی ہوتی ہے۔

بعثت کا یقینی ہونا

اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، یہ الٰہی وعدہ ہے اس کے خلاف نہیں ہونا۔ ہر حال میں انسان نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اس کے خلاف نہیں ہونا، مشرکین اس کا انکار کرتے تھے۔ جو علماء ہیں، خدا شناس ہیں انہیں اس کے واضح ہونے کا یقین ہے، وہ تو اس کو یاد کرکے گریہ وزاری کی حالت میں خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کا سجدہ بجا لاتے ہیں۔ وہ اپنے اعضاء وجوارح کے ساتھ ذلت، بندگی اور خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔قرآن سے ان کے لیے انکساری اور عاجزی میں اضافہ ہوتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

”کہہ دو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے پکارو سب اسی کے عمدہ نام ہیں، اور اپنی نماز میں نہ چلا کر پڑھ اور نہ بالکل ہی آہستہ پڑھ اور اس کے درمیان راستہ اختیار کر۔“

اللہ کے اسماء

اللہ اور رحمٰن یہ دو نام ہیں اس لیے اس جگہ یہ بتایا جارہا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو

لفظ اللہ سے پکارو یا لفظ رحمٰن سے۔ دونوں ذات باری تعالیٰ کے نام ہیں، ان دو میں فرق نہیں ہے۔ اگر ان دو ناموں سے باری تعالیٰ کو یاد کرو گے تو گویا آپ نے اللہ کے اسماء الحسنیٰ میں سے کسی ایک سے پکارا ہے کیونکہ اللہ کے سب نام خوبصورت ہیں۔ سب ہی اسماء الحسنیٰ ہیں۔

اللہ کے اسماء بارے وضاحت

ا۔ اسماء دو طرح کے ہیں: کچھ نام ایسے جو اچھے مسمیات پر دلالت کرتے ہیں اور پوری طرح اس کا تعارف کروا دیتے ہیں۔

۲۔ جبکہ کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو برے مسمیات پر دلالت کرتے ہیں یعنی وہ بری چیزوں کے نام ہوتے ہیں ان کے بولنے سے برائی کا تصور آتا ہے۔

اللہ کی ذات بارے

اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے۔ قبیح و برائی کا اس کی ذات اقدس سے تعلق ہی نہیں۔

اسماء الحسنیٰ کی اقسام

جو نام اچھے ہیں اور خوبصورت ہیں، یہ بھی دو طرح کے ہیں:

ا۔ کچھ اسماء وہ ہیں جو حسن محض ہیں۔ ان میں کچھ بھی نقص یا کمی نہیں ہے ایسا علم کہ جس میں جہل کی آمیزش نہ ہو، ایسا غناء و دولت مندی کہ جس میں فقر و افلاس کا عنصر نہ ہو۔

۲۔ کچھ اسماء وہ ہیں جن میں اچھی بات کبھی کبھار ہو اس میں کمزوری بھی ہے قبیح و نقص کی ملاوٹ ہے۔ جب کہ ان کا حسن و اچھائی والا پہلو دوسرے پہلو پر غالب ہے جیسے انسان کا علم کہ اس میں جہالت بھی ہوتی ہے۔ انسان کا دولتمند ہونا کہ اس میں فقر بھی ہوتا ہے،

انسان کی قدرت کہ اس میں ناتوانی بھی ہوتی ہے۔

اللہ کے اسماء الحسنٰی

یقینی بات ہے کہ اللہ کے لیے اسماء الحسنٰی کی پہلی قسم ہے لہٰذا اللہ کے اسماء ایسے ہیں جو تمام ناموں میں بہترین اور حسین ترین نام ہیں۔ اس میں کوئی نقص نہیں اور نہ ہی کمزوری ہے۔

حدیث میں ہے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''نحن اسماء اللہ الحُسنیٰ''

''اللہ کے اسماء الحسنٰی ہم ہیں''

اللہ کے سارے نام ہی حسنیٰ اور خوبصورت ہوتے ہیں لہٰذا جس نام سے پکارو اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ ایسے نام فقط اللہ کے لیے مخصوص ہیں کسی اور کے لیے نہیں ہیں یہ تمام فقط اللہ کا آئینہ ہیں کسی اور پر صادق ہی نہیں آتے یہ سب ایک مسمّٰی پر دلالت کرتے ہیں جو تمام صفات کا جامع ہے اور فقط اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس ہے۔

بت پرستوں کا رویہ

لیکن جو بت پرست ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو ہر وصف اور ہر حد سے برتر جانتے ہیں لیکن جب اس ذات کو ان اسماء سے کسی ایک نام سے پکارا جائے تو اسے تولد اور پیدائش کا عنوان دیتے ہیں، یہ فرشتوں اور جنات کو اللہ تعالیٰ کے اسماء کے لیے بلند مرتبہ مطلب خیال کرتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ سب اللہ کے فرزندان تھے ان کا عالم وجود میں عمل دخل ہے ان کا تصرف کائنات میں ہے ان کا نظریہ ہے کہ ہر عابد کی عبادت ان ہی اسماء کے مرحلہ سے گزری ہے، ان فرزندان سے آگے نہیں بڑھتی اور خدا تک وہ عبادت نہیں جاتی یہ ان کا خیال تھا۔ بت پرستی میں غرق لوگ یہ سوچتے ہیں ان کے اعتقادات گھٹیا اور پستہ تھے سوچ پست تھی۔ جب

انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کبھی یا اللہ کہتے ہیں اور کبھی یا رحمٰن کہتے ہیں تو وہ کہتے تھے یہ کیسا پیغمبر ہے جو ہمیں تو دو معبودوں کی پرستش سے منع کرتا ہے اور خود دو الٰہ کو پکارتا ہے یعنی ایک الٰہ اللہ ہے دوسرا الٰہ و معبود رحمٰن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے ان کو جواب دیا ہے یہ سب اسماء ایک ذات پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ یہ اسماء خود علیحدہ معبود ہیں۔

نماز کے بارے حکم

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو نماز کے بارے ہدایت دی ہے کہ نہ تو بہت اونچی آواز میں پڑھو اور نہ ہی بہت ہی دھیمی آواز میں بلکہ درمیانہ انداز اپناؤ۔ لہٰذا دونوں انتہاؤں سے منع کرتے ہوئے اعتدال اور درمیانہ انداز اپنانے کا حکم دیا ہے۔

یہ کلام اس پر منطبق ہے جو سنت رسولؐ سے ثابت ہے کہ صبح کی دو رکعت اور مغرب و عشا کی پہلی دو رکعت کو بلند آواز سے پڑھو کہ قریب والا اسے سن سکے، اور نماز ظہر اور نماز عصر کی پہلی دو رکعت کو آہستہ پڑھو کہ خود آپ کے کان سنیں کہ آپ کیا پڑھ رہے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں بلند آواز سے پڑھنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات بلند ہے اور نماز میں آہستہ پڑھنے سے اللہ کا قرب ہونا مراد ہے لہٰذا نماز کو دونوں صورتوں میں انجام دینا چاہیے (البتہ تفصیل فقہی احکام سے مربوط ہے آیت کے ظاہر سے اس کا معنی واضح نہیں ہوتا) اللہ کی شان کے بارے یہ جملہ کہا جاتا ہے:

الَّذِی بَعُدَ فَلَا یُرٰی وَ قَرُبَ فَشَهِدَ النَّجْوٰی تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی

ترجمہ: "وہ اللہ کہ دُور ہے کہ اسے دیکھا نہیں جا سکتا اور قریب اتنا ہے کہ مخفیانہ مناجات اور سرگوشی کو سن لیتا ہے، وہ ذات بابرکت ہے اور بلند مرتبہ ہے"۔

وَ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّهٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ کَبِّرۡهُ تَکۡبِیۡرًا ﴿۱۱۱﴾

"اور کہہ دو سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا سلطنت میں شریک ہے اور نہ کوئی کمزوری کی وجہ سے اس کا مددگار ہے، اور اس کی بڑائی بیان کرتے رہو۔"

اللہ ہی لائق حمد کیوں؟

اس آیت میں رسول اللہؐ کو حکم ہے کہ وہ اللہ کی حمد بجالائے اور یہ حمد کیوں بجالائے اس کی وجہ بتادی ہے کہ ساری حمد و تعریف و ستائش اس اللہ کے لیے خاص ہے:

- جو اولاد نہیں رکھتا۔
- جس کا مُلک شرکتِ غیر سے پاک ہے۔
- اس کی ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔
- سارا مُلک اسی کا ہے۔
- اللہ ہی مالک ہے وہی قادر مطلق ہے۔

پورے عالم کی تدبیر وہ اکیلے کرتا ہے۔ جس کا ملک ہوتا ہے وہی اس کا مالک ہوتا اور جو جس ملک کا مالک ہوتا ہے وہ اس ملک کو چلانے، اسے نظم دینے، اس کے امور کی تدبیر کرنے میں بااختیار ہوتا ہے۔ پس اللہ ہی ہے کہ اس کی خدائی میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں، اسے کسی کو اپنا سرپرست بنانے کی ضرورت نہیں۔

"اس کی مانند و مثل کوئی نہیں"۔[1] اللہ ہی غالب و مقتدر و عزیز ہے، اس کے ہاں

[1]۔ سورہ شوریٰ، آیت: ۱۱۔

ذلت کی راہ نہیں تا کہ وہ اس ذلت اور کمزوری کو دُور کرنے کے لیے کسی کا محتاج ہو۔

اللہ کی کبریائی

آخر میں فرمایا ہے کہ اے میرے رسول تم پس اللہ کی کبریائی بیان کرو۔ تکبر اسی کے لیے ہے اور وہی اس کا لائق ہے۔ اللہ اس سے بلند و بزرگ تر ہے کہ اس کا وصف بیان کیا جائے، وہ اس سے منزہ ہے کہ کسی بھی معاملہ میں کسی اور کو شراکت دار بنائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندے اللہ کا جو وصف بیان کرتے ہیں، جو حمد بجالاتے ہیں اور جس طرح اس کی قدرت کو بیان کرتے ہیں تو اللہ ان سب امور سے بالاتر اور بلند تر ہے۔ یہ مطلب امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت میں بھی آیا ہے۔[1]

اس سورہ کی خصوصیات اور اس کی عمدگی یہ ہے کہ اس کا آغاز اللہ کی سبحانیت و وحدانیت کے بیان سے ہے اور اس کا اختتام اللہ کی حمد، الٰہی ستائش اور کبریائی کے بیان سے ہے۔ اس کی ذات سے شریک کی نفی کی ہے اور اس کی عزت واقتدار اور غلبہ کو ثابت کیا ہے۔

---

[1] ۔اصول کافی دو جلدی عربی جلد دوم ص ۹۱۔

سورۃ الکھف

(مکی، آیات 110)

سورہ کے مطالب

حق پر چلنے کی دعوت، نیک عمل کی تلقین، قیامت کے بپا ہونے کے ثبوت، اللہ سے شرک کی نفی، اللہ کا کوئی فرزند نہیں، توحید، رسالت اور معاد بنیادی عقائد بارے واضح بیان۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿ۜ۱﴾

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندہ پر کتاب اتاری اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی''۔

کتاب کا تعارف

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اُتاری ہے اس کا تعارف اس طرح کروایا گیا ہے کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں جس میں کوئی کمزوری ہو یا کسی قسم کا انحراف و کج روی و ٹیڑھا پن ہو۔ اس میں سب ہی مستقیم و سیدھا اور صحیح ہے۔ انسانوں کے مصالح اور مفادات جو ان کی دُنیا و آخرت کے لیے ہیں ان کا اس میں واضح بیان ہے۔ اس کتاب کو جس ذات نے اُتارا ہے وہی لائق حمد ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی وجہ

قابل تعریف وہی ہوتا ہے جو کسی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے کتابِ ہدایت اُتاری ہے جس میں ان بندوں کے فائدے کی باتیں ہیں جو انسانی معاشرہ کے لیے

منفعت بخش تھا۔ اسے اس میں بیان کر دیا ہے یہ سب کچھ بڑے عظیم انبیاء کی برکات سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے منتخب فرمایا اور پھر ان کے لیے کتاب اُتاری جس میں انسانوں کے مصالح و مفادات کا بیان موجود ہے۔ قرآن مجید ہے جس کے نزول کو چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اس نے انسان کو تہذیب و تمدن دیا ہے، منفعت بخش علم عطا کیا ہے، بہترین نظام حیات دیا ہے، انسان میں عمل صالح کو رواج دیا ہے۔ یہ کتاب کمال کی انتہاء پر ہے اور سابقہ ادیان کی تکمیل ہے۔

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾

"ٹھیک اتاری تاکہ اس سخت عذاب سے ڈرائے جو اس کے ہاں ہے اور ایمان داروں کو خوشخبری دے جو اچھے کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے اچھا بدلہ ہے۔"

مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ﴿۳﴾

"جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

قیم: معنی کے اعتبار سے یہ پچھلی آیات کے ساتھ ملحق ہے جو کتاب کی صفت ہے، یعنی انسانوں کی مصلحتوں کو قائم کرنے والی کتاب یا انسانوں کے مفادات کو بیان کرنے والی کتاب جس میں کوئی افراط اور تفریط نہیں ہے۔ اس کتاب نے دوسری آسمانی کتابوں کو بھی اپنے اندر محفوظ کیا ہوا ہے۔ اس میں تدبیر ہے، بیان ہے، سابقہ شریعتوں کے بعض قوانین کے خاتمہ کو بیان کیا ہے اور انسان کے مفاد میں نئے قوانین کو بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کے نزول کی مصلحت

اس آیت میں قرآن نازل کرنے کا مقصد بھی بیان ہوا ہے۔ سب حمد و ستائش اللہ

تعالیٰ کے لیے ہے جس نے اپنے عبد پر قرآن نازل کیا جس میں کسی طرح کا انحراف نہیں ہے، اس کا بیان سیدھا اور مستحکم ہے۔ یہ کتاب اس لیے اُتاری ہے تاکہ وہ لوگ جو حق کو تسلیم نہیں کرتے اور اللہ کی دعوت کو ٹھکرا دیتے ہیں، جو باطل پر ہیں، عمل صالح نہیں کرتے، انہیں خطرناک انجام سے ڈرائے اور جو مومنین ہیں جن کے عقائد صحیح ہیں، عمل صالح بجا لاتے ہیں، انہیں بشارت دے کہ ان کے لیے بہت ہی اچھا اجر و ثواب ہے اور ان کے لیے بہشت ہے۔

وَّ يُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾

"اور انہیں بھی ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔"

قرآن کے اہداف

قرآن کا ایک مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے لیے بیٹا قرار دیتے ہیں ان کو بھی ڈرایا جائے، اور انہیں بتایا جائے کہ تمہارے اس غلط عقیدہ کا سخت مؤاخذہ ہو گا اور اللہ کا سخت عذاب تمہارے لیے ہو گا۔

یہ لوگ بت پرست تھے اور فرشتوں یا جنات کو اللہ کی اولاد قرار دیتے، یا انسانوں میں سے بعض کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے۔

نصرانیوں نے حضرت مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور یہودیوں نے حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا کہا۔ ایسے افراد کے بارے میں عمومی انداز کو بیان کرنے کے بعد خصوصی طور پر خبردار کرتے ہوئے ڈرایا گیا ہے۔

پہلے یہ بات کہی گئی کہ جو لوگ عقائد میں انحراف رکھتے ہیں اور بدعمل ہیں انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرانا اس کتاب کا کام ہے اور اس کے بعد خصوصی طور پر ان کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے لیے بیٹا قرار دیتے ہیں انہیں بھی خطرناک نتائج سے ڈرانا قرآن کا ایک ہدف ہے۔

قرآن انسان کو اللہ کا اطاعت گذار عبد قرار دیتا ہے تاکہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور عمل صالح بجالائے۔ قرآن، انسان کو ایسی ہی تربیت دینے آیا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

"ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ان کے باپ دادا کے پاس تھی، کیسی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ لوگ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔"

خدا کی طرف بیٹے کی نسبت دینا

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے تو یہ لوگ جہالت میں غرق ہیں۔ نہ تو ان کو کچھ معلوم ہے اور نہ ہی ان کے آباء کو کچھ خبر تھی، یہ سب جہالت کے سمندر میں غرق ہیں، انہوں نے اپنے اسلاف کی بے ہودہ تقلید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کی شدید مذمت کی ہے کہ یہ بہت بڑا جملہ ہے جو ان کے منہ سے جاری ہوا ہے ان کی جانب سے اللہ کی شان میں یہ گستاخی ہے، بہت بڑی جسارت ہے۔ اللہ کی ذات پاک ہے کیونکہ ان کی بات کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ کا شریک ہو کیونکہ بیٹے ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ کو مرکب ہونا مانا جائے، اس کے اجزاء مانے جائیں جس کا لازمہ احتیاج ہے۔ خداوند اس قسم کے اوصاف سے منزہ و پاک ہے۔ پھر اللہ فرماتا ہے کہ یہ انکا جھوٹ محض ہے افتراء ہے جو انہوں نے خود سے گھڑ لیا ہے۔ اس کی کچھ بنیاد و اساس نہیں ہے، اللہ لاشریک ہے۔ اللہ ان لوگوں کے چھوٹے موٹے خیالات سے بلند تر ہے، پاک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں، اس کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ اس کا کوئی باپ ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا ۞

''پھر تم کو شاید ان کے پیچھے افسوس سے اپنی جان ہلاک کر دے گا اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائے۔''

اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ۞

''جو کچھ زمین پر ہے بے شک ہم نے اسے زمین کی زینت بنا دیا ہے تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں کون اچھے کام کرتا ہے۔''

وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَيۡهَا صَعِيۡدًا جُرُزًا ۞

''اور جو کچھ اس پر ہے بے شک ہم سب کو چٹیل میدان کر دیں گے۔''

رسول اللہؐ کیلئے تسلی اور زندگی کی حقیقت

چھٹی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی اندرونی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو حق پر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن پر ایمان لانے کا کہتے ہیں، حقائق بڑے واضح ہونے کے باوجود جب لوگ ایمان نہیں لاتے اور اس وجہ سے عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہرتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ ان کی اس حالت میں غمزدہ ہوتے ہیں، افسردہ ہوتے ہیں۔ اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ خود کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیارے کو تسلی دیتا ہے کہ تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اور جگہ بیان کیا ہے کہ میرے پیارے تیرا کام پیغام پہنچانا تھا، سو آپ نے پیغام پہنچا دیا، اب خود کو ہلکان مت کرو، آپ پر کچھ نہیں۔

بعد والی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ایک ظاہری زیبائش و آرائش ہے،

جو زمین کے اوپر سب کے سامنے ہے، زمین پر انواع و اقسام کی زینتیں موجود ہیں۔ انسان جب انہیں دیکھتا ہے تو ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے جبکہ یہ سب کچھ امتحان کے لیے ہے کیونکہ زندگی کی حقیقت ظاہری نمود و نمائش نہیں۔ ہر انسان کے نفس کا جوہر اور اصلیت اس کی بلندی ہے، شرافت ہے وہ کبھی پستی اور ذلت و گھٹیاپن کو نہیں اپناتا۔ انسان دُنیا میں زمین پر زندگی گزارنے آیا ہے اس کے اسباب اللہ نے بنا دیئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ انسان کو دے کر اس سے چاہا ہے کہ وہ اپنی جاودانی سعادت اور ہمیشہ کے کمال کا ارادہ کرے۔ اللہ اسے کامل دیکھنا چاہتا ہے۔ ان ظاہری اسباب کو ہمیشہ کی کمالیت کے لیے استعمال میں لے آئے، حق پر عقیدہ رکھے، عمل صالح بجالائے، زمین پر موجود سب زینتیں، آرائش و زیبائش کے سامان یہ سب مادی اور زمینی زندگی کے لیے ہیں، ان کے وسیلہ سے انسان کا امتحان لینا مقصود ہے تاکہ وہ ان سے دل وابستہ نہ کرے۔ ہمیشہ کی سعادت اور دائمی کمال حاصل کرے اور ان اسباب کو ہدف قرار دینے کی بجائے وسیلہ قرار دے۔

مومن و کافر کا فرق

مومن صحیح عقیدہ رکھتا ہے، اچھے عمل بجالاتا ہے، دنیاوی وسائل کو اپنے عقیدہ کی روشنی میں استعمال کرتا ہے اور اپنی اُخروی زندگی کا سامان بناتا ہے، وہ یقین رکھتا ہے کہ زمین اس کے رہنے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہ عارضی سکونت ہے۔ انسان نے دنیارہ کر اپنی دائمی سکونت اور ہمیشہ کی زندگی کا سامان مہیا کرنا ہے۔ اللہ کے قوانین کے مطابق اس دنیا میں زندگی گزار کر اپنے لیے سعادت اور خوشبختی کمانا ہے جبکہ کافر رب رحمان کی دعوت کو ٹھکرا دیتا ہے عمل میں انحراف کرتا ہے۔ دنیاوی زندگی کو ہدف بنالیتا ہے، مادیات سے دلبستہ ہو جاتا ہے۔

یہ انسان ناکام ہوتا ہے بالآخر اللہ تعالیٰ نے زمین کی تمام رعنائیوں اور خوبصورتیوں

کا خاتمہ کر دینا ہے۔ ایسی خشک اور ویران زمین ہو جائے کہ اس میں کوئی رغبت نہ کرے۔ زمین پر موجود ہر زینت زائل ہو جائے گی۔ نہ خوبصورتی رہے گی اور نہ ہی اس میں کوئی رغبت کرنے والا ہو گا۔

اس بات سے اشارہ کیا جا رہا ہے کہ انسان اور دنیا کے متاع و مال کے درمیان رابطہ کٹ جائے گا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ سب کو اس دُنیا فانی سے آخرت کی طرف منتقل کر دے گا تاکہ وہاں پر انسان احتساب کے مرحلہ سے گزریں۔

رسول اللہؐ کے لیے تسلی

ان دونوں آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اے میرے رسول ! ان کے منہ پھیر لینے اور دعوت حق کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے آپ اندر سے پریشان نہ ہوں۔ کیونکہ ان سب کے اعمال اللہ کے ارادہ کے تابع ہیں کیونکہ اللہ نے ہی یہ چاہا کہ وہ دُنیاوی اشیاء اور ان مادیات کو ان کے سامنے خوبصورت بنا کر پیش کرے تاکہ ان وسائل سے انسانوں کا امتحان لیا جائے تاکہ اللہ کے فرمان کو ماننے والے اور اللہ کے نافرمان جدا جدا ہو جائیں۔ انجام کار، جب امتحان ختم ہو گا، سب کو زمین سے اُٹھا لیا جائے گا جو کچھ زمین میں موجود ہے اور خود زمین کو بھی خشک کر دیں گے ایک ویران منظر ہو گا جس میں کسی کی دلچسپی نہ ہو گی۔ لوگوں کا کفر اختیار کر لینے کا معنی یہ نہیں کہ اللہ مغلوب ہوا اور یہ لوگ غالب ہوئے بلکہ یہ سب ایک نظم کے تحت ہے۔ امر خدا ہی غالب ہے، انسان کو اللہ نے اپنے انجام کے انتخاب کا حق دیا ہے اس کے لیے زمین پر انواع و اقسام کی زینتیں قرار دی ہیں تاکہ اس زمین پر زندگی گزارنے میں آزاد ہو۔ اسے امتحان گاہ بنایا ہے اور ان نعمات کے استعمال کا قانون بھی اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے جو اس کے مطابق عمل کرے گا وہ کامیاب ہو گا جو مخالفت کرے گا وہ ناکام ہو گا۔ اللہ کا امر ہر حال میں غالب ہے۔

اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَ الرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾

''کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور کتبہ والے ہماری نشانیوں والے عجیب چیز تھے۔''

یہودیوں کی طرف سے مشرکین کو یاد کرائے گئے سوالات

یہودیوں نے مشرکین کو تعلیم دی کہ رسول اللہؐ سے تین سوال کریں تاکہ اس طرح ان کی نبوت کے دعویٰ کو پرکھا جاسکے کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے:

پہلا سوال: موسیٰ اور اس کے ہم سفر کے متعلق تھا۔

دوسرا سوال: ذوالقرنین کے بارے تھا۔

تیسرا سوال: اصحاب کہف کا قصہ تھا۔

اصحاب کہف کا قصہ پہلے بھی اجمالی طور پر لوگوں کے درمیان موجود تھا، قرآن مجید نے اس واقعہ کی پوری تفصیل لوگوں کو بیان کر دی اور یہ فرمایا کہ اصحاب کہف کا قصہ ہماری نشانیوں سے حیرت انگیز نہیں ہے جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کیونکہ ہر انسان کی زندگی کا ماجرا اسی طرح ہے جو روئے زمین پر رہتا ہے اور زمینی آرائش و زیبائش کا فریفتہ ہو جاتا ہے اور مادی زینتوں کی وجہ سے یاد خدا سے غافل ہو جاتا ہے ان سب میں اللہ کی نشانیاں ہیں اور اصحاب کہف کے قصہ سے ان کی شباہت ہے۔ کہف بڑے اور کھلے غار کو کہتے ہیں اور رقیم سے مراد لکھا ہوا، تحریر شدہ مطالب، جبکہ بعض کا خیال ہے کہ جس پہاڑ میں غار تھا اس کا نام رقیم تھا۔ ان اصحاب کا واقعہ غار کے اندر پتھر پر لکھا ہوا تھا اس لیے یہ کہا گیا کہ ایسے ساتھی جن کا واقعہ تحریر شدہ موجود ہے کیونکہ یہ لوگ اس پہاڑ کے بڑے غار میں چھپے تھے اس لیے انہیں اصحاب کہف کہا گیا بڑے غار والے، یہ غار رقیم پہاڑ میں تھا تو اس لیے اسے رقیم والے کہا گیا۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ رقیم اس شہر کا نام تھا جس میں یہ پہاڑ تھا جس کی غار میں یہ لوگ چھپے تھے لیکن پہلا قول زیادہ مضبوط ہے۔

بعض مفسرین نے اصحاب کہف اور اصحاب رقیم کو الگ الگ گروہ قرار دیا ہے۔ اس آیت میں اس ماجرا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد والی آیات میں اس واقعہ کی تفصیلات بیان کی گئی ہے۔

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠

''جب کہ چند جوان اس غار میں آ بیٹھے پھر کہا اے ہمارے رب ہم پر اپنی طرف سے رحمت نازل فرما اور ہمارے اس کام کے لیے کامیابی کا سامان کر دے۔''

اصحاب کہف کا واقعہ

یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ چند جوان جو کہ خدا پرست تھے وہ اس خوف سے کہ کہیں انہیں ان کے عقیدے سے موڑ نہ دیا جائے وہ ایک غار میں جا چھپے کیونکہ ان کے مخالف ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ اس حالت میں انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے رب ہماری تائید فرما دے، ہم پر اپنی رحمت عطا فرما۔ اُنہوں نے اپنی قوم سے فرار اختیار کیا تھا اور ان کی قوم والے ان کے پیچھے تلاش میں آئے تھے تاکہ جہاں بھی وہ ملیں وہ ان کو قتل کر دیں یا وہ غیر خدا کی پرستش پر آمادہ ہو جائیں اس لیے انہوں نے اللہ سے درخواست کی کہ ان کے واسطے نجات کا کوئی ذریعہ نکل آئے اور وہ ان شرپسندوں سے نجات پا لیں۔ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہیں۔ اللہ نے اپنی رحمت و قدرت سے ان کے لیے نجات کے وسائل مہیا کر دیے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝١١

"پھر ہم نے کئی سال تک غار میں ان کے کان بند کر دیے۔"

اصحاب کہف کے لیے اللہ کی امداد

ان جوانوں کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند غالب کر دی اس طرح کہ وہ سینکڑوں سال گہری نیند میں چلے گئے، ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا تاکہ کوئی آواز یا کسی قسم کا شور انہیں بیدار نہ کرے۔ شاید اس جملہ سے مراد یہ ہو کہ جس طرح ماں پیار سے تھپکیاں دے کر چھوٹے بچے کو سلا دیتی ہے اس کے کان پر پیار سے اپنے ہاتھ سے تھپتھپاتی ہے تاکہ اس کے حواس یکجا ہوں اور بچہ گہری نیند سو جائے۔ یہ عبارت اس سے مربوط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شفقت و مہربانی سے انہیں سلا دیا یہ بلاغت و فصاحت کی اعلیٰ صورت ہے بالخصوص سالوں کے بارے اشارہ ہے کہ ایسے سال جن کو شمار کیا جاسکے ہمیشہ کے لیے نہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ۧ﴿۱۲﴾

"پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ دونوں جماعتوں میں سے کس نے بات یاد رکھی ہے جتنی کہ مدت وہ رہے۔"

اصحاب کہف کو بیدار کرنے کا مقصد

اس جگہ لفظ بعث استعمال ہوا ہے۔ پچھلے بیان کی روشنی میں اس سے مراد نیند سے بیدار کرنا لیا جائے گا کیونکہ وہ مرے نہیں ہیں بلکہ سوئے ہوئے ہیں اللہ کی قدرت سے ان پر گہری نیند مسلط کی گئی ہے۔ ایسی جماعت جو قابلِ شمار ہو گئی ہو جو مختصر گروہ سے مراد محدود عرصہ اور طے شدہ وقت ہے۔

یہ جو فرمایا ہے کہ (لِنَعْلَمَ) تاکہ ہم جان سکیں اس سے مراد اللہ کا علم فعلی ہے وگرنہ اللہ کے علم میں سب کچھ ہے اللہ جاہل نہیں کہ اس عمل سے کسی بات کو اللہ جان سکے، علم

فعلی سے مراد معلوم کا حضور اور موجودگی ہے اس کا موجود یا اسی کیفیت کا اپنے مخصوص وجود کے ساتھ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہونا، شاید اس طرح ترجمہ کریں کہ انہیں بیدار کیا تاکہ ہم اپنے معلوم کو ظاہر کریں یعنی جو ہم جانتے ہیں اسے منصۂ شہود پر لے آئیں۔

دو حزب سے مراد اصحاب کہف کے دو گروہ مراد ہیں جن کا آپس میں اختلاف ہوا اور ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوئے رہے؟ ایک گروہ نے کہا ایک دن یا اس سے کچھ زیادہ سوئے رہے۔ دوسرے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہم کس قدر سوئے رہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

”ہم تمہیں ان کا صحیح حال سناتے ہیں، بے شک وہ کئی جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے انہیں اور زیادہ ہدایت دی۔“

ہدایت یافتہ جوان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے بارے بیان کر دیا تھا کہ یہ افراد سب کے سب جوان تھے، اپنے رب تعالیٰ پر ایمان لا چکے تھے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا ایمان قبول و پسندیدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان میں اور اضافہ فرما دیا۔ یہ سب ہدایت یافتہ تھے جس سے ایمان کے بلند ترین درجہ پر پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ صاحب ایمان پر جو انعام کرتا ہے اس بارے ایک اور آیت میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا

تَمۡشُوۡنَ بِهٖ وَ يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۚ﴿۲۸﴾ [1]

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا اور تمہیں ایسا نور عطا کرے گا کہ تم اس کے ذریعہ سے چلو اور وہ تمہیں معاف کر دے گا، اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔"

وَّ رَبَطۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا۟ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

"اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے جب وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہ پکاریں گے، ورنہ ہم نے بڑی ہی بے جا بات کہی ہے۔"

اصحاب کہف کی خصوصیات

اس آیت میں اصحاب کہف کے اوصاف کو بیان کیا جارہا ہے، ان کے امتیاز کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ اُنہوں نے "اللہ ہمارا رب ہے" کے نعرہ کو بلند کیا۔

۲۔ اُنہوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا معبود ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یوں توحید کا پرچم بلند کیا۔

۳۔ اُنہوں نے اپنے رب کا وصف بیان کیا کہ وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔

اس جملہ سے اُنہوں نے اللہ کے رب ہونے کی دلیل بیان کر دی۔

اُنہوں نے یہ نعرہ اپنے زمانہ کے ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے بلند کیا، اس کی ربوبیت

---

[1] ۔ سورہ الحدید، آیت: ۲۸۔

اور الوھیت کی نفی کی۔

۴۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ اگر ہم اس کے علاوہ کچھ اور عقیدہ رکھیں تو ہم باطل پر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا انعام

ان واضح اور روشن عقیدہ پر اللہ تعالی نے ان کے لیے یہ انعام دیا کہ ان کے دل کو اور مضبوط کر دیا کہ ان میں کسی قسم کا خوف نہ رہے اور مضبوطی سے اپنے عقیدے پر قائم رہیں۔ اس لیے ان جوانوں نے جابر حکمران کی طاقت و قدرت کو معمولی جانا اور اپنے عقیدے پر ڈٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوۡ لَا يَاۡتُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِسُلۡطٰنٍۢ بَيِّنٍ ؕ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ﴿۱۵﴾

”یہ ہماری قوم ہے انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے ہیں، ان پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔“

مومن جوانوں کا اپنی قوم کے بارے بیان

اس آیت میں ان پاک طینت مومن جوانوں کا بیان پیش کیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی قوم کے بارے اس طرح بیان دیا:

ہماری قوم اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور ہماری قوم نے اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

ہماری قوم کی جسارت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کی پوجا پاٹ پر لگے ہیں، لیکن اس نظریہ اور عمل بارے کوئی ٹھوس اور مضبوط دلیل ان کے پاس نہ ہے وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ ہماری قوم والے بہت بڑے ظالم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں

کہ اللہ نے کوئی پیغام لانے والا نہیں بھیجا۔ اللہ واحد نہیں، اللہ تک جانے کے لیے بتوں، انسانوں، حیوانوں، جمادات وغیرہ کی پوجا پاٹ کرنا ہے۔ہماری قوم اللہ پر افتراء باندھتی ہے، افتراء باندھنا بھی ظلم ہے کسی عام آدمی پر افتراء باندھنا ظلم ہے اور اللہ پر افتراء باندھنا تو اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ان لوگوں نے اپنے اور اللہ کے درمیان بتوں کو واسطہ بنا لیا ہے یہ ان کا من گھڑت سلسلہ ہے اس کا کوئی جواز نہیں ہے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی دلیل ہے۔

وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡكَهۡفِ یَنۡشُرۡ لَكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَ یُهَیِّیٴۡ لَكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا ﴿۱۶﴾

”اور جب تم ان سے الگ ہو گئے ہو اور (ان سے بھی) اللہ کے سوا جنہیں وہ معبود بناتے ہیں تب غار میں چل کر پناہ لو، تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لیے تمہارے اس کام میں آرام کا سامان کر دے گا۔“

دو جوانوں کی گفتگو

اس آیت میں اس حوالے سے بیان ہے کہ بظاہر ان خدا پرست جوانوں میں سے دو جوانون الٰہی الہام سے اپنے رب رحمان کی رحمتِ واسعہ کا احساس کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے اس طرح کہتے ہیں کہ دیکھو بھائیو اب جبکہ تم نے ان لوگوں سے جو غیر خدائی پرستش کرتے ہیں علیحدگی اختیار کر لی ہے اور فقط اللہ تعالیٰ کی عبادات و پرستش کرتے ہو تو آپ سب ایک غار کی طرف چلو کہ اللہ اپنی رحمت تمہارے اوپر سایہ فگن کرے گا۔ تمہیں ان کے شر اور ظلم سے نجات دے گا

اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے تمہیں نجات کا راستہ مہیا کرے گا۔

ان دو جوانوں کے بیان سے استفادہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے یہ نہیں کہا کہ تم ایسا کرو گے تو الٰہی رحمت آپ کے لیے ہو گی اور نجات اللہ کی رحمت کے صدقے پا لو گے بلکہ اُنہوں نے پورے جزم اور یقین کے ساتھ ان سے کہا کہ حتمی طور پر اللہ کی رحمت تمہارے اوپر سایہ فگن ہو گی، تمہیں اپنے گھیرے میں لے لے گی اور اللہ تعالیٰ حتمی تمہارے لیے راہ نجات قرار دے گا۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

''اور تو سورج کو دیکھے گا جب وہ نکلتا ہے ان کے غار کے دائیں طرف سے ہٹا ہوا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان کی بائیں طرف سے کتراتا ہو گزر جاتا ہے اور وہ اس کے میدان میں ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہ کر دے پھر اس کے لیے تمہیں کوئی بھی کارساز راہ پر لانے والا نہیں ملے گا۔''

غار کے حالات

اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ جس غار میں ان توحید پرست جوانوں نے پناہ لی تو وہ غار بہت ہی وسیع اور لمبا چوڑا تھا اس غار میں یہ لوگ آرام کر رہے تھے سورج طلوع اور غروب کے وقت اس غار کے دائیں اور بائیں جانب سے گزر جاتا تھا جس وجہ سے سورج کی شعاعیں غار کے اندر نہیں جاتی تھیں۔ اصحاب کہف غار کے درمیان میں آرام کر رہے تھے،

گہری نیند میں تھے، سورج انہیں اذیت نہ دیتا تھا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے کے رنگ، اور ان کے لباس کو پرانے ہونے سے محفوظ کر لیا کہ سورج کی گرمی اور سردی سے وہ محفوظ تھے۔ان کی جنوبی شمالی جانب تھی کہ سورج کے طلوع اور غروب کے وقت اس کی حیات بخش شعاعوں سے وہ فیضیاب ہو رہے تھے۔وہ اپنی نیند آسودہ اور آرام میں تھے، غار کی ہوا بھی حبس کنندہ نہ تھی بلکہ ہوا کا گزر وہاں سے ہو رہا تھا۔یہ سب کچھ اللہ کی عنایات اور الطاف عالیہ میں سے ہے۔

اللہ کی نشانیاں

آخر میں فرمایا یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں، ان میں سے ہر ایک نشانی اللہ کے وجود پر اور اللہ کی رحمت واسعہ پر دلالت کرتی ہے۔اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ اللہ جس کی ہدایت اور راہنمائی فرمائے وہی نجات پانے والا ہے اور جس کی اللہ ہدایت نہ فرمائے اور اسے ایمان کی نعمت نہ ملے تو وہ اپنے کفر و فسق کی وجہ سے کبھی بھی نجات نہیں پا سکتا۔اللہ کے سوا کوئی اس گمراہ کی مدد کو نہیں آسکتا اور نہ ہی اس کا کوئی ہمدرد دوست ہو سکتا ہے۔ایسے افراد بے سرپرست اور بے یار و مددگار ہیں۔

وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

"اور تو انہیں جاگتا ہوا خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں، اور ہم انہیں دائیں بائیں پلٹتے رہتے ہیں، اور ان کا کتا چوکھٹ کی جگہ اپنے دونوں بازو پھیلائے بیٹھا ہے،

اگر تم انہیں جھانک کر دیکھو تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو اور البتہ تم پر ان کی دہشت چھا جائے۔"

غار کے اندر کے حالات

اس آیت میں غار میں سونے والوں کی کیفیت کو بیان کیا جارہا ہے:

ان کی آنکھیں نیند کی حالت میں کھلی ہوئی تھیں، ایسے لگتا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں، جبکہ وہ حقیقت میں سوئے ہوئے تھے۔اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے انہیں دائیں اور بائیں کروٹ میں پلٹاتا ہے تاکہ ان کا بدن زمین سے چپک نہ جائے اور اس طرح بدن ریزہ ریزہ نہ ہو جائے، بوسیدہ نہ ہو جائے کیونکہ بدن میں اگر حرکت نہ ہو تو وہ سن ہو جاتا ہے، بے حس ہو کر خراب ہو جاتا ہے، خون کی روانی ختم ہو جاتی ہے لیکن بدن کو حرکت دینے سے ان کا پورا جسمانی سسٹم چالو رہتا ہے یہ سب اللہ کا لطف و کرم ہے۔

اصحاب کہف کا کتا

اصحاب کہف کا کتا غار کے دہانے پر اپنے پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا،اس پورے لمبے عرصہ میں وہ اسی طرح بیٹھا رہا، ان کی حالت ایسی تھی جو بھی ان کے قریب سے گزرتا تو وہ ڈر جاتا۔ ان کی حالت کو دیکھ کر وہاں سے راہ فرار اختیار کرتا، تاکہ خود کو ناخوشگوار حالت سے محفوظ رکھے۔ ان کو دیکھ کر وحشت، خوف ہو جاتا، یہ سبب بنا کہ جو بت پرست ان کے پیچھے آرہے تھے وہ پیچھے ہٹ گئے اور چھپ گئے۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا

لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿١٩﴾

"اور اسی طرح ہم نے انہیں جگا دیا تاکہ ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک نے کہا تم کتنی دیر ٹھہرے ہو، انہوں نے کہا ہم ایک دن یا دن سے کم ٹھہرے ہیں، کہا تمہارا رب خوب جانتا ہے جتنی دیر تم ٹھہرے ہو، اب اپنے میں سے ایک کو یہ اپنا روپیہ دے کر اس شہر میں بھیجو پھر دیکھے کون سا کھانا ستھرا ہے پھر تمہارے پاس اس میں سے کھانا لائے اور احتیاط سے جائے اور تمہارے متعلق کسی کو نہ بتائے۔"

اصحاب کہف کو لمبی نیند سلانے کا مقصد

جس زمانہ کا واقعہ ہے اس زمانہ میں کفر و شرک پورے معاشرہ پر غالب تھا یہ چند جوان تھے جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے اللہ سے اپنی رحمت کا سوال کیا، کفر کی لمبی حکومت جابر حکمرانوں کا ظلم و ستم اس نے انہیں پریشان کر رکھا تھا اور ان کے دل میں ایسا خیال بھی آتا تھا کہ اللہ کی رحمت کب شامل ہو گی اور مشرکین کا خاتمہ ہو گا اور حکومت حق قائم ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کر دیا، اور ان میں سے ایک کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ اس اجتماع سے باہر چلے جائیں اور کسی غار میں چھپ جائیں۔ ایسا ہی ہوا اللہ تعالیٰ نے غار میں انہیں لمبی اور گہری نیند سلا دیا۔ صدیاں گزر گئیں لیکن اللہ نے انہیں نیند کی حالت میں رکھا اور ان کی عمروں میں کوئی تبدیلی نہ آئی، ان کا جسم ایسا ہی تھا جیسے وہ مشرکین کی جمعیت سے فراری ہوئے

تھے لیکن لمبا عرصہ گزرنے کے بعد اللہ نے انہیں بیدار کیا وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم دن کے کچھ حصہ میں سوئے رہے اس لیے آپس میں سوال کرتے ہیں کہ ہم کتنا سوئے، پورا دن یا دن کا کچھ حصہ؟ پھر اُنہوں نے خود یہ جواب دیا کہ اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے جتنا بھی سوئے رہے اس بارے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس بیان سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اس وقت دن تھا وہ تھکے ماندے تھے اس لیے انہیں جلدی نیند آگئی اور یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ ظالم مشرک جمعیت سے نکلے تو ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ موجود نہ تھا خالی ہاتھ تھے۔

اصحاب کہف کے جاگنے کے بعد

اصحاب کہف جاگ جاتے ہیں، جاگنے کے بعد کے بارے آیت بیان کر رہی ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جاگنے کے فوراً بعد انہوں نے آپس میں جو پہلی گفتگو کی وہ یہ تھی کہ ہم کتنی دیر سوئے رہے اور یہ کہ سب اکٹھے ہی بیدار ہوئے اور وہ اسی حالت میں تھے جس حالت میں اس غار میں داخل ہوئے تھے، ان کے جسم میں کوئی تبدیلی نہ تھی اور نہ ہی ان کا لباس تبدیل ہوا تھا۔ بیدار ہوتے ہی انہیں سخت بھوک کا احساس ہوا اور کھانے کا انتظام کرنے کی فکر ہوئی۔ ان کے پاس پیسے موجود تھے، اس لیے فیصلہ کیا کہ ایک شخص پیسے لے کر باہر جائے اور کھانا لے آئے۔ کھانا لانے کے لیے ایک آدمی کو بھیجا گیا۔

کھانا لانے والے سے کہا کہ وہ چوکنا رہے کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ جس پہاڑ میں وہ غار تھا اس کے قریب والی آبادی ایسی نہیں تھی جو انہیں پہچانتے ہوں۔ اسے ہدایت دی کہ وہ خیال رکھے کہ کوئی انہیں جاننے والا ان کو پہچان نہ لے بہت ہی دقت سے خیال رکھے۔ کھانے کے بارے یہ کہا کہ صاف ستھری جگہ سے اور پاکیزہ کھانا لایا جائے، نجس کھانا نہ لائیں۔ ان کی گفتگو کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کٹر توحید پرست

تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ ہر طرح کا علم اللہ کے پاس ہے بس یہ بھی اللہ کو علم ہے کہ ہم کتنا سوئے۔

اصحاب کہف کی تعداد

اس بیان سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد سات سے کمتر نہ تھی کیونکہ ایک دفعہ یہ کہا ہے کہ ایک نے کہا پھر فرمایا انہوں نے جواب دیا جمع کا اطلاق کم از کم تین پر ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، آخر میں پھر یہ ہے کہ انہوں نے تجویز دی کہ ان میں سے ایک باہر کھانا لینے کے لیے جائے اور ان پیسوں سے کھانا لائے۔ تو کھانا لانے کی تجویز دینے والے بھی تین سے کم نہیں تھے۔ جو شخص جائے تو وہ لوگوں کے ساتھ بہت ہی احتیاط سے اور پوری دقت اور راز داری سے بات چیت کرے کہ کسی کو شک نہ گزرے کہ ہم وہ توحید پرست ہیں جو حکومت کے کارندوں سے فرار ہو چکے ہیں۔ ان کا خیال یہی تھا کہ وہ ابھی تک اسی بت پرستی کے دور میں ہیں اور ان کے زمانہ کا جابر حکمران بھی باقی ہے۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝٢٠

”بے شک وہ لوگ اگر تمہاری اطلاع پائیں گے تو تمہیں سنگسار کردیں گے یا اپنے دین میں لوٹالیں گے پھر تم کبھی فلاح نہیں پاسکو گے۔“

احتیاط سے کام لینے کی وجہ

اس آیت میں پچھلی بات کی وجہ بیان کی گئی ہے جس شخص کو کھانا لانے کے لیے بھیجا جارہا ہے اسے تاکید کی کہ وہ ایسا طریقہ اپنائے کہ کسی کو ان کے بارے خبر نہ ہو کیونکہ اگر ان لوگوں کو ان کے متعلق خبر ہو گئی تو پھر اس کے نتائج خطرناک ہوں گے اور وہ لوگ

ہمارے اوپر ٹوٹ پڑیں گے اور ہم پر پتھراؤ کریں گے کہ ہم نے ان کا دین کیوں چھوڑا ہے یا پھر وہ یہ چاہیں گے کہ ہم ان کے دین کو اپنا لیں۔ اگر ہم ان کے دین کو اپنا لیں گے تو اس میں ہمارے لیے ہر گز کامیابی اور رستگاری نہیں ہے۔

اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اصحاب کہف ایسے افراد تھے جن کا بہت زیادہ اثر تھا۔ حکومت میں انکا نفوذ تھا کہ اگر یہ توحید پرست ہوتے ہیں تو لوگ ان کی پیروی کرلیں گے۔ اس لیے پورے معاشرہ کے افراد کو ان کے خلاف بھڑکایا ہوا ہے کہ اگر یہ لوگ مل جائیں تو ان کی بات سننے کی بجائے ان پر سارے لوگ ٹوٹ پڑو اور انہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دو اور ایسا انداز بدترین قتل شمار ہوتا ہے لہٰذا ان کو یہ اندازہ تھا کہ ہماری بات کو سننے کی بجائے جیسے ہی بستی والوں کو ہمارے بارے معلوم ہوگا وہ سارے نکل کھڑے ہوں گے کہ یہ لوگ باغی ہیں، حکومت کے آئین کی خلاف ورزی کی ہے، ہمارے دشمن ہیں، ہمارا دین انہوں نے چھوڑ دیا ہے لہٰذا کھانا لانے والوں کو اس خطرناک انجام سے آگاہ کیا کہ اگر وہ ہمیں ماریں گے تو بدترین طریقہ اپنائیں اور اگر ہم ان کا دین اختیار کرتے ہیں اور واپس پلٹ جاتے ہیں تو اس سے بڑھ کر جرم کوئی اور نہ ہوگا اور ہمارے لیے بدترین ناکامی ہو گی۔ لہٰذا کھانا بھی لے آؤ اور کسی کو خبر بھی نہ ہو کہ تم کون ہو اور کن کے لیے کھانا لے جا رہے ہو۔

وَ كَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ
لَا رَيۡبَ فِيۡهَا ۚ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اَمۡرَهُمۡ فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَيۡهِمۡ بُنۡيَانًا ؕ
رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰٓى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ
مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾

" اور اسی طرح ہم نے ان کی خبر ظاہر کر دی تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں، جبکہ لوگ ان کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے، پھر کہا ان پر ایک عمارت بنا دو، ان کا رب ان کا حال خوب جانتا ہے، ان لوگوں نے کہا جو اپنے معالے میں غالب آ گئے تھے کہ ہم ان پر ضرور ایک مسجد بنائیں گے۔"

اصحاب کہف سے لوگوں کی آگہی

لفظ "عثر" استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس واقعہ کے بارے معلوم نہ ہو اور اتفاقاً اس کے بارے آگہی ہو جائے، صدیوں سے ان جوانوں کے بارے لوگوں کو پریشانی تھی کہ ان کا کیا ہوا۔ صدیاں اس واقعہ سے گزر چکی تھیں اور لوگوں کو ان کے متعلق ان پیسوں سے ہوئی جن کو وہ ایک جوان لے کر بازار گیا کہ وہ کھانا اپنے لیے لے آئے۔ جب وہ جوان بازار میں کھانا لینے کے لیے گیا جب کھانا لے لیا تو اس نے پیسے جب دکاندار کو دیئے تو وہ حیران ہوا کہ یہ پیسے تم کہاں سے لائے ہو۔ یہ پیسے تو تین سو سال پہلے کے ہیں۔ اس طرح ان کا راز کھل گیا۔

یہ آگہی اس لیے دی گئی کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ قیامت کا وعدہ برحق ہے، تین سو سال سونے کے بعد زندہ ہونا اور ان کے بدن اور لباس میں کوئی فرق نہ آنا، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قبروں سے مردوں کو اسی طرح ان کی اصلی حالت میں اٹھایا جائے گا۔

اس جوان سے پہلے تو پوچھا کہ تم نے کسی خزانہ کو پایا ہے؟ جب اس نے بتایا کہ نہیں ایسا نہیں ہے، اس جوان کو بھی سمجھ آ گئی کہ یہ زمانہ اس ظالم بادشاہ کا نہیں ہے اسے ختم ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں تو وہ لوگوں کو ساتھ لے کر اس غار پر آ گیا جس میں اس کے باقی ساتھی موجود تھے اور سب لوگوں نے مشاہدہ کر لیا کہ کس طرح تین سو سال بعد یہ سب جوان صحیح و سالم ہیں۔ جب لوگوں پر حجت تمام ہو گئی اور معاد کی ہیئت کو سب نے سمجھ لیا تو پھر اللہ تعالیٰ

نے ان سب کی ارواح کو قبض کیا اور ان سب کو موت دے دی۔ چند گھنٹوں کے لیے وہ لوگوں کے سامنے آئے اور یہ اس لیے تھا کہ مشرکین کے دل سے شبہ ختم ہو جائے جو کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد کس طرح دوبارہ اسی پہلی حالت میں زندہ ہوں گے۔

لوگوں میں اصحاب کہف بارے اختلاف

چند گھنٹے بعد جب غار میں موجود جوانوں پر موت آگئی تو جو لوگ باہر جمع تھے وہ دو طرح کے تھے کچھ تو مشرکین تھے، اس سے اشارہ ملتا ہے کہ توحید پرستوں کے ساتھ ساتھ بت پرست اور مشرکین بھی موجود تھے۔ جب مشرکین کے سامنے اتنی واضح ثبوت معاد کامل گیا تو وہ گھبرا گئے انہوں نے یہ چاہا کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو اس لیے یہ کہا کہ اس غار کے ارد گرد دیوار بنا دو تاکہ اس کا نام ونشان مٹ جائے لیکن جو مومنین تھے اُنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کے بارے زیادہ آگاہ ہے۔ اس واقعہ کے مشاہدہ کے بعد ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ قیامت یقینی ہے۔ ان کے تمام شکوک و شبہات دُور ہو گئے۔ آخر کار سب توحید پرستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم غار پر مسجد بنائیں گے تاکہ لوگ اس جگہ آئیں، اللہ کو یاد کریں، عبادت انجام دیں۔ اس واقعہ کو یاد کریں، قیامت اور معاد پر ان کا یقین کامل ہو اس بارے ہر قسم کا شک و شبہ زائل ہو جائے۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًاۢ بِالْغَيْبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۫ۗ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

"بعض کہیں گے تین ہیں چوتھا ان کا کتا ہے، اور بعض کہیں گے پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے، اور بعض کہیں گے سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے، کہہ دو ان کی گنتی میرا رب ہی خوب جانتا ہے ان کا اصلی حال تو بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں، پس تو ان کے بارے میں سرسری گفتگو کے سوا جھگڑا نہ کر، اور ان میں سے کسی سے بھی ان کا حال دریافت نہ کر۔"

اصحاب کہف کی تعداد بارے لوگوں کا اختلاف

اس آیت میں لوگوں کے درمیان اصحاب کہف کے متعلق جو اختلاف نظر آرہا تھا اسے بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جو کچھ یہ لوگ ان کی تعداد بارے باتیں کرتے ہیں یہ اٹکل پچو ہیں اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ ثبوت موجود نہیں ہے۔ ایسے ہی ہے جیسے کوئی تاریکی میں تیر چلاتا ہے، نہیں معلوم ہوتا کہ وہ نشانے پر لگے گا یا نہیں۔

دو اقوال کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے تیسرا قول جدا کرکے بیان کیا ہے کہ وہ سات افراد تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ ان تین اقوال میں سے کون سا قول سچ ہے اس بات پر خاموشی اختیار کی گئی ہے اور ان کی تعداد بارے بیان کو " رجم بالغیب " کہا ہے لیکن تیسرے قول کو " رجم بالغیب " (اٹکل پچو انداز سے بات کرنا) نہیں کہا۔ خود ہر بات میں تیسرے قول کے صحیح ہونے پر دلیل بنتی ہے اور اس جملہ سے پہلے "واؤ" جو نئی بات کے بیان کو بتا رہی ہے یہ بھی اس پر دلالت ہے کہ تیسرا قول علم و یقین کی بنیاد پر کہا جارہا ہے اور تیسرے قول والوں کو اطمینان ہے کہ ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں کتا تھا۔

پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے خصوصی حکم یہ دیا گیا کہ ان لوگوں سے یہ کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد کے بارے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ بہت ہی تھوری تعداد کے علاوہ کوئی اور ان کے بارے آگاہ نہیں ہے۔ پس آپ اس بارے زیادہ بحث و مباحثہ نہ کریں بس اتنی گفتگو ضرور

کریں کہ جس سے طرف مقابل کی بات کا جواب ہو جائے۔ اہل کتاب سے کسی کے بارے ان کے متعلق سوال نہ کرو آپ کے لیے قرآن کا بیان اور تیرے پروردگار کی گفتگو ہی کافی ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾

"اور کسی چیز کے متعلق یہ ہرگز نہ کہو کہ میں کل اسے کر ہی دوں گا۔"

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

"مگر یہ کہ اللہ چاہے، اور اپنے رب کو یاد کرلے جب بھول جائے اور کہہ دو امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے بھی بہتر راستہ دکھائے۔"

قرآنی تعلیمات سے ایک اہم امر

اس جگہ بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا ہے، خطاب دوسروں کو بھی ملا کر ہو سکتا ہے۔ بہرحال قرآنی تعلیمات کی روشنی میں جو کچھ عالم ہست و بود میں ہے ذات، صفات، آثار، افعال، حرکات و سکنات سب اللہ کے مملوک ہیں وہ جیسا چاہے ان کے بارے اپنا حکم جاری کر سکتا ہے۔ کوئی اللہ کے حکم سے سرپیچی نہیں کر سکتا اور اس حکم کے بارے چون و چرا کرنے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔ اللہ کا غیر کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہے فقط اس کا مالک ہے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔

لہٰذا جو بھی اپنے پروردگار کے مقام سے واقف ہے تو کبھی بھی اپنی ذات کو مستقل خیال نہ کرے گا لہٰذا وہ اس طرح نہ کہے کہ میں کل ایسا کروں گا کیونکہ کل تو اس کے اختیار میں نہیں ہے لہٰذا وہ کس طرح یقین سے کہہ سکتا ہے کہ میں کل ایسا کروں گا؟ جس کو اپنی جان کی خبر نہیں کہ وہ کل تک زندہ بھی ہوگا کہ نہیں تو پھر وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ہر صورت کل

ایسا کروں گا۔ اس نہیں کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کام کو اپنی طرف نسبت نہ دے، اسے معلوم ہو کہ اللہ ہی ہے جو اسے کام کرنے کی طاقت دیتا ہے اور اس کام کے انجام دینے میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دُور کرتا ہے اور اس عمل کے انجام بارے اسباب برقرار رکھتا ہے اور اگر اللہ ارادہ کرے تو اس سے اس کام کی انجام دہی کی تمام صلاحیتیں چھین سکتا ہے۔ لہٰذا انسان خود کو اپنے اعمال و افعال میں مستقل نہ جائے اور اپنے عمل میں استقلال اور اللہ کی مشیت سے خود کو بے نیاز نہ سمجھے کبھی بھی یہ نہ کہے کہ میں ہر صورت ایسا کام کروں گا مگر یہ کہ وہ اس طرح سے کہے کہ انشاء اللہ میں ایسا کروں گا۔ انشاء اللہ میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا، اپنی بات کو اللہ کی مشیت اور ارادہ سے مقید کردے کہ میں اس کام کو کروں گا اگر اللہ کی مشیت اس میں شامل ہوئی تو۔

اللہ کی یاد

اس کے بعد فرمایا کہ جب تم بھول جاؤ کہ اپنی کلام میں انشاء اللہ کہنا تو جیسے تمہیں یاد آئے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو اور خود کو اللہ کے سپرد کردو اور اس طرح کہو کہ اُمید ہے کہ میرا پروردگار مجھے ایسے امر کی راہنمائی فرما دے اور بہتر راستہ دکھا دے۔ اللہ کا ذکر، اللہ کی قدرت کو ہر وقت اپنے ذہن میں رکھنا، اللہ کے اختیار اور مشیت کے لامتناہی دائرہ پر ایمان اور اسے یاد رکھنا ہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾

”اور وہ اپنے غار میں تین سو سے زائد نو برس رہے ہیں۔“

غار میں اصحاب کہف کے قیام کا عرصہ

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غار میں اصحاب کہف کتنا عرصہ رہے۔ تین سو سال اس میں رہے بلکہ اس کے اوپر نو سال ہے۔ تین سو سال کے اوپر نو سال بارے حضرت

علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ شمسی سال کے اعتبار سے ان کا عرصہ تین سو سال جتنا تھا جبکہ قمری سال کے اعتبار سے تین سو نو سال بنتے ہیں۔ تین صدیاں، شمسی اور قمری حساب لگائیں تو تین سال کا فرق ہوتا ہے۔ اتنی مقدار جو اس کلام میں بیان ہوئی ہے یہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

''کہہ دو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کتنی مدت رہے، تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے، کیا ہی عجیب دیکھتا اور سنتا ہے، ان کا اللہ کے سوا کوئی بھی مددگار نہیں اور نہ ہی وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔''

اللہ کا فیصلہ حتمی ہے

اصحاب کہف کے بارے جو بحث جاری تھی اس کا خاتمہ اس بیان سے کیا گیا ہے اور وہیں پر بنیادی باتیں سمجھائی ہیں:

اصحاب کہف غار میں کتنا عرصہ رہے، اس کے بارے اللہ تعالیٰ ہی زیادہ آگاہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو جو کچھ غیب ہے اس کے بارے اللہ ہی آگاہ ہے کوئی اور آگاہ نہیں ہے۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے اختیار میں ہے یہ امر اللہ کی مخلوق پر مخفی ہے، ان کا علم محدود ہے ہر موجود کا اپنے وجود سے جتنی بہرہ برادری ہے اتنا ہی وہ اپنے بارے اور اپنے غیر کے بارے معلومات رکھتا ہے، وہ خود محدود ہے اس لیے اس کا علم بھی محدود ہے۔ لہٰذا بہت سارے امور ہیں وہ اس انسان کی بہ نسبت غیب شمار ہوتے ہیں اللہ کا وجود لامحدود ہے اس لیے اس کا علمی احاطہ بھی لامحدود ہے۔ اللہ سے کچھ بھی مخفی و پوشیدہ نہ ہے وہ

اللہ جو عالم غیب کا مالک ہے جس کے پاس بینائی اور شنوائی کا کمال موجود ہے تو یہ امر یقینی ہے کہ اصحاب کہف کا غار میں قیام کا عرصہ تو اس بارے اللہ داناتر ہے کیونکہ وہ تو اللہ کے مملوک تھے وہ ان کو دیکھتا بھی ہے ان کی باتوں کو سنتا بھی ہے، اللہ کے سوا ان کا کوئی ولی و سرپرست و دوست نہیں ہے۔ اللہ ہی براہ راست ان کے بارے فیصلے اور احکام صادر فرماتا ہے۔ اس جگہ "مالھم من ولی" ان کے لیے (یعنی اصحاب کہف کے لیے) کوئی ولی و سرپرست و دوست اللہ کے سوا نہیں ہے۔ پہلی عبارت میں غیر خدا کی براہ راست اور استقلال ولایت کی نفی کی گئی ہے۔ بعد والے جملہ میں اس بات کی بھی نفی کر دی گئی ہے کہ اللہ کی ولایت میں کسی اور کی شراکت ہو، یعنی جس طرح اللہ کے سوا کوئی بھی ولی نہیں ہے اسی طرح کوئی بھی ولایت میں اللہ کا شریک نہیں۔

بعض مفسرین نے "مالھم" کی ضمیر تمام موجودات کی طرح پلٹایا ہے کہ سارے موجودات جو ہیں ان کا اللہ کے سوا کوئی ولی و دوست و سرپرست نہیں ہے لیکن پہلا معنی زیادہ بہتر ہے۔ ظاہر عبادت کے ساتھ مناسبت اسی معنی کی ہے۔

اللہ کی جانب سے دو دلیلیں

اس آیت میں دو باتیں کہی گئی ہیں:

۱۔ اصحاب کہف غار میں کتنا عرصہ ٹھہرے؟ اس کے بارے اللہ تعالیٰ داناتر ہے۔ اس بات میں عمومی دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام غیبی امور سے آگاہ ہے۔ آسمانوں اور زمین کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے لہٰذا اس بارے بھی اللہ ہی سب سے زیادہ آگاہ ہے کہ وہ کتنا عرصہ غار میں ٹھہرے۔

۲۔ ایک دوسری بات سمجھائی ہے کہ اللہ اصحاب کہف کے معاملہ کا ولی و سرپرست و حاکم ہے۔ اللہ کی طرف سے براہ راست ان کے بارے قضاء و فیصلہ جاری ہوا۔

پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے جس کے امور کا اختیار اللہ کے پاس ہے اللہ ان کے بارے اور ان کی غار میں ٹھہرنے کی مدت کے متعلق آگاہ نہ ہو۔ یہ دوسرے دلیل ہے کہ اللہ ہے ان کے بارے آگاہ تر ہے کوئی اور نہیں۔[1]

وَ اتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ۫ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

"اور پڑھا کرو اپنے رب کی کتاب سے جو تیری طرف وحی کی گئی ہے، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور تو اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائے گا۔"

رسول اللہؐ کے لیے تسلی

کتاب سے مراد قرآن یا لوح محفوظ۔ البتہ کلام میں قرینہ موجود ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے البتہ کام کے تسلسل میں دوسرا معنی بہتر لگتا ہے۔

اللہ کی کتاب میں جو کچھ موجود ہے تو وہ وہی ہے جس کی تبلیغ کا رسول اللہؐ کو حکم دیا گیا ہے جو کہ حکمت الٰہی کی بنیاد پر مبنی ہے۔

آیت کا معنی سابقہ مطالب کو سامنے رکھ کر اس طرح ہے اے ہمارے رسولؐ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر پریشان نہ ہوں۔ جو کچھ تمہارے اوپر کتاب سے وحی ہوتی ہے تم

---

[1]۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی روایت کے مطابق اصحاب کہف کے نام اس طرح ہیں:

(۱) مُكْسَلْمِیْنَا (۲) تَمْلِیخا (۳) مَوْطُوْنَس (۴) سَنُوْنَس (۵) ذُوْنَوَاس (٦) كَعَسْطَطِیُوْنَس (۷) سَارِیْنُوْتَس (جو کہ چوپان کا نام تھا) (۸) قطمیر (ان کے کتے کا نام)۔ سریانی زبان میں ان کے نام اس طرح ہیں: (۱) ماکسمیلیانوس (۲) سولیدانوس (۳) داناسیوس (۴) مارتینوس (۵) تلمیحا (٦) یامانیس (۷) انطونیوس۔ جس توحیدی دین کو اُنہوں نے اپنایا تھا وہ مسیحی دین تھا۔

اس کی تلاوت کرو کیونکہ کوئی چیز بھی ان کلمات کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ کلمات اٹل اور حتمی ہیں کیونکہ اللہ کے کلمات حق اور ثابت ہیں۔ اس لحاظ سے کہ غیر اللہ اور اللہ کے کلمات کے سوا تیرے دل میں کسی کی جگہ نہیں ہے لہٰذا کسی اور کو دل میں لانا یا اس کی جانب مائل ہونے کی ضرورت نہیں ہے آپ رسول ہیں، پیغام رساں ہیں، لہٰذا جس نے آپ کو بھیجا ہے جس نے آپ کو رسول بنایا ہے اس کے سوا کسی اور کی طرف آپ کا میلان اور رجحان نہیں ہونا چاہیے۔ اسی مطلب کو سورہ جن آیت ۲۳، ۲۲ میں فرمایا ہے۔

وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَ الۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ‌ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ ۚ وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰٮهُ وَ كَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

"تو ان لوگوں کی صحبت میں رہ جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضامندی چاہتے ہیں، اور توں اپنی آنکھوں کو ان سے نہ ہٹا، کہ دنیا کی زندگی کی زینت تلاش کرنے لگ جائے۔ اور اس شخص کا کہنا نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور اپنی خواہش کے تابع ہو گیا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔"

رسول اللہؐ کو تبلیغ دین میں صبر کی تلقین

جو دشواریاں اور مشکلات میں اپنے نفس کو بے تاب نہیں ہونے دیتا اور پریشان نہیں ہوتا اسے کہتے ہیں اس نے صبر کیا۔ اس جگہ رسول اللہؐ کو صبر کی تلقین کی جارہی ہے کہ

تبلیغ دین میں جو مشکلات آرہی ہیں ان سے گھبرانا نہیں ہے اور پریشان نہ ہوں۔ وَجْہِ خدا سے مراد اللہ کے اسماء الحسنیٰ اور اللہ کی صفات عالیہ ہیں کہ تمام عبادت کرنے والے ان ہی اسماء اور صفات علیا کو سامنے رکھ کر ذاتِ حق کی جانب توجہ کرتے ہیں لیکن ذات حق تعالیٰ تک رسائی کسی کے لیے میسر نہیں ہے۔

رسول اللہؐ کے لیے خصوصی ہدایت

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا ہے کہ جو لوگ صبح و شام حق تعالیٰ کی بارگاہ میں راز و نیاز کرتے ہیں آپ ان سے اپنا تعلق مضبوط کرو اور جو دُنیا کی رنگینیوں اور چاشنیوں میں غرق ہیں اللہ کے ذکر سے غافل ہیں، نفسانی خواہشات کی پیروی میں غرق ہیں ان سے منہ پھیر لو۔ جو لوگ حق تعالیٰ کی رحمت واسعہ کے طالب ہیں اللہ کو اس کے بہترین ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو ایسی حالت میں قرار دیتے ہیں جو صفات الٰہی کا تقاضا ہے اسی کے مطابق اپنے نفس کو قرار دیتے ہیں خود کو اللہ کے حضور انتہائی ذلت، خضوع و خشوع میں پیش کرتے ہیں، اللہ سے انعامات کے طالب رہتے ہیں جو انعامات ملے ہوئے ہیں ان پر شاکر و ذاکر ہوتے ہیں۔ یہی اللہ کی کبریائی اس کی صفات علم اور قدرت کا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد سے خصوصی مہربانی کا حکم اپنے رسولؐ کو دیا ہے لیکن جو دنیادار ہیں، غافل ہیں، اللہ کو یاد میں نہیں لاتے، اپنے مال، اولاد اور دُنیاوی لذتوں میں غرق رہتے ہیں، نفسانی خواہشات کے پجاری ہیں تو وہ اس لائق نہیں کہ ان پر توجہ دی جائے جب انہوں نے اپنے مالک کو بھلا دیا ہے تو اے میرے پیارے تم انہیں بھلا دو، ان کی زیادہ فکر میں نہ رہو۔

اُمیہ بن خلف کے متعلق رائے

ابن عباس سے روایت ہے یہ آیت امیہ بن خلف کے متعلق آئی ہے۔ اس نے آپ سے یہ کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قریش کے بڑے اور نامور لوگ آپ کی دعوت کو قبول

کرلیں اور آپ کا ساتھ دیں تو آپ اپنے قریب سے ان فقیر و تہی دامن کمزوروں، مومنوں کو اپنے سے دور بھگا دو جبکہ سلمان فارسی سے روایت ہے کہ یہ آیت عینیہ بن بدر اور افرع بن حالب کے متعلق نازل ہوئی کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے آکر کہا کہ آپ اپنے سے بلال حبشی، سلمان فارسی اور ابوذر جیسوں کو اپنے سے دور کر دیں تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

لیکن یہ آیت جہاں پر اپنے ابتدائی مصادیق رکھتی ہے اور اس دور کے افراد بارے ہے اسی طرح اس کا مفہوم عام ہے اللہ کے ہاں وہ لوگ باوقار اور عزت و اکرام کے مستحق ہیں جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ کا ذکر کرتے ہیں، خود کو دُنیاوی آرائش وزیبائش میں غرق کرکے اپنے رب رحمٰن مالک خالق کو نہیں بھلاتے اور جو نفسانی خواہشات کے پیرو ہیں دُنیاوی معاملات میں اس قدر غرق ہیں کہ اپنے منعم و مالک و خالق کو بھلا دیتے ہیں تو وہ قابل قدر و ستائش نہیں۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

''اور کہہ دو کہ سچی بات تمہارے رب کی طرف سے ہے، پھر جو چاہے مان لے اور جو چاہے انکار کر دے، بے شک ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے انہیں اس کی قناتیں گھیر لیں گی، اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے فریاد رسی کیے

---

[1]۔ الدر المنثور، ج ۴، ص ۲۱۹۔

جائیں گے جو تانبے کی طرح پگھلا ہوا ہوگا موہنوں کو جھلس دے گا، کیا ہی برا پانی ہوگا اور کیا ہی بری آرام گاہ ہوگی۔"

کفار کے لیے واضح اعلان

یہ بیان پچھلے بیان کا نتیجہ ہے کہ جن کافروں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا تھا کہ اگر وہ اپنے ارد گرد سے فقراء اور مساکین کو بھگا دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ سے فرمادیا کہ ان سے جواب میں یہ کہہ دو کہ حق تو یہی ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے اور یہ تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ اگر ایمان لانا ہے تو لے آؤ، حق پر ایمان لانے کے لیے کسی قسم کی شرط قبول نہیں ہے اور اگر ایمان نہیں لاتے اور کفر اختیار کرتے ہیں تو کافر ہو جاؤ کیونکہ ایمان لانے کا فائدہ خود آپ کو ہونا ہے اور اگر کفر اختیار کروگے تو اس کا نقصان بھی آپ لوگوں کو خود اٹھانا ہے۔ اس کے بعد ان کافروں کو خبردار کیا گیا کہ جو بھی ایمان نہیں لاتا تو وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اور جگہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ کا شریک ٹھہرانا سب سے بڑا ظلم ہے تو اس جگہ فرمایا جو ظالم ہیں ان کا بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ دھکتی آگ ان کے لیے تیار ہے جب ان ظالموں کو اس آگ میں پھینکا جائے گا تو یہ فریاد کریں گے، پانی مانگیں گے تو کھولتا ہوا سخت گرم پانی ان کے چہروں پر پھینکا جائے گا جس سے ان کی چیخیں نکلیں گے اور ان کے چہروں کو اور جلار رکھ دیں گے، ہر جانب سے انہیں آگ اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ گرم پانی کی شدت ایسی ہو گی جس طرح پگھلا ہوا تانبا ہوتا ہے جس سے ان کے چہرے کباب بن جائیں گے۔[1] اس جگہ ان

---

[1]۔ سورہ اعراف میں ظالموں کے بارے آیا کہ ظالم کون ہیں: آیت: ۴۵ "وہ لوگ جو اللہ کی راہ کے سامنے بند باندھتے ہیں اور ٹیڑھا راستہ اپناتے ہیں (سیدھے راستہ کو اختیار نہیں کرتے) اور آخرت کے بارے انکار کرتے ہیں تو یہی لوگ حقیقت میں ستمگار اور ظالم ہیں"۔

ظالموں کی سزا کو بیان کیا گیا ہے۔ بعد والی آیات میں مومنوں کے لیے جو انعامات ملنے ہیں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ﴿ۚ۳۰﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ہم بھی اس کا اجر ضائع نہیں کریں گے جس نے اچھے کام کیے۔''

صاحبان ایمان کی جزاء کا وعدہ

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جس کا عقیدہ صحیح ہے، ایمان لاتے ہیں، حق کو قبول کرتے ہیں اور پھر اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرتے ہیں، اعمال صالح بجالاتے ہیں تو ان کا اجر ضائع نہ ہوگا بلکہ انہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور یہ اجر بہت جلد انہیں ملے گا۔ اس آیت سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ ایمان بغیر عمل صالح کے مفید نہیں ہے جس طرح عمل صالح بغیر ایمان کے مفید نہیں ہے۔ اُخروی اجر و ثواب کے لیے ضروری ہے کہ ایمان ہو اور ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔[1]

[1] ۔ یہ تفسیر المیزان کے مولف کا نظریہ ہے۔ تفسیر اطیب البیان میں آیا ہے کہ ایمان کا معنی توحید، نبوت اور شریعت پر دل سے یقین رکھنا اور زبان سے اقرار کرنا اور اس کے سامنے تسلیم ہونے کے معنی میں ہے۔ اور یہی چیز نجات کا وسیلہ ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ انسان اسی عقیدے پر دنیا سے چلا جائے اور اس کے گناہ اس کے اعمال کے ضائع ہونے کا سبب نہ بنیں۔ (مترجم)

أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ
أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ
مُّتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ ۚ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾

"وہی لوگ ہیں جن کے لیے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی انہیں وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور باریک اور موٹے ریشم کا سبز لباس پہنیں گے وہاں تختوں پر تکیے لگانے والے ہوں گے، کیا ہی اچھا بدلہ ہے اور کیا ہی اچھی آرام گاہ ہے۔"

مومنین کے لیے انعامات

اس آیت میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے معانی اس طرح ہیں: "عدن" اس سے مراد اقامت ہے، قیام کرنا، ٹھہرنا، "اساور" اس کا معنی کنگن اور دست بند کے ہیں۔ "سندس" ابریشمی ہو کہ نرم و نازک ہو۔ "استبرق" ابریشمی کپڑا جو ضخیم و بھاری ہو۔ "الارائك" تخت، پلنگ۔ اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ مومنین:۔

1) بہترین باغات میں قیام کریں گے۔
2) ایسے باغات جن کے پہلو میں پانی کی نہریں جاری ہوں گی۔
3) بہترین ابریشم کے نرم و نازک اور بھاری لباس زیب تن کیے ہوں گے۔
4) بہترین زیوروں سے آراستہ ہوں گے۔
5) پلنگوں اور مسہریوں پر تکئے لگائے ہوں گے۔
6) ہر قسم کے سکون و آرام میں ہوں گے۔

7) بہت ہی آرام دہ ٹھکانہ ہو گا اور ہمیشہ اس میں قیام کریں گے۔
مومنوں کے لیے یہ بہترین اجر و ثواب ہے جو انہیں ملے گا۔

وَ اضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّ حَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّ جَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾

" اور انہیں دو شخصوں کی مثال سنا دو ان دونوں میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ تیار کیے اور ان کے گرد کھجوریں لگائیں اور ان دونوں کے درمیان کھیتی بھی لگا رکھی تھی۔"

ایک باغ کی مثال

یہ لوگ جو دُنیا کی رنگینیوں اور زیبائشوں میں مست و مگن ہیں، ان کے لیے مثال پیش کرو تاکہ ان کو پتہ چلے کہ جس سے انہوں نے دل لگا رکھا ہے یہ سراب کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہ ہے۔ البتہ اس کا احتمال ہے کہ اس واقعہ کا خارجی مصداق ہے کہ دو آدمیوں کو اپنے سامنے رکھو، ان میں سے ایک کو ہم نے ایک انگوروں کا باغ دیا جس باغ کے گرد کھجوریں تھیں اور درمیان میں کھیت، یہ انگوروں کے دو باغ ایسے تھے کہ ان باغات کو دو اطراف سے کھجوروں کی لمبی قطار نے گھیرا ڈال رکھا تھا جس سے باغ کے مالک کی ضروریات زندگی پوری ہوتی تھیں۔

كِلۡتَا الۡجَنَّتَيۡنِ اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَ لَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـًٔا ۙ وَّ فَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾

"دونوں باغ اپنے پھل لاتے ہیں اور پھل لانے میں کچھ کمی نہیں کرتے، اور ان دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر بھی جاری کر دی ہے۔"

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

"اور اسے پھل مل گیا، پھر اس نے اپنے ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور جماعت کے لحاظ سے بھی زیادہ معزز ہوں۔"

باغ کے مالک کا انداز گفتگو

جس شخص کے لیے دو باغ تھے بہترین زراعت تھی، خوبصورت جگہ تھی، اس باغ میں کام کرنے والے افراد تھے وہ اس حال پر بہت ہی خوش تھا اپنے ساتھی سے باتیں کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میرے پاس تم سے مال و متاع زیادہ ہے میری افرادی قوت بھی تم سے زیادہ ہے اس میں یہ معنی بھی لیا جا سکتا ہے کہ کھجوروں کا پھل تیار ہے انگور کی بیلیں بھی پھل سے لدی ہوئی تھیں، وہ بہت ہی خوش تھا، غرور میں تھا وہ بھول گیا کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے اس نے خیال کیا کہ وہ اپنے اموال اور مالکیت میں تصرف کرنے میں آزاد ہے، وہ بھول گیا کہ اللہ مالک مطلق ہے اور جس کسی کو کچھ دینا ہے تو وہ آزمائش اور امتحان کے لیے ہوتا ہے تاکہ خبیث اور طیب کو جدا جدا کر دے لیکن جو دُنیاوی زینتوں اور آرائشوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور ظاہری اسباب سے تعلق بنا رکھا ہے یہ غافل ہو جاتے ہیں اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ظالم قرار پاتے ہیں۔ ظالموں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

''اور اپنے باغ میں داخل ہوا ایسے حال میں کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہوگا۔''

متکبر کا انجام

اس آیت میں متکبر کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہی بات تو کہی ہے کہ جب وہ اپنے باغ میں وارد ہو گا ایک باغ کی بات کی جبکہ اس کے تو دو باغ تھے یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک وقت میں وہ ایک باغ ہی میں وارد ہو سکتا ہے نہ کہ دو باغوں میں۔ اسی ظالم کا عنوان دیا ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے اپنے دوست پر زیادتی کی تھی کہ وہ یہ سمجھا کہ وہ اس سب کچھ حاصل کرنے میں مستقل ہے اللہ کی قدرت سے غافل ہوا اور اس نے اپنے دوست پر تکبر و بڑائی دکھائی۔ ظاہری اسباب کو سب کچھ جانا اور اللہ کی عطا و عنایت کو بھول گیا جو کہ حقیقی موئثر ہے اس طرح اس نے اللہ کا شریک قرار دے دیا اور اپنے اوپر ظلم کیا کیونکہ اللہ کا شریک ٹھہرانا سب سے بڑا ظلم ہے۔ پھر یہ بات کرتا ہے اس نے بہت ہی بڑا دعویٰ کر دیا کہ میں خیال نہیں کرتا کہ میرا یہ باغ کبھی نابود و تباہ ہوگا۔ اس نے اس چیز کو دائمی قرار دے دیا۔ آیت یہ ہر آدمی کی اندرونی کیفیت کو بیان کر رہی ہے کہ ہر آدمی ایسی چیز سے دل نہیں لگاتا جو فنا ہونے والی ہو، ناپائیدار ہو وہ تو اس سے دل لگاتا ہے جس میں بقاء کی بو آ رہی ہو۔ ہر متکبر کا انجام ہے تکبر و غرور، خود ستائی اور اپنی ذات پر اعتماد اور خود کو سب کچھ سمجھ لینے کا انجام ہے کہ انسان ظالم قرار پاتا ہے۔

وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا ﴿۳۶﴾

''اور میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت ہونے والی ہے، اور البتہ اگر میں اپنے رب کے ہاں لوٹایا بھی گیا تو اس سے بھی بہتر جگہ پاؤں گا۔''

صاحب باغ کا قیامت سے انکار

باغ کا مالک اس قدر خود سر اور تکبر میں ڈوب جاتا ہے کہ وہ قیامت کا انکار کر دیتا ہے اور یہ طرز فکر مادیات سے حد سے زیادہ تعلق اور ربط کا نتیجہ ہے۔ یہ تعلق سبب بن گیا کہ اس نے قیامت کے وقوع پذیر ہونے سے انکار کر دیا۔ کہ ایسا تو نہیں ہو سکتا پھر اسی حوالے سے اپنے لیے کرامت اور فضیلت کے استحقاق کا قائل بھی ہو جاتا ہے کہ وہ سب خیرات و برکات کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے، پھر کہتا ہے کہ اگر بالفرض قیامت بپا بھی ہو جائے اور مجھے اپنے رب کی جانب پلٹایا جائے تو پھر بھی میری جو ذاتی کرامت اور فضیلت ہے تو وہاں پر میرے لیے اس موجودہ زندگی سے بہتر آسائش وآرام نصیب ہوگا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ یُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرۡتَ بِالَّذِیۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿ؕ۳۷﴾

''اسے اس کے ساتھی نے گفتگو کے دوران میں کہا کیا تو اس کا منکر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے پھر نطفہ سے بنایا پھر تجھے پورا آدمی بنا دیا۔''

انسان کو اپنی خلقت یاد رکھنی چاہیے

بات ہو رہی تھی دو دوستوں کی، ایک کے پاس دو باغ ہیں، دوسرے کے پاس ایسا

کچھ نہیں۔ باغوں کا مالک اس قدر متکبر و مغرور ہو جاتا ہے کہ اللہ کا انکار کر بیٹھتا ہے، سب کچھ ظاہری اسباب کو قرار دیتا ہے اور نتیجہ میں قیامت کا بھی انکاری ہے اور اپنے لیے ذاتی کرامت و فضیلت کا قائل ہو جاتا ہے تو اس کا ساتھی ایسی حالت میں اسے دیکھ کر اس کو اس کی اصلیت یاد دلاتا ہے کہ تجھے کیا ہو گیا ہے اپنی اصلیت کو یاد کر۔ توں کس طرح خود کو مستقل سمجھتا ہے اور کس طرح مغرور ہے اور اپنے سوا دوسروں کو خوار خیال کرتا ہے۔ اس کا دوست اس سے اس انداز سے سوال کرتا ہے

کیا ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تجھے مٹی اور خاک سے پیدا کیا ہے کہ اسی خاک سے تیرا نطفہ تیار ہوا اور پھر اس نطفے نے مراحل طے کیے اور اللہ تعالیٰ نے اسی نطفہ سے تجھے آدمی بنا دیا، ایک مکمل مرد قرار دے دیا۔ متوازن خلقت والا ممکن انسان بنا دیا۔ اس کے باوجود تم اللہ کے انکاری ہو اور خود کو مستقل خیال کرتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تم اپنے خالق خود تو نہیں ہو جو تیرا خالق ہے تم اس کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ جبکہ اللہ ہی تیرا مالک ہے کہ اس نے تجھے بنایا ہے جو جسے بناتا ہے وہی اس کا مالک ہوتا ہے اللہ ہی نے یہ سب کچھ تجھے دیا ہے و گرنہ انسان تو محض احتیاج و فقر کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ جسے چاہے اپنے ملک میں تصرف کر سکتا ہے۔ توں جو کچھ دعویٰ کر رہا ہے اور خود کو مستقل قرار دے رہا ہے یہ بات ٹھیک نہیں اور جو خاک سے بنا ہے اسے تکبر زیب نہیں دیتا۔ تیرا اندازِ گفتگو ایسا ہے کہ تو اللہ کے وجود کا بھی منکر ہو گیا جو کہ تیرا اور پوری کائنات کا مالک ہے۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

”لیکن میرا تو اللہ ہی رب ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔“

اللہ کی توحید الوھیت اور توحید ربوبیت ایک طے شدہ اور ثابت امر ہے لہٰذا اللہ کا کسی کو شریک

قرار دینا جائز نہیں ہے۔

وَ لَوْ لَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾

"اور جب تو اپنے باغ میں آیا تھا تو توں نے اس طرح کیوں نہ کہا کہ جو اللہ چاہے وہی ہوتا ہے اور اللہ کی مدد کے سوا کوئی طاقت نہیں، اگر توں مجھے دیکھتا ہے کہ میں تجھ سے مال اور اولاد میں کم ہوں۔"

فَعَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ یُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا ۙ﴿۴۰﴾

"پھر امید ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر دے اور اس پر لو کا ایک جھونکا آسمان سے بھیج دے پھر وہ چٹیل میدان ہو جائے۔"

اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

"یا اس کا پانی خشک ہو جائے پھر تو اسے ہر گز تلاش کر کے نہ لا سکے گا۔"

مومن مرد کی گفتار

ان آیات میں مرد مومن کی اپنے کافر دوست سے جو گفتگو ہوئی !اسے بیان کیا گیا ہے۔

اس بیان میں مرد مومن اپنے کافر دوست کی سرزنش کرتے ہوئے اس سے کہتا ہے:

گفتار کا پہلا حصہ: جب تم اپنے باغ میں وارد ہوئے تو مغرور کیوں ہو گئے؟ باغ کی

آبادی اور اس کی ملکیت کو اپنی ذات کی طرف نسبت دے دی اور اپنے رب، مالک و خالق اللہ کو یاد نہیں کیا۔ تمام امور کو اللہ کی طرف منسوب کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ کوئی ایک بھی مستقل نہیں ہے اور نہ ہی اللہ سے بے نیاز ہے۔ تمام نعمات کا اللہ سے تعلق ہے اور تمام تر صلاحیتیں، اختیارات، طاقتیں سب کی سب اللہ کی ذات سے ہی حاصل ہوتی ہیں کسی کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، کسی بھی مخلوق کی قدرت و اختیار اس کا اپنا نہیں ہے سب اللہ کا عطا کردہ ہے۔ تم نے ایسا کہہ کر بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اللہ جو کچھ دیتا ہے جب چاہے اسے واپس بھی لے سکتا ہے۔

گفتار کا دوسرا حصہ: جس میں اپنی کمزوری کا سبب بیان کرتا ہے کہ ٹھیک ہے میرے پاس تیرے برابر مال نہیں ہے اور نہ ہی اتنی اولاد ہے جو تیری ہے۔ میں مالی لحاظ سے اور افرادی قوت میں تجھ سے کمتر ہوں لیکن تمہیں معلوم رہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت و ارادہ کے تحت ہوا ہے اس لیے نہیں کہ تیرا کوئی ذاتی استقلال و کمال ہے اور وہ میرا نہیں ہے تاکہ اس اعتبار سے تم مجھ پر اپنی برتری جتاؤ اور اس طرح کی بڑکیں مارو اور شیخیاں بکھیرو۔ یہ سب معاملہ تو اللہ کے اختیار میں ہے، تیرے اختیار میں نہیں ہے، اللہ مجھے تجھ سے بہتر باغ دے سکتا ہے۔

گفتار کا تیسرا حصہ: اپنے کافر دوست کو اللہ کے غضب سے ڈرایا کہ اس وقت سے ڈرو کہ تمہارے اس تکبر اور تمہاری خودسری کے نتیجہ میں اللہ کا غضب تم پر ٹوٹ پڑے، آسمان سے بجلی گرے اور تیرے باغ کو راکھ بنا دے اور یہ سرسبز و شاداب زمین ویران ہو جائے، ایسی زمین کہ جس پر کبھی زرعات و کھیت موجود ہی نہ تھا۔ اللہ میری حالت تجھ سے بہتر کر دے اور تیری حالت بدتر ہو جائے۔ اس وقت جو تیرے باغات میں پانی جاری وساری ہے یہ پانی زمین نگل لے اور ایک قطرہ پانی کا نہ رہے اور پھر تم اس پانی کی تلاش کرو اور تمہیں یہ پانی نصیب نہ ہو۔

اس طرح مرد مومن نے اس کافر کو متوجہ کیا اور اس کے کفران نعمت کرنے پر اس

کی سرزنش کی اور اللہ کے سخت عذاب سے ڈرایا۔

وَ اُحِیۡطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصۡبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیۡهِ عَلٰی مَاۤ اَنۡفَقَ فِیۡهَا وَ هِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِهَا وَ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ لَمۡ اُشۡرِکۡ بِرَبِّیۡۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

''اور اس کا پھل سمیٹ لیا گیا پھر وہ اپنے ہاتھ ہی ملتا رہ گیا اس پر جو اس نے اس باغ میں خرچ کیا تھا اور وہ اپنی چھتریوں پر گرا پڑا تھا اور کہا کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

نعمت الٰہی کا کفران کرنے والے کا انجام

کافر دوست سے جیسے مومن موحد نے کہا تھا تو ایسا ہی ہوا، ایک صبح جب وہ اپنے باغات میں پہنچتا ہے تو پورے کا پورا باغ برباد ہو چکا تھا، سب پھل و میوہ جات زمین پر آگرے تھے، انگوروں کی بیلیں زمین پر گری پڑی تھیں، سب کچھ ویران و برباد ہو چکا تھا۔ اپنے باغات کی بربادی کو دیکھ کر بہت ہی پریشان ہوا اور افسوس سے اپنے دونوں ہاتھ مسلنے لگا کہ میں نے اتنا مال ان باغات پر خرچ کیا، سب ضائع ہو گیا۔ کہنے لگا کاش! میں نے اللہ، اپنے رب کا شریک نہ ٹھہرایا ہوتا اور اپنی ذات پر جو اعتماد کیا تھا اور سب کچھ اپنی طرف نسبت دیتا رہا اور خیال کرتا تھا کہ یہ سب کچھ میری اپنی وجہ سے ہے اور سب کچھ میرے اپنے اختیار میں ہے، غرور کا شکار ہو گیا۔ کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ کفران نعمت نہ کرتا اور اس سزا کا مستحق نہ ٹھہرتا۔ ظاہری اسباب کا فریفتہ ہو کر دھوکہ نہ کھاتا۔

وَ لَمۡ تَکُنۡ لَّهٗ فِئَۃٌ یَّنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ مَا کَانَ مُنۡتَصِرًا ﴿ؕ۴۳﴾

''اور اس کی کوئی جماعت نہ تھی جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتے اور نہ وہ خود ہی بدلہ لے سکا۔''

کفران نعمت کرنے والے کا کوئی مددگار نہیں

پہلی آیت میں اس بات کو واضح کیا گیا کہ جو وہ خیال کرتا تھا کہ یہ سب کچھ ظاہری اسباب سے ہے اور اس کا اپنا اختیار ہے۔ اللہ کو بُھلا بیٹھا تھا تو اس کافر نے اپنی اس غلطی کا اظہار کر لیا اور اپنے رویے پر افسوس کیا جبکہ اس آیت میں ایک اور حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ جو اللہ سے دُور ہوتا ہے اور جب اللہ کی گرفت میں آتا ہے تو پھر کوئی بھی ایسے شخص کی مدد نہیں کر سکتا نہ ہی کوئی گروہ اس کی حمایت کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے اور خود وہ شخص بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ خود کو عذاب الٰہی سے بچا سکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا باغ بچا سکا اور نہ ہی اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکا۔ اللہ ہی خالق اسباب ہے جو خود کو مستقل سمجھتا ہے۔ وہ شخص باغی اور کافر ہے اور اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے اور ظالم کی سزا جہنم ہے اور دُنیا میں اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا جیسا کہ اس کافر کے ساتھ ہوا۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

"یہاں سب اختیار اللہ ہی کا ہے جو حق ہے اسی کا انعام بہتر ہے اور اسی کا دیا ہوا بدلہ اچھا ہے۔"

اللہ کی مالکیت و حاکمیت

اس جگہ "ولایت" سے مراد تدبیر اور انتظامات کی مالکیت اور اختیار ہے۔ نجات کے سارے اسباب ختم ہو جائیں گے اور جو انسان خود کو مستقل اور بااختیار سمجھ رہا تھا اس کی ناتوانی اور کمزوری واضح ہو جائے گی۔ اس سے یہ بات روشن ہے کہ انسانوں کے تمام امور و معاملات کی تدبیر کرنا اور اس کی تاثیرات حق اور واقعیت کی بنیاد پر ہے، جتنے بھی ظاہری اسباب ہیں اور فرضی شرکاء کاموں کو انجام دینے میں ہیں ان سب کا بنیادی اور اصلی طور پر کوئی اثر نہیں ہے۔

ان کا اتنا اثر ہے جس قدر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قرار دیا ہے اور اللہ کی اجازت سے وہ اسباب اپنی تاثیرات چھوڑ رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اسباب کے ساتھ قیاس نہیں کر سکتے فقط سمجھنے سمجھانے کے لیے اگر اسباب کے ساتھ اللہ تعالیٰ تمام اسباب میں سب سے موثر تر اور بہتر ہے کیونکہ اللہ کے لیے جو بھی کام انجام دیتا ہے اللہ اسے اس کا ثواب اور بدلہ دیتا ہے۔ اسی فرضی مثال میں اللہ تعالیٰ انجام کار اور کاموں کے نتیجہ دینے میں بھی سب سے زیادہ اچھا ہے کیونکہ اللہ حق اور ثابت ہے اس میں زوال نہیں، تبدیلی نہیں، اس میں کچھ باطل نہیں، سب کا سب حق ہے اسی وجہ سے اللہ کی طرف اکرام اور اللہ کا ثواب بھی تغیر پذیر نہیں اور زائل بھی نہیں ہو گا جبکہ ظاہری اسباب جتنے بھی ہیں وہ تبدیل ہونے والے ہیں فانی ہیں۔ اللہ نے ہی ان اسباب کو جلوہ عطا کیا ہے جو انسان کی نگاہ میں آراستہ و پیراستہ ہوئے ہیں اور وہ ان اسباب کو اپنے اختیار میں لے لیتا ہے یہ سب کے سب حقیقت نہیں، سراب ہیں۔ ان کا اثر اتنا ہے جتنا اللہ نے ان کے لیے قرار دیا ہے اور یہ تاثیر بھی اس وقت تک رہتی ہے جب تک اللہ کی طرف سے اذن اور اجازت ہے اللہ جب چاہے وہ اس کو واپس لے سکتا ہے اور سارے اسباب اپنی تاثیرات سے خالی و فارغ ہو سکتے ہیں۔[1]

وَ اضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ۝۴۵

---

[1] ۔ تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کشاف میں "ھنالک" کی ضمیر کے مرجع کو قیامت قرار دیا گیا ہے۔ اسی بناء پر ثواب اور عقاب کو بھی اسی سے مربوط جانا گیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر آیت کے سیاق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

''اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو جو مثل ایک پانی کے ہے جسے ہم نے آسمان سے برسایا پھر زمین کی روئیدگی پانی کے ساتھ مل گئی پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئی کہ اسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

دُنیاوی زندگی کے لیے دوسری مثال

پہلے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیاوی زندگی کے زائل اور فانی ہونے کے حوالے سے مثالیں پیش کی ہیں، اور یہاں دوسری مثال پیش کی گئی ہے چنانچہ اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ دُنیاوی لذات اور اس کی آرائشوں و زیبائشوں میں غرق ہو جانے والے افراد کو یہ مثال دے دو، کیونکہ یہ لوگ اللہ کی یاد سے غافل ہو چکے ہیں۔ مثال اس لیے پیش کر دو تاکہ ان کے لیے اس زندگی کی حقیقت واضح و روشن ہو جائے۔

دُنیاوی زندگی کی مثال

اس زندگی کی مثال بارش کے پانی کی مانند ہے جو زمین پر اترتا ہے۔ اس پانی سے زمین میں سبزہ نمودار ہوتا ہے، لہلاتے کھیت کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ پانی کے زمین میں جذب ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے اور اس کی خوبصورت تصویر سامنے آجاتی ہے لیکن پھر یہ سب کچھ خشک ہو جاتا ہے۔ سبزہ خشک گھاس میں بدل جاتا ہے اور ہوا اسے اڑا کر لے جاتی ہے۔ زمین سبزہ سے خالی ہو جاتی ہے۔ جی ہاں! اللہ ہی کے پاس یہ سب قدرت ہے کہ وہ اس طرح پانی زمین پر اُتارے، زمین سرسبز و شاداب ہو جائے پھر سبزہ خشک ہو اور ہوا میں اڑ جائے اور زمین پھر خالی نظر آئے۔

اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

''مال اور اولاد تو دنیا کی زندگی کی رونق ہیں، اور تیرے رب کے ہاں باقی رہنے والی نیکیاں ثواب اور آخرت کی امید کے لحاظ سے بہتر ہیں۔''

دُنیا کا مال و متاع

یہ آیت پچھلی آیت کا نتیجہ ہے اس میں بتایا جارہا ہے کہ مال اور اولاد ان امور سے ہیں جو دُنیاوی زینت ہیں جو انسان کے لیے آرائش و زیبائش کا سامان ہے۔ انسان کا دل مال سے لگا ہوتا ہے یا پھر اولاد کے ساتھ دل بہلاتا ہے اس کی آرزوئیں اسی کے گرد گھومتی ہیں لیکن یہ سارے امور دھوکہ دینے والے اور زود گزر ہیں۔ انسان کے ذہن میں جو منافع اور اُمیدیں و آرزوئیں تھیں اور وہ جن کی انتظار میں تھا وہ سب کچھ اسے حاصل نہیں ہوتا لیکن انسان کے جو اعمال صالحہ ہیں وہ اللہ کے ہاں محفوظ ہیں اس کے پاس وہ اعمال باقی رہتے ہیں اور اس طرح کے اعمال کا ثواب اللہ کے پاس بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کے مدمقابل جو انسان انجام دیتا ہے اللہ اسے بہترین ثواب دیتا ہے اور اللہ انسان کی بہترین آرزوؤں کو بھی پورا کرنے والا ہے۔ انسان کے عمل کے مقابل میں اللہ کی طرف سے جس کرامت اور رحمت حاصل کرنے کی انتظار انسان کو ہے وہ پوری طرح اللہ اسے دے گا بلکہ اس سے زیادہ بھی دے گا جبکہ جو دُنیاوی زینتیں ہیں وہ سب کی سب زود گزر ہیں۔ جھوٹی اُمیدوں اور دھوکہ دینے والی خواہشات شامل ہیں ایک فیصد بھی عالم واقعیت میں تحقق نہیں پس جو شخص یہ جانتا ہے کہ دُنیا ایک زائل ہونے والا اور فانی متاع و مال ہے اس کی زینتیں جو ہیں جن سے انسان کا تعلق ہوتا ہے یہ سب زائل ہونے والی چیزیں ہیں وہ سمجھتا ہے کہ اس کے مقابل میں جو اللہ کی طرف سے اجر و ثواب ہے وہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ اس طرح وہ سمجھتا ہے آخرت باقی رہنے والی جگہ ہے۔ اس کے مقابل میں دُنیاوی زندگی کی کچھ حیثیت نہیں ہے۔

سنی شیعہ دونوں کے حدیثی منابع میں آیا ہے کہ ''وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ

''سے تسبیحات اربعہ ہیں جو کہ ''سُبْحَانَ اللهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، اَللهُ اَكْبَرُ'' ہے۔[1]
بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ باقیات صالحات سے مراد نماز اور ولایت اہل البیت علیہم السلام ہے۔[2] لیکن یہ سارے موارد باقیات صالحات کے مصادیق ہیں ان کے علاوہ اور اعمال بھی ہیں جو اس عنوان کے تحت آسکتے ہیں۔ ہر وہ عمل جو اللہ کا پسندیدہ ہے جس میں اللہ کی رضا ہے وہ عمل باقی رہنے والا ہے اور اس کا بڑا ثواب ہے اور وہ باقیات الصالحات سے ہے۔

وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّ حَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾

''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور توں زمین کو صاف میدان دیکھے گا اور ہم سب کو جمع کریں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے۔''

قیامت بپا ہونے کا منظر

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اس دن کو یاد میں لے آؤ جب پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے، ہر شیئ حرکت میں آجائے گی، زمین کھل جائے گی۔ اس کا ٹھہراؤ درہم برہم ہو جائے گا، زمین کی کوئی جگہ پوشیدہ نہ ہو گی، تمام آفاقی نظارہ سامنے ہو گا کوئی مانع درمیان میں باقی نہ رہے گا، زمین کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے میں مانع نہ رہے گا، اس وقت ہم سب انسانوں کو محشور کریں گے، میدان محشر میں لے آئیں گے سب کو زندہ کریں گے اور سب کو اپنے حضور میں اکٹھا کر دیں گے۔ اس منظر کو سامنے رکھ کر اسے یاد رکھنے کی بات کی گئی ہے۔

---

[1]۔ الدر المنثور، جلد ۴/ تفسیر طبری، جلد ۱۵/ نور الثقلین، جلد ۳

[2]۔ تفسیر برہان، جلد ۲/ منہج الصادقین، جلد ۵/ منہج الصادقین، جلد ۵

وَ عُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍۭ ۫ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَکُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۸﴾

''اور سب تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیے جائیں گے، البتہ بتحقیق تم ہمارے پاس آئے ہو جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ تم نے خیال کیا تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وعدہ کی جگہ مقرر نہ کریں گے۔''

مشرکین کے حالات کا بیان

اس آیت سے یہ بیان سامنے آتا ہے کہ مشرکین کو ان کے حالات بارے آگاہ کیا جارہا ہے جو قیامت کے دن کے بارے انکار کرتے تھے اور دُنیا کے ظاہری اسباب کے فریفتہ تھے۔ اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے خود کو مستقل سمجھتے تھے مرنے کے بعد اُٹھائے جانے کے انکاری تھے۔ مادی اسباب ہی پر سارا اعتماد تھا، اپنے خالق سے رابطہ کاٹ چکے تھے غفلت میں تھے۔ اللہ تعالیٰ مادی اسباب اور دُنیاوی مال و متاع سے ان کی آزمائش کر رہا تھا، ان کا امتحان لیا جارہا تھا۔ آخر کار انجام ان کا یہ ہو گا کہ سب کے سب ایک صف میں، ایک قطار میں ترتیب کے ساتھ اللہ کی جناب میں حاضر ہوں گے، کسی ایک کو دوسرے پر برتری نہ ہو گی جبکہ دُنیا میں مال، منصب، عہدہ، خاندان، حسب و نسب ان کی برتری و کمتری کا معیار بنا ہوا تھا لیکن آخرت میں تمام امتیازات کا خاتمہ ہو گا کوئی برتر و کمتر نہ ہو گا کوئی مولا و غلام نہ ہو گا۔ کوئی سید و سردار اور رعایا کا عنوان نہ رہے گا، سب کو زبردستی ایک صف میں لا کھڑا کیا جائے گا۔ اس وقت یہ سب جان جائیں گے کہ جو کچھ وہ دُنیا میں سوچتے تھے وہ سب غلط خیالات کے سوا کچھ نہ تھا، ان کا حقیقت سے کچھ تعلق نہ تھا۔

اس چھوٹی سے عبارت میں '' عُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ ''، میں تین نکات بیان ہوئے

ہیں:۔

۱۔ ساری مخلوق ہر صورت میں حتمی طور پر اپنے رب کے سامنے محشور ہو گی۔

۲۔ کافروں کی اس دن کوئی حرمت اور عزت نہ ہو گی۔

۳۔ قیامت میں تمام برتریاں اور دُنیاوی امتیازات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

قیامت کے دن اللہ کا اعلان

اللہ کی طرف میدان محشر میں یہ آواز آئے گی:

"اب تو تم یقینی طور پر ہمارے سامنے آموجود ہوئے، ہم نے تمہیں پہلے خلق کیا تھا اور آج پھر تمہیں دوبارہ اسی طرح خلق کیا ہے"

اس بیان میں دُنیاوی زندگی کی رنگینیوں میں اس قدر غرق ہوئے کہ وہ اپنی اصلیت کو بھول گئے، دین حق کو چھوڑ دیا اور خیال کر بیٹھے کہ اللہ کے پاس اُنہوں نے حاضر نہیں ہونا۔

اللہ کا ارشاد ہو گا: "تم خیال کرتے تھے کہ ہمارے پاس احتساب کے لیے نہ آؤ گے اور ہم تمہارا احتساب نہ کریں گے، دُنیاوی زندگی کی آرائش و زیبائش نے تمہیں یہ سب کچھ بھلا دیا کہ ہم نے ہی تمہیں سب کچھ دیا ہے اور ہم نے تمہیں خلق کیا، معاد کو بھلا بیٹھے اور یہ کہ اللہ کی ملاقات نہ ہو گی، راہ ہدایت کو ترک کر دیا اور تم غلط قسم کے اعمال کرتے تھے" جیسا کہ اور جگہ ارشاد فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾[1]

ترجمہ: "کیا تم نے خیال کر لیا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد، بے ہودہ خلق کیا ہے اور تم لوگ ہماری طرف واپس نہیں آؤ گے"۔

---

[1]۔ سورہ مومنون، آیت ۱۱۵

اس بیان سے اللہ نے انہیں یاد دلایا کہ جس کا تم انکار کرتے تھے آج تم ہمارے پاس آ حاضر ہوئے اور آج سب کا احتساب ہوگا۔

وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَ يَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

" اور اعمال نامہ رکھ دیا جائے گا پھر تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ اس چیز سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہے اور کہیں گے افسوس! ہم پر یہ کیسا اعمال نامہ ہے کہ اس نے کوئی چھوٹی یا بڑی بات نہیں چھوڑی مگر سب کو محفوظ کیا ہوا ہے، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب کو موجود پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔"

قیامت کے دن اعمال نامہ

قیامت کے دن ایک کتاب سامنے رکھی جائے گی جس میں تمام مخلوقات کے اعمال درج ہوں گے۔ ہر ایک شخص کا اپنا اپنا صفحہ ہو گا جس میں اس کے تمام اعمال درج ہوں گے، چھوٹا بڑا عمل جو بھی اس نے کیا ہو گا وہ سب موجود ہو گا۔ [1]

اس کتاب کو سب کے سامنے رکھ دیا جائے گا تاکہ اس کی بنیاد پر اس کے متعلق فیصلہ دیا جائے البتہ یہ بات اس سے مطابقت نہیں رکھتی کہ ہر ایک کے لیے اور ہر اُمت کے واسطے

---

[1]۔ بہت ساری تفاسیر میں کتاب سے مراد ہر شخص کا اپنا نامہ عمل مراد لیا گیا ہے نہ کہ ایسی کتاب جس میں ساری مخلوقات کے اعمال درج ہوں گے۔ (مترجم)

جداگانہ کتاب ہے اس سے منافات نہیں رکھتا۔

گناہگار اپنا اعمال نامہ دیکھیں گے

تمام مجرمین اپنے جرائم کی پوری تفصیل کو اس کتاب میں تحریر شدہ موجود پائیں گے اسے پڑھیں گے، لکھا ہوا پائیں گے، جب کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیں گے تو ان میں عجیب خوف ہو گا اور یہ خوف اور ڈر اسی وجہ سے ہو گا کہ ان کو معلوم ہے کہ انہوں نے جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ مجرموں، کافروں، مشرکوں اور برے اعمال کرنے والوں سب کو شامل ہے جیسے اپنے تمام جرائم کو اس کتاب میں تحریر شدہ موجود پائیں گے تو اس منظر کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھیں گے وائے ہو ہمارے اوپر! اس میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہو گا اور اس کے ساتھ ہی ہر ایک کے سامنے اس کے اعمال مجسم ہو جائیں گے اس طرح وہ اپنے تمام اعمال کو اپنے سامنے موجود و حاضر پائیں گے۔ جہاں پر ان اعمال کو تحریر شدہ دیکھیں گے تو اس کے ساتھ ہی اس کے سارے اعمال، تمام جرائم جسمانی شکل میں ہر گناہ اسی خاص شکل میں جو شکل اس گناہ کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی ان کے سامنے ہوں گے کیونکہ اس جگہ ہر ایک کے لیے اس کے عمل کو پلٹایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا جو کچھ جس نے انجام دیا ہے اس کا نتیجہ ہی اس کی سزا کے طور پر اسے ملے گا جس طرح نیک عمل کا بدلہ اسے ملے گا۔ سزا دینے میں کسی کے ساتھ کچھ زیادتی نہ ہو گی۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾

”اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا سو اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی، پھر کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی اولاد کو کارساز بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں، بے انصافوں کو برا بدل ملا۔“

فرشتوں کی اطاعت کرنا اور ابلیس کی سرکشی

اس آیت میں حضرت آدمؑ کے لیے سجدہ کا اللہ نے جو حکم دیا اس واقعہ کو ذکر کیا ہے کہ اللہ نے سب کو حکم دیا کہ وہ آدم کا سجدہ کریں، سارے فرشتوں نے اللہ کا حکم تسلیم کرتے ہوئے آدم کا سجدہ کیا جبکہ ابلیس نے تکبر کرتے ہوئے اس حکم کی تعمیل نہ کی جبکہ ابلیس جنات میں تھا یعنی فرشتوں کی جنس سے نہ تھا لیکن فرشتوں کے درمیان موجود تھا کہ یہ حکم جس طرح فرشتوں کے لیے تھا اس کے لیے بھی تھا۔

انسانوں کے لیے نصیحت

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی سرکشی کو بیان کرنے کے بعد سب انسانوں کو بتایا ہے کہ جو بھی میرے حکم کی تعمیل نہ کرے وہ ابلیس کا پیروکار ہے۔ انسانوں سے کہا گیا کہ تمہارا کیسا رویہ ہے کہ تم ابلیس اور اس کی اولاد کو اپنا دوست سمجھو جبکہ وہ تو اللہ کا نافرمان ہے، سرکش ہے۔ اللہ ہی تمہارا سرپرست ہے۔ جو بھی ابلیس اور اس کی اولاد کو اپنا سرپرست قرار دے گا تو وہ ظالموں میں سے ہو گا۔ ابلیس اور اس کی اولاد انسان کی کھلی دشمن ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ابلیس اور اس کے کارندوں سے دھوکہ نہ کھائیں۔ دُنیاوی لذات میں خود کو غرق نہ کریں، اللہ کی یاد کو نہ بھلائیں، اپنے دشمن کو سمجھیں، اللہ کی ولدیت و حکمرانی میں خود کو قرار دیں اس جگہ ولایت سے مراد اطاعت میں اللہ کی ولایت، مالکیت میں اللہ کی ولایت، تدبیر و نظام میں

اللہ کی ولایت مراد ہے یہی ربوبیت کا معنی ہے۔ ربوبیت اللہ تعالیٰ کی ہے، مشرکین جنات کو اپنا معبود سمجھتے تھے ان کے ڈر سے ان کی عبادت کرتے تھے کہ کہیں وہ انہیں نقصان نہ دیں اس لیے یہ واضح کیا کہ ابلیس جس نے اللہ کی ربوبیت کو تسلیم نہ کیا اور سرکشی کی تو وہ جنات سے تھا۔ سارے جنات ابلیسی ہیں، لہٰذا جنات کو اپنا ولی و سرپرست نہ بناؤ۔ تمام انسانوں کو بتایا گیا کہ جو بھی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ابلیس اور اس کی قوم و قبیلہ یعنی جنات کے دھوکہ دینے سے کرتا ہے۔

مشرکین کی مذمت

مشرکین کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے اور ان کے اس عمل کو انتہائی برا عمل قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ان ظالموں کا بدلہ اور عوضانہ شیاطین ہیں کیونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا معبود قرار دیتے تھے، ان کو اپنا ولی بنا رکھا تھا، یہ عمل ظلم ہے لیکن ان کا یہ عمل بہت قبیح اور بڑا ظلم ہے کہ جس کے ارتکاب سے ان مشرکین نے ساحت مقدس الٰہی میں ظلم کیا در حقیقت اپنے اوپر ظلم کیا اور ظالموں کا ٹھکانہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

''نہ تو آسمان اور زمین کے بناتے وقت اور نہ خود انہیں بناتے وقت میں نے انہیں بلایا، اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنانے والا نہ تھا۔''

اُمور کی تدبیر میں ولایت

جو چاہتا ہے کہ وہ کسی کے اُمور اور اس کے معاملات کی تدبیر کرے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے اُمور کے متعلق مکمل آگاہ ہو کیونکہ پورے عالَم کے جتنے امور ہیں ان کا ایک دوسرے

کے ساتھ تعلق ہے، ایسی ولایت کے لیے ضروری ہے کہ ایسا تصرف کرنے والی ذات پورے عالم کی جزئیات سے بھی آگاہ ہو جبکہ ابلیس اور اس کی اولاد نہ تو آسمانوں اور زمین کی آفرینش کے آغاز سے آگاہ ہے اور نہ ہی اپنی آفرینش کے متعلق انہیں خبر ہے۔ وہ خلقت کے اُمور سے بالکل ناآشنا ہیں تو ایسے موجودات جن کو اپنی خلقت کا پتہ نہیں ہے اور وہ اپنی احتیاجات سے بھی ناواقف ہیں تو وہ کس طرح پورے عالم کی تدبیر کر سکتے ہیں بلکہ اس عالم کے کچھ حصہ کی تدبیر بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کے احوال سے ناواقف ہیں اور ان کی احتیاجات کا بھی انہیں علم نہیں ہے یہ پہلی بات۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودات کی جتنی انواع واقسام ہیں ہر نوع اپنی فطرت میں اپنے لیے مطلوب کمال کی جانب متوجہ ہے کیونکہ اللہ کی عمومی ہدایت نے تمام موجودات کو اپنے احاطہ و گھیرے میں لے رکھا ہے۔ دوسری جانب یہ بات بھی مدنظر رہے کہ شیاطین ایسے موجودات ہیں جو شریر ہیں، مفسد ہیں۔ ان کا ہدف انسانوں کو گمراہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں لہٰذا اگر شیاطین کو اپنے اُمور کی تدبیر کا اختیار ہو یعنی اپنے اُمور پر ان کا اختیار ہو تو یقینی امر ہے کہ یہ اللہ کے اذن واجازت سے ہی ہو گا تو یہ بات الٰہی غرض کے منافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ انسانوں کو کمال تک پہنچائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایسے موجودات جو شریر و فسادی ہیں اور انسانوں کو راہ ہدایت سے منحرف کرنا چاہتے ہیں ان کے پاس ایسا اختیار ہو کہ وہ اپنے امور کی تدبیر کر سکیں۔

آیت کے آخری حصہ سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ یہاں گمراہ کرنے والوں کی ولایت و سرپرستی کی بالکل نفی کی گئی ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا: میرا قانون یہ ہے کہ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنے امور کو چلانے والا قرار نہیں دیتا، تو پھر کس طرح ہو سکتا ہے اس عالم کے کچھ امور کی انجام دہی شیاطین کے ذمہ قرار دے دوں؟!!!

وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

"اور جس دن فرمائے گا کہ میرے شریکوں کو پکارو جنہیں تم مانتے تھے پھر وہ انہیں پکاریں گے سو وہ انہیں جواب نہیں دیں گے، اور ہم نے ان کے درمیان ہلاکت کی جگہ بنا دی ہے۔"

مشرکین کا اپنے معبودوں سے رابطہ کٹ جانا

اس جگہ تیسرا انداز بیان کا ہے کہ قیامت کا دن ہوگا، یہ مشرکین موجود ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوگا کہ دُنیا میں تم لوگ جنہیں میرا شریک ٹھہراتے تھے اب جاؤ اور ان کو بلا کر لے آؤ۔ فرض کیا گیا ہے کہ مشرکین یہ اعلان سن کر مشرکین کو آوازیں دیں گے جن کی وہ پوجا پاٹ کرتے تھے لیکن انہیں کسی جگہ سے کچھ جواب نہ آئے گا جس سے معلوم ہو جائے گا کہ دُنیا میں جنہیں وہ معبود سمجھتے تھے وہ معبود نہ تھے اور نہ ہی اللہ کے شریک تھے۔ اس وقت مشرکین اور ان کے خیالی معبودوں کے لیے ہلاکت کا ٹھکانہ ہوگا گویا کہ مشرکین کو اپنی ہلاکت کے ساتھ ساتھ ان کی ہلاکت کا منظر سامنے نظر آئے گا جنہیں وہ اللہ کا شریک بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے ان کے درمیان ربوبیت کا رابطہ ختم ہو جائے گا اور وہ اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ ان کا خیال غلط تھا ایسا کوئی تعلق ان شرکاء کا اور اللہ کا آپس میں موجود ہی نہ تھا یہ فقط ان کا خیال تھا۔

وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''اور گنہگار آگ کو دیکھیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔''

مجرمین کا ٹھکانہ

اس جگہ مجرم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ کلمہ عام ہے جو شرک اور دوسرے گناہوں کو بھی شامل ہے۔ سب گنہگار ایک جگہ اکٹھے ہوں گے، آتش جہنم کا نظارہ کریں گے اور سب کو اس بات کا یقین ہو گا کہ اُنھوں نے اس آگ میں جلنا ہے اس میں انہیں ڈالا جائے گا ان کے پاس کوئی بھی اور جگہ نہ ہو گی کہ جہاں پر وہ پناہ لے سکیں یا خود کو آتش جہنم سے بچا سکیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

''اور البتہ تحقیق ہم نے اس قرآن میں ان لوگوں کے لیے ہر ایک مثال کو کئی طرح سے بیان کیا ہے، اور انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے۔''

حقیقت شناسی کے لیے نمونے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حقائق سے آگہی کے لیے طرح طرح کی مثالیں اور نمونے دیئے ہیں تاکہ لوگ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ہدایت حاصل کر سکیں لیکن انسان ہر بات میں جھگڑا کرتا ہے، ہٹ دھرمی دکھاتا ہے، اثر نہیں لیتا، حقیقت کو قبول کرنے کی بجائے اس کا انکار کر دیتا ہے۔ یہ انسان کی طبیعت و مزاج ہے، انسان کی کمزوری کو بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ کی مہربانی عیاں ہے، اگر یہ انسان ان نمونوں پر توجہ دیتا اور ہٹ دھرمی نہ کرتا، قلابازی سے پرہیز کرتا تو وہ حقیقت کو قبول کر لیتا اور ہلاکت سے بچ جاتا۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَہُمُ الۡہُدٰی وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِیَہُمۡ سُنَّۃُ الۡاَوَّلِیۡنَ اَوۡ یَاۡتِیَہُمُ الۡعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

''اور جب ان کے پاس ہدایت آئی تو انہیں ایمان لانے اور اپنے رب سے معافی مانگنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ انہیں پہلی امتوں کا سا معاملہ پیش آئے یا عذاب ان کے سامنے آجائے۔''

لوگوں کی ہٹ دھرمی

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ ایمان لانے کے درپے نہیں ہیں، ہٹ دھرم اور ضدی ہیں، ایمان لانے اور اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگنے کے تمام حوالے موجود تھے اور ہدایت لینے پر کوئی رکاوٹ موجود نہ تھی بلکہ یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ جس طرح پہلے والوں کے لیے قانون تھا کہ جب وہ ایمان نہ لاتے، ہٹ دھرمی کرتے، انبیاء کو جھٹلاتے تو پھر انہیں نابود کرنے والا عذاب ان پر آجاتا۔ یہ لوگ بھی ایمان نہیں لاتے مگر ان پر ان کے سامنے عذاب نازل ہو جب عذاب آجائے گا تو پھر اس وقت ان کا ایمان لانا ان کو کچھ فائدہ نہ دے گا کیونکہ اس وقت ایمان لانا اختیاری نہ ہوگا بلکہ اضطرار اور مجبوری کے عالم میں ہوگا ایسا ایمان ان کو فائدہ نہ دے گا لہٰذا اس دور کے لوگوں کو اللہ کی آیات کو دیکھ کر ایمان لانا چاہیے۔

وَ مَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ ۚ وَ یُجَادِلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِہِ الۡحَقَّ وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَ مَاۤ اُنۡذِرُوۡا ہُزُوًا ﴿۵۶﴾

"اور ہم رسولوں کو صرف خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں، اور کافر ناحق جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے سچی بات کو ٹلادیں، اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جس سے انہیں ڈرایا گیا ہے مذاق بنالیا ہے۔"

رسول اللہؐ کے لیے حوصلہ وتسلیت

اس آیت میں رسول اللہؐ کو تسلی دی گئی، ان کا حوصلہ بڑھایا ہے تاکہ آپ کافروں کی ہٹ دھرمی اور مشرکین کے انکار کی وجہ سے مایوس نہ ہوں اور ان کے دور ہونے کی وجہ سے دل تنگ نہ کریں۔ اس میں واضح فرمایا گیا کہ رسولوں کا کام بشارت دینا اور ڈرانا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کافروں و مشرکوں کا ہمیشہ ایک ہی طریقہ رہا ہے کہ وہ ہمارے رسولوں کا انکار کرتے ہیں، ان کی دعوت کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو جن خطرات سے ڈرایا جاتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، بغیر منطق و دلیل کے لیے لجاجت اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ یہی حال اے میرے رسول آپ کے دور میں جو مشرکین ہیں ان کا ہے، وہ چاہتے ہیں اپنی گفتگو سے اور اپنی چال کے انداز سے حق کو نابود کریں لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آپ ان کے رویہ سے نہ گھبرائیں۔ آپ اپنی ذمہ داری کو ادا کرتے رہیں۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

"اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جسے اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے پھر وہ ان سے منہ پھیر لے اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے بھول جائے،

بے شک ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے، اور اگر تو انہیں ہدایت کی طرف بلائے تو بھی وہ ہر گز کبھی راہ پر نہ آئیں گے۔"

بڑا ظلم

بارہا یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ ظلم کا اثر جتنا بڑا ہو گا تو اسی نسبت سے ظلم بڑا ہو گا۔ جو لوگ اللہ کی آیات سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کے پیغام کا مذاق اُڑاتے ہیں اور الٰہی دعوت کو قبول نہیں کرتے ان کا متعلق اللہ اور اللہ کی آیات ہیں اس وجہ سے یہ ظلم سب مظالم سے بڑا ظلم ہے۔ جو اعمال آگے پہنچے ہیں ان کو بھلا دیا ہے اور اعمال کے بارے بے پرواہ ہونا، جیسے حق سے منہ موڑنا، حق بات کا مذاق اڑانا جب کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے وہی حق ہے۔

حق سے منہ موڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ایسے حالات اپنے لیے بنا دیے ہیں کہ ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے گئے ہیں اور ان کے کانوں کو بھاری کر دیا ہے وہ نہ تو قرآن کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی حق کو سن سکتے ہیں۔ ہدایت کی طرف دعوت دی جائے تو وہ اس کو سنتے ہی نہیں، سنی ہوئی بات کو ایسے لیتے ہیں کہ انہوں نے بالکل سنا ہی نہیں ہے۔

اس کلام سے یہ واضح کہا جا رہا ہے کہ ایسے افراد کے ایمان لانے کے بارے میں مکمل طور پر نااُمیدی ہے کیونکہ ہر وہ جسے اللہ گمراہ کر دے تو پھر اسے کوئی راہ رست پر نہیں لا سکتا (اللہ کے گمراہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ گمراہی کے اسباب بنائے جو شخص ان اسباب کو اپنا لیتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ حتمی ہے پس جس نے گمراہی کے اسباب اپنا لیے ہیں تو گویا خدا نے اسے گمراہ کر دیا ہے کہ اسباب کا خالق اللہ ہے ان اسباب کو انسان نے اپنے اختیار سے اپنایا ہے

،اب اس کی گمراہی حتمی ہے اور اس کی ہدایت ممکن نہیں رہی۔[1]

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ یَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْىِٕلًا ۝۵۸

"اور تیرا رب بڑا بخشنے والا اور رحمت والا ہے، اگر ان کے کیے پر انہیں پکڑنا چاہتا تو فوراً ہی عذاب بھیج دیتا، بلکہ ان کے لیے ایک معیاد مقرر ہے اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔"

عذاب میں تاخیر

اس جگہ اللہ کا اپنے بندوں پر مہربان ہونا اور ان کی خطاؤں کو معاف کرنے کا تذکرہ ہے اور اس بات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے بداعمال اور فسادی کردار تو ایسا تھا کہ اللہ فوری انہیں پکڑ میں لے لیتا اور ان پر عذاب اُتارتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و مغفرت کی بناء پر عذاب لانے میں جلدی نہیں کی بلکہ عذاب کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ اس سے پہلے عذاب نہیں دینا لیکن جب وہ وقت آجائے گا تو پھر اس سے کسی کے لیے گریز نہ ہوگا۔

وَ تِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَ جَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝۵۹ ع

"اور یہ بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کیا ہے جب انہوں نے ظلم کیا تھا اور ہم نے ان کی ہلاکت کا بھی ایک وقت مقرر کیا تھا۔"

---

[1] ۔ سورہ الاعراف ۳۳

اللہ کا ستم گاروں کے بارے قانون

اللہ کا یہ قانون ثابت اور طے شدہ ہے کہ ستمگاروں کو اللہ ہلاک کرتا ہے۔ فسادیوں اور ظالموں کی ہلاکت و بربادی میں تاخیر اور انہیں مہلت دینا تو یہ بھی نئی بات نہیں، یہ بھی اللہ کا دوسرا قانون ہے کہ ہر نافرمان قوم اور ستمگاروں کی سزا کا وقت مقرر کر دیا، جب وہ وعدہ آجاتا ہے تو اس وقت انہیں عذاب دیا جاتا ہے۔ اس آیت میں جس ہلاکت و عذاب کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد قیامت کے دن حساب لینے کے بعد والا عذاب نہیں ہے جو مجرموں کے لیے قرار دیا گیا ہے۔ اس سے مراد دُنیاوی عذاب ہے جیسا کہ بدر کی جنگ میں مکہ کے بڑے بڑے مشرکین کو ہلاک کیا گیا یا اس سے مراد آخری زمانہ کا عذاب بھی لے سکتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کو اس سے خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم دیکھتے ہو کہ مجرموں کو سزا نہیں مل رہی، دُنیا میں ظالم دندناتے پھرتے ہیں تو تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ دُنیاوی عذاب کا بھی وقت مقرر ہے، جب وعدہ کا دن آئے گا تو ان ستمگاروں اور مجرموں کو سزا ملے گی اور انہیں اس سزا سے اس دُنیا میں کوئی نہیں بچا سکے گا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

”اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا کہ میں نہ ہٹوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر پہنچ جاؤں یا سالہا سال چلتا جاؤں۔“

موسیٰؑ کا اپنے شاگرد سے مکالمہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو ساتھی ان کے ہمراہ تھا وہ یوشع بن نون تھے اور مجمع البحرین سے مراد دو سمندروں کے ملنے کی جگہ اس سے خلیج فارس کے غربی حصہ کا آخری حصہ

مراد ہے کہ مجازاً ان دو سمندروں کے اکٹھے ہونے کو بیان کیا ہے۔ اس آیت کا معنی کچھ اس طرح (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) کہ اے پیغمبر اس بات کو یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنے نوجوان ساتھی سے یہ کہا کہ جب تک ہم دو سمندروں کے اجتماع کی جگہ نہ پہنچیں اپنا سفر جاری رکھیں گے یا اس لمبے دن میں اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ اس آیت میں فقط موسیٰ کی خواہش کا اظہار ہے جس سے لگتا ہے کہ طولانی سفر کا ارادہ رکھتے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے استراحت کا ارادہ کیا تو اپنے ساتھی سے اس کا اظہار کیا اور پھر اسی جگہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر اپنے سفر کو جاری رکھا جیسا کہ بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

''پھر جب وہ دو دریاؤں کے جمع ہونے کی جگہ پر پہنچے دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے پھر مچھلی نے دریا میں سرنگ کی طرح کا راستہ بنا لیا۔''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ زندہ مچھلی ان کے پاس تھی وہ کسی ظرف میں ہو گی وہ اپنی حرکت سے سمندر میں چلی گئی ہو گی۔ اس طرف اشارہ دیا گیا ہے۔

مچھلی کا بھولنا اور مچھلی کا زندہ ہونا

ایسا احتمال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کے پاس ایک مچھلی موجود تھی جسے اُنہوں نے نمک لگا رکھا تھا اور اسے اپنے کھانے کے لیے تیار کیا تھا۔ راستہ میں جہاں پر اُنہوں نے استراحت کی تھی وہیں پر اس مچھلی کو بھول گئے تھے۔ جب دو سمندروں کے

[1] تاریخی حوالے سے حاشیہ میں یہ لکھا ہو گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سفر کہاں سے شروع کیا تھا اور کہاں کا ارادہ تھا، مقصد کیا تھا، تفاسیر سے دیکھ کر لکھنا ہو گا۔ مترجم اردو

ملاپ کے مقام پر پہنچتے ہیں تو بھوک لگی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھی سے مچھلی مانگی تو اس نے بتایا کہ وہ تو پیچھے چھوڑ آئے ہیں، مچھلی اللہ کے اذن سے زندہ ہوئی اور اس نے خود کو سمندر میں ڈال دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے جو ساتھی تھے شاید اس نے مچھلی کے زندہ ہونے کو دیکھا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام بھی بھول گئے کہ اس مچھلی کے متعلق سوال کریں جو ان کی خورجین میں تھی اور وہ جواب میں موسیٰ علیہ السلام کو بتائے کہ وہ تو زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تھی۔

آیت اللہ طباطبائی کے علاوہ مفسرین نے اس بارے ایسا ہی بیان کیا ہے لیکن آپ فرماتے ہیں: ''آیات اور روایات کے ظاہر میں اس بات کی تصریح موجود نہیں ہے کہ مچھلی زندہ ہو گئی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مچھلی کو سمندر کے کنارے پر موجود پتھر پر رکھا گیا ہو، سمندری لہریں اسے سمندر میں لے گئیں اور مچھلی سمندر کی گہرائیوں میں جا کر گم ہو گئی۔ مچھلی کا گم ہونا اس بات کی علامت تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ہو گی۔ بہر حال اللہ ہی اس بارے آگاہ ہے کہ حقیقت کیا ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

'' پھر جب وہ دونوں آگے بڑھ گئے تو اپنے جوان سے کہا کہ ہمارا کھانا لے آ، البتہ بتحقیق ہم نے اس سفر میں تکلیف اٹھائی ہے۔''

موسیٰؑ کا کھانا طلب کرنا

غداء دوپہر کے کھانے کو کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر صبح کے بعد ہی شروع کیا ہوگا اور ظہر کے قریب کسی جگہ پر پہنچے ہوں گے۔ بھوک کا احساس ہوا تو موسیٰ علیہ

السلام نے دوپہر کا کھانا طلب کیا۔ اس کھانا سے مراد وہی مچھلی ہے جسے انہوں نے اپنے کھانے کے لیے اپنے ہمراہ رکھا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گئے، کھانے سے تھکاوٹ دُور کرنا چاہتے تھے، بھوک لگی ہوئی تھی۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۘ وَ مَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَ اتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

''کہا کیا تو نے دیکھا جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تو میں مچھلی کو وہیں بھول آیا، اور مجھے شیطان ہی نے بھلایا ہے کہ اس کا ذکر کروں، اور اس نے اپنی راہ سمندر میں عجیب طرح سے بنالی۔''

بھولنے کی نسبت شیطان کی طرف دینا

جو، جوان موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ تھا جس وقت راستہ میں آرام کرنے کے لیے ایک چٹان کے کنارے بیٹھے تو اس وقت مچھلی کو اس جوان نے اس چٹان پر رکھ دیا۔ اس جگہ کو چٹان کہا ہے کہ چٹان کی پناہ میں آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ دوپہر کی گرمی سے بچنے کے لیے اس چٹان کے سایہ کا سہارا لیا ہوگا گویا کہ چٹان کی پناہ میں آگئے اور مچھلی اس چٹان پر رکھ دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب مچھلی طلب کی تو اس جوان نے پورا واقعہ کہہ دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میں مچھلی کو اٹھانا بھول گیا ہوں۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ جب اس نے مچھلی کو اس چٹان کے ایک کونے پر رکھا تھا تو سمندری لہر آئی تھی اور وہ مچھلی کو سمندر میں بہا کر لے گئی تھی۔ اس جگہ یہ بھی کہا کہ شیطان سبب بنا کہ میں آپ کو اس کے بارے بتاتا۔ اس مچھلی کے سمندر میں چلا جانا عجیب اور حیریت انگیز امر ہے۔ اس جواب پر موسیٰ علیہ السلام نے کوئی ردعمل یا

ناراضگی کا اظہار نہیں کیا جیسا کہ اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے اور پھر اُنہوں نے اپنے سفر کو سمندر کے کنارے جاری رکھا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾

”کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے، پھر اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہی الٹے پھرے۔“

موسیٰ ؑ کے لیے علامت

مچھلی کا سمندر میں چلے جانا، جب یہ موسیٰ علیہ السلام نے سنا تو فوراً کہا کہ یہ تو ہمارے لیے ایک علامت و نشانی ہے کہ ہم جس کی تلاش میں ہیں چلو اب واپس اسی جگہ پر چلتے ہیں جہاں پر ہم نے چٹان کے کنارے پناہ لی تھی اور اپنے پاؤں کے نشانات پر واپس چل پڑے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ یہ حکم ملا تھا کہ جہاں پر دونوں سمندر مل ہو رہے ہوں اس جگہ پر ان کی ایک عالم سے ملاقات ہو گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مچھلی کے گم ہونے کو اس عالم سے ملاقات کی علامت قرار دیا۔ اسی لیے پوری دقت سے اپنے پاؤں کے نشانات پر واپس پلٹے جس راستہ سے آئے تھے اسی راستہ پر واپس ہو گئے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

” پھر ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جسے ہم نے اپنے ہاں سے رحمت دی تھی اور اسے ہم نے اپنے پاس سے ایک علم سکھایا تھا۔“

اللہ کی خصوصی رحمت

اللہ کی طرف سے ہر نعمت اللہ کی رحمت سے عبارت ہے۔ یہ رحمت سب مخلوق کے

لیے حاصل ہے۔ اس رحمت کے لیے جسے ظاہری اور باطنی نعمات ہیں لیکن بعض نعمات ایسی ہیں جو رحمت کے واسطہ کے بغیر ہیں جیسے باطنی اور معنوی نعمات، جن میں نبوت، ولایت اور اس طرح کے اور بلند و اعلیٰ مقامات ہیں۔ اس آیت میں فرمایا ہے ''رَحۡمَةً مِّنۡ عِندِنَا'' ہماری جناب سے رحمت، تو اس رحمت سے مراد نبوت و ولایت نہیں ہے کیونکہ ولایت اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے کہ اس میں فرشتوں کی مداخلت نہیں ہے جبکہ نبوت وحی اور فرشتوں کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ انجام دیتا ہے۔

علم لدُنی سے مراد

اس جگہ علم لدنی سے مراد ایسا علم ہے جو اکتسابی نہیں ہے، جو علم اولیاء کے لیے خاص ہے اس میں حساسیات، فکر و سوچ، تفکر و تعقل کی مداخلت نہیں ہے۔ اس سے مراد احادیث اور بیانات کی توجیہہ و تاویل کا علم ہے جو حادثات و واقعات کائنات میں رونما ہوتے ہیں ان کی وجوہات کو بیان کرنا ہے۔

حضرت خضرؑ کے بارے

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام جو اس جگہ عبد خاص کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں وہ نبی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں لمبی عمر دی ہے اور آج تک زندہ ہیں۔ کچھ روایات میں ہے اس جگہ عبد سے مراد شخص خضر علیہ السلام نہیں لیکن روایات سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اللہ کے عبد خاص تھے، ان پر اللہ کا خاص انعام تھا۔ علم لدنی انہیں عطا کیا گیا وہ آج تک زندہ ہیں۔[1]

---

[1] ۔ روایات کے مطابق آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری وصی حضرت امام مہدی (عج) کے مونس و غمخوار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے کائنات کے اندر ہونے والے مختلف امور ان کے ذمہ ہیں۔ حضرت خضرؑ کا لمبی عمر والا ہونا حضرت امام مہدی ولی العصر (عج) کے طول عمر پر دلیل بھی ہے اور حضرت خضرؑ آپ کے ہمراہ تشریف لائیں گے۔ مترجم اردو

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝٦٦

"اسے موسیٰ نے کہا کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس شرط پر کہ توں مجھے سکھائے اس میں سے جو تجھے ہدایت کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔"

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ۝٦٧

"کہا بے شک تو میرے ساتھ ہر گز صبر نہیں کر سکے گا۔"

حضرت موسیٰؑ کی عالم ربانی سے درخواست

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حکم الٰہی تھا کہ میرے اس عبد کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ رہو، چنانچہ جب مچھلی گم ہونے والی جگہ پر پہنچتے ہیں اور اس عبد خاص سے ملاقات کرتے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے ہیں آپ مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں؛ جیسے کوئی شخص کسی کے پاس تعلیم لینے کے لیے جاتا ہے۔ وہ عالم ربانی جو حضرت خضر علیہ السلام تھے، اُنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے کیونکہ تمہاری برداشت کم ہے۔ جب تم راستہ میں کچھ امور کا مشاہدہ کروگے تو بے تاب ہو جاؤگے اور اپنے اس بیان کو بڑے زور دے کر کہا، لفظ "اِنَّ" استعمال کیا جو تاکید کا معنی دیتا ہے اور اس کے بعد نکرہ کو لایا گیا ہے جو عمومیت کا فائدہ دیتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اس میں صبر کی استطاعت کی نفی کی گئی ہے کہ تمہارے اندر اس قسم کے واقعات کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اس کام کی نفی کی ہے، درحقیقت اس کے اسباب سے واقفیت نہیں رکھتے تو اس کو برداشت نہیں کر پائیں گے اس قاطعیت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات سمجھائی ہے کہ آپ میں ہماری تعلیم کی روش کو برداشت کرنے کی طاقت موجود نہیں ہے۔

وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

''اور تو صبر کیسے کرے گا اس بات پر جو تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

بے صبری کی وجہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اصرار کرتے ہیں کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لیجئے، میں صبر کروں گا۔ اس بات کا جواب حضرت خضر علیہ السلام نے اس طرح دیا کہ بھئی جس بات کے بارے آپ کی اطلاع نہیں، جس امر کے بارے علمی احاطہ آپ کے پاس نہیں، جس سے تم بے خبر ہو کہ ایسا کیوں ہوا ہے تو پھر تم کس طرح اس امر کو دیکھ کر چپ رہ سکتے ہو؟ یہ خاص تعلیمی روش ہے جس کے بغیر ان اُمور سے آگہی حاصل نہیں ہو سکتی۔

قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

''کہا ان شاء اللہ تو مجھے صابر ہی پائے گا اور میں کسی بات میں بھی تیری مخالفت نہیں کروں گا۔''

صبر و برداشت کا وعدہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عبد عالم (خضر علیہ السلام) سے عرض کیا کہ ان شاء اللہ میں صبر کروں گا، مجھے صبر کرنے والوں سے پاؤگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس وعدہ میں لفظ ان شاء اللہ کا استعمال کیا کہ اگر اللہ کی مشیت ہوئی تو مجھے صابر پاؤگے۔ اگر ایسا نہ کہتے تو پھر صبر نہ کرنے پر جھوٹ ہو جاتا ہے۔ جو شان نبوی کے خلاف ہے، بعد والا جملہ کہ میں آپ کی کسی بات کی نافرمانی نہ کروں گا، یہ بھی ان شاء اللہ سے مشروط ہے کہ اگر اللہ کی مشیت شامل ہوئی تو ایسا ہو گا اس بیان سے خلاف ورزی جھوٹ و وعدہ خلافی سے شمار نہیں ہوتی۔

پیغام: اس میں سب کے لیے ایک پیغام ہے کہ جب کوئی بات کہو یا کوئی وعدہ دو تو اس میں ان شاء اللہ ضرور کہو، کیونکہ کوئی امر اللہ کی مشیت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِىۡ فَلَا تَسۡــَٔلۡنِىۡ عَنۡ شَىۡءٍ حَتّٰٓى اُحۡدِثَ لَكَ مِنۡهُ ذِكۡرًا ﴿٧٠﴾

''کہا پس اگر تو میرے ساتھ رہے تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کر یہاں تک کہ میں خود تیرے سامنے اس کا ذکر کروں۔''

عالم ربانی کی تعلیم کے لیے شرط

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ میرے ایک عبد کے پاس جاؤ جو عالم ہے اس سے سیکھو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عالم سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھ لیں اور تعلیم دیں تو پہلے اس عالم نے کہا کہ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتے کیونکہ ایسے معاملات آئیں گے جن کو دیکھ کر تم بے تاب ہو جاؤ گے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اصرار کیا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں، انشاء اللہ میں صبر کروں گا اور انشاء اللہ کسی امر میں ان کی نافرمانی نہ کروں گا تو اس اظہار کے بعد اس عالم ربانی نے واضح شرط لگا دی کہ ٹھیک ہے میرے ساتھ چلو لیکن ایک شرط ہے کہ جو کچھ تم دیکھو تو اس کے بارے کوئی سوال نہ کرنا بلکہ خاموش رہنا یہاںتک کہ میں خود آپ کو خبر دُوں کہ وہ واقعہ کیوں ہوا اور اس سے کیا مقصد تھا۔

شاگردی کے آداب

اس گفتار میں بہت ہی حیرت انگیز ادب و آداب کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم پیغمبر ہیں وہ آئے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام سے کچھ حاصل

کریں جس کا نمونہ بعد والی گفتار میں ظاہر ہو گا اور تعلیم سے پہلے جو گفتگو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان ہوئی ہے اس میں ایک شاگرد کو اپنے لیے جسے استاد بنانا چاہتا ہے کس ادب سے بات کرتا ہے تو اس ساری گفتار میں درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:۔

ا۔ سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں (یعنی آپ مجھے اپنی شاگردی اور تابعیت میں لیتے ہیں)

۲۔ عالم کے ساتھ رہنے کو مصاحبت (اپنا ساتھی بنالو) کا سول نہیں کیا بلکہ تابعیت (پیروی اور پیچھے چلنے کا) سوال کیا کہ آپ کے پیچھے پیچھے چل سکتا ہوں۔

۳۔ اپنے پیچھے چلنے کو اس کے ساتھ مشروط نہیں کیا کہ آپ مجھے کچھ تعلیم دیں گے بلکہ یہ کہا کہ میں آپ کی پیروی کروں گا ہو سکے تو آپ مجھے کچھ تعلیم دیں۔

۴۔ باقاعدہ طور پر خود کو ان کا شاگرد قرار نہیں دیا۔

۵۔ ان کے علم کو اللہ سے نسبت دی ہے کہ اللہ نے جو کچھ آپ کو علم دے رکھا ہے۔

۶۔ ان کے علم کو رُشد وارتقاء کا نام دیا۔

۷۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جو کچھ انہیں تعلیم دیا اسے ان کے علم کا ایک حصہ قرار دیا۔

۸۔ حضرت خضر علیہ السلام کے دستورات کا ان کا امر قرار دیا اور ان کی نافرمانی کو عصیان و معصیت قرار دیا۔

۹۔ حضرت خضر علیہ السلام کی متابعت کو اللہ کی مشیت کے ساتھ مشروط کیا۔

یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے تھا جس ادب کا لحاظ رکھا گیا۔

حضرت خضرؑ (اُستاد کی جانب سے ادب کا لحاظ)

حضرت خضر علیہ السلام نے بھی ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا جواب دیا۔

۱۔ صراحت کے ساتھ اسے رَد نہ کیا۔

۲۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ دیا کہ وہ اس کی مخالفت نہ کریں گے تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم نہیں دیا کہ جی ہاں! تم میری پیروی میں آجاؤ بلکہ انہیں مختار قرار دیا کہ تم بااختیار ہو، چاہو تو میری پیروی کرو لیکن ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ دیکھو اس کے بارے سوال مت کرنا یہاں تک کہ میں خود تمہیں بیان کروں کہ کیا تھا اور کیوں تھا، کس لیے تھا؟

۳۔ مطلّقاً انہیں سوال کرنے سے منع نہیں کیا بلکہ یوں فرمایا کہ اگر میری پیروی پر آمادہ ہو تو پھر تم مجھ سے سوال نہ کرنا بلکہ خاموشی سے میرے ساتھ رہنا۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا اِمْرًا ۝۷۱

"پس دونوں چلے، یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوئے تو (بندے نے) اسے پھاڑ دیا، (موسٰی نے) کہا کیا تو نے اس لیے پھاڑا ہے کہ کشتی کے لوگوں کو غرق کر دے، البتہ تو نے خطرناک بات کی ہے۔"

حضرت موسیٰؑ کی پہلی کلاس

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اکیلے گئے، حضرت یوشع کو چھوڑ دیا، کشتی میں جب بیٹھ گئے تو حضرت خضر علیہ السلام کشتی

میں سوراخ کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ کشتی اپنی سواریوں سمیت غرقِ آب ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی یہ حرکت عجیب لگی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے برداشت نہ ہو سکا اور سوال کر ڈالا اور حیرت سے پوچھا جناب خضرؑ یہ آپ نے کیا کام کیا ہے کہ اس کشتی میں سوراخ کر دیا اس سے تو کشتی والے سارے لوگ غرق ہو جائیں گے تو کیا آپ انہیں غرق کرنا چاہتے ہیں، یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے اس کام پر اعتراض کر دیا اور یہ درحقیقت پہلی کلاس تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کام کی افادیت کو نہ جان سکے، بے خبر تھے اس لیے تو سوال کیا کہ یہ تم نے کیا کر ڈالا اور صبر نہ کر سکے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾

"کہا کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ توں میرے ساتھ صبر نہیں کر سکے گا۔"

حضرت موسیٰؑ کا بے محل سوال کرنا

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال کو بے محل اور بے جا سوال قرار دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ابتدائی گفتگو یاد دلائی کہ میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ تم میرے ساتھ چلوگے تو کچھ ایسے واقعات دیکھوگے جن کے متعلق تم بے تاب ہو جاؤگے اس کے متعلق سوال کروگے، صبر نہ کر سکوگے۔ اس کی وجہ بھی حضرت خضر علیہ السلام نے بتا دی تھی کہ انسان جس بارے آگاہ نہیں ہوتا تو وہ اس کے متعلق سوال کرتا ہے۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾

"کہا میرے بھول جانے پر گرفت نہ کر اور میرے معاملہ میں سختی نہ کر۔"

حضرت موسیٰؑ کا معذرت چاہنا

جب حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ابتدائی گفتگو یاد دلائی کہ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم میری ہمراہی میں جب آؤگے تو صبر نہ کر سکوگے اور تم نے وعدہ دیا تھا کہ صبر کروگے اب میری بات سچ ہوئی۔ یہ واقعہ دیکھ کر تم بے تاب ہوگئے اور صبر نہ کیا تاکہ میں خود تمہیں بتاتا کہ کشتی کے سوراخ کرنے میں کیا راز ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کرتے ہوئے یوں کہا کہ مہربان استاد میں بھول گیا تھا کہ آپ کے کاموں کے متعلق آپ سے سوال نہ کروں گا، میں نے وعدہ خلافی کی اور آپ سے سوال کر ڈالا۔ اب آپ میری اس بھول پر موأخذہ نہ کریں، میرے معاملہ میں سختی نہ فرمائیں۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةًۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

”پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ انہیں ایک لڑکا ملا تو (بندے نے) اسے مار ڈالا، (موسیٰ نے) کہا تو نے ایک بے گناہ کو ناحق مار ڈالا، البتہ تو نے بری بات کی۔“

کشتی میں سوراخ کے بعد بچے کا قتل

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دونوں کشتی سے اُترے، جب راستہ میں چل رہے ہوتے ہیں تو ایک چھوٹے بچے کو سامنے دیکھتے ہیں، حضرت خضر علیہ السلام نے اس بچے کو پکڑا اور قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر بے تاب ہو جاتے ہیں، ان کی برداشت جواب دے جاتی ہے کہ تم نے ایک ایسے معصوم بچے کو جو ابھی بالغ بھی نہیں ہوا تھا آپ نے اسے قتل کر دیا ہے اس نے تو کبھی گناہ نہیں کیا، آپ نے اسے قتل کرکے بہت برا کیا ہے، ناپسندیدہ عمل انجام دیا ہے۔ اس کے لیے تو قصاص دینا پڑے

گا بغیر وجہ کے اسے قتل کیا ہے۔ یہ کام تو انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے کہ کسی معصوم بچے کو بلاوجہ قتل کر دیا جائے۔ انسانی معاشرہ، سول سوسائٹی اسے کسی بھی حوالے سے قبول نہیں کرے گی۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا اعتراض تھا، اسی میں تندی بھی اور سختی بھی۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝٧٥

''کہا کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہیں کرسکے گا۔''

خضرؑ کا موسیٰؑ کے لیے جواب

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض پر وہی پہلے والی بات کہی کہ میں نے تو پہلے ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ جب تم میرے ساتھ چلوگے تو میرے کچھ کاموں کو دیکھ کر تمہیں حیرت ہوگی اور تم ان کاموں پر بے تاب ہو جاوٴگے اور بے صبری میں سوال کروگے کہ تم نے یہ کیا کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوگی کہ تم اس کام کی افادیت سے بے خبر ہوگے اور انسان جس بارے آگاہ نہ ہو تو اس پر کس طرح صبر کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی تم سے کہا ہے کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے، تم میں برداشت نہیں ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تم میری باتوں کو سمجھ نہیں سکے اور نہ ہی جو کچھ میرے مدنظر تھا اسے جان سکے ہو۔ ورنہ میری بات کرنے کا کچھ مقصد نہ تھا فقط اس حقیقت کی طرف تمہاری توجہ دلانا تھی کہ میرے کام ایسے ہیں کہ جو بھی انہیں دیکھے تو وہ اس پر حیرت زدہ ہو اور اس کی حقیقت کو نہ جاننے کی وجہ سے معترض ہوگا اور اب وہی ہو رہا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ تم اپنے وعدہ کے خلاف کر رہے ہو۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝٧٦

''کہا اگر اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کا سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھیں، آپ میری طرف سے معذوری تک پہنچ جائیں گے۔''

تیسری بات سوال کرنے پر فراغت

حضرت خضر علیہ السلام کے جواب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخری بار حضرت خضر علیہ السلام سے مہلت مانگ لی۔ اس دفعہ نہیں کہا کہ میں بھول گیا تھا، آپ مجھے معاف کر دیں، میری معذرت قبول کرلیں بلکہ اب کی بار انداز بدل دیا اور آخری مہلت مانگ لی، اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اگر تیسری مرتبہ پھر میں نے آپ کے کسی کام پر اس طرح اعتراض کیا تو پھر آپ مجھے فارغ کر دینا اور میرے ساتھ نہ چلیں، میرے پاس پھر کوئی بہانہ بھی نہیں ہوگا اور آپ کا مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا اس پر آپ حق بجانب ہوں گے۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ٍۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝

''پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزرے تو ان سے کھانا مانگا انہوں نے مہمان نوازی سے انکار کر دیا پھر انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرنے ہی والی تھی تب اسے سیدھا کر دیا، کہا اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کوئی اجرت ہی لے لیتے۔''

حضرت خضرؑ کا بغیر اجرت لیے دیوار بنانا

حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اکٹھے چل رہے ہیں۔ ایک گاؤں میں

پہنچ جاتے ہیں ایسے معلوم ہوتا ہے کہ بھوکے تھے اور کھانا لینے کے لیے اب ان کے پاس پیسے بھی نہیں ہیں لہٰذا بستی والوں سے کھانا مانگا اور یہ کہ کوئی انہیں اپنا مہمان بنا لے (ایسے لگتا ہے کہ رات کا وقت ہو گا) بھوکے رہتے ہیں۔ اسی بستی میں رہے ہوں گے اور آگے جانے کا پروگرام بنا لیتے ہیں کہ جاتے جاتے ایک دیوار کے پاس سے گزرتے ہیں کہ انہیں محسوس ہوا کہ یہ دیوار بالکل خراب ہو چکی ہے اور بہت جلد ہی گر پڑے گی۔

حضرت خضر علیہ السلام اس دیوار کو بناتے ہیں، ظاہر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس دیوار کو بنانے میں حضرت خضر علیہ السلام کی مدد کی ہو گی۔ جب دیوار کو دوبارہ کھڑا کر دیا اور کام سے فارغ ہوئے تو اگلے سفر پر چل دیئے۔ اس دیوار بنانے کی کوئی اجرت نہیں لی، پیسے تو پاس نہ تھے ایک محنت کی تھی اب حضرت موسیٰ علیہ السلام حیران ہوئے کہ بستی والوں نے ہمیں کھانا تک نہیں دیا، ہمیں مہمان بنانے سے بھی انکار کیا، پیسے ہمارے پاس نہیں تو فوراً سوال کر دیا کہ جناب استاد ہم نے مزدوری کی ہے ان کی گرتی ہوئی دیوار کو بہترین بنا دیا ہے اس پر ان لوگوں سے اجرت ہی لے لیتے تاکہ ہمارے لیے زاد راہ بن جاتا اور ان پیسوں سے ہم اپنے لیے کھانا لے سکتے۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝٧٨

"کہا اب میرے اور تیرے درمیان جدائی ہے، اب میں تجھے ان باتوں کا راز بتاتا ہوں جن پر تو صبر نہ کر سکا۔"

حضرت خضرؑ کا موسیٰؑ کو فارغ کرنے کا اعلان

تیسری بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب خضر علیہ السلام کے کام پر نقطہ

اعتراض اٹھایا تو اب حضرت خضر علیہ اسلام نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے، آپ اپنا کام کریں اور مجھے اپنا کام کرنا ہے، اب تیرے اور میرے درمیان جدائی اور علیحدگی کی وجہ واضح ہو چکی۔ خود موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا اگر تیسری بار اعتراض کروں تو پھر مجھے فارغ کر دینا۔ البتہ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ بھی ساتھ فرمایا کہ ابھی میں آپ کو ان کاموں کی حقیقت کے بارے آگاہ کرتا ہوں کہ ان کاموں کا انجام کیوں دیا گیا اور اس کے پس پردہ کونسی حکمت موجود تھی جس کی وجہ سے آپ صبر نہ کرسکے اور ان کے ظاہر کو دیکھ کر بے تاب ہو گئے۔

اَمَّا السَّفِیۡنَۃُ فَکَانَتۡ لِمَسٰکِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ فِی الۡبَحۡرِ فَاَرَدۡتُّ اَنۡ اَعِیۡبَہَا وَ کَانَ وَرَآءَہُمۡ مَّلِکٌ یَّاۡخُذُ کُلَّ سَفِیۡنَۃٍ غَصۡبًا ﴿۷۹﴾

”جو کشتی تھی سو وہ محتاج لوگوں کی تھی جو دریا میں مزدوری کرتے تھے پھر میں نے اس میں عیب کر دینا چاہا اور (یہ اس لیے کہ) ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا۔“

کشتی کو عیب دار بنانے کا فلسفہ

کشتی غریبوں کی تھی، ایک ظالم بادشاہ اپنی ضرورت کے تحت ہر صحیح و سالم کشتی پر قبضہ کر لیتا تھا۔ یہ غریب لوگ اس کشتی کے ذریعہ اپنا روزگار کماتے ہیں، میں نے کشتی کو عیب دار بنا دیا تاکہ بادشاہ اس کشتی پر قبضہ نہ کرلے اور اس طرح غریبوں کے روزگار کا وسیلہ ان کے پاس باقی رہے کیونکہ کشتی کا مالک اس کے عیب کو ٹھیک کر لے گا، مرمت کے بعد دوبارہ اسے استعمال میں لے آئے گا۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًاۚ۝۸۰

''اور رہا لڑکا سو اس تو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے سو ہم ڈرے کہ انہیں بھی سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے۔''

لڑکے کو قتل کرنے کا فلسفہ

خشیت سے مراد دل میں خوف آنا مراد نہیں بلکہ اس جگہ مہربانی، شفقت اور پیار کے تحت کسی کے بارے پریشان ہونا مراد ہے کیونکہ انبیاء اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

''اور وہ (انبیاء) اللہ کے سوا کسی ایک سے نہیں ڈرتے''۔[1]

حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس بچے کے والدین نیک اور مومن تھے، ہمیں ان پر شفقت و پیار آیا کہ کہیں یہ بچہ اپنے والدین کو کفر و سرکشی پر آمادہ نہ کر لے۔ کفر و طغیان اور فساد کی بیخ کنی کے لیے اس کی اساس و بنیاد کو خاتمہ کرنا چاہیے یعنی اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ فلاں شخص فتنہ و فساد کا سبب ہے بدامنی کا سہولت کار ہے تو اسی جڑ کا ہی خاتمہ کر دیا جائے۔

حضرت خضر علیہ السلام جانتے تھے یہ بچہ والدین کو فتنہ و فساد، کفر و الحاد کی طرف پہنچائے گا اس وجہ سے انہوں نے اپنے علم کی بنیاد پر اس بچہ کو قتل کر کے فساد کی جڑ کا خاتمہ کر دیا اور ان دو مومنوں کو ہلاکت سے بچا لیا اگرچہ وہ بچہ تھا لیکن اس نے ایسا کرنا تھا۔ ایسا علمی احاطہ انبیاء عظام کے سوا کسی کے پاس نہیں، اگر کسی پیغمبر کو پتہ چل جائے کہ فلاں بچہ آئندہ

---

[1] ۔ سورہ احزاب: ۳۹

کفر و فساد کا سبب بنے گا تو وہ اسے قتل کرنے کا حکم دے سکتے ہیں کسی اور کو ایسا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ نابالغ کے بارے یہ حکم جاری کرے البتہ عدالت کا حق ہے کہ اگر اس کے لیے کسی کے بارے معلوم ہو جائے اور ثابت ہو کہ وہ شخص فتنہ و فساد کا موجب ہے تو وہ اس کے قتل کا حکم دے سکتا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس اللہ کا دیا ہوا اختیار تھا جسے انہوں نے استعمال کیا، البتہ اس کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ تھا۔

فَاَرَدْنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

"پھر ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلہ میں انہیں ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر اور محبت میں اس سے بڑھ کر ہو"۔

یَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

"اور جو دیوار تھی سو وہ اس شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا اور ان کا باپ نیک آدمی تھا، پس تیرے رب نے چاہا کہ وہ جوان ہو کر اپنا خزانہ تیرے رب کی مہربانی سے نکالیں، اور یہ کام میں نے اپنے ارادے سے نہیں کیا، یہ حقیقت ہے اس کی جس پر تو صبر نہیں کر سکا۔"

نیک شخص کا بدلہ

اس جگہ چند مطالب بیان ہوئے ہیں:۔

۱۔ اللہ نیک شخص کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے۔

۲۔ یتیم وہ ہوتا ہے جس کا باپ نہ ہو۔

۳۔ اس دیوار کے نیچے خزانہ مدفون تھا۔

۴۔ یتیم جب بالغ عاقل رشید ہو جائے تو وہ اپنے مال میں تصرف کر سکتا ہے۔

۵۔ اللہ کے حکم سے حضرت خضر علیہ السلام نے اس دیوار کو بنایا تھا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نیک آدمی کے اعمال کا بدلہ اس کی اولاد کو بھی دیتا ہے۔

۷۔ ہر کام کے پیچھے ایک حکمت ہوتی ہے۔

خضرؑ کے جوابات کے تناظر میں سبق

اس سارے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے:۔

ا۔ کہ انبیاء کے علاوہ بھی اللہ کے خاص بندگان ہیں جن کو اللہ نے علم عطا کر رکھا ہے۔

۲۔ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔

۳۔ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس ایسی معلومات تھیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھیں۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم پیغمبرؑ تھے، کلیم خدا تھے ان کے ذہن میں علم اور اپنے مرتبہ کا گھمنڈ نہ آئے تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا جائے کہ جو کچھ تیرے پاس ہے کچھ اور بھی ہیں جن کے پاس اس کے علاوہ بھی معلومات ہیں جو تیرے پاس نہیں۔

۵۔ ہر عالم کے اوپر بھی ایک عالم ہو سکتا ہے۔

۶۔ دُنیا میں جو حادثات و واقعات رونما ہو رہے ہوتے ہیں افراد کے لیے ہوں یا پورے اجتماع میں ہوں، آسمانی ہوں یا زمینی ہوں، جن واقعات کے ظاہری اسباب سے ان کی افادیت کا پتہ نہ چلے تو یہ نہ کہیں کہ یہ واقعہ بے سود ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، یہ نہ ہوتا تو بہتر تھا، کیونکہ ہر عمل و فعل و واقعہ کی حقیقت کا اللہ کو پتہ ہے اور اللہ کا کوئی کام بھی بغیر

مصلحت اور حکمت کے نہیں ہوتا۔

۷۔ حضرت خضر علیہ السلام آج بھی موجود ہیں اور وہ اب بھی اللہ کے حکم سے بہت سارے کام کر رہے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔

۸۔ روایات میں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام آخری پیغمبر محمد مصطفیٰ ﷺ کے آخری وصی حضرت امام العصر مہدی (عج) کے مونس و غمخوار ہیں اور ان کے ماتحت کائناتی امور میں ذمہ داریوں کو ادا کر رہے ہیں۔

خزانہ جو پوشیدہ تھا اس کے متعلق

کتاب الدر المنثور میں ہے کہ جو خزانہ دیوار کے نیچے چھپایا گیا تھا وہ سونا و چاندی نہ تھا بلکہ چار مطلب تھے جو ایک تختی پر لکھے ہوئے تھے:

۱۔ کلمہ توحید ۲۔ جس کو موت کا یقین ہے وہ کس طرح زندگی گزارے۔

۳۔ جسے احتساب کا یقین ہے تو کبھی بھی خوشحال نہیں ہوتا۔

۴۔ جس کو قدر کا یقین ہے (سب کچھ مقدرات سے ہے) تو وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔[1]

۹۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ایسے کام جس میں نقص و کمزوری کا اندیشہ ہے اسے اپنی طرف نسبت دی ہے جیسے فرمایا میں نے چاہا کہ کشتی میں سوراخ کرکے اسے عیب دار بنا دُوں۔ اور ایسا کام جس کے لیے اپنی طرف اور خدا کی طرف نسبت دینا درست تھا تو اس جگہ فرمایا:

"ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان دونوں کا بدلہ دے"۔

---

[1] ۔ تفسیر عیاشی جلد ۲، الدر المنثور ج ۴ میں ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے جو اس کی تائید کرتی ہے۔ تفسیر فخر رازی میں اس واقعہ کے بارے بہت عمدہ نکات بیان کیے گئے ہیں۔

اور جہاں پر عمل کا تعلق فقط ربوبیت کا ہے تو اس جگہ فقط اللہ کی طرف نسبت دی ہے۔ فرمایا: ''تو تیرے رب نے یہ ارادہ کیا کہ وہ دونوں جب اپنے رُشد کو پہنچ جائیں۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ﴿۸۳﴾

''اور آپ سے ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ اب میں تمہیں اس کا حال سناتا ہوں۔''

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَ اٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۙ﴿۸۴﴾

''ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی اور اسے ہر طرح کا ساز وسامان دیا تھا۔''

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾

''تو اس نے ایک ساز وسامان تیار کیا۔''

جناب ذوالقرنین کا قصہ

حضرت ذوالقرنین کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کے متعلق تمہیں خبر دے دُوں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ذوالقرنین کو ہم نے زمین پر اقتدار دیا اور اس اقتدار کے لیے ہم نے اسے ہر وسیلہ عطا کیا اور ذوالقرنین نے ہمارے دیے ہوئے وسیلہ کو استعمال کیا اور زمین پر مقتدر بنا۔ یہ سب اللہ کی طرف سے اس کے لیے تھا۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ۬ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

''یہاں تک کہ جب سورج ڈوبنے کی جگہ پہنچا تو اسے ایک گرم چشمے میں ڈوبتا ہوا پایا اور وہاں ایک قوم بھی پائی، ہم نے کہا اے ذوالقرنین ! یا انہیں سزا دے اور یا ان سے نیک سلوک کر۔''

ذوالقرنین کا سفر

ذوالقرنین نے اپنا سفر جاری رکھا وہ خشکی پر چل رہا تھا تو ایک ایسے چشمہ کے پاس پہنچ گئے جو گل آلود تھا سیاہی مائل کیچڑ تھا یا اس سے مراد یہ ہے کہ سمندر کے ساحل پر پہنچ گئے کہ اس کے بعد خشکی کی اُمید باقی نہ رہی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے سورج غروب ہو رہا تھا آگے پانی تھا، خشکی ختم ہو گئی تھی سمندر کے کنارے جب انسان کو سورج غروب ہوتے دیکھتا ہے تو اُفق کی انتہاء سمندر پر منطبق ہوتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے لجن دار (کیچڑ اور گل آلود) بحر محیط (مغربی اوقیانوس) کے جزائر خالدات پر منطبق ہو رہا ہے۔ ہئیت قدیم میں یہ جزائر جغرافیائی طول کا مبدء وآغاز سمجھے جاتے تھے۔

بعض قرائتوں میں عین حمئہ کو عب حامیہ پڑھا گیا ہے جس کا معنی گرم پانی ہے تو اس سے مراد بحر گرم اوقیانوس کبیر کے استوائی حصہ پر بولا جاتا ہے جو کہ افریقہ کی سرزمین پر صادق آتا ہے۔ بعید نہیں کہ حضرت ذوالقرنین مغربی جانب چلتے چلتے افریقی ساحلوں پر پہنچے ہوں گے۔

ظالموں کے ساتھ رویہ

اس ساحل کے قریب یا اس چشمہ کے نزدیک ایک قوم کو آباد پایا کہ ان میں سے کچھ ستمگر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے توسط سے یا الہام ربانی (جو کہ غیر وحی ہے) کے وسیلہ سے ذوالقرنین سے سوال کیا کہ تم ان کے ساتھ کیسا سلوک کرو گے اب جبکہ تم ان پر غالب آچکے

ہو اور یہ لوگ تمہارے تسلط و غلبہ میں ہیں۔ سزا دو گے یا ان پر احسان کرو گے؟ کس کا انتخاب کرو گے؟۔ گفتگو کا انداز ایسا ہے کہ احسان والی جہت کو ترجیح دی گئی ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكۡرًا ﴿۸۷﴾

''کہا جو ان میں ظالم ہے اسے تو ہم سزا ہی دیں گے پھر وہ اپنے رب کے ہاں لوٹایا جائے گا پھر وہ اسے اور بھی سخت سزا دے گا۔''

وَ اَمَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالۡحُسۡنٰى ۚ وَ سَنَقُوۡلُ لَهٗ مِنۡ اَمۡرِنَا يُسۡرًا ﴿۸۸﴾ؕ

''اور جو کوئی ایمان لائے گا اور نیکی کرے گا تو اسے نیک بدلہ ملے گا، اور ہم بھی اپنے معاملے میں اسے آسان ہی حکم دیں گے۔''

ظالم کے لیے سزا اور نیک کے لیے جزاء

بعض مفسرین نے اس آیت میں ظلم سے مراد شرک لیا ہے اور عذاب سے مراد قتل کرنا۔ لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ظلم عام ہے شرک سے اور یہ شامل ہے شرک و کفر کو بھی اور اس پر ایمان لانے والے کو بھی جو عمل صالح کی بجائے فساد کرتا ہے۔ زمین میں بدامنی پھیلاتا ہے، اس طرح ظلم زمین میں فساد پھیلانے کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح عذاب کا معنی بھی اعم سے قتل کرنے اور دوسری سزا دینے سے بھی ہر قسم کی سزا مراد ہے۔

ذوالقرنین کا فیصلہ

ذوالقرنین کہتے ہیں میں ظالموں اور مفسدوں کو قتل کرنے کے ذریعہ یا دوسرے

طریقہ سے عذاب دُوں گا اور آخرت میں اللہ کے پاس یہ پلٹیں گے اور وہ انہیں بے سابقہ اور بے مثل عذاب دے گا کہ جس کے بارے ان کا خیال تک نہ رہا ہوگا۔ لیکن جو ایمان لا چکے اور پھر ایمان کا تقاضا پورا کرتے ہوئے عمل صالح بجا لائے تو ان کے لیے اچھا بدلہ ہے۔ ان پر احسان و نوازش ہے اور ہم ان کے لیے ہر بات آسان کرکے پیش کریں گے، ان پر سختی نہ کریں گے ان کے لیے مشکلات زیادہ نہ دیں گے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾

"پھر اس نے ایک ساز و سامان تیار کیا۔"

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾

"یہاں تک کہ جب سورج نکلنے کی جگہ پہنچا تو اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر نکلتے ہوئے پایا کہ جس کے لیے ہم نے سورج کے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی۔"

مشرق کی جانب سفر

جہاں پر پہلے اترے جو کہ مغربی جانب تھی پھر انہوں نے مشرقی جانب سفر شروع کر دیا تو مشرقی جانب ایک صحراء میں پہنچ گئے، وہاں پر انہوں نے لوگوں کو موجود پایا جن کے پاس زندگی کے وسائل موجود نہ تھے کہ وہ خود کو دھوپ سے بچا سکیں۔

ایسے تمدن و تہذیب میں نہ تھے کہ وہ اپنے بدن کو چھپا سکیں یا اپنے لیے گھر و چشمہ بنائیں، ننگے سر برہنہ، بے چھت تھے۔ ان کے پاس ابھی اللہ نے یہ علم نہ دیا تھا کہ وہ اپنے لیے ستر پوشی کے واسطے لباس بنائیں یا رہائش کے لیے مکانات تعمیر کریں۔ مٹی کے گھروندے میں زندگی گزار رہے تھے یہ بھی ذوالقرنین کے لیے نئی بات تھی۔

كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾

''اسی طرح ہی ہے، اور اس کے حال کی پوری خبر ہمارے ہی پاس ہے۔''

اللہ کی عطا

ذوالقرنین کے لیے اللہ کی عطا تھی جو کچھ ذوالقرنین کے پاس آگہی اور معلومات تھیں یہ سب اللہ کی دی ہوئی تھیں اور جو کچھ وسائل اس کے پاس تھے وہ بھی اللہ کی عطا تھی اور سارے معاملات اللہ کی ہدایت اور تدبیر سے انجام پا رہے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾

''پھر اس نے ایک ساز و سامان تیار کیا۔''

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾

''یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا ان دونوں سے اس طرف ایک ایسی قوم کو دیکھا جو بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔''

دو پہاڑوں کے درمیان کا واقعہ

ذوالقرنین نے اپنا سفر جاری رکھا۔ چلتے چلتے دو پہاڑوں کے درمیان پہنچ گئے ان پہاڑوں کے درمیان ایک بدو قوم کو موجود پایا جو بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے، کم سمجھ تھے، کسی بات کو سمجھتے نہیں تھے۔ یعنی جو بات ان سے کی جاتی تو وہ اس کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان کی زبان عجیب و غریب تھی جو ذوالقرنین کی زبان

کو نہیں سمجھتے تھے۔ دو باتیں ہیں؛ ایک یہ ہے کہ وہ زبان کو سمجھتے تھے لیکن بات کی تہہ اور اس سے جو مقصد تھا اس کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اصلاً ذوالقرنین کی زبان ہی کو نہیں سمجھتے تھے۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

"انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین بے شک یاجوج ماجوج اس ملک میں فساد کرنے والے ہیں پھر کیا ہم آپ کے لیے کچھ محصول مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں۔"

یاجوج ماجوج کا قصہ

ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم تھی جسے یاجوج ماجوج کے نام سے پکارا ہے کہ وہ ایسی قوم ہے جو پہاڑوں کے پیچھے سے آکر ہمارے اوپر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہمارا نقصان کرتے ہیں، قتل و غارت گری ان کا کام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں رہتے تھے اور ان دو پہاڑوں کے پیچھے سے اندر آنے کا راستہ تھا وہاں سے یاجوج ماجوج کی قوم ان پر حملہ آور ہوتے ان کے مال مویشی لوٹ لیتے، ان کا قتل کرتے، انہوں نے حضرت ذوالقرنین اور ان کے لشکر کو دیکھا اور ان سے مہربانی سے پیش آتے دیکھا تو انہوں نے حضرت ذوالقرنین کی خدمت میں یاجوج ماجوج کی شکایت کر ڈالی اور یہ کہا کہ آپ ایسا کام کریں کہ ان کے آنے کا جو راستہ ہے اس راستہ میں ایک بڑی مضبوط دیوار بنا دیں تاکہ وہ اس کو عبور نہ کر سکیں، اس کے بدلہ میں ہم تمام اخراجات ادا کریں گے۔

قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾

''کہا جو میرے رب نے قدرت دی ہے کافی ہے سو طاقت سے میری مدد کرو کہ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں۔''

ذوالقرنین کا دیوار بنانے پر آمادگی کا اظہار

ذوالقرنین ان کی درخواست کو قبول کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ مجھے اس کام کی مزدوری کی ضرورت نہیں ہے البتہ افرادی قوت آپ کو مجھے فراہم کرنا ہو گی۔ یہ بھی انہیں کہا کہ میرے رب نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تمہارے پاس ہے اور ساتھ ہی انہیں تسلی بھی دی کہ ایسی مضبوط دیوار بنا دُوں گا کہ حملہ آور تمہیں نقصان نہ دے سکیں گے۔ [1]

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾

''مجھے لوہے کے تختے لا دو، یہاں تک کہ جب دونوں سروں کے بیچ کو برابر کر دیا تو کہا کہ دھونکو، یہاں تک کہ جب اسے آگ کر دیا تو کہا کہ تم میرے پاس تانبا لاؤ تاکہ اس پر ڈال دوں۔''

---

[1]۔ تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج سے مراد مغل اقوام ہیں جو انتہائی فسادی و فتنہ پرور تھے۔ قتل، غارت گری ان کا پیشہ تھا، ہمسایہ علاقوں پر حملہ کرتے، لوٹ مار کرتے اور واپس لوٹ جاتے۔ دیوار کے بارے احتمال ہے کہ یہ علاقہ شمالی جنوبی ایشیاء کا مراد ہے اور دیوار سے مراد دیوار چین کا یا سر باب الابواب ہے۔

دیوار بنانے کا سامان

دیوار بنانے کے لیے اس قوم سے جو ذوالقرنین نے طلب کیا تھا وہ یہ تھا کہ دیوار بنانے کے وسائل اکٹھے کرکے لے آئیں۔ ان وسائل میں سب سے اہم لوہے کے ٹکڑے تھے جن کا ذوالقرنین نے ان سے کہا کہ تم یہ لے آؤ، اتنے ٹکڑے لے آؤ کہ یہ درمیانی جگہ بھر جائے اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ لوہاروں کے پاس پھونک مارنے کا وسیلہ ہے جس سے وہ لوہے کو آگ میں ڈال کر اس آگ کو بھڑکاتے ہیں اور اس طرح لوہا پگھل جاتا ہے تو یہ لوگ اوپر والی جگہ پر بیٹھ جائیں اور پھر پگھلا ہوا لوہا اس دیوار میں جو سوراخ ہیں ان میں ڈالتے جائیں تاکہ یہ لوہا بڑی بڑی مضبوط میخوں کا کام دے اور اس طرح دیواریں فولادی بن جائیں کہ اسے کوئی توڑ نہ سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دیوار کو بڑے بڑے پتھروں پر بنایا گیا اور ان پتھروں کو پگھلے ہوئے لوہے سے جوڑا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں اور ٹوٹنے نہ پائیں۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾

''پھر وہ نہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔''

دیواروں کی مضبوطی

اس جگہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ دیوار ایسی مضبوط تیار کی گئی کہ یاجوج و ماجوج نہ تو اس دیوار کے اوپر چڑھ کر اسے عبور کر سکتے تھے اور نہ ہی اس دیوار میں سوراخ کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیوار لمبائی، اونچائی اور موٹائی میں ایسی تھی کہ دشمن کے لیے اسے عبور کرکے دوسری طرف موجود اقوام پر حملہ آور ہونا ممکن نہ تھا۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿٩٨﴾

''کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اسے ریزہ ریزہ کر دے گا، اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔''

اللہ کی رحمت کا تذکرہ

ذوالقرنین اپنے سارے کام کو اللہ کی رحمت قرار دیتے ہیں اور ان لوگوں کو یہ بات سمجھائی ہے کہ یہ تمہارے لیے اللہ کی نعمت ہے جو آپ پر اتری اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے منتخب کیا اور میں نے تمہارے اور اس شر پسند قوم کے درمیان ایک بڑا بند باندھ دیا ہے جس سے تم امن میں ہو گئے ہو اور یاجوج وماجوج کے شر سے محفوظ ہو لیکن جب اللہ کا وعدہ محقق ہو گا اور قیامت برپا ہو گی تو اس وقت پوری زمین ہموار ہو جائے گی، سب اونچ نیچ برابر ہو گی یا پھر اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت سے پہلے ویرانی ہو گی اور ہر شئی برابر ہو جائے گی اور پھر قیامت آجائے گی۔ اللہ کی بات برحق ہے اور اللہ کے بیانات برحق ہیں۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾

''اور ہم چھوڑ دیں گے بعض ان کے اس دن بعض میں گھسیں گے، اور صور میں پھونکا جائے گا پھر ہم ان سب کو جمع کریں گے۔''

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾

''اور ہم دوزخ کو اس دن کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔''

قرآن کی پیشن گوئی

اس وقت اللہ کا وعدہ پورا ہو گا یاجوج اور ماجوج کے مدمقابل جو بند باندھا ہے زمین

کے ساتھ برابر ہو جائے گا لوگ خوف کے مارے درہم برہم ہوں گے، سمندری امواج کی طرح ان کی حالت ہو گی، لوٹ پوٹ رہے ہوں گے، پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا، جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو لوگ قبروں سے باہر نکل آئیں گے اس وقت اللہ سب لوگوں کو محشور کرے گا اور ان کا حساب لینا شروع ہو گا اس وقت سارے لوگ اللہ کی بارگاہ میں اکٹھے ہوں گے۔ اور پھر اعلان ہوا کہ قیامت کے دن کافروں کو جہنم کا سامنا کرنا ہو گا۔

الَّذِیْنَ كَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِیْ وَ كَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

”جن کی آنکھوں پر ہماری یاد سے پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ سن بھی نہ سکتے تھے۔“

کافروں کی حالت کا بیان

دُنیا میں کافروں کی حالت یہ تھی کہ آنکھوں سے الٰہی آیات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود اس کو سمجھ نہ پاتے تھے گویا ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور جو حقائق ان کے لیے بیان ہوتے تھے انہیں سن نہیں پاتے تھے۔ آنکھیں رکھتے تھے لیکن حقائق کو دیکھتے نہ تھے، کان رکھتے تھے لیکن حقائق کو سنتے نہ تھے۔

اللہ کی آیات اور ان کی آنکھوں اور کانوں کے درمیان ایک پردہ اور حجاب لاحق تھا۔ ان سے حقائق دیکھنے اور سننے کی صلاحیت چھین لی گئی تھی اور یہ سب کچھ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہوا تھا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حکمتوں، مواعظ اور عبادتوں سے کچھ سبق نہ لیتے تھے۔ اسی لیے وہ لوگ حق تک پہنچانے والے راستے سے پھسل گئے اور گویا آنکھ اور کان دونوں ان کے

لیے ناکارہ تھے۔[1]

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝۱۰۲

”پھر کافر کیا خیال کرتے ہیں کہ میرے سوا میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں گے، بے شک ہم نے کافروں کے لیے دوزخ کو اُترنے کی جگہ بنایا ہے۔“

غیر اللہ کو سرپرست وولی بنانا

اس آیت میں سوال انکاری کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو کافر ہوئے انہوں نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا۔ اللہ کی آیات کو جھٹلایا، اللہ کو چھوڑ کر اللہ کے بندگان کو اپنا معبود و سرپرست بنالیا۔ جابر وظالم حکمرانوں کی اطاعت میں آگئے تو اب قیامت کے دن وہ ان کی مدد کو آئیں گے تو ایسا نہیں ہے وہ ان سے میرے عذاب کو دور نہیں کر سکتے۔ ہم نے جہنم کو کافروں کی منزل گاہ، اترنے کی جگہ قرار دیا ہے۔ یہ لوگ دُنیاوی زندگی کی ایک زینت میں ایسے غرق ہوئے اور ان ظاہری اسباب پر ایسا اطمینان کرلیا کہ وہ آخرت کو بھول بیٹھے۔ سب کچھ دُنیا کو سمجھ لیا لیکن جہنم ان کے لیے تیار ہے۔ آخرت میں آگ سے ان کی پذیرائی ہو گی۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۭ ۝۱۰۳

ترجمہ: کہہ دو کیا میں تمہیں بتاؤں جو اعمال کے لحاظ سے بالکل خسارے میں ہیں۔

---

[1] ۔ عیون الاخبار الرضا، جلد ا، ص ۱۳۶ میں امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ جس میں اس آیت کے باطن کو ولایت اہل البیتؑ کے منکرین پر تطبیق دیا گیا ہے جس کا یہ کلی مصداق جزئی پر ہو گا۔

اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُهُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَ هُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾

”وہ جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں کھو گئی اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔“

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمۡ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِیۡمُ لَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾

”یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس کے روبرو جانے کا انکار کیا ہے پھر ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے سو ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔“

ذٰلِکَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا کَفَرُوۡا وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَ رُسُلِیۡ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

”یہ سزا ان کی جہنم ہے اس لیے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق بنایا تھا۔“

مشرکین کے نام پیغام

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ ان مشرکین کو یہ بتا دو کہ وہ لوگ جن کے اعمال ضائع جائیں گے اور جو کچھ انہوں نے دُنیا میں یہ سوچ کر کیا ہو گا کہ وہ نیک اعمال کر رہے ہیں سب ضائع جائیں گے، ان کو کچھ نہیں ملے گا۔ ایسے افراد سب سے بڑا خسارہ اٹھانے والے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے نبوت کا انکار کیا، معاد کا انکار کیا، اللہ کی توحید ربوبیت کا انکار کیا، ان لوگوں نے جو بھی دُنیا میں اعمال کیے چاہے وہ اعمال ان کی نظروں میں اچھے اور

نیکی کے ہی کیوں نہ ہوں سب کے سب ضائع ہو جائیں گے۔ ان کی زندگی کا راستہ جو تھا وہ ایسا تھا کہ ان کے خیالات کے برعکس انہیں نتیجہ ملا کیونکہ انسان جب کاروبار کرتا ہے، تجارت کرتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے اس سب میں اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے فائدہ ملے اور وہ ہمیشہ نقصان سے بچنا چاہتا ہے لیکن اگر اس کے کام کا نتیجہ یہ نکل رہا ہو کہ اس کا اصل سرمایہ کم ہو رہا ہو یا اسے نظر میں رکھی گئی منفعت سے کم منفعت مل رہی ہو یا عدم تجربہ کی وجہ سے اسے خسارت و نقصان اٹھانا پڑ رہا ہو تو ایسے حالات میں اس کے لیے ایک اُمید کی کرن ہوتی ہے کہ وہ ان کمزوریوں کا تدراک کرے یا تجربہ کار افراد سے مشورہ کرکے خود کو خسارت سے نکال لے لیکن ایسا شخص جو خسارہ کو منفعت خیال کر رہا ہو تو ایسا خسارہ سب سے بڑا خسارہ ہے اور بہت زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ ایسے شخص کے خسارہ کے زائل ہونے کی کوئی اُمید موجود نہیں ہوتی۔ یہی حالت ان کی ہے جنہوں نے اپنے اور اپنے رب تعالیٰ کے درمیان، انکار و عناد، ھٹ دھرمی کا حجاب کھڑا کر دیا ہے۔ جاہلانہ تعصب، خود سری اور غرور کو اپنا سرمایہ قرار دے دیا ہے، نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا رہا اور شہوات میں غرق رہا اور ایسے اعمال کو اپنے لیے پسندیدہ اور نیک خیال کرتا رہا تو ایسے افراد ہر لحاظ سے خسارہ میں ہیں اور ان کا خسارہ ناپذیر ہے کیونکہ غلط راستہ پر چلے ہیں اسی غلط راستے کو اپنی نجات کا راستہ خیال کرتے ہیں ایسے افراد کے لیے نجات کی کوئی اُمید نہ ہے اور اس خسارہ کے زوال کی اُمید بالکل نہ ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آفاقی اور انفسی آیات کا انکار کیا ہے۔ اللہ کے انبیاء کے جو معجزات ہیں ان کا انکار کیا۔ پیغمبروں کا کفر کیا، معاد کا انکار کیا، اللہ کی ملاقات کے منکر ہوئے، جو نبوت، معاد کے منکر ہیں وہی بت پرست ہیں، ہر دو صفات ان کی ہیں ان کے سب اعمال ضائع ہیں ان کا کوئی اجر نہ ہے کیونکہ انہوں نے کوئی عمل اللہ کی رضا کے لیے انجام ہی نہیں دیا۔ آخرت میں ثواب کی طلب ان کے مد نظر تھی۔

جب اونٹ زہریلا کھانا کھالیتا ہے اور اس کا پیٹ پھول جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ خبط النافه، اونٹ حابط ہو گیا، ضائع ہو گیا، ختم ہو گیا۔ اسی طرح کافروں کے اعمال بھی حبط ہو گئے۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے قیامت کے دن میزان قرار نہ دیں گے جس میں اعمال کا جائزہ لیا جانا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ان کا بدلہ جہنم ہے، جہنم کی آگ ان کے لیے آمادہ ہے، کیونکہ دُنیا میں یہ اللہ کے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے، اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے، اب اس کا مزہ چکھیں گے اور جہنم کی آگ ہی اُن کی غذا ہو گی۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتۡ لَہُمۡ جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی مہمانی کے لیے فردوس کے باغات ہوں گے۔"[1]

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا لَا یَبۡغُوۡنَ عَنۡہَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

"ان میں ہمیشہ رہیں گے وہاں سے جگہ بدلنی نہ چاہیں گے۔"

مومنوں کی قیامت کے دن حالت

اس آیت میں قیامت کے دن کافروں کے مقابلے میں مومنوں کی حالت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ پر، اللہ کے رسولؐ پر، معاد پر، اللہ کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اس

---

[1] ۔ تفسیر مجمع البیان میں عبادہ نے رسول خداﷺ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق بہشت کے سو درجے ہیں، جن میں سے ہر درجے کا دوسرے درجے سے فاصلہ آسمان سے زمین جتنا ہے۔ بہشت کا بالاترین درجہ فردوس ہے۔

ایمان کا تقاضا پورا کرتے ہیں اور اعمال صالح بجالاتے ہیں، ان کے لیے اجر و ثواب ہے۔ قیامت کے دن جنت الفردوس ان کے استقبال کے لیے سجائی گئی ہے۔ جنت میں ان کی پذیرائی کے وسائل موجود ہیں۔ یہ لوگ جنت کی نعمات میں ہمیشہ رہیں گے، جہاں نعمتوں میں کوئی تبدیلی بھی نہ ہو گی بلکہ ہمیشہ موجود رہیں گی، اور کتنی ہی عمدہ جگہ ہے جسے ان کے لیے قرار دیا گیا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

کہہ دو اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اور اگرچہ اس کی مدد کے لیے ہم ایسا ہی اور سمندر لائیں۔

اللہ کے کلمات

قرآن مجید میں لفظ "کلمہ" زیادہ تر اللہ کے بیان و گفتار اور حکم میں استعمال ہوا ہے؛ لیک یہی لفظ قرآن مجید میں اللہ کی مخلوقات پر بھی بولا گیا ہے۔ جس طرح لفظ، کلمہ ہے اور بامقصد معنی رکھتا ہے اسی طرح کائنات کا ہر موجود بھی کلمہ ہے اور اس کا بھی ایک معنی ہے اور ہر کلمہ، اللہ کے وجود پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ اس کا خالق ہے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا گیا۔ آسمانی سیارے، کہکشائیں، سورج، چاند، زمین، سمندر، سحر و برساتی مخلوقات، چھوٹی بڑی نظر آنے والی، نظر نہ آنے والی، سب اللہ کا کلمہ ہیں، جو سب کلمہ "کن" سے ایجاد ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اللہ کا تکلم ہی وجود بھی ہے۔ سورہ نحل آیت ۴۰ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ”ہمارا قول تو کسی چیز کے بارے بھی ہے کہ جب ہم ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کن تو وہ شئی موجود ہو جاتی ہے“۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دین حق کو بھی کلمہ کہا ہے، چنانچہ سورہ انعام آیت ۱۱۵ میں ارشاد فرمایا:

ترجمہ: ”تیرے رب کا کلمہ (دین حق) سچائی اور عدالت پر مبنی پورا ہو چکا ہے“

اسی طرح فاسقون کی گمراہی کو بھی کلمہ سے تعبیر کرتے ہوئے سورہ ہود، آیت ۱۹۹ میں ارشاد ہوا:

ترجمہ: ”اور یہ رب کا کلمہ (فاسقون اور فاجروں کے بارے، طے شدہ فیصلہ و حکم بھی پورا ہے وہ اسی طرح ہے) جہنم کو ضرور بالضرور انسانوں اور جنات سے بھر دُوں گا (فاسقون کا ٹھکانہ جہنم ہے یہ الٰہی فیصلہ ہے)“۔اس جگہ کلمۃ، فیصلہ اور حکم کے معنی میں آیا ہے۔

انوار عالم کلمتہ اللہ ہیں

اس لحاظ سے کہ سارے موجودات عالَم کلمتہ اللہ ہیں، اللہ تعالیٰ ہر لمحہ خلقت اور ایجاد کی حالت میں ہے، ہر آن اس کی نئی شان ہے، ہر آن نئی خلقت موجود ہے۔ چنانچہ سورہ الرحمٰن آیت ۲۹ میں ارشاد ہوا:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ”ہر دن وہ نئی شان میں ہے۔“

اسی طرح سورۂ ذاریات آیت ۴۷ میں ارشاد ہوا:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: ”اور آسمان کو ہم نے بنایا ہے (تعمیر کیا ہے) اپنی قدرت کے توانا ہاتھ سے اور بتحقیق ہم اسے وسعت دے رہے ہیں“ یعنی خلقت کا عمل مسلسل جاری ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ اگر سارا سمندر سیاہی بن جائے، اور اس جیسے اور سمندر بھی ہوں جو سب سیاہی بن جائیں اور حق کو لکھنے والے ہوں اور اللہ کے کلمات (موجودات) کے بارے لکھنا شروع کر دیں، تو سمندروں کے پانی ختم ہو جائیں گے لیکن اللہ کے موجودات کی تفصیل مکمل نہ ہو گی۔ اللہ کے موجودات کا شمار اور حصار نہ ہو سکے گا؛ چنانچہ سورہ نحل آیت: ۹۶ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ تو ختم ہو جائے گا، اللہ کے پاس جو ہے وہ باقی ہے۔''

اسی طرح سورہ لقمان آیت ۲۷ میں ہے:

ترجمہ: ''اور سمندر اس کے ساتھ سات گنا اور بڑھ جائے''۔

اللہ کے کلمات کو تحریر میں نہیں لایا جا سکتا، کوئی محدود کسی لامحدود کا شمار کیسے کر سکتا ہے؟! بلکہ ہر لکھنے والی بات بھی تو ایک نیا موجود ہی ہو گا پس ایسا ممکن ہی نہیں کہ اللہ کی موجودات (کلمات اللہ) کا شمار کیا جا سکے۔ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت واسعہ اور اللہ کے ملک لا متناہی کا بیان ہے۔[1]

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝١١٠ۧ

---

[1] ۔ تفسیر قمی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے، اللہ کے کلمات کا نہ آغاز ہے نہ اختتام، اس کے کلمات ابد تک اختتام پذیر نہ ہیں، وہ جاری و ساری اور باقی ہے۔

ترجمہ: کہہ دو کہ میں بھی تمہارے جیسا آدمی ہی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، پھر جو کوئی اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے تو اسے چاہیے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

اللہ کا رسول بشر ہے

اس آیت میں واضح بتایا گیا کہ اللہ کا رسول بشر ہے۔ جس طرح باقی انسان ہیں وہ بھی انسانوں سے ایک انسان ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کے پاس اللہ کی وحی آتی ہے، اللہ نے اسے اپنا رسول بنایا ہے اور اپنے پیغامات کا امین بنایا ہے، اپنے اور اپنے بندگان کے درمیان اسے اپنا سفیر قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی دعوت دے۔

اسی کے ساتھ ہی رسول اللہؐ نے اللہ کا پیغام بھی پہنچا دیا کہ یاد رکھو اللہ ایک ہے، یکتا ہے، وہی تمہارا رب ہے اور جو اپنے رب سے ملاقات چاہتا ہے تو رب کی رضا اور لقاء کا واحد راستہ عمل صالح ہے اور یہ کہ اپنے رب کا کسی کو شریک نہ قرار دو۔ سارے انسان اللہ کی طرف رجوع کریں۔ اللہ کی وحدانیت، ربوبیت پر ایمان، آخرت پر اعتقاد، رسولوں پر ایمان اور عمل صالح، وحدانیت کا عقیدہ شرک کے ساتھ میل نہیں کھاتا، اللہ کا نام بلند ہے وہ اپنی صفات وذات میں ایک ہے۔ ان صفات سے الوھیت اور اللہ کا معبود ہونا ہے اس میں بھی شراکت نہ ہے۔[1]

---

[1] ۔ الدر المنشور جلد ۴ میں طبرانی ابن مردویہ نے ابی حکیم کے قول سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن سے اگر سورہ کہف کی آخری آیت کے سوا کچھ نازل نہ ہوا ہوتا تو یہی آیت میری اُمت کے لیے کافی تھی۔
اس آیت کے بارے بیان ہوا ہے کہ جو شخص سونے سے پہلے اس آیت کو پڑھ لے تو جو ارادہ کرے گا اس کے مطابق بیدار ہو جائے گا؛ مثلاً نماز تہجد، صبح کی نماز، سحر خیزی کے لیے مطلوبہ وقت میں بیدار ہو جائے گا۔

سورۂ مریم

(مکی، آیات 98)

اس سورت کے مطالب

مخلصین کے لیے بشارت، گمراہوں کے لیے انذار، انسانوں کے تین گروہ: ۱۔ منتخب اور ہدایت یافتہ جن پر اللہ کا انعام ہے۔ ۲۔ گمراہ جو ہدایت اور رشد کا سرمایہ ہاتھ سے دے بیٹھے۔ ۳۔ توبہ کرنے والے، ایمان لانے کے بعد عمل صالح بجالانے والے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا تذکرہ۔ سیدہ مریمؑ کی عصمت وطہارت، اللہ کی قدرت کا بیان۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کٓہٰیٰعٓصٓ ۚ﴿۱﴾

”ک ھ ی ع ص ۔“

متعدد بار اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ کسی بھی سورہ کے شروع میں موجود حروف مقطعات کا، اُس سورہ میں بیان شدہ مطالب سے ربط اور تعلق ہے۔ جن سورتوں کا آغاز

حروف مقطعات سے ہوتا ہے ان کی آپس میں شباہت موجود ہے اور ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ حروف مقطعات اللہ کے اسماء الحسنٰی پر دلالت کرتے ہیں، جیسے کاف سے کافی، کریم، ھا سے ھادی، یا سے یاور، صاد سے صادق پر دلالت کرتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ مشرکین کو خاموش کرانے کے لیے حروف مقطعات کا ذکر ہوا کہ قرآن کے کلمات حروف تہجی سے ہی عبارت ہیں۔ اگر یہ کلام اللہ سے نہیں تو پھر تم لوگ ان حروف سے ایسا کلام تیار کرکے لے آؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ حروف مقطعات کے ذریعہ بعض واقعات و حالات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کوڈ ورڈ کے طور پر ہیں جن سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اوصیاء علیہم السلام آگاہ ہیں۔[1]

حروف مقطعات سے بامعنی جملہ

پورے قرآن میں ۱۴ حروف مقطعات ہیں، ان سب حروف مقطعات سے مکرر حروف الگ کرلیں تو ایک بامعنی بنتا ہے کہ ''صراط علی حق نمسکه'' علی کا راستہ برحق ہے، ہم اس راستہ سے تمسک کرتے ہیں۔''

بہر حال حروف مقطعات اللہ کے اسرار و رموز ہیں، ان کے بارے عالمان قرآن ہی جانتے ہیں کہ اللہ نے ان سے کیا مراد لیا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ﴿٢﴾

یہ تیرے رب کی مہربانی کا ذکر ہے جو اس کے بندے زکریا پر ہوئی۔

[1]۔ کھیعص کے اللہ کے نام پر دلالت کرنے کے متعلق کتاب معانی الاخبار میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت بھی نقل ہوئی ہے جسے سفیان ثوری نے نقل کیا ہے۔

اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا ﴿۳﴾

جب اس نے اپنے رب کو خفیہ آواز سے پکارا۔

زکریاؑ کی دُعا کا قبول ہونا

یہ ایک خبر ہے کہ جو اللہ کی رحمت حضرت زکریاؑ کے لیے حاصل ہوئی اس رحمت سے حضرت زکریاؑ کی دُعا کے قبول ہونے کی بات ہے جس وقت حضرت زکریاؑ لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر اپنے رب کو زور زور سے پکارتے ہیں ایسی جگہ پر بیٹھ کر دُعا مانگی جس جگہ پر کوئی اور نہ تھا اور کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ فلاں جگہ پر حضرت زکریاؑ موجود ہیں کوئی اور شخص آپ کی آواز نہ سن رہا تھا۔

بعض مفسرین[1] نے یہ کہا ہے اس کی وجہ کہ حضرت زکریاؑ نے اپنے رب کو زور زور سے پکارا۔ بلند آواز سے دعا کی کہ یہ ادب کی وجہ سے کہ بندہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے بلند مقام کے سامنے بہت دُور خیال کرتا ہے اس لیے بلند آواز سے پکارتا ہے اور جو بھی اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے وہ اسی طرح ہی انداز اپناتا اور زور زور سے اللہ کو پکارتا ہے اور اپنی عرض داشت پیش کرتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَہَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ اشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَیۡبًا وَّ لَمۡ اَکُنۡۢ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ﴿۴﴾

''کہا اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور سر میں بڑھاپا چمکنے لگا ہے اور میرے رب! تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں ہوا''۔

---

[1]۔ مجمع البیان جلد ٦۔

حضرت زکریاؑ کی دعا

اس آیت میں حضرت زکریاؑ کی دُعا کا ذکر ہوا ہے۔ دعا جس مقصد کے لیے کرنا چاہتے ہیں اس سے پہلے حضرت زکریاؑ نے مقدمہ باندھا کہ اے میرے رب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اپنے بڑھاپے کو بیان کرنے کا انداز ایسا اپنایا کہ جس سے عاجزی کا اظہار ہے، جس طرح ایک غلام اپنے مالک سے بات کرتا ہے کہ میری ہڈیاں بوسیدہ ہیں، سر کے بال سفید ہو گئے،.بڑھاپا ہے، کمزوری ہے، سر کے بالوں کو آگ کے پھیلتے شعلوں سے شباہت دی ہے جس طرح آگ کے شعلے پھیل جاتے ہیں اور بلندی پر سفیدی سرخی ملی ہوتی معلوم ہوتی ہے سر کے بالوں کی سفیدی کو اس سے تشبیہ دی ہے اور یہ عرب زبان کا بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ اشارہ ہے۔ پھر یہ بھی عرض کیا کہ میں تو ہمیشہ تیری دعا سے فیضیاب ہوتا رہا ہوں یعنی جب کچھ مانگا تو مجھے مل گیا، جب میں نے پکارا تو نے میرے پکار کو سن لیا اور میری حاجت کو پورا کیا۔

وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ﴿۵﴾

”اور بے شک میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے پس تو اپنے ہاں سے ایک وارث عطا کر“۔

اللہ سے وارث کی درخواست

اس آیت میں موالی سے مراد چچا اور چچازاد بھائی ہیں۔ بعض نے اس سے مراد کلالہ یا عصبہ مراد لیے ہیں اور بعض عمومی ورثہ مراد لیتے ہیں۔ بہر حال اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ میرے لیے بلافصل میری اولاد سے کوئی وارث موجود نہیں ہے اس جگہ حضرت زکریاؑ اپنے رب سے درخواست گذار ہیں کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، موت کے آثار نمایاں ہیں، میری

اولاد نہیں جو میرے مرنے کے بعد میری وارث بنے۔ مجھے خوف ہے کہ میں اس دُنیا سے بغیر وارث چھوڑے چلا جاؤں جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بوڑھا ہوں۔ عادی اور ظاہری اسباب تو اولاد کے لیے موجود نہیں ہیں۔ طبیعی اسباب تو موجود نہیں لیکن میری اُمید تیری رحمت سے ہے مجھے اپنی جانب سے فرزند عطا کردے جو میرے بعد میرا جانشین بنے۔

يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝

''جو میرا اور یعقوب کے خاندان کا بھی وارث ہو، اور میرے رب اسے پسندیدہ بنا''۔

حضرت زکریاؑ کی خواہش

اس آیت میں حضرت زکریاؑ کی جو دلی خواہش تھی اسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

پہلی بات حضرت زکریاؑ چاہتے ہیں کہ وہ فرزند ان کا ولی بنے یعنی جتنے ان کے امور ہیں ان کی نگرانی کرنے والا ہو۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ آل یعقوب کے اوپر کا بھی نگراں بنے، کسی شخص کی آل اسے کہا جاتا ہے جو اس شخص کی اولاد قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ اسی طرح آل کا لفظ اس شخص کے خاصان پر بھی بولا جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ یہ چاہ رہے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد ان کے جتنے کام ہیں جن میں اہم کام تبلیغ دین ہے وہ اس میں حضرت زکریاؑ کا وارث بنے،

چوتھی بات، فقط اپنی بات نہیں کی بلکہ آل یعقوب کی بات کی ہے۔ حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحٰقؑ کے فرزند ہیں اور حضرت اسحٰق حضرت ابراہیمؑ کے فرزند ہیں۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝

''اے زکریا بے شک ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحیٰی ہوگا، اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی پیدا نہیں کیا''۔

زکریاؑ کی دُعاء کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی دعا کو قبول کرلیا اور اس کی خبر حضرت زکریاؑ کو دی گئی کہ ہم نے تیری دعاء قبول کی ہے تجھے ایک فرزند دے رہے ہیں ہم نے اس کا نام یحیٰؑ رکھا ہے اور یہ ایسا نام ہے کہ اس نام کو اس سے پہلے کسی کے لیے قرار نہیں دیا گیا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ بشارت حضرت زکریاؑ کو وحی کے ذریعہ دی گئی اور فرشتوں کے وسیلہ سے یہ بشارت حضرت زکریاؑ کے پاس آئی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت یحیٰؑ علیہ السلام کے لیے جو اوصاف بیان کیے ہیں اس سے پہلے ایسے اوصاف کسی پیغمبر کے لیے ذکر نہیں کیے ہیں جیسے:

۱۔ بچپن میں حکم جاری کرنے کی صلاحیت: سورہ مریم آیت ۱۲ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اور ہم نے اسے بچپن میں حکم (قانون کا بیان) دے دیا''۔

۲۔ سیادت اور شادی نہ کرنا: سورہ آل عمران آیت ۳۹ میں ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اور ہم نے اسے سید و سردار اور ایسا قرار دیا کہ جس نے شادی نہ کی''۔

۳۔ اللہ کا اس پر ولادت کے وقت، وفات کے وقت اور قبر سے نکلنے کے وقت سلام بھیجنا: سورۂ مریم، آیت ۱۵ میں ارشاد ہے:

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

[1] ۔اسی طرح کا بیان سورہ مریم آیت ۶۵ میں آیا ہے: '' هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا '' ''کیا ہم اس کے لیے ایسا نام جانتے ہیں'' یعنی اس کے نام کا پہلے کوئی سا نام ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ وہ بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خصوصیات میں شریک تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت گفتگو کی تھی ایسا پیغمبر نہیں گذرا کہ جس کے بارے میں ایسے اوصاف ہوں، پہلی مرتبہ یہ اوصاف حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے بیان ہوئے اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿٨﴾

"کہا اے میرے رب میرے لیے لڑکا کہاں سے ہوگا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے میں انتہائی درجہ کو پہنچ گیا ہوں"۔

بیٹے کی بشارت پر زکریاؑ کی حیرت

زکریاؑ کی دعا کو اللہ نے قبول کرلیا اور زکریاؑ کو اطلاع دے دی کہ تیرے لیے بیٹا ہوگا جس کا نام ہم نے یحییٰ رکھ دیا ہے۔ زکریاؑ یہ سن کر حیرت زدہ ہوئے اور شرعی تقاضا کے تحت سوال کر ڈالا کہ اے رب میں تو ایسا بوڑھا ہوں جس میں شہوت ہی موجود نہیں، بیوی بوڑھی و بانجھ ہے تو پھر کس طرح میرے لیے بیٹا ہوگا؟ کیونکہ طبیعی اسباب اولاد کے لیے جو اللہ نے بنائے ہیں وہ مرد اور عورت کے ملاپ سے ہونا ہے اور عوت میں بچہ جننے کی صلاحیت موجود ہو وہ بانجھ نہ ہو۔ اس میں اللہ کی قدرت کا انکار نہیں تھا فقط اس کی تفصیل جاننا مقصود تھا کہ بغیر ملاپ ہو جائے گا کیونکہ پیغمبر معصوم ہوتا ہے وہ اللہ کی قدرت میں شک نہیں کرتا اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے اور نہ ہی اللہ کے وعدے کے بارے اسے شک ہوتا ہے۔ اللہ نے اس سوال کا جواب حضرت زکریاؑ کو اس طرح دیا:

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ

لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿۹﴾

''کہا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے وہ مجھ پر آسان ہے اور میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا حالانکہ تو کوئی چیز نہ تھا''۔

اللہ کا اپنی قدرت کا اظہار

کذلك کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ پہلے خبر دی گئی ہے اسی طرح ہی ہونا ہے اور جو تمہیں بشارت دی گئی ہے اس میں کچھ بھی شک نہ کرو۔ اس کے بعد وحی والے فرشتے نے اس کی وجہ کو اس طرح بیان کر دیا کہ تیرے رب نے اسے زکریا تیری حیرانگی کو جان لیا ہے وہ فرما رہا ہے کہ اے زکریا یہ کام تو میرے لیے آسان ہے تم یاد کرو کہ تم کچھ بھی نہ تھے میں نے تمہیں لاشئی سے خلق کیا اب جبکہ تم بھی موجود ہو اور تمہاری بیوی بھی موجود ہے جیسا میرا ارادہ تعلق پکڑے گا تو پھر ایسا ہی ہو جائے گا۔ جن طبیعی اسباب کا تم ذکر کر رہے ہو کہ تم خود اور تمہاری بیوی ان اسباب کے فاسد ہیں تو یہ تو میرے ارادے کے تابع ہے جیسے ہی میرا ارادہ تعلق پکڑے گا تو یہ اسی وقت ہو جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے لیے جس طرح لاشئی سے خلقت کرنا ہے تو ایک بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت سے بیٹا دینا تو بہت ہی آسان ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے اس میں تعجب اور حیرانگی کی ضرورت نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾

ترجمہ: کہا اے میرے رب میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر، کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات تک مسلسل لوگوں سے بات نہیں کر سکے گا۔

حضرت زکریاؑ کے لیے نشانی

حضرت زکریاؑ نے اپنے اطمینان کے لیے اللہ سے درخواست کر دی کہ میرے لیے کوئی ایسی نشانی قرار دے دے تاکہ جس کے وسیلہ سے میں آسانی سے حق کو باطل سے تشخیص دے سکوں تاکہ اسے یہ معلوم ہو جائے اور اطمینان ہو کہ جو خطاب اسے پہنچا ہے اور جو کچھ اس نے سنا ہے یہ رحمانی بیان تھا، شیطانی خیال نہیں تھا۔ تو اللہ نے حضرت زکریاؑ کی اس دُعا کو بھی قبول کرلیا اور فرمایا کہ جو تمہیں بشارت دی گئی اس کے رحمانی ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تم تین رات کسی فرد بشر سے بات نہ کرنا، چپ و خاموشی کا روزہ رکھنا ہے فقط ذکر خدا کرنا ہے، کسی آدمی سے بات نہیں کرنا، لوگوں سے کچھ کہنا ہو تو اشاروں سے کام چلائیں۔[1]

فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِهٖ مِنَ الۡمِحۡرَابِ فَاَوۡحٰۤی اِلَیۡهِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡا بُکۡرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۱۱﴾

"پھر حجرہ سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے اور انہیں اشارہ سے کہا کہ تم صبح و شام خدا کی تسبیح کیا کرو"۔

محراب: حرب سے ہے، عبادت میں جب انسان مصروف ہوتا ہے تو حقیقت میں وہ شیطان اور غیر الٰہی طاقتوں سے جنگ کر رہا ہوتا ہے تو گویا عبادت کی جگہ جنگ کا میدان ہوتا ہے۔ محراب کا معنی "مجلس اشراف" نگرانی کرنے کی نشست اور "**ایحاء**" کا معنی مخفیانہ انداز سے تیزی سے کسی بات کا القاء کرنا۔

اللہ کی طرف سے جو حکم آیا اس کے تحت وہ عبادت کی مخصوص جگہ سے باہر نکلے اور

---

[1] - ﴿قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا ؕ﴾ سورہ آل عمران آیت ۴۱۔

لوگوں کے درمیان آئے، ان سے بات نہیں کی انہیں اشارہ سے سمجھایا کہ صبح وشام اللہ کی یاد کریں۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ؀

''اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اسے بچپن ہی میں حکمت عطا کی''۔

یحییٰ ؑ کے لیے الٰہی فرمان

'' خُذِ الْكِتٰبَ '' اس آیت سے ایک بات تو یہ بیان ہوئی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو کتاب دی گئی۔ دوسری بات کہ بچپن ہی میں اللہ نے یحییٰ علیہ السلام کو صاحب کتاب بنا دیا تھا۔ تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمان جاری کرنے کے لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے کہاکہ وہ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام لیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں جو مطالب ہیں ان کو عملی جامہ پہناؤ اور ان پر عمل کرو۔ اس آیت میں جو حکم ہے اس سے مراد سمجھ، عقل، دانائی اور حکمت ہے۔ اللہ نے حضرت زکریاؑ پر جو انعام کیا اس کا تذکرہ ہے کہ ہم نے حضرت زکریاؑ کو یحییٰ دیا اور پھر یحییٰ پر یہ انعام کیا کہ اسے کتاب دی اور حکمت و دانائی سے نوازا اور یحییٰ کو بتایا کہ یہ کتاب بڑی امانت ہے جو تیرے سپرد کی ہے۔ علم و عمل دونوں کو مضبوطی سے تھام لو۔ احتمال ہے کہ اس کتاب سے مراد تورات ہے جس میں معارف اور قوانین موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ کے بارے جو کچھ بیان کیا اس میں یہ بات بھی ہے کہ حقائق کے کشف کا علم بھی انہیں دیا گیا اور ایسے غیبی امور سے بھی آگاہ تھے جن کا عام لوگوں کو علم نہ تھا۔

وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ؀

''اور اسے اپنے ہاں سے رحم دلی اور پاکیزگی عنایت کی، اور وہ پرہیزگار تھا''۔

یحییٰؑ کے لیے اللہ کے عطیات

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو جو کچھ اللہ نے عطا کیا ان میں یہ بھی الٰہی عطیہ تھا کہ وہ پاکیزہ اور معصوم تھے۔ صاحب محبت تھے، شفیق و مہربان انہیں بنایا، صالح و نیک تھے۔ اللہ کے اوامر و نواہی کے پابند تھے۔ حرام سے بچنے والے، واجبات کو انجام دینے والے، نیک و پارسا، اللہ کی اطاعت میں رہنے والے تھے۔ یہ اللہ کا خاص لطف و کرم حضرت یحییٰ علیہ السلام پر تھا اور اللہ کی خاص عنایت سے انہوں نے نشو و نما پائی۔ روحانی اور معنوی طور پر ارتقاء و کمال کو پہنچے۔ اسی بات کو اللہ نے ان کی صفت "تقی" سے بیان کیا ہے۔

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيۡهِ وَ لَمۡ يَكُنۡ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾

"اور اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا تھا اور سرکش نافرمان نہ تھا"۔

یحییٰؑ کا والدین اور لوگوں سے رویہ

"بَرًّا" احسان اور نیکی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ "جَبَّارًا"[1] اسے کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھے اور اپنے ارادے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے پر دوسروں کو مجبور کرے۔ "عَصِی" گناہگار اور حد سے تجاوز کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دو خصوصیات اور بیان کی ہیں:۔

۱۔ والدین پر مہربان تھے، ان کا احترام کرتے تھے، ان پر احسان و نیکی کرتے تھے۔

۲۔ عام لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ تھا کسی پر جبر و زیادتی نہ کرتے تھے، رؤف

---

[1]۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو اس کا معنی جبران کرنے والا اور جوڑنے والا ہوتا ہے۔ (مصحح)

ورحیم تھے، خیر خواہ اور متواضع تھے، کمزوروں کی مدد کرتے تھے، لوگوں کے خیر خواہ تھے، لوگوں پر سختی کے روانہ تھے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

''اور اس پر سلام ہو جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن مرے گا اور جس دن وہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا''۔

اللہ کی طرف سے سلام

اس آیت میں تین حالتوں کا تذکرہ ہے، ہر حالت جو ہے ایک نئے عالم کا آغاز ہے۔

۱۔ پہلا عالم، عالَم دنیا ہے، اس کا آغاز ولادت سے ہے۔

۲۔ دوسرا عالَم، عالَم برزخ ہے، جو موت کے آنے سے شروع ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا عالَم، عالَم قبر سے اٹھنے کا ہے جو کہ عالَم آخرت کا آغاز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں مراحل کے آغاز پر یحییٰ علیہ السلام کے لیے سلامتی وامنیت کا عطیہ ہے کہ ہر ایک عالَم میں داخل ہوتے وقت ان کے لیے کسی قسم کی تھکاوٹ اور اکتاہٹ نہ ہوگی۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ ''حیا'' ہے اس سے اشارہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اس دُنیا سے شہید جائیں گے اور شہید زندہ ہوگا۔ ''بل احیاء عند ربھم یرزقون''۔ شہدا کے بارے ہے بلکہ وہ تو زندہ ہوتے ہیں اور اللہ کے ہاں سے روزی دی جارہی ہوتی ہے۔[1]

لفظ وُلِدَ اور لفظ یُبْعَثَ کو مجہول کے صیغہ سے بیان کیا گیا ہے پہلے کو ماضی کے صیغہ ہے اور بعد میں **یموت** اور **یبعث** مضارع کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیاوی زندگی میں

---

[1]۔ رُوح المعانی، جلد ۱۴، سورہ آل عمران، آیت ۱۶۹۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے امن و سلامتی ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی بات ہو۔ جب کہ موت کے وقت سلامتی ہے اور مبعوث ہوتے وقت بھی سلامتی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿١٦﴾

''اور اس کتاب میں مریم کا ذکر کر جب کہ وہ اپنے لوگوں سے علیحدہ ہو کر مشرقی مقام میں جا بیٹھی''۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۪ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾

''پھر لوگوں کے سامنے سے پردہ ڈال لیا، پھر ہم نے اس کے پاس اپنے فرشتے کو بھیجا پھر وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا''۔

حضرت مریمؑ کے پاس رُوح کا آنا

حضرت مریم ''سلام اللہ علیہا'' اللہ کی عبادت میں مصروف تھیں، بی بی مریمؑ نے خود کو دوسروں سے الگ تھلگ قرار دینے کے لیے اور یہ کہ کوئی غیر آپ کو نہ دیکھ سکے تو انہوں نے اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک پردہ لٹکا دیا تھا تاکہ آپ دلجمعی سے اعتکاف و عبادت میں مصروف رہیں اور کوئی ان کے مزاحم نہ ہو۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے رُوح کو ان کے پاس بھیج دیا جو انسان کی صورت میں بی بی مریمؑ کے پاس آیا یعنی حضرت مریمؑ کی نظروں میں وہ روح پورا مکمل انسان نظر آیا جبکہ وہ انسان نہیں تھا بلکہ روح ہی تھا۔ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ قرآن کی زبان میں انہیں رُوح القدس کہا گیا ہے اور رُوح الامین بھی جبرئیل علیہ السلام کو کہا

گیا ہے۔[1]

قَالَتْ إِنِّیْٓ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِیًّا ﴿۱۸﴾

''کہا بے شک میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو پرہیزگار ہے''۔

رُوح کو دیکھ کر بی بی مریمؑ کا ردعمل

بی بی مریمؑ نے اس آدمی کو جب دیکھا تو گھبرا گئیں اور خوف کے عالم میں اس اجنبی سے مخاطب ہوئیں، خود کو اللہ رحمٰن کے سپرد کر دیا تاکہ اللہ کی رحمت اس مرحلہ میں اس کی مدد کو پہنچے اور سب محتاجوں، پریشان حالوں اور عبادت گزاروں کا انتہائی ہدف اللہ ہی ہے، اللہ سے پناہ مانگتی ہیں۔ اس آدمی سے کہتی ہیں کہ اگر تم صاحب تقویٰ ہو، نیک ہو، خداپرست ہو تو میں تیری بری نیت کے حوالے سے اللہ سے مدد مانگتی ہوں، اللہ ہی میری پناہ ہے کہ تیرے اندر تقوی ہی ایک ایسی حالت ہے جو مجھے تیری بدنیتی سے بچالے گی، کیونکہ تقویٰ اچھی اور خوبصورت صفت ہے۔ کوئی بھی انسان خود سے اس کیفیت کی نفی نہیں کرتا، کوئی بھی ایسا نہیں جو یہ کہے کہ میں متقی نہیں ہوں؛ بلکہ ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کے لیے ایسی اچھی صفت موجود ہو۔

بعض مفسرین نے لفظ (اِنْ) کو نافیہ قرار دیا ہے اور اس کا معنی اس طرح کیا ہے کہ تمہیں اللہ کا خوف نہیں کہ تم بغیر اجازت لیے میرے حریم میں داخل ہو گئے ہو میں اللہ سے تیری بری نیت کے بارے پناہ مانگتی ہوں۔

قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ﴿۱۹﴾

''کہا میں تو بس تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ تجھے پاکیزہ لڑکا دُوں''۔

---

[1] ۔ سورہ نحل، آیت ۱۰۲، سورہ الشعراء، آیت ۱۹۴۔

جبرئیلؑ کی حضرت مریمؑ سے گفتگو

جناب جبرئیل علیہ السلام نے جب بی بی مریم سلام اللہ علیہا کی گھبراہٹ دیکھی اور ان کی بات سنی تو فوراً جبرئیل علیہ السلام نے ان سے یہ کہا کہ میں تیرے رب کی جانب سے نمائندہ بن کر آیا ہوں اور آپ کو ایک پاکیزہ بیٹے کی خبر دینے آیا ہوں، ایسا بیٹا ہوگا جو ہر آلائش سے پاک ہوگا، رشید ہوگا، سمجھدار ہوگا۔ اس سورہ کے بیانات میں جو عمدگی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ لفظ "وھب" استعمال کیا گیا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسحٰق دیا، جب زکریاؑ کو یحییٰ دیا تو اس میں بھی "وھب" استعمال کیا۔ اللہ کی جانب سے ہبہ، عطیہ کو کہا جاتا ہے۔ یعقوبؑ اسحٰقؑ کو دیا، موسیٰؑ کو ہارونؑ بطور وزیر و مشیر دیا[1] تو اس میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا۔ سب پر اللہ کا سلام ہو۔ اس جگہ بھی بی بی مریم سلام اللہ علیہا کو عیسیٰ علیہ السلام عطا کیا تو اسے بھی اللہ کا ہبہ قرار دیا۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾

"کہا میرے لیے لڑکا کہاں سے ہوگا حالانکہ مجھے کسی آدمی نے ہاتھ نہیں لگایا اور نہ میں بدکار ہوں"۔

حضرت مریمؑ کا جبرائیلؑ سے مکالمہ

جب جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا سے یہ کہا کہ میں تو اللہ کی طرف سے پیغام لایا ہوں کہ میں اللہ کی جانب سے تیرے لیے ایک پاکیزہ، سمجھدار بیٹا ہبہ کرنے آیا ہوں تو اس پر فوراً بی بی مریم سلام اللہ علیہا نے کہا کہ میرا تو کسی سے نکاح نہیں ہوا

---

[1]۔ جناب ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی اور ان کے مشیر اور وزیر تھے۔ وہ حضرت موسیٰ کے امور میں ان کی مدد کرتے تھے۔ (مترجم)

اور میں بدکارہ عورت بھی نہیں ہوں جب کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں تو پھر میرے لیے بیٹا کیسے ہو گا؟ مریمؑ نے تعجب اور حیرت سے سوال کیا۔ کیونکہ کسی عورت سے بچے کا ہونا بغیر مرد کے عورت کے ساتھ مخصوص خلوت کرنے کے نہیں ہو سکتا۔

بی بی مریم سلام اللہ علیہا نے اپنے سے اس کی نفی کی اور آپ اس بات میں سچی ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کی جانب سے جو بیٹے عطا کرنے کی بشارت دی تھی اس پر آپ کا تعجب بجا تھا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

"کہا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے، اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں، اور یہ بات طے ہو چکی ہے"۔

مریمؑ کی حیرت پر جبرئیلؑ کا جواب

حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی حیرانگی بجا تھی لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بی بی مریم سلام اللہ علیہا کو اللہ کی قدرت کا حوالہ دیا اور یہ مریم سے کہا کہ جو میں نے آپ کے پاس اللہ کا پیغام پہنچایا کہ اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں ایک لڑکا جو پاکیزہ ہے وہ آپ کو عطا کر دُوں۔ اس نے ایسا ہی ہونا ہے یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اے مریمؑ تیرے رب کے لیے یہ بہت ہی آسان ہے اس میں کچھ مشکل نہیں ہے کہ اللہ کی

طرف سے ”کُنۡ فَیَکُوۡنُ“ ہوتا ہے۔[1] اللہ کے ارادہ ہی سے شئی موجود ہو جاتی ہے جب اللہ کا ارادہ ہو گیا تو تیرے لیے بیٹا موجود ہو گیا۔[2] اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی اس طرح خلقت سے جو غرض ہے اسے بیان کیا ہے۔

ا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طبیعی اسباب سے جدا بغیر باپ کے خلقت اللہ کی طرف سے ایک نشانی اور علامت ہے۔ انسانوں کے لیے کہ اللہ جس طرح بغیر باپ اور ماں کے حضرت آدمؑ اور حضرت حواء کی خلقت کی اسی طرح ایک بیٹا اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے خلق کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ کیفیت انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے یہ اللہ کی طرف سے اپنے بندگان کے لیے رحمت ہے کہ اس کے ذریعہ اس پاکیزہ موجود کے ذریعہ معجزات صادر ہوں گے جو انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے گا۔

یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو حتمی ہے نیز ولادت طبیعی اسباب کے حصول کے بغیر ہو گی اس کو کوئی نہیں روک سکتا، اس میں نہ تو مریم بی بی کا اختیار ہے اور نہ ہی کوئی اور رکاوٹ بن سکتا ہے یہ فقط اللہ کا اپنا فیصلہ ہے۔

فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

”پھر اس (بچہ کے ساتھ) حاملہ ہوئی پھر اسے لے کر کسی دور جگہ میں چلی گئی“۔

فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ﴿۲۳﴾

---

[1] ۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۳ میں امام صادق علیہ السلام سے منقول روایت کے مطابق جبرئیل نے حضرت مریمؑ کے گریبان میں پھونکا جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہوئیں۔ ان کے حمل کی مدت ایک گھنٹا، بعض روایات کے مطابق نو گھنٹے اور بعض کچھ روایات کے مطابق چھ ماہ تھی۔

[2] ۔ سورہ یسین آیت ۸۲: ”اللہ کی قدرت لامحدود ہے“۔

''پھر اسے دردِ زہ ایک کھجور کی جڑ میں لے آیا، کہا اے افسوس میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی اور میں بھولی بھلائی ہوتی''۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

''پھر اسے اس کے نیچے سے پکارا کہ غم نہ کر تیرے رب نے تیرے نیچے سے ایک چشمہ پیدا کر دیا''۔

وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

''اور تو کھجور کے تنہ کو پکڑ کر اپنی طرف ہلا تجھ پر پکی تازہ کھجوریں گریں گی''۔

فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

'' پس کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی کر، پھر اگر تو کوئی آدمی دیکھے تو کہہ دے کہ میں نے رحمان کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے سو آج میں کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔''

عیسیٰؑ کی ولادت کے وقت مریمؑ کی پریشانی

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب اللہ کا پیغام پہنچایا اور اللہ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے آگاہ کیا، اس کے بعد حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی جو کیفیت ہوتی ہے اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا مرحلہ اور ولادت کے بعد کے حالات، اسے بہت ہی اختصار اور پوری بلاغت و فصاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جسے ہم چند نکات میں بیان کرتے ہیں:۔

۱۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی خبر دینے کے بعد بی بی مریم سلام اللہ علیہا نے یہ محسوس کیا کہ وہ حمل سے ہو گئی ہیں۔

۲۔ جب حمل کے آثار جسم سے ظاہر ہونے لگے تو وہ اپنے گھر والوں سے دُور کسی جگہ پر چلی گئیں۔

۳۔ بی بی مریم سلام اللہ علیہا تنہا تھیں، ان کے ساتھ کوئی موجود نہ تھا۔

۴۔ ایسا مرحلہ آگیا جب حامل خاتون بچے کے جننے سے پہلے محسوس کرتی ہے یعنی درد زہ شروع ہو جاتا ہے اور بی بیؑ کو احساس ہو گیا کہ بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔

۵۔ ایسی حالت میں کھجور کے درخت کا سہارا لیتی ہیں، اور اسی اثناء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہو جاتی ہے۔

۶۔ ولادت کے بعد بی بی مریم سلام اللہ علیہا پریشان ہو جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ کاش میں آج سے پہلے مر گئی ہوتی یا ایسی حالت میری ہوتی کہ مجھے کوئی نہ جانتا اور میں غیر معروف ہوتی، لوگوں میں میرا تذکرہ نہ ہوتا۔ پریشان اس لیے تھیں کہ بی بی مریم سلام اللہ علیہا غیر شادی شدہ تھیں، بچہ متولد ہو گیا آپ کا تعلق نبوی گھرانہ سے تھا، پاکیزہ وطاہرہ تھیں، عابدہ تھیں، سب لوگ آپ کو جانتے تھے۔ اب بی بیؑ نے سوچا کہ جب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ میرے لیے بیٹا ہوا ہے تو میرے بارے کیا کہیں گے۔ اس پریشانی میں ان جملوں کو ادا کرتی ہیں، یہ پریشانی بجا تھی۔

۷۔ اللہ کی آیت اور نشانی حضرت عیسیٰؑ تھے۔ عیسیٰ جو تازہ متولد ہوئے ہیں اللہ کے حکم سے بول پڑے، سب سے پہلے تو یہ کہا اماں آپ پریشان نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے ایک پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔ اس طرح عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کو بتا دیا کہ اپنے بارے لوگوں کے سامنے کسی قسم کے دفاعیہ کے لیے نہ اٹھیں اور کچھ بات بھی ان سے نہ کریں بلکہ خود یہ بچہ جو ابھی ابھی پیدا ہو ہے یہ خود ہی اپنی اماں کی پاکیزگی اور طہارت کی

گواہی دے گا اور یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔

۸۔ بچے کی ولادت کے بعد پانی کی ضرورت ہوتی ہے، غذا کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے پانی کا چشمہ سامنے سے جاری کر دیا جو کہ پہلے نہ تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اماں سے کہا اماں جان اس کھجور کے درخت کو ہلائیں اس سے تازہ کھجوریں گریں گے، ان کو کھائیں اور اس چشمہ کا پانی پئیں۔ اس طرح اپنی تھکاوٹ، بھوک و پیاس کو دُور کریں اور بالکل پریشان نہ ہوں۔ کھجور کا تنا جو کہ خشک تھا اور اس پر پھل موجود نہ تھا جیسے ہی بی بی مریم سلام اللہ علیہا نے اسے ہلایا تو وہ درخت سرسبز ہو گیا، خوشے نکل آئے اور ان سے تازہ کھجوریں بی بیؑ کے دامن میں آگریں۔ بی بیؑ نے ان کھجوروں کو تناول کیا اور چشمہ کے پانی سے سیراب ہوئیں۔

۹۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اماں سے کہا کہ آپ کھجوریں کھائیں، پانی پئیں اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائیں، آنکھوں پر پانی ڈالا ہو گا منہ دھویا ہو گا بچہ کو نہلایا ہو گا بہر حال یہ پورا منظر نامہ ہے جس کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک ماں ہے اور اس کے ساتھ نومولود ہے ان دونوں کو اس الگ تھلگ جگہ پر دیکھ کر لوگوں کا سوال کرنا بنتا ہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اماں سے کہا کہ دیکھیں اماں جان جب تیرے پاس لوگ آجائیں اور تجھ سے سوال کریں تو آپ نے ان سے بات نہیں کرنی اور ان سے اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے (چپ کا روزہ اس زمانہ میں رکھا جاتا تھا جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ تم چپ کا روزہ رکھ لینا اور تین رات تک کسی سے نہیں بولنا، اشاروں سے بات کرنا ہے یہی بات اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ سے کہی ہے کہ آپ نے آنے والوں سے اشارہ میں بات کرنا ہے کسی سے بولنا نہیں۔ اماں جان لوگوں کے سوالات کا جواب میں نے دینا ہے، آپ اشارہ کر دینا کہ جو کچھ پوچھنا ہے میرے متعلق تو اس بچہ (نومولود) سے پوچھ لو۔

حضرت عیسیٰؑ کا گواہی دینا

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔـا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

''پھر وہ اسے قوم کے پاس اٹھا کر لائی، انہوں نے کہا اے مریم البتہ تو نے عجیب بات کر دکھائی''۔

يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ۖۚ ﴿۲۸﴾

''اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ ہی برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی''۔

ہارون سے مراد

جس ھارون کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے اس کے بارے چار قول ہیں:۔

۱۔ ہارون نبی اسرائیل میں بہت ہی نیک و پارسا شخص تھا، نیک لوگوں کو اس کی شبیہ قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت مریمؑ کو کہا جاتا ہے کہ تم تو پاکدامنی میں ھارون کی مانند معروف تھیں، تم نے یہ کیا کر دیا؟

۲۔ مریمؑ کا باپ کی طرف سے ایک بھائی تھا جس کا نام ھارون تھا۔

۳۔ ہارون سے مراد حضرت موسیٰؑ کے بھائی ہی ہیں اور یہ نسبت خاندان کے حوالے سے ہے کہ تم تو ھارون کے خاندان سے ہو تم نے یہ کیا کر دیا؟

۴۔ ہارون ایک بدکار آدمی تھا جو اس دور میں مشہور تھا۔ اُنہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ تم نے تو ھارون جیسا کام کر دکھایا ہے ان جیسی ہو گئی ہو۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اے مریمؑ تیرا باپ نیک، تیری ماں نیک، تیرا خاندان نیک، تم نے یہ کیا گل کھلایا ہے بغیر شادی کے مولود اپنے ہمراہ لے آئی ہو؟

فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ‌ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُڪَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾

''تب اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے کہا ہم پنگوڑھے والے بچے سے کیسے بات کریں''۔

قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ‏ ﴿۳۰﴾

''کہا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے''۔

قوم کے اعتراضات اور عیسیٰؑ کا جواب

بی بی مریم سلام اللہ علیہا اپنے نومولود عیسیٰ علیہ السلام کو لے کر جب قوم کے سامنے آتی ہیں تو قوم کے لیے انہیں اس حالت میں دیکھ کر بہت ہی دُکھ ہوا اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی، برے الفاظ کہنے لگے۔

ان کے لیے بی بی مریمؑ نے اپنے نومولود بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو، قوم کے افراد نے تعجب کیا اور کہنے لگے ایک تو غلطی پر ہو دوسرا ہمیں اس بچے سے بات کا کہہ رہی ہو؟ ابھی یہ کہہ رہے تھے کہ نومولود بچے نے بولنا شروع کیا:

پہلی بات کہی میں عبد اللہ ہوں، دوسری بات کہی کہ میں اللہ کا نبی ہوں، تیسری بات کہی مجھے اس نے بابرکت بنایا ہے اور یہ برکت زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی ہے، چوتھی بات یہ کہی کہ اللہ نے مجھ سے کہا ہے جب تک زندہ ہو نماز ادا کرو، زکات دُوں۔ دو اہم فریضے ان کا تذکرہ کیا۔ جب نبی کے لیے نماز وزکوۃ کا حکم ہے تو اُمت کے لیے بھی یہی حکم ہے۔

اس گفتگو میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میری ماں پاکدامن ہے بلکہ اپنے بارے بتایا کہ میں کون ہوں؟ اسی کے ضمن میں ان کے اعتراضات کا جواب موجود

تھااور سب حیرت زدہ ہوئے اور دنگ ہو گئے۔

آغاز میں بھی اللہ کی عبودیت کا اعتراف کیا کہ میں اللہ کا عبد ہوں اور آخر میں بھی فرمایا جس میں ان کے لیے پیغام بھی دے دیا اور یہیں سے تبلیغ دین کاآغاز کر دیا؛ فرمایا:

ترجمہ: ''بلاشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا بھی اللہ رب ہے، لہٰذا تم سب لوگ اللہ کی عبادت کرو''۔[1]

وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾

''اور مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں ہوں، اور مجھے نماز اور زکوۃ کی وصیت کی ہے جب تک میں زندہ ہوں''۔

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾

''اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا، اور مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا''۔

وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

''اور مجھ پر سلام ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا''۔

حضرت عیسیٰؑ کا مزید بیان

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے بابرکت ہونے کو بیان کرتے ہوئے نماز اور زکات جیسے خدائی احکامات کو بطور نمونہ پیش کیا اور پھر اپنی صفات میں مزید

---

[1] ۔ سورہ مریم، آیت: ۳۶۔

اضافہ کرتے ہوئے فرمایا:

۱۔ اللہ نے مجھے اپنی ماں کے لیے مہربان واحسان اور نیکی کرنے والا قرار دیا ہے۔

۲۔ اللہ نے مجھے سخت پکڑ والا، سرکش، دوسروں پر ظلم کرنے والا نہیں بنایا۔ میں ایسا نہیں کہ دوسروں پر ظلم وجور روا رکھوں۔

۳۔ البتہ میں ایسا بھی نہیں کہ کسی کا ظلم برداشت کروں اور اس طرح شقی و بدبخت بن جاؤں۔ لوگوں کی طرف سے جو خیر خواہی کا اظہار ہو تو ان کے ساتھ ویسا اچھا رویہ اپنایا جائے۔

۴۔ حضرت نے بتایا میرے لیے سلامتی و امن و خیر ہے۔ جس دن میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے سلامتی و خیر و برکت قرار دی۔ یہ اللہ کا میرے اوپر انعام ہے جس دن میں مروں گا تو اس دن بھی میرے اوپر خیر و سلامتی ہو گی اور یہ سلسلہ مرنے کے بعد جب دوبارہ میں زندہ کیا جاؤں گا تو اس وقت بھی میرے اوپر خیر و برکت ہے، سلامتی ہے، سلام ہے۔

عیسیٰؑ اور یحییٰؑ میں سلام کا فرق

جو سلام کا لفظ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے وہ نکرہ ہے۔ جو خاص سلام کو یحییٰ علیہ السلام کے لیے بیان کر رہا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لفظ سلام پر الف لام میم آیا ہے جو عمومیت کے لیے ہے جس کا معنی ہے ہر قسم کا سلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر سلام اللہ کی جانب سے ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اوپر خود سلام کا استعمال کیا ہے۔ یہ کہا ہے میرے اوپر سلام ہے اس دن جس دن پیدا ہو اور اس دن جس دن مروں گا اور اس دن جس دن زندہ (قبر

سے) اُٹھایا جاؤں گا۔

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝٣٤

"یہ عیسیٰ مریم کا بیٹا ہے، سچی بات جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں"۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٣٥ؕ

"اللہ کی شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے، وہ پاک ہے، جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف اسے کن کہتا ہے پھر وہ ہو جاتا ہے"۔

عیسیٰؑ کے بارے اللہ کا واضح بیان

ان دو آیات میں سابقہ بیانات کی روشنی میں اللہ کا واضح بیان ہے کہ جو کچھ بیان کیا گیا تو واضح رہے یہ سب اوصاف جس کے لیے ہیں وہ مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک خاتون کے بیٹے ہیں وہ اللہ کے بیٹے نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں جو نبی ہیں، صاحب کتاب ہیں، نماز و زکات کی وصیت کرنے والے ہیں، اپنی والدہ کے لیے مہربان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور بیٹا قرار دینا اس کی شان الوھیت کے خلاف ہے۔ اللہ بے نیاز ہے، غنی ہے، ہر نقص سے پاک ہے۔

اللہ جب خلقت کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادہ ہی سے شئی خلق ہو جاتی ہے۔ اللہ غنی بالذات ہے، توالد و تناسل سے شان ربوبیت و سبحانیت کے منافی ہے، کیونکہ بیٹا باپ کا ہی حصہ ہوتا ہے جس سے اس کا ربط و تعلق ہوتا ہے جس میں تدریج بھی ہے مراحل ہیں جن کو عبور کرتا ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۶﴾

اور بے شک اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا رب ہے سو اسی کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔

اللہ کی ربوبیت

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کیا ہے اور سب کو یہ واضح بتادیا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارا رب بھی اللہ ہے۔ جو رب ہے اسی کا قانون چلے گا لہٰذا رب ہی کی اطاعت کرنا ہوتی ہے۔ اس بیان سے ان کی بنیاد کو ہی منہدم کردیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ اپنے بیان سے ان کی کج فہمی کا جواب دیا ہے اور یہی وہ تنہا راستہ ہے جسے اپنا کر انسان اپنے کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی طریقہ اپنایا جائے گا وہ انحرافی طریقہ ہوگا اور گمراہی پر منتج ہوگا۔ صراط مستقیم ہی صحیح اور کمال تک پہنچانے والا راستہ ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۷﴾

”پھر جماعتیں آپس میں مختلف ہوگئیں، سو کافروں کے لیے ایک بڑے دن کے آنے سے خرابی ہے“۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾

''کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے، جس دن ہمارے پاس آئیں گے، لیکن ظالم آج صریح گمراہی میں ہیں''۔

ظالموں کا اللہ کے محضر میں موجود ہونا

قیامت کے دن سارے ظالم الٰہی دربار میں پیش ہوں گے اور کتنا اچھا دیکھیں گے اور کتنا ہی اچھا سنیں گے۔ ان پر حق آشکار ہوگا کچھ بھی مخفی نہ رہے گا، سب کچھ ان پر عیاں ہو چکا ہوگا، لیکن ان کو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور ان کو یہ پتہ چل جائے گا کہ اُنہوں نے جو کچھ دُنیا میں انجام دیا سب ہی بے فائدہ ہے ان سے کچھ بھی انسان کو ملنے والا نہیں ہے۔ انہیں اس دن اپنی کھلی گمراہی کا پتہ چل جائے گا ان کے پاس فرار اور گریز کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٩﴾

''اور انہیں حسرت کے دن سے ڈرا جس دن سارے معاملہ کا فیصلہ ہوگا، اور وہ غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے''۔

غفلت میں رہنے والوں کو ڈرانا

اس جگہ پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا ہے ان لوگوں کو اس فیصلہ کے بارے بتاؤ اور ان کو اس حتمی فیصلہ کے جو نقصانات انہیں ہوں گے ان سے آگاہ کرو۔ اس وقت ان کی ہلاکت حتمی ہے اور اس سے چھٹکارا بالکل ممکن نہ ہوگا۔ وہ ایسا دن ہوگا کہ جس میں صاحب ایمان سعادت مند ہوں گے اور جنہوں نے اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسولوں کا انکار کر دیا اور ان کی دعوت کو قبول نہ کیا اور غفلت میں رہے، جب انہیں موت کے بعد دوبارہ انہیں اٹھایا جائے گا اور میدان محشر میں لایا جائے گا اور وہ اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے تو اُن کے لیے ہر

بات واضح و روشن ہو جائے گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ غلطی پر تھے، صحیح راستہ سے انحراف کر چکے تھے اور اس حال میں انہیں اپنی ہلاکت اور عذاب سامنے نظر آئے، اس دن اُنہیں حسرت اور افسوس ہو گا اور کہیں گے کہ کاش ہم ایمان لے آتے؛ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ لہٰذا اے رسول انہیں اس دن کے بارے ڈراؤ کہ وہاں پر حیرت اور افسوس تمہیں ہو گا لہٰذا آج ہی ایمان لے آؤ تا کہ کل تمہیں حسرت و یاس کا سامنا نہ کرنا پڑے تا کہ ابدی ہلاکت سے خود کو بچا سکیں۔

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

''بے شک ہم ہی زمین کے وارث ہوں گے اور ان کے بھی جو اس پر ہیں اور ہماری طرف لوٹائے جائیں گے''۔

زمین اور اہل زمین کے اموال کی وراثت

جب زمین سے ہر شئی فنا ہو جائے گی اللہ تعالیٰ کی ذات ہی باقی ہو گی، تمام انسان موت کے ذریعہ ہر شئی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، خالی ہاتھ قبر میں چلے جائیں گے، زمین اللہ کی ہی ہو گی اور اللہ ہی مالک ہے اور انسانوں نے جو کچھ دُنیا میں بنایا تھا کمایا تھا اس سب کا مالک بھی اللہ ہی ہے وہ سب کچھ اللہ کے لیے باقی چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ زمین کی فنا کے بعد بھی جو ذات باقی رہے گی وہ اللہ ہی ہے اور زمین سے جو وجودی آثار ہوں گے ان کا مالک بھی اللہ ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ہم ہی سب کچھ کے وارث ہیں جو زمین میں ہے اور جو کچھ زمین کے اوپر موجود ہے۔ اور ہر موجود اپنے اختتام پر اللہ کی طرف پلٹ جائے گا اور سب ہی سب اللہ کے حضور میں محشور ہوں گے، پیش ہوں گے۔ یہ آیت بھی ایک اور ثبوت ہے کہ اللہ کا کوئی فرزند نہیں۔ جب خداوند ہر چیز کا وارث ہے یقینی امر ہے کہ اسے فرزند کی ضرورت نہ ہے۔ بیٹے کی ضرورت اسے ہوتی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کے چلے جانے کے بعد وہ اس کا وارث

بنے جبکہ اللہ نے تو موجود رہنا ہے اور جو کچھ بھی ہے زمین میں ہو یا زمین پر جو کچھ موجود ہے سب اللہ کا ملک ہے اور اللہ ہی ہر چیز کا وارث ہے۔ اس جگہ وراثت مالکیت کے معنی میں ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾

''اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، بے شک وہ سچا نبی تھا''۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو وصف

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے بتایا جا رہا ہے اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو وصف بیان کیے ہیں:۔

۱۔ کہ وہ بہت ہی سچے، بہت سچ بولتے تھے۔

۲۔ وہ رسول تھے، اللہ کے پیغمبر تھے۔

جس ماحول میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام موجود تھے وہ بت پرستوں کی سوسائٹی تھی، ایک بھی توحید پرست نہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس انحرافی معاشرہ میں اللہ وحدہ کا نعرہ بلند کیا، توحید پرستی کا پرچم اٹھا کر اپنے چچا سے بحث کا آغاز کیا اور دلائل سے انہیں سمجھایا کہ اللہ یکتا ہے اور اس دور کے ظالم بادشاہ نمرود کا مقابلہ کیا۔ استقامت دکھائی اور ان کے جھوٹے خداؤں کو شکست دی، نمرود بابل کا بادشاہ تھا، آپ توحیدی طریقہ کو اپنائے ہوئے تھے، استقامت دکھائی۔ انہوں نے ان کے دلائل کا جواب نہ پا کر آپ کو آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔ اللہ نے انہیں نجات دلائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستوں کا مقابلہ کیا، وہ بتوں کی پوجا پاٹ کرتے تھے آپ نے ان سے بیزاری کا اعلان کیا۔ اللہ تعالٰی نے انہیں اپنی رحمت میں لے لیا اور وہ ہی کامیاب ہوئے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْــٴًـا ﴿۴۲﴾

''جب اس نے اپنے باپ (چچا) سے کہا اے میرے چچا تو کیوں پوجتا ہے ایسے کو جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ تیرے کچھ کام آسکے گا''۔

ابراہیمؑ کا اپنے چچا سے مکالمہ

اس جگہ باپ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا آزر مراد ہیں یا ماں کی جانب سے ان کے نانا ہیں یا پھر ان کی ماں کے شوہر ہیں، سوتیلے باپ؛ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ ان کی ولادت کے بعد فوت ہو گئے تھے اور ان کی ماں نے ان کے چچا سے شادی کر لی تھی جس گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرورش پائی اس وجہ سے آپ اسے بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ نبی کا باپ، نبی کی ماں، توحید پرست ہوتے ہیں یہ طے شدہ امر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استفہام توبیخی اور انکاری کے ذریعہ اپنے چچا کو متوجہ کیا ہے کہ تم ان بتوں کے آگے جھکے ہو، ان کی عبادت کس لیے کرتے ہو یہ تو نہ سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں اور نہ ہی کچھ فائدہ دیتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو پھر تم ان سے کیا مانگتے ہو، ان کے آگے کیوں جھکتے ہو؟۔

یہ انداز تھا انہیں سمجھانے کا کہ کسی کی پرستش کیوں کی جائے؟ بے جان پتھروں کی پرستش سے کیا حاصل ہوتا ہے تو ایک لغو اور بے فائدہ اور بے مقصد عمل ہو جائے گا۔ پتھر بالکل اس قابل نہیں کہ ان کی پرستش کی جائے۔

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾

''اے میرے چچا بے شک مجھے وہ علم حاصل ہوا ہے جو تمہیں حاصل نہیں، تو آپ میری تابعداری کریں میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا''۔

ابراہیمؑ کی اپنے چچا کو توحید کی دعوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بت پرستی کی مذمت کر دی اور یہ بتا دیا کہ یہ بے جان پتھروں سے کیا حاصل کرو گے وہ کچھ دینے پر قادر نہیں نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ جو خود کو کچھ نہیں دے سکتے وہ آپ کو کیا دیں گے جب بت پرستی کا بطلان بتا دیا تو پھر اپنے چچا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے گھر سے ہی توحید پرستی کی دعوت کا آغاز کر دیا۔ اور اس میں بتایا کہ میرے پاس جو علم ہے وہ آپ کے پاس نہیں ہے، میں مامور ہوں کہ آپ کو دعوت دُوں، آپ جس راستہ پر ہیں وہ راستہ باطل ہے اور بے فائدہ اور بے ہودہ راستہ ہے۔ میرے پاس جو علم ہے وہ آپ کے پاس نہیں ہے اور جو نہیں جانتا اسے چاہیے کہ وہ اس کی پیروی کرے جو جانتا ہے لہٰذا آپ میری بات مانیں میں آپ کو ہدایت دُوں گا اور صحیح راستہ بتاؤں گا، گمراہی سے نکالوں گا۔ راہ مستقیم سیدھا راستہ ہے جس میں ٹیڑھا پن اور انحراف نہ ہے جو اس پر چلتا ہے وہ کبھی بھٹکتا نہیں، وہ اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

ہدایت کا معنی

ہدایت کا معنی راستہ دکھانا ہے، راستہ کے نشانات بنانا ہیں، مطلوب تک پہنچانا نہیں۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی امامت کے مقام پر فائز نہ تھے ابھی نبی و رسول تھے، آپ کو آخری عمر میں اللہ تعالیٰ نے امام قرار دیا۔ اس لیے اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا کہ میں آپ کو سیدھے راستہ کے نشانات واضح طور پر بتا دُوں گا اور جو سیدھے راستہ پر آجاتا ہے تو وہ پھر بھٹکتا نہیں اور اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

يَاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾

”اے میرے باپ (چچا) شیطان کی عبادت نہ کر، بے شک شیطان اللہ کا نافرمان ہے“۔

شیطان کی انسان سے دشمنی

حضرت ابراہیم نے اپنے چچا کو بتایا کہ دیکھو شیطان انسان کا دشمن ہے۔ آپ شیطان کی پیروی مت کرو۔ شیطان جنات سے تھا، بت پرست شیطان کے عقیدت مند تھے لیکن اس جگہ عبادت سے مراد اطاعت ہے کہ شیطان کی اطاعت سے آپ نے انہیں منع کیا۔ وہ جو بھی کہے اس کی نافرمانی کرنا ہے اس میں ایک شیطان کا یہ فرمان ہے کہ غیر خدا کی پرستش کی جائے۔ جو لوگ بتوں کے آگے جھکتے تھے وہ گویا شیطان کی اطاعت میں تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے بت پرستی کو لغو اور بے مقصد عمل قرار دیا ہے اس جگہ یہ بتایا ہے یہ عمل انسان کو ہلاکت میں ڈال دے گا اور شیطان کی عبودیت اور اطاعت میں لے آتا ہے۔ جو شیطان کا بندہ ہو جائے تو پھر اس کے لیے ہدایت و سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور اس کی ہلاکت حتمی ہے کیونکہ شیطان نے خود اللہ کی نافرمانی کی جبکہ اللہ ہی تمام نعمات اور رحمتوں کا منبع و مرکز ہے لہٰذا وہ شخص جو ساری نعمات اور رحمتوں کے منبع و مرکز کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ جو بھی امر کرے گا تو وہ اللہ کی رحمت سے دُوری ہی کا ہوتا ہے وہ خود راندہ درگاہ الٰہی ہوا ہے اور وہ ہر ایسا حکم جاری کرے گا تاکہ دوسرے بھی درگاہ الٰہی سے راندہ ہو جائیں۔

يَاَبَتِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّيۡطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

''اے میرے باپ بے شک مجھے خوف ہے کہ تم پر اللہ کا عذاب آئے پھر شیطان کے ساتھی ہو جاؤ''۔

ابراہیمؑ کا اپنے چچا کو خطرہ سے آگاہ کرنا

اس جگہ حضرت ابراہم علیہ السلام نے اپنے چچا کو ایک بڑے خطرے سے آگاہ کرتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس آیت میں اور اس سے پہلے والی آیت میں اللہ کی بجائے لفظ ''رحمٰن'' کا استعمال کیا ہے کیونکہ رحمت کا وصف دونوں احکام میں دخیل ہے۔ پہلی آیت میں اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری رحمتوں اور نعمات کا منبع و مرکز ہے جب ایسا ہے تو پھر اللہ کی نافرمانی کرنا صحیح نہیں ہے۔ انسان کو یہ لائق نہیں دیتا کہ وہ اللہ کی اطاعت کو چھوڑ دے۔ جو نعمات و رحمات کا منبع ہے اور شیطان جو راندہ درگاہ الٰہی ہے اس کی اطاعت کرے۔ اس آیت میں بھی اللہ ہی منبع و مرکز و رحمت ہے لہٰذا اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے اللہ کی رحمت کا سہارا لیا جائے۔

اس جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: اے بابا اس لحاظ سے کہ اللہ مہربان ہے، رحمت فراواں جاری کرنے والا ہے، ساری نعمات اور رحمات کا سرچشمہ ہے۔ مجھے ڈر لگا ہے کہ اگر آپ بت پرستی نہ چھوڑیں گے تو اللہ اپنی رحمت کو تم سے کاٹ نہ دے اور اس طرح اللہ کی جانب سے رسواء کرنے والا عذاب تمہیں آلے اور شیطان ہی تمہارا سرپرست ولی و دوست باقی رہ جائے۔ جب اللہ کی ولایت سے نکل جاؤ گے تو پھر شیطان ہی تمہارے سارے امور کا نگہبان بن جائے گا اور شیطان کی سرپرستی و ولایت سوائے تباہی و بربادی اور ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِیۡ یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾

"کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے، البتہ اگر تو باز نہ آیا میں تجھے سنگسار کر دوں گا، اور مجھ سے ایک مدت تک دور ہو جا"۔

آزر کا ابراہیمؑ کے لیے جواب

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سوتیلے باپ کو تبلیغ کی، اسے بت پرستی سے منع کیا اور اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا لیکن اس کے جواب میں آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ دھمکی دے ڈالی اور واضح کہہ دیا کہ تم ہمارے معبودوں (ان بتوں) کے بارے مخالفت مت کرو۔ ان کو برا مت کہو، ان کی پرستش سے مت رکو۔ اگر تم اس حرکت سے نہ رکے تو میں تمہیں سنگسار کروں گا۔ سخت سزا دُوں گا، گھر سے نکال دُوں گا، تمہیں اپنے پاس نہ آنے دُوں گا، اس طرح آذر نے بدترین شکل میں ابراہیم علیہ السلام کو مار دینے کی دھمکی دی کیونکہ سنگسار، شکنجہ، دُور بھگانا، تحقیر، قتل کرنے، پتھر مارنے سب کو شامل ہے۔ آزر نے اپنی اس گفتگو سے ابراہیم علیہ السلام کو خود سے دُور کر دیا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیۡكَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیۡ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾

"کہا تیری سلامتی رہے، اب میں اپنے رب سے تیری بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے"۔

ابراہیمؑ کا اپنے سوتیلے باپ کی دھمکی پر جواب

آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جان سے مارنے کی دھمکی دی، بت پرستی سے

روکنے پر سخت ردعمل ظاہر کیا اور گھر سے نکال دینے کا کہا لیکن اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت ہی نرم رویہ اپنایا، اس میں پہلے تو اس کے لیے سلامتی وامن اور خیر کا پیغام دیا۔

یہ بھی کہا کہ اے میرے بابا آپ جو کچھ میرے متعلق کہیں لیکن میں تو آپ کی خیر و سلامتی چاہتا ہوں، آپ کو ہلاکت سے بچانا چاہتا ہوں اور اگر تم بت پرستی سے باز آجاؤ تو میں اپنے رب سے تمہارے لیے گناہوں سے معافی کی درخواست کروں گا اور میرا رب تو میرے اوپر مہربان ہے وہ میری دعا کو آپ کے حق میں قبول کرلے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انداز مخاطب قرآنی تھا کہ قرآن کہتا ہے:

ترجمہ: ''جب ان سے جاہل لوگ گفتگو کرتے ہیں (یعنی سخت جملے استعمال کرتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں، ان کی دعوت کو رد کرتے ہیں تو وہ ان کے معاملہ میں کہتے ہیں) سلامتی ہو، خیر ہو جاہلوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ اپناتے ہیں''۔[1]

یہی انداز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر کی دھمکی آمیز گفتگو کے مدمقابل اپنایا اور ان کے لیے خیر و سلامتی کی آرزو کی۔ یہاں یہ بھی روشن ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ آذر حتمی طور پر شیطان کے اولیاء سے ہے اور ان کا دل مہر زدہ ہے۔ حق کے ساتھ عناد اور دشمنی اتنی ہے کہ اس سے واپسی ممکن نہیں، اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کے لیے دعائیہ کلمات نہ بولتے اور نہ ہی ان کے واسطے طلب مغفرت کرتے اور آخر میں یہ بھی بتادیا کہ میرا رب میرے اوپر مہربان ہے وہ میری دعا کو رد نہیں کرے گا، میں آپ کے حق میں طلب مغفرت کروں گا تو وہ ضرور تجھے مغفرت سے نواز دے گا۔

---

[1]۔ سورہ فرقان، آیت: ٦٣۔

وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ ۫ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾

"اور میں چھوڑتا ہوں تمہیں اور جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اور میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا، امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا"۔

ابراہیمؑ کا بت پرستوں سے علیحدگی کا اعلان

ابراہیم علیہ السلام نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان بت پرستوں سے علیحدہ ہو جائے تاکہ خلوت اور تنہائی میں اپنے رب سے راز و نیاز کر سکے اور خلوص کے ساتھ عبادت میں مصروف رہے۔ اس لیے اعلان کیا کہ میں تم بت پرستوں سے علیحدگی اختیار کر رہا ہوں تاکہ میری دعا بے ثمر نہ ہو۔ اس بات کو رجاء اور اُمید کے انداز میں بیان کیا اور یہ اس لیے کہ تنہائی اور علیحدگی میں عبادت کرتا، دعا و مناجات میں مصروف رہتا۔ ان کے اسباب سے نہیں کہ اس وجہ سے دعا و عبادت قبول ہو کیونکہ اجتماع میں موجود رہتے ہوئے بھی دعا قبول ہوتی ہے بلکہ اس جگہ اس بات کا اظہار ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ دعا و مناجات اور توجہ کے نتیجہ میں سعادت مرحمت فرمادے یا نعمت دے دے یا آرزو کو پورا کر دے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفضل و مہربانی ہے۔ اللہ پر ایسا کرنا واجب و لازم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمام امور کی کامیابی کا معیار ان کا انجام و اختتام ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کو غیب کا اور معاملات کے انجام اور عاقبت کا علم نہیں ہے۔ اس لیے مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رجاء و خوف میں رہتے ہیں، اللہ کے تفضل کا امیدوار ہوتا ہے اور اللہ کی پکڑ سے ڈرتا رہتا ہے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

''پھر جب علیحدہ ہوا ان سے اور اس چیز سے جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیا، اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا''۔

ابراہیمؑ کے لیے عطیہ الٰہی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ ٹھیک رکھا، خلوص کے ساتھ اللہ کی عبادت میں مشغول رہے، بت پرستوں کو چھوڑ دیا، رشتہ اور تعلق داری کی پرواہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں نبوت اور رسالت کو قرار دے دیا۔ اس انعام کا اس طرح اعلان کیا کہ ہم نے ابراہیم کو اسحٰق بیٹا دیا اور اسحٰق کو اللہ تعالیٰ نے یعقوب دیا اور پھر یعقوب کی نسل میں بہت بڑی تعداد اللہ نے انبیاء اور رسولوں کی قرار دی۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اسحٰق بیٹے اور آپ کے پوتے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے اپنے انعامات کا حوالہ دیا ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ ع

''اور ہم نے ان سب کو اپنی رحمت سے حصہ دیا اور ہم نے ان کا نیک نام بلند کیا''۔

امامت کا انعام

اس آیت میں رحمت سے مراد امامت ہے جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم نے ابراہیم کی اولاد سے آئمہ کو قرار دیا جو ہمارے امر کی ہدایت دیتے ہیں'' (سورہ انبیاء، آیت: ۳)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رحمت سے مراد رُوح القدس کے ذریعہ خصوصی تائید اور حمایت مراد ہو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ہم نے ان کی جانب اچھائیوں کے عمل کی وحی کر دی، لہٰذا صدق سے مراد اچھا ذکر، اچھائی کے ساتھ تذکرہ کرنے سے مراد بلندی ہے۔

اللہ فرمارہا ہے کہ ہم نے اپنی رحمت سے ان کو نوازا، انہیں ہم نے امامت عطا کی اور ہم نے روح القدس کے ذریعہ ان کی تائید کا انتظام کیا اور ان کے لیے بلندی پر ذکر قرار دیا ان کا نام بہت ہی بلند کر دیا کہ ان کا اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خالص قرار دیا کہ اس کے عمل میں اور اس کے کاموں میں اللہ کے سوا کوئی بھی شریک نہ ہو، یہ عبودیت اور بندگی کے بلند ترین مقامات سے ہے۔ رسول صاحب کتاب نبی کو کہتے ہیں، صاحب شریعت وہ ہوتا ہے جسے عوام تک پہنچانا اور اسے نافذ کرنا، ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ نبی وہ ہوتا ہے جو عالم غیب سے وحی کے ذریعہ رابطہ میں ہوتا ہے، نبی کسی اور رسول کی شریعت کی تبلیغ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی باطنی خصوصیات اور ظاہری کرامات کی وجہ سے اپنے لیے خاص قرار دیا۔ ان کی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سارے امتحانات اور آزمائشوں سے گزارا۔

۱۔ بیدار ہوتے ہوئے اپنی ماں سے جدائی

۲۔ فرعون کی سرپرستی میں رہنا

۳۔ مظلوم کی مدد کرنے کے لیے اقدام اور نا چاہتے ہوئے بھی ظالم کو قتل کر دینا

۴۔ انتقام کے ڈر سے مصر کو چھوڑ دینا

۵۔ کئی سال چرواہی کا کام کرنا

۶۔ اپنے وطن کی جانب واپسی پر کوہ طور سے نور الٰہی کا مشاہدہ، درخت کی پیچھے سے نور کا مشاہدہ

۷۔ رسالت اور پیغام رسانی کی ماموریت ملنا

۸۔ فرعون کی جانب تبلیغ کے لیے جانا، جو انتہائی ظالم و جابر، خونخوار بھیڑیے کی مانند تھا۔ دُنیا پرستی اور مادہ پرستی میں غرق تھا۔

۹۔ بنی اسرائیل کے ظلم و ستم،، ان کی قتل و غارت گری، ہتک حرمت جیسے امور جو کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایک بادشاہ کے گھر پر اس کی عیش و عشرت کو چھوڑ کر مظلوموں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجہ میں انہیں بہت زیادہ مشقتوں اور تکالیف سے گزرنا پڑا۔ اس سب کو اللہ کی راہ میں قبول کیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

”اور کتاب میں موسٰی کا ذکر کر، بے شک وہ خاص بندے اور بھیجے ہوئے پیغمبر تھے“۔

وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾

”اور ہم نے اسے کوہِ طور کے دائیں طرف سے پکارا اور اسے راز کی بات کہنے کے لیے قریب بلایا“۔

موسیٰؑ کے لیے اعزاز

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مشقتوں اور زحمات کو انہیں اس طرح

صلہ دیا کہ جب وہ کوہ طور پر پہنچے تو وہ بظاہر اپنی بیوی کے لیے آگ لینے گئے تھے تاکہ اس کے لیے آگ جلائیں اور سردی سے اس کا بچاؤ کریں لیکن جب کوہ طور پر جاتے ہیں اور جیسے ہی روشنی کے قریب ہوتے ہیں تو اس جگہ اللہ کی وحی اس کے لیے آجاتی ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ نے موسیٰ کو اپنا قرب عطا کر دیا اور اس کے ساتھ راز و نیاز کی بات کی۔ اللہ تو جسم و جسمانیات سے پاک ہے اللہ کا کسی کو اپنے قریب کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے بڑا معنوی مقام عطا کر دیا کہ وہ اپنے رب تعالیٰ کی بارگاہ کا مقرب و قریبی ہو گیا۔ اس قرب سے مراد معنوی اور روحانی قرب ہے۔ کتنا بڑا مقام ہے کہ اللہ اپنے عبد کے ساتھ سرگوشی کرے۔ یہ ایسی رحمت اور عطا ہے جو ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی یہ سب اسے نصیب ہوتی ہے جس میں اسے وصول کرنے کی لیاقت و قابلیت موجود ہو۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِیًّا ﴿۵۳﴾

''اور ہم نے اسے اپنی رحمت سے اس کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا''۔

موسیٰؑ کی دُعا کی قبولیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ اے موسیٰ توں میری کمر میرے بھائی ہارون کے ذریعہ مضبوط کر دے تو اس آیت میں اس دُعا کی قبولیت کی جانب اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ میرے بھائی ہارون ہیں انہیں میرا وزیر و زور کمر قرار دے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ھارون علیہ السلام کو نبوت سے نوازا اور اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دے دیا کہ وہ تبلیغ کے اَمر میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شریک رہے۔ دعا کے الفاظ اس طرح ہیں:

وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۲﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت: ۲۹ تا ۳۲)

ترجمہ: ''اے اللہ میرے لیے میرے خاندان سے میرا وزیر بنا اور وہ ہارون ہو جو میرے بھائی ہیں، ہارون کے ذریعہ مجھے مضبوطی عطا فرما اور ہارون کو میرے کام میں شریک قرار دے''

اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو پورا قبول کیا، اور مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا کہ ہم نے ہارون کو نبی بنا کر موسیٰ کے لیے عطیہ کر دیا۔ نبوت دی تاکہ موسیٰ کے کاموں میں شریک ہو جائے اس کے ذریعہ موسیٰ کو سہارا اور مضبوطی دی اور ہارون ان کے خاندان سے تھے اور ان کے بھائی تھے موسیٰ نے جو چاہا وہی اللہ نے انہیں دے دیا۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ﴿۵۴﴾

''اور کتاب میں اسماعیل کا بھی ذکر کر، بے شک وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا پیغمبر تھا''۔

حضرت اسماعیلؑ کا تذکرہ

اس آیت میں حضرت اسمٰعیلؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس جگہ حضرت اسمٰعیلؑ سے مراد اسمٰعیل بن حزقیل ہے جو بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی و رسول تھے کیونکہ اگر حضرت ابراہیم کے فرزند اسمٰعیل مراد ہوتے تو ان کے ساتھ اسحٰق و یعقوب کا تذکرہ بھی ہوتا۔ اگر ان کے ساتھ خصوصی عنایت مقصود تھی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا اور حضرت موسیٰ کے تذکرہ سے پہلے ان کا ذکر آتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کا ذکر کیا جانا اس بات کی نشانی ہے کہ اس اسمٰعیل سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء سے ایک ہیں نہ کہ اسماعیل بن ابراہیم علیہم السلام۔ قرآن مجید نے ان کا پہلا وصف بیان کیا ہے کہ وہ صادق الوعد تھے، وعدے کے سچے تھے وعدہ

خلافی نہیں کرتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے وہ پیغمبر تھے، ان پر وحی اترتی تھی اور وحی پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی وحی کے ذریعہ ان کا عالم غیب سے رابطہ تھا۔

وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾

"اور اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوۃ کا حکم کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے ہاں پسندیدہ تھا"۔

اسمٰعیل بن حزقیل کے مزید اوصاف

ان کا تیسرا وصف یہ تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکات کا حکم دیتے تھے۔ اہل سے مراد گھرانہ، قوم، قبیلہ ہے۔ وہ اپنے خاندان، اپنی قوم اور قبیلہ کو نماز پڑھنے اور زکات دینے کے لیے آمادہ کرتے تھے۔ نماز و زکات کا اہتمام کرتے تھے، نماز بندے اور رب کے درمیان رابطہ و تعلق کا وسیلہ ہے جبکہ زکات ایسا عمل ہے جس میں فرد کا اپنی سوسائٹی اور مزید معاشرہ سے تعلق و رابطہ بنتا ہے۔ چوتھی خصوصیت ان کی یہ تھی کہ ان کا عمل اللہ کو پسند تھا۔ ایسی رضایت جو عظمت الٰہی کے مقام سے صادر ہونے کی لیاقت رکھتی ہے۔[1]

---

[1]۔ کتاب علل الشرائع میں ابن ابی عمیر اور محمد بن سنان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جس صادق الوعد اسماعیل کا تذکرہ اس آیت میں ہوا ہے اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسماعیل مراد نہیں ہیں۔ بلکہ انبیاء الٰہی میں سے ایک تھے جسے اللہ تعالیٰ نے قریش میں مبعوث کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے انہیں پکڑا اور ان کے سر اور چہرے کی جلد کو اتارا۔ ایک فرشتہ ان کے پاس آیا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ تم جو چاہو انجام دوں۔ انہوں نے کہا کہ میں دوسرے انبیاء یا امام حسین علیہ السلام کی اقتداء کرتا ہوں۔ عیون اخبار رضا میں امام رضا علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ ان کو صادق الوعد کہنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک آدمی سے کسی مقام پر وعدہ کیا تھا اور وہ پورا ایک سال اس فرد کے انتظار میں وہاں منتظر رہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾

''اور کتاب میں ادریس کا ذکر کر، بے شک وہ سچا نبی تھا''۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾

''اور ہم نے اسے بلند مرتبہ پر پہنچایا''۔

حضرت ادریسؑ کا تذکرہ

ادریسؑ کا حوالہ آگیا ہے ان کا نام اخنوخ تھا جیسا کہ توریت میں ہے وہ حضرت نوحؑ کے اجداد سے تھے ان کو ادریسؑ اس لیے کہتے تھے کہ وہ درس وتدریس میں بہت زیادہ مشغول رہتے تھے اس کے اوصاف میں بیان کیا ہے کہ وہ انبیاؑ سے تھے وہ بہت زیادہ سچ بولتے تھے اللہ کے مقرب تھے اللہ نے انہیں نبوت عطا کی، ولایت کا مقام دیا، اور ''مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾'' سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اسے بلند مقامات عطا کیے اس سے معنوی درجات کی بلندی مراد ہے۔

فخر رازی نے اپنی تفسیر میں بعض احادیث کا حوالہ دے کر بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادریس کو آسمان پر لے گیا اور وہی پر ان کی روح قبض کی۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو یہ ان کا بہت بڑا امتیاز ہے جسے آیہ شریفہ بیان کر رہی ہے جس سے اللہ کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔[1]

[1]۔ سیر و تاریخ کی کتابوں میں یہ بات موجود ہے کہ پہلی شخصیت جس نے قلم سے لکھا وہ حضرت ادریسؑ تھے اور پہلا شخص جس نے درزی کا کام کیا اور کپڑے سینے کا عمل شروع کیا وہ بھی حضرت ادریسؑ تھے۔ کتاب اصول کافی میں کلینی نے عبد اللہ بن سنان کے واسطہ سے حضرت امام صادق علیہ السلام سے یہ بات درج کی ہے مسجد سھلہ جو کوفہ میں ہے حضرت ادریسؑ کی رہائش گاہ تھی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَ
مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّ مِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْرَائِيلَ وَ مِمَّنْ
هَدَيْنَا وَ اجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَّ
بُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا پیغمبروں میں اور آدم کی اولاد میں سے، اور ان میں سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے، اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا، جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو روتے ہوئے سجدے میں گرتے ہیں''۔

منتخب انبیاء کے بارے خصوصی بیان

سابقہ آیات میں جن انبیاؑ کا ذکر آیا ان کی طرف اولئک کے لفظ سے اشارہ کرکے بیان کیا گیا ہے کہ یہ سارے انبیاء زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، موسیٰ، ہارون، اسماعیل، ادریس علیہم السلام جن کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ سب مثال کے طور پر بیان ہوئے یہ نمونے تھے۔ اس آیت میں اور بعد والی دو آیات میں ان کی خصوصیات کو بیان کیا ہے کہ یہ وہ ہیں جن پر اللہ کے انعامات ہوئے، یہ مبتداء تھے اور (اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ) والا جملہ اس مبتداء کی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر قسم کی نعمات اتاری یہ سب اہل سعادت اور کامیاب تھے ان میں کسی قسم کی بدبختی نہ تھی ان کو کوئی مکروہ و ناپسندیدگی والی بات نہ ہے۔

اللہ نے فرمایا: جن کا نام ہم نے لیا ہے یہ مثالیں اور نمونے ہیں کہ خداوند نے ان انبیاء پر انعام کیا ہے یہ سب وہ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں اور اللہ کا انتخاب ہیں یہ سب حضرت آدمؑ

کی ذریت ہیں، اور ان میں سے ہیں جو نوحؑ کی کشتی میں سوار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ذریت میں برکت عطا فرمائی۔ سورہ صافات میں ہے "ہم نے ان کی اولاد کو زمین پر باقی رکھا" نیز ابراہیم اور یعقوب (اسرائیل) کی اولاد بھی یہ سب بھی حضرت آدمؑ کی ذریت ہیں۔ عام کے بعد خاص کا ذکر کر دیا ہے۔ شاید یہ اشارہ اس امر کی طرف ہو کہ نوع بشر میں نبوت کی سعادت و برکت ہے۔ پے در پے نازل ہوئی، ایک کے بعد دوسرا نبی، ان میں سے بعض پر انعام الٰہی ہوا، ایک گروہ ہے جن پر خداوند نے خصوصی تفضل فرمایا ان کو منتخب کیا، انہیں چُن لیا جبکہ وہ انبیاء سے نہیں۔

ان سب افراد کی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر جب بھی ہماری آیات کی تلاوت ہوئی تو وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ روتے ہوئے زمین پر سجدہ میں گر جاتے۔

سورۂ حمد میں بھی یہ ہے کہ یہ وہ افراد ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے یہ وہ ہیں جو (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ) ہیں۔

سورہ انعام میں انہیں ہدایت یافتہ اور برکت والے کے عنوان سے بیان کیا ہے،[1] لہٰذا اصحاب صراط مستقیم وہ ہیں جو انعام یافتہ ہیں اور جو صراط مستقیم پر نہیں وہ غضب الٰہی میں ہیں، گمراہ ہیں۔ جو انعام یافتہ ہیں وہ اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کی ملاوٹ نہیں کرتے۔ سعادت کے راستہ کو عبور کرتے ہیں، حق پر باقی رہتے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۟ۙ ﴿۵۹﴾

---

[1]۔ سورہ انعام آیت ۸۲۔

''پھر ان کی جگہ ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز ضائع کی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پھر عنقریب گمراہی کی سزا پائیں گے''۔

بدکردار جانشینوں کے بارے

انسان اپنے پیچھے دو طرح کے جانشین چھوڑتا ہے:

ا۔ نیک و صالح، جو اپنے آباء کی نیک نامی کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ بدکردار، جو اپنے نیک آباء کی بدنامی کا سبب بنتے ہیں۔

انبیاء نے ہمیشہ اپنے لیے ایسے جانشینوں کی آرزو کی جو ان کے راستہ کو باقی رکھیں۔

اس آیت میں ایسے جانشینوں کی بات ہو رہی ہے تو نماز کو ضائع کر دیں گے۔ نماز جو کہ عبد اور رب کا رابطہ ہے اور اطاعت الٰہی کا مظہر ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اللہ کی اطاعت چھوڑ دیں گے، فسادی ہوں گے، بے راہ ہوں گے، اپنی خواہشات کے پیرو ہوں گے، اللہ نے جن پر انعامات کیے تھے لیکن جب وہ چلے گئے تو ان کے جانشین ایسی اقوام آئیں جو گمراہ تھے، ذکر خدا کو ترک کر دیا، شہوات کی پیروی نے انہیں تباہی میں ڈال دیا، قیامت کا دن حقائق کو کشف کرنے کا جہان ہے وہاں پر یہ لوگ اپنی گمراہی سے آگاہ ہوں گے لیکن اس جگہ انہیں اس کا کچھ فائدہ نہ ہو گا۔

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَ لَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ۙ﴿۶۰﴾

''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے سو وہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا''۔

ایمان اور توبہ کرنے والوں کا انجام

اس آیت میں سابقہ آیت کا استثناء ہے۔ پچھلی آیت میں تھا کہ جنہوں نے نماز کو ضائع کیا، اللہ کی اطاعت چھوڑ دی، خواہشات کی پیروی کی، فسادی ہو گئے وہ گمراہی میں چلے گئے اور بد بختی ان کا انجام ہوا۔ ان کے مدمقابل وہ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کرلی، اللہ پر ایمان لے آئے اور نیک اعمال بجالائے۔ اس کا نتیجہ انہیں جنت الفردوس میں جانے کا حکم ملے گا ان پر زیادتی نہ ہو گی کیونکہ انہوں نے صحیح عقیدہ کو عمل صالح سے ملایا، ایمان اور عمل صالح کو اکٹھا رکھا، عمل صالح در حقیقت ایمان کے تقاضا کو پورا کرتا ہے۔ یہ لوگ ان کے ساتھ ملحق ہوں گے جن پر ماضی میں اللہ کا ان پر انعام ہوا تھا ان کا حصہ نہیں ہوں گے یہ لوگ اپنے عقیدے اور عمل کا پورا پورا بدلہ پائیں گے۔[1]

جَنّٰتِ عَدۡنِ ِۣ الَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ وَعۡدُہٗ مَاۡتِیًّا ﴿۶۱﴾

”ہمیشگی کے باغوں میں جن کا رحمان نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے جو ان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے، بے شک اس کا وعدہ پورا ہونے والا ہے“۔

ہمیشہ کی جنت

عدن کا معنی اقامت ہے اور اس میں ہمیشگی اور جاودانگی بھی ہے۔ غیب کا وعدہ، یعنی

---

[1] - جیسا کہ سورۂ نساء آیت ۶۹ میں آیا ہے: ”وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿ؕ۶۹﴾“ ”اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ انبیاء، صدیقین، گواہوں اور صالحین کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں“۔

ایسا وعدہ جسے ابھی دیکھا نہیں گیا اور وعدہ ماتی ایسا وعدہ جس نے ہر صورت پورا ہونا ہے۔

اس آیت میں اس بہشت کا وصف بیان کیا جارہا ہے جس کا تذکرہ اس سے پہلے والی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ بیان کیا ہے کہ جاودانی بہشتیں ہیں یہ وہ ہیں جو اللہ کا وعدہ ہے اللہ جو کہ رحمٰن ہے۔ اپنے بندگان کو جس کا اس نے وعدہ کیا ہے ایسا وعدہ جسے ان لوگوں نے دیکھا نہیں ہے لیکن اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوگا۔ اس میں کچھ بھی باقی نہ ہوگا۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۲﴾

”اس میں سوائے سلام کے کوئی فضول بات نہ سنیں گے، اور انہیں وہاں صبح و شام کھانا ملے گا“۔

بہشت کی خصوصیات

لغو ایسی کلام جو بے فائدہ ہو، بہشتیوں کی کیفیت ایسی ہو گی کہ وہ بہشت میں کبھی بھی کوئی غلط اور بے ہودہ بات نہ سنیں گے، بہشتی سوائے سلام کے اور کچھ نہ بولیں گئے یہ استثناء منفصل ہے ”سلام“ امن کے معنی میں ہے جب کوئی شخص کسی کو سلام کرتا ہے تو اسے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ تم مجھ سے کبھی بھی برائی نہ دیکھو گے، مطمئن رہو، میں تمہارے لیے خیر وعافیت چاہتا ہوں، تجھ سے ہر برائی دُور رہے۔ [1]

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

[1]۔ سورہ واقعہ میں ہے ”اس جگہ کچھ بھی لغو نہ سنو گے اور نہ ہی برائی ہو گی نہ گناہ کی بات سنیں گے اور وہ ہو گا: سلاماً سلاماً۔

"یہ وہ جنت ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اس کو وارث بنائیں گے جو پرہیزگار ہوگا"۔

بہشت کا ارث میں ملنا

وراثت کسی کے مرنے کے بعد جو کچھ ملتا ہے اس جگہ جنت کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ انہیں ارث میں ملے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہشت اس لیے خلق کی گئ کہ اس میں سارے بندگان آئیں، جب کچھ بندگان اپنے گناہوں کی وجہ سے بہشت میں نہ آئیں گے تو ان کی جگہ انہیں دی جائے جو نیک اعمال کریں گے، مومن ہوں گے، شہوات کی پیروی نہ کریں گے، نمازی ہوں گے، کیونکہ بہشت فقط متقین کے لیے ہے، پس یہ متقین ان کی جگہ کو بھی لے لیں گے جو اس جگہ نہیں آئے۔ اس لیے یہ کہا کہ ان نافرمانوں کے لیے جو کچھ تھا وہ ہم ان نیک لوگوں کو دے دیں گے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ﴿٦٤﴾

"اور ہم تیرے رب کے حکم کے سوا نہیں اترتے، اسی کا ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، اور تیرا رب بھولنے والا نہیں"۔

فرشتوں کی حقیقت

تنزل کا معنی ہوتا ہے آہستہ آہستہ دقیقہ دقیقہ اوپر سے نیچے آنا، فرشتوں کی زبان سے فرشتوں بارے بتایا گیا:

- فرشتے وقفے وقفے سے اُترتے ہیں۔
- فرشتے اللہ کے حکم سے آتے ہیں۔
- فرشتوں کے پاس جو کچھ ہے اللہ کی جانب سے ہے۔
- فرشتے اپنے پاس سے کچھ اختیار نہیں رکھتے۔
- فرشتوں پر حقیقی تصرف اللہ کا ہے۔
- اللہ فرشتوں کا مالک ہے اور فرشتوں کے متعلقات کا بھی مالک ہے ان کے وجود کے متعلق اس کے بعد کے متعلقات بھی اللہ سے متعلق ہیں، اسی وجہ سے ان کا زمین پر اُترنا یا نہ آنا یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
- اللہ اپنے ملک سے کچھ بھی فراموش نہیں کرتا، اللہ کو اپنی تمام مخلوقات اور ان کے جو متعلقات ہیں سب کا علم ہے۔

اللہ اپنی مخلوقات کی تدبیر و تقدیر اور ان سے کام لینے میں کسی قسم کا خلل نہیں آنے دیتا اور نہ ہی کسی کو بھولا جاتا ہے۔ جہاں ضروری ہوتا ہے وہاں پر ان کو بھیجتا ہے۔ جہاں ضروری نہیں ہوتا اللہ فرشتگان کو نہیں بھیجتا ہے۔ یہ سب اللہ کا اختیار ہے، جب چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے جب مصلحت نہیں ہوتی تو وحی نہیں بھیجتا۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فَاعۡبُدۡہُ وَ اصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ ؕ ہَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ﴿۶۵﴾

''آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جو چیز ان کے درمیان ہے سو اسی کی عبادت کر اور اسی کی عبادت پر قائم رہ، کیا تیرے علم میں اس جیسا کوئی اور ہے''۔

اللہ کی عبادت

اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس حکم کے ساتھ اس کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اللہ جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور وہ ہی آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے اس کا بھی مالک ہے اس سے

- ایک بات یہ واضح ہو گئی کہ فرشتوں کا مالک بھی اللہ ہے۔
- اللہ اپنی مخلوقات کے بارے فراموش کار نہیں ہے کیونکہ جو کسی چیز کا رب ہوتا ہے وہ اس کا مالک اور مدبر ہوتا ہے۔ اس کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے، اپنی مخلوقات بارے مکمل احاطہ ربوبیت کے لوازمات سے ہے۔ اسی طرح عدم نسیان کا تعلق بھی ربوبیت سے ہے۔ جب رب ہے تو پھر فراموشی کیسی؟

آیت کا دوسرا حصہ آیت کے پہلے حصہ پر قائم ہے۔ اب جب یہ طے ہے کہ فرشتگان اللہ کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔

ہم نے اس قرآن کو تیرے اوپر نازل کیا ہے۔ لہٰذا آپ کو چاہیے کہ اپنے رب کی عبادت کر، اسے سب کچھ جانو۔ اللہ کی عبادت و پرستش کرنے میں صبر سے کام لو کیونکہ اس کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔ وہ تیرا رب ہو اللہ ہی تیرا رب ہے۔

سوال کیا ہے کہ کیا تمہارے سامنے کوئی ایسا ہے جس میں اللہ والی صفات موجود ہوں یا وہ اس کا عامل ہو کہ اسے اللہ کا نام دیا جاسکے جب کوئی بھی اس کا مثل نہیں ہے تو کس طرح تم کسی اور کی عبادت کر سکتے ہو؟

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾

''اور انسان کہتا ہے جب میں مر جاؤں گا تو کیا پھر زندہ کرکے نکالا جاؤں گا''۔

معاد کا انکار کرنے والے کی بات

اس آیت سے لے کر چھٹی آیت تک (یہ چھ آیات) اس حوالے سے ہیں کہ جو انسان معاد کا انکار کرتا ہے اس کی بات کیا ہے انسان کہتا ہے کہ معاد نہ ہے کیونکہ جب انسان مر جائے گا اور اسے قبر میں ڈال دیا جائے گا تو پھر وہ کس طرح اس قبر سے دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ رب جس نے انسان کو قوت عقل سے نوازا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ نے اسے لاشئی سے (کچھ نہ تھا) خلق کیا ہے تو پھر وہ کس طرح قیامت کے دن دوبارہ زندہ کو بعید قرار دیتا ہے۔ اس آیت میں لفظ انسان کو استعمال کیا ہے کہ انسان کی طرف سے مسلسل اس کا انکار ہے وہ چاہتا ہے کہ الٰہی نظام تبدیل ہو جائے۔ احکام اور شرائع جو اللہ کے ہیں تبدیل ہو جائیں، وہ چاہتا ہے زبان سے اور عمل میں انکار ہے۔

اَوَ لَا یَذۡکُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰہُ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ یَکُ شَیۡـًٔا ﴿۶۷﴾

''کیا انسان کو یاد نہیں ہے کہ اس سے پہلے ہم نے اسے بنایا تھا اور وہ کوئی چیز بھی نہ تھا''۔

فَوَ رَبِّکَ لَنَحۡشُرَنَّہُمۡ وَ الشَّیٰطِیۡنَ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّہُمۡ حَوۡلَ جَہَنَّمَ جِثِیًّا ﴿ۚ۶۸﴾

''سو تیرے رب کی قسم ہے ہم انہیں اور ان کے شیطانوں کو ضرور جمع کریں گے پھر ہم انہیں گھٹنوں پر گرے ہوئے دوزخ کے گرد حاضر کریں گے''۔

ثُمَّ لَنَنۡزِعَنَّ مِنۡ کُلِّ شِیۡعَۃٍ اَیُّہُمۡ اَشَدُّ عَلَی الرَّحۡمٰنِ عِتِیًّا ﴿ۚ۶۹﴾

''پھر ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو الگ کرلیں گے جو اللہ سے بہت ہی سرکش تھے''۔

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۝

''پھر ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو دوزخ میں جانے کے زیادہ مستحق ہیں''۔

منکرین معاد کا انجام

ان چند آیات میں جو معاد و قیامت کے منکر ہیں انہیں جواب دیا گیا ہے اور ان کا انجام بھی بتایا گیا ہے جو کچھ اس طرح ہے:۔

- پہلی بات یہ ہے کہ اے انسان جب ہم نے تجھے اس وقت پیدا کیا جب تم کچھ نہ تھے تو پھر تجھے دوبارہ خلق کرنا کس طرح ہمارے لیے مشکل ہے؟

بہترین عقلی دلیل معاد کی یہی ہے کہ جب لاشئی سے خلق کیا ہے تو پھر دوبارہ خلق کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سورہ یٰسین آیت ۷۹ میں ہے:

''اے رسول ان کو کہہ دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ خلق کیا ہے''۔

- جو معاد کا انکار کرتے ہیں جب قیامت کے دن وارد ہوں گے تو ہم ان کو شیاطین کے ساتھ محشور کریں گے۔ کافروں کے اولیاء دنیا میں شیاطین ہیں۔ ذلت و رسوائی کے ساتھ انہیں گھٹنوں کے بل جہنم میں ڈالا جائے گا۔ گروہ گروہ، دستہ دستہ جہنم میں انہیں پھینکا جائے گا۔
- ان مجرموں کے گروہ بنائے جائیں گے۔ ان میں جو زیادہ سرکشی کرنے والے ہوں گے ان کو دوسروں سے علیحدہ کیا جائے گا، ان کی سزا دوسروں سے زیادہ ہو گی۔

- جہنم میں طبقات و درجات ہیں، ایک طبقہ میں سزا یافتہ دوسرے طبقہ سے شدید تر ہیں۔ اللہ فرمارہا ہے کہ ہم بہتر جانتے ہیں کہ کون سا گروہ کتنے عذاب کا مستحق ہے اور کس کو کس قدر شدید عذاب دینا ہے۔ ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دیا جائے گا اور اللہ کا ہر ایسا امر بالکل مشتبہ نہ ہے۔

وَ اِنۡ مِّنۡکُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتۡمًا مَّقۡضِیًّا ﴿۷۱﴾

"اور تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا اس پر گزر نہ ہو، یہ تیرے رب پر لازم مقرر کیا ہوا ہے"۔

ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡهَا جِثِیًّا ﴿۷۲﴾

"پھر ہم انہیں بچالیں گے جو ڈرتے ہیں اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں پر گرے ہوئے چھوڑ دیں گے"۔

سب کا پل صراط سے گزرنا

اس آیت کا خطاب عام ہے اور مومن و کافر سب کے لیے ہے۔ ایک دفعہ جہنم ان کے سامنے آئے گی، یا سب لوگوں کو جہنم کے سامنے لایا جائے گا۔ اس سے قریب سے گزرنا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک معنی قصد اور ارادہ کرنا بھی ہے۔[1] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ تم

[1]۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ پل صراط سے سب گزریں گے، پل صراط کے نیچے جہنم ہوگی، مجرمین پل صراط سے نیچے جہنم میں گرتے جائیں گے۔ مجرموں کو جہنم اپنے اندر لے لے گی جبکہ مومنین برق رفتاری سے اس کے قریب سے گزر جائیں گے۔ آتش جہنم انہیں کچھ بھی نقصان نہیں دے گی بلکہ وہ اس کی تپش تک محسوس نہ کریں گے۔

سب جہنم کے کنارے پر لائے جاوگے۔[1]

- اللہ کا فیصلہ حتمی ہے اس کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا اور کوئی بھی نہیں جو اللہ پر حکم چلائے سب پر اللہ کا حکم چلتا ہے۔
- تقویٰ اختیار کرنے والے جہنم سے بچ جائیں گے۔ متقین کو آتش جہنم میں داخل ہونے سے نجات مل جائے گی۔ جہنم کے قریب سے گزریں گے لیکن اللہ کے حکم سے انہیں جہنم سے آزادی دی جائے گی۔ مومن و کافر سب کو جہنم پر وارد کیا جائے گا جس طرح پیاسے جانور پانی کے لیے گھاٹ پر پہنچتے ہیں۔ جب جہنم کے کنارے پہنچیں گے لیکن متقین کو نجات ملے گی اور مجرموں کو جہنم میں پوری ذلت وخوارگی کے ساتھ پھینک دیا جائے گا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾

"اور جب انہیں ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کافر ایمان داروں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں سے کس کا مرتبہ بہتر ہے اور محفل کس کی اچھی ہے"۔

[1]۔ تفسیر قمی میں اس آیت کے ضمن میں حسین بن ابی علاء نے امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ عرب کہتے ہیں: فلانی قبیلہ پر وارد ہوا، یعنی ان کے قریب پہنچا، نہ یہ کہ ان پر داخل ہوا۔
مجمع البیان جلد ۳ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگ جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے اور اس کے بعد وہاں سے نکل جائیں گے، جہنم سے باہر نکلنے میں جلدی اور دیر لگنے کا دارومدار انسان کے اعمال پر ہے۔

اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے

اللہ کی جانب سے لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح اور روشن نشانیاں بھیجی جاتی ہیں ان روشن نشانیوں کو دیکھ کر ایمان لانے کی بجائے کافروں کا رویہ عجیب ہے کہ وہ الٹے مومنوں سے کہتے ہیں کہ ہم دیکھ لیں گے کہ آگے کس کی جگہ بہتر اور کس کا ٹھانہ بہتر ہو گا یعنی اس دنیا میں ہمارا ٹھکانہ بہتر ہے۔ ہمارا گھر تم سے بہتر ہے، دنیا کی زندگی میں ہمارے حالات تم سے بہتر ہیں۔ سعادت و خوش بختی ہمارے حصہ میں ہے، تمہارے پاس کیا ہے کیا تمہارے لیے سعادت دُنیاوی اور مادی زندگی سے بہرہ ور ہونا نصیب ہے ہم ہی تو تم سے بہتر ہیں۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءْيًا ﴿۷۴﴾

"اور ہم ان سے پہلے کتنی جماعتیں ہلاک کر چکے ہیں وہ سامان اور نمود میں بہتر تھے"۔

کافروں کے بیان کا جواب

کافروں نے پہلی آیت میں یہ کہا مومنوں پر احتجاج کیا کہ ہم دُنیا میں تم سے بہتر حالت میں ہیں۔ اس سے وہ اخروی جہان کے بارے غفلت کا شکار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں کہا ہے کہ کتنے زیادہ گروہ تھے جن کے پاس مال بھی بہت تھا، ان کے محلات بھی بڑے بڑے تھے، ان کا منظر بھی بہتر تھا، ان سب کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

دُنیا، دار اِقامت نہیں ہے اس کی متاع فانی ہے، آخرت دار البقاء ہے انسان کی دُنیاوی سعادت محدود مدت کے لیے ہے اس کا عرصہ تھوڑا ہے، آخرت کی ابدیت کے مقابلہ میں اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔

اسی قسم کی بات فرعون سے بھی نقل ہوئی ہے وہ کہتا تھا کہ میں مصر کا بادشاہ ہوں،

ملک میں پانی، دریا، سمندر سب جاری ہیں، سب میرے کنٹرول میں ہیں۔ میں اس مرد (موسیٰ) سے بہتر ہوں۔ اللہ نے ان سب کو غرق کر دیا اور ان کا انجام آتش جہنم ہوا۔[1]

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

''کہہ دو جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے سو اللہ بھی اسے ڈھیل دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھیں گے جس کا انہیں نے وعدہ دیا گیا تھا یا عذاب یا قیامت، تب معلوم کر لیں گے مرتبے میں کون برا ہے اور لشکر کس کا کمزور ہے''۔

گمراہوں کے لیے واضح اعلان

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو افراد گمراہی پر باقی رہتے ہیں اور ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ایسے افراد کے لیے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسی حالت پر باقی رکھے اور جس حالت میں وہ ہیں اسے جاری رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی گمراہی کے اسباب کو باقی رکھتا ہے، جیسے دُنیاوی نعمات کو ان کے لیے باقی رکھتا ہے اور وہ اسی مادی عیش میں غرق رہتے ہیں اور پوری طرح حق سے منہ موڑے رکھتے ہیں۔ نتیجہ میں یا تو دُنیاوی عذاب ان پر آجائے گا (جیسے اللہ تعالیٰ نے بعض اقوام کو دُنیا میں عذاب بھیج کر ہلاک کیا) یا پھر قیامت کے دن کا مشاہدہ کریں گے جو اچانک آجائے گا۔ اس وقت ان کے لیے حقیقت روشن ہو جائے گی۔ اس وقت ان پر یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ کون سے گروہ کا ٹھکانہ

---

[1]۔ سورہ زخرف، آیت: ۵۱ تا ۵۶۔

دوسرے سے بہتر ہے اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ کونسا گروہ دوسرے سے زیادہ کمزور ہے۔ یعنی ان پر واضح ہوگا جو اللہ پر ایمان لاتے تھے وہ ان سے بہتر جگہ پر ہیں اور جن کو وہ کمزور خیال کرتے آج (قیامت کے دن) وہی طاقتور اور غالب گروہ ہے۔ لیکن اس وقت ان پر سارے حقائق کا روشن ہو جانا ان کو کچھ فائدہ نہ دے گا اور نہ ہی ان کا یہ جان لینا انہیں دوزخ کی آگ سے بچاسکے گا کیونکہ اللہ کے سوا کسی کے لیے کوئی یاور و مددگار نہیں ہے اور نہ ہی ان کے لیے کوئی لشکر ہے جو ان کا دفاع کرسکے۔

آیت کے ظاہری معنی سے واضح ہو رہا ہے کہ اس میں عذاب سے مراد دُنیاوی عذاب ہے جیسے کفار مکہ کہ دُنیا میں ان کو بدر والے کنوئیں میں دفن ہونا پڑا اور جنگ بدر میں دُنیاوی عذاب ان کی ہلاکت کی صورت میں سامنے آیا اور انہیں پتہ چل گیا کہ ان کا ٹھکانہ برا ٹھکانہ ہے اور ان کا گروہ کمزور ہے جبکہ قیامت کے دن ان کا بدترین ٹھکانہ آتش جہنم ہی ہے یہ آیات قریش مکہ کی جنگ بدر میں شکست کھانے کے بعد نازل ہوئیں۔ اس میں مخاطب قریش مکہ کے سردار ہیں جو مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم تم سے بہتر جگہ پر رہتے ہیں اور تم سے زیادہ طاقتور ہیں۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

''اور جو لوگ ہدایت پر ہیں اللہ انہیں زیادہ ہدایت دیتا ہے، اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے نزدیک ثواب اور انجام کے لحاظ سے بہت ہی بہتر ہیں''۔

صالح مومنین کے لیے اللہ کا انعام

کافروں و مشرکوں کے مقابل میں مومنین صالحین کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ہدایت یافتہ ہیں، صاحبان ایمان ہیں تو اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے یہ ہدایت الٰہی اس

لیے ہے کہ وہ حق اور ایمان پر پوری توجہ سے نیک اعمال بجالاتے ہیں۔ باقیات صالحات[1] کے لحاظ سے بہتر ہیں اور واپسی کی جو جگہ ہے جو ان کے لیے اصل ٹھکانہ ہے وہ اس دُنیا کے ٹھکانوں سے بہترین ہے۔ ان کے لیے بہشت جاودانی ہے جس کی نعمات زوال پذیر نہیں ہیں۔ یہ نعمات ان نعمات سے بہتر ہیں جو کافروں کو دُنیا میں ملتی ہیں۔ اللہ کے ہاں اس فیصلہ میں کوئی خطاء نہیں ہے اور نہ ہی بھول ہے۔ یہ ان کافروں کو جواب ہے جو دعویدار تھے کہ ان کی دُنیا میں بہتر حالت تھی، وہ خوشحال ہیں اور خود کو مومنین سے بالاتر سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب دیا ہے۔

اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ کَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوۡتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہتا ہے کہ مجھے ضرور مال اور اولاد ملے گی''۔[2]

اَطَّلَعَ الۡغَیۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا ﴿۷۸﴾

''کیا اس نے غیب پر اطلاع پائی ہے یا اس نے اللہ سے اقرار لے رکھا ہے''۔

---

[1]۔ روایات کی روشنی میں باقیات الصالحات کے مصادیق میں سے کچھ مصادیق یہ ہیں: صالح اولاد، عام المنفعۃ کام اور نفع بخش علم۔۔۔۔(مترجم)

[2]۔ تفسیر قمی جلد ۲؛ تفسیر روح المعانی جلد ۱۶ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ یہ روایت عاص بن وائل کے بارے نازل ہوئی ہے۔ وہ خباب بن ارت کا مقروض تھا۔ جب خباب نے اپنا قرضہ مانگا تو اس نے کہا کہ میں تمہارا قرضہ بہشت میں تمہیں دوں گا۔ کیونکہ اللہ کی قسم میں بہشت میں دنیا سے بھی زیادہ مالدار ہوں گا۔

کافروں کے منہ زور بیانات کا جواب

اتنے سارے واضح اور روشن دلائل جو ہماری آیات (اللہ کی آیات) کی حقانیت پر ثبوت ہیں اس کے باوجود بعض منکرین نے جب کافروں کی یہ بات سنی تو گویا انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ اللہ پر ایمان لانے میں نحوست ہے جس کی وجہ سے مومنین فقیر ہیں۔ لہٰذا اللہ کا شریک ٹھہرانے میں برکت اور عبودیت ہے کہ کافروں اور مشرکوں کی اکثریت مالدار ہے اور دُنیا میں ان کے لیے خیر و سعادت ہے۔ اس لیے اس منکر نے یہ کہا کہ میں بھی الٰہی آیات کا انکار کر کے دُنیا میں سعادت مند ہو جاؤں گا اور ہم نے ہم ملک مشرکوں کی مانند میرے لیے اولاد بھی زیادہ ہو گی اور مال بھی بہت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس منکر کی بات کا جواب دیا ہے کہ کیا اس شخص کے پاس غیب کی خبر ہے یا اللہ تعالیٰ نے اس سے عہد و پیمان باندھ لیا ہے کہ اس قاطعیت اور حمیت کے ساتھ ایسا اعلان کر رہا ہے کہ میں مالدار ہو جاؤں گا اور صاحب اولاد کثیر بھی ہوں گا۔ استفہام انکاری کے ذریعہ اس کے علاوہ اس کی نفی کی ہے کہ جس کے پاس غیب ہے کوئی ایسی خبر آئی ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے اس کا کوئی عہد و پیمان ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔ ایسا ہر گز نہیں ہے۔

كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾

"ہر گز نہیں، ہم لکھ لیتے ہیں جو کچھ وہ کہتا ہے اور اس کے لیے عذاب بڑھاتے جاتے ہیں"۔

وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾

"اور ہم اس کے وارث ہوں گے جو کچھ وہ کہتا ہے اور ہمارے ہاں تنہا آئے گا"۔

حق کا انکار کرنے والے کا جواب

کلا کا لفظ ڈانٹ ڈپٹ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ غلط ہے۔ اللہ کی آیات کا انکار اور اللہ کا کفر اختیار کرنا مال و دولت اور اولاد و آل میں اضافہ کا سبب نہ ہے کیونکہ اس شخص کا اعلان یہ تھا کہ وہ کفر اختیار کرتا ہے تاکہ اس کا مال بھی زیادہ ہو جائے اور اس کی اولاد بھی زیادہ ہو بلکہ کفر کا اختیار کرنا عذاب کو اپنے لیے حاصل کرنا ہے۔ نیز اللہ نے فرمایا ہے ہم اسی کی بات کو اس کے حساب میں لکھ لیں گے اور اس کا اثر اسے پہنچے گا۔ ہر جھٹلانے والے شخص کے لیے جو عذاب ہے اس کے لیے یہ عذاب جاری و ساری رہے گا۔ وہ منکر جو بات کہہ رہا تھا کہ میں اللہ کا کفر اختیار کرکے مالدار ہو جاؤں گا اور صاحب اولاد ہوں گا تو اس کی بات ہمارے پاس محفوظ ہے اور یہ شخص ہمارے پاس تنہا آئے گا اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ بعض مفسرین اس منکر کی بات کو دُنیاوی مال کو قرار نہیں دیتے بلکہ اسے قیامت کی طرف پلٹایا ہے لیکن ایسی تفسیر آیت کے سیاق سے سازگار نہیں ہے کیونکہ مشرکین کا معاد، بہشت اور دوزخ پر بالکل ایمان ہی نہ تھا۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾

''اور انہوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں''۔

مشرکین کے غلط خیالات کی نفی

مشرکین نے غیر خدا اپنے لیے معبود قرار دیے ہوئے تھے جو فرشتوں کی جنس سے، یا جنات سے یا مقدس انسانوں سے یا جابر بادشاہوں سے انہیں اپنے لیے خدا بنا رکھا تھا۔ ان میں سے بہت سارے جابر حکمرانوں کے بارے قائل تھے کہ انہیں آسمان سے ایک تقدس و شان حاصل ہے۔ انہیں اپنے لیے خدا تصور کرتے تھے ان کا مقصد ان کو معبود بنانے کا یہ تھا کہ

یہ قیامت کے دن ان کے لیے سفارشی بنیں اور اللہ کے دربار میں ان کے لیے مددگار بنیں تاکہ اس طرح انہیں دُنیا کی عزت و مقام ملے اور یہ عزت ان کے لیے خیرات و برکات کو ان کی طرف کھینچ کر لے آئے اور ان سے شر و بدبختیوں کو دُور کر دے جبکہ وہ اس بات میں غلطی پر تھے۔

كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

''ہرگز نہیں، وہ جلد ہی ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے''۔

جھوٹے معبودوں کی عبادت کا انجام

جو لوگ جھوٹے معبودوں کے آگے جھکتے ہیں اور غیر اللہ سے اپنے لیے معبود بنا لیے ہیں اور خیال کرتے ہیں وہ ان کے لیے اللہ کے پاس سفارشی ہوں گے اور وہ ان سے تکالیف و مصائب کو دُور کریں گے تو بہت ہی جلد ایسا ہوگا کہ جن کو اُنہوں نے اپنے لیے معبود بنا رکھا تھا اور خیال کرتے تھے کہ وہ ان کے سفارشی ہوں گے اور مشکل وقت میں ان کی مدد کریں گے، وہ سب کے سب ان سے لاتعلّقی کا اعلان کریں گے اور بوقت ضرورت ان کی کچھ مدد نہ کریں گے۔ وہ دن ان کی بہت زیادہ پریشانی کا ہوگا اور جو کچھ یہ سوچتے اور خیال کرتے رہے وہ سب کے سب غلط ثابت ہوگا اور انہیں وہاں پر سمجھ آجائے گی کہ وہ جو کچھ کرتے رہے اور جن کو اُنہوں نے معبود بنایا تھا ان کے بارے جو کچھ خیال کرتے تھے وہ حقیقت پر مبنی نہ تھا سب ہی بے حقیقت تھا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾

''کیا تو نے نہیں دیکھا ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے وہ انھیں ابھارتے رہتے ہیں''۔

کافروں کے لیے شیاطین معاون و مددگار

مشرکین نے حق کا انکار کیا، الٰہی دعوت سے کفر اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی، ان کی مدد کے لیے شیاطین کو چھوڑ دیا تاکہ وہ انہیں اور شر و فساد میں دھکیل دیں جو بھی کفر و گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے، حق و حقیقت کا انکار کرتا ہے تو ان کے لیے شیاطین ہی سرپرست و پناہ گاہ بنتے ہیں، پھر وہ جدھر چاہتے ہیں انہیں کھینچ کر لے جاتے ہیں، کافرین پر شیاطین کو بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ کفر اختیار کرنے والوں کے لیے ان کا کفر ہی اس بات کا سبب بنا کہ ان کے پاس شیاطین کو بھیج دیا جائے۔

اس آیت سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ شیاطین انسانوں کے معبودوں میں سے معبود ہیں۔ اللہ کے اذن سے انہیں کافروں کے پاس بھیجا گیا تاکہ حق کے انکار کی وجہ سے انہیں باطل میں دھکیل دیں کیونکہ شیطانوں کے پاس بھی خود سے کوئی طاقت اور اختیار نہیں ہے کہ وہ خود سے کچھ کر سکیں بلکہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کا دیا ہوا، لیکن انہوں نے اپنی اس طاقت کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کیا۔

مثال: آگ میں جلانے کی صلاحیت اللہ نے رکھی ہے، جب کوئی چیز بغیر رکاوٹ کے آگ میں ڈالی جائے گی تو وہ جلے گی لیکن جلانے کی صلاحیت اللہ کی طرف سے دی گئی ہے اگر اللہ چاہے تو اس صلاحیت کو ختم کر سکتا ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ کے الاؤ میں پھینکا گیا تو اللہ نے اتنے بڑے آگ کے الاؤ کو نہ فقط آگ سے جلانے کی صلاحیت چھین لی بلکہ آگ کو ایسا ٹھنڈا کر دیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے سلامتی و عافیت کا سبب ہو۔

انسان جب کفر اختیار کرتا ہے اور اللہ کی آیات کا انکار کر دیتا ہے، اللہ کے رسول کا انکار

کرتا ہے تو اس کا یہ عمل سبب فراہم کرتا ہے کہ شیطان ان پر مسلط ہو جائے۔ اب شیطان کے پاس جو صلاحیت و اختیار ہے وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہے، وہ کافروں کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور انہیں گمراہی پر تحریک کرتے ہیں اور ان کو گمراہ رکھتے ہیں چنانچہ ان شیاطین کو اللہ ہی ان کافروں پر مسلط کرتا ہے اس تسلط کا سبب کافر خود بنتے ہیں۔

فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمۡ عَدًّا ۚ﴿۸۴﴾

''سو تو ان کے لیے عذاب کی جلدی نہ کر، ہم خود ان کے دن گن رہے ہیں''۔

کافروں پر عذاب لانے میں جلدی کی خواہش

اس جگہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو تسلی دے رہا ہے کہ ان لوگوں نے میرے سوا مختلف انواع و اقسام کے معبود بنا رکھے ہیں ان کے آگے جھکے ہوئے ہیں یہ خود اور ان کے معبود سب نے ہمارے پاس حاضر ہونا ہے۔ یہ ہمارے غلبہ و تسلط سے باہر نہیں ہیں ہم ان کی تمام حرکات و سکنات بلکہ سانسوں تک کا شمار کر رہے ہیں۔ آپ جلدی نہ کریں کہ ہم فوری ان کا کام تمام کر دیں ان کے دن پورے ہو جائیں گے اور وہ دن آجائے گا کہ جن کا ان کو وعدہ دیا گیا۔ اس دن ان کو ان کے کیے کی سزا دی جائے گی۔

زندگی کی گھڑیاں شمار کرنے کا مطلب اصل میں ان کے اعمال کو شمار کرنا ہے کہ ان کا نامہ عمل لکھا جا رہا ہے انسان کا دنیا میں قیام اس لیے ہے کہ اس کی رُوح کامل ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جو کچھ مقدر کیا ہے وہ اسے مل جائے۔ آخر تک اس کے اعمال کا حساب کیا جا رہا ہوتا ہے اگر وہ اس طرح سے دنیا میں زندگی گزارے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے قرار دیا ہے تو وہ اپنے آخری کمال کو پہنچ جاتا ہے اور اگر اس کے خلاف چلے گا تو پھر عذاب و بدبختی، زوال و سقوط اس کا مقدر ہے۔ اس سے فرار نہ کر پائے گا اور اسے کوئی فائدہ دینے والا نہ ہو گا۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾

''جس دن ہم پرہیزگاروں کے رحمان کے پاس مہمان بنا کر جمع کریں گے''۔

متقین کا انجام

جو لوگ صاحب تقویٰ ہیں، اللہ پر ایمان لائے، اعمال صالح بجالائے، اللہ کے قوانین پر عمل کیا، خود کو اللہ کی نافرمانی سے بچائے رکھا۔ جب یہ قیامت میں قبروں سے باہر آئیں گے تو ان کے آگے آگے نور جارہا ہوگا کہ جس طرح کوئی وفد بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، مومنین اسی طرح قیامت کے دن رب رحمان کے ہاں حاضر ہوں گے اور یہ ان کے لیے اعزاز ہوگا ان کو اس کی اجازت ملے گی کہ وہ رحمٰن کے ہاں حاضر ہوں۔

وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾

''اور گناہگاروں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے''۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

''کسی کو سفارش کا اختیار نہیں ہوگا مگر جس نے رحمان کے ہاں سے اجازت لی ہو''۔

مجرموں کا انجام

وہ لوگ جو مجرم ہیں اللہ کے نافرمان ہیں، نہ اللہ پر ایمان لائے اور نہ ہی اللہ کے قوانین پر عمل کیا تو ان کی حالت قیامت کے دن ایسی ہو گی جس طرح پیاسے شدت پیاس سے کسی جگہ پر جا پہنچتے ہیں تاکہ اپنی پیاس بجھا سکیں تو ان کی حالت ایسی ہو گی کہ انہیں ہانک کر جہنم کے کنارے پر پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ان کے جرائم کی وجہ سے ہو گا۔ آتش جہنم سے ان کی

تشنگی و پیاس بجھائی جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قیامت کے مجرم کسی قسم کی شفاعت کے مالک نہ ہوں گے کیونکہ اللہ کے پاس ان کے لیے کوئی عہد و پیمان نہ ہے کیونکہ اللہ کے ہاں عہد و پیمان اللہ پر ایمان لانا اور نبوت و رسالت کی تصدیق کرنا ہے؛ کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ انسان جس کو چاہے اپنا دوست بنالے اور پھر وہ دوست اس کے لیے شفاعت کرے، اپنی مرضی سے معبود بنالے اور وہ اس کی شفاعت کو آئے بلکہ شفاعت کا حق ان کے لیے جس کا اللہ سے معاہدہ ہے یعنی جو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اعمال صالح بجالائے ہیں۔

بعض مفسرین[1] نے اس عہد سے مراد اس شفاعت کے وعدہ کو لیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل و آئمہ اہل البیت علیہم السلام، اپنے اولیاء اور مومنین و فرشتگان کے لیے دے رکھا ہے۔ لیکن پہلا معنی بہتر ہے کہ اس جگہ اللہ سے عہد مراد ہے کہ جو اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾

"اور کہتے ہیں کہ رحمان نے بیٹا بنالیا"۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾

"البتہ تحقیق تم سخت بات زبان پر لائے ہو"۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾

"کہ جس سے ابھی آسمان پھٹ جائیں اور زمین چیری (پھٹ) جائے اور پہاڑ ٹکڑے ہو کر گر پڑیں"۔

---

[1]۔ مجمع البیان، جلد ۶۔

اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾

''اس لیے کہ انہوں نے رحمان کے لیے بیٹا تجویز کیا''۔

وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

''اور رحمان کی یہ شان نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے''۔

بت پرستوں کی افتراء پردازیاں

جو بت پرست تھے ان کے ہاں ایسا عقیدہ تھا کہ خاص کر عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ (آلِھا) جو کہ اِلٰہ کی جمع ہے یہ حقیقت میں لاھوت سے نکلا ہوا لفظ ہے، اسی جوہر و مادہ سے جو ان کے باپ (یعنی اللہ) میں ہے وہ ان میں بھی موجود ہے لہٰذا یہ لوگ اللہ کے لیے اولاد کے قائل نہیں بلکہ حقیقی جانتے ہیں، تمام معبودوں کو اللہ کی اولاد سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بے ہودہ بات کا جواب دیا کہ تمہاری یہ بات بہت ہی بری اور گھٹیا اور بہت ہی سخت ہے اس کے بہت ہی برے اثرات ہیں یہ بڑا گناہ اور بڑا بہتان ہے کہ زمین و آسمان و پہاڑ، کوہ و دمن سب اللہ کی مخلوقات اس الزام سے منزہ و بری ہیں اور اس گناہ کی سنگینی اس قدر ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑیں، زمین پھٹ جائے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اللہ کی شان میں ایسا نہیں کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہو، اللہ کی ذات اس سے بلند ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور نہ ہی اس سے بہتر ہوا ہے وہ مرکب نہیں، وہ ذات بسیط ہے، کمال مطلق ہے، مرکب نہیں ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان میں سے ایسا کوئی نہیں جو رحمان کا بندہ بن کر نہ آئے''۔

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾

''البتہ تحقیق اس نے انہیں شمار کر رکھا ہے اور ان کی گنتی گن رکھی ہے''۔

وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

''اور ہر ایک ان میں سے اس کے ہاں اکیلا آئے گا''۔

تمام مخلوقات اللہ کی اطاعت میں

آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات ہیں سب کی توجہ اپنے رب کی جانب ہے اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔ ہر لحاظ سے اللہ کے مملوک و عباد ہیں، وہ بالکل اپنے نفع و نقصان، اپنی موت و حیات کے مالک نہیں ہیں۔ حشر و نشر کا اختیار بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ سب رحمٰن کے تابع فرمان ہیں اس بات کا تعلق آخرت سے نہیں ہے بلکہ اسی دُنیا میں تمام موجودات عین فقر و عین حاجت ہیں ان کے ہاں رحمٰن کی بندگی کے سوا کوئی اور عنوان نہ ہے، انکے پاس اپنا کچھ بھی نہیں جو یہ رب تعالیٰ کے حضور پیش کر سکیں کیونکہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے تو وہی سب کا مالک ہے۔ جب مالک ہے تو سب کا رازق بھی وہی ہے، جب رزق اس نے دے رکھا ہے تو پھر قانون بھی اسی کا ہے۔ لہٰذا وہی رب ہے، اسی کی تدبیر ہے، اسی کا نظام ہے سب اس کے تحت ہیں، ساری مخلوقات عبودیت کی منزل پر ہیں اور تخلیقی اعتبار سے اللہ کے نظام حیات کے تحت اپنا اپنا کام کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں جو بھی وجودی آثار ہیں سب اللہ کے دیئے ہوئے ہیں۔

اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ ساری مخلوقات کی تعداد اللہ کے پاس ہے، سب کا شمار پوری طرح موجود ہے ہم ان کا شمار رکھتے ہیں اس کا معنی ان مخلوقات کی عبودیت کو ثابت کرنا ہے کیونکہ ان کی روزی، ان کے فرائض، بندگاں کے

تمام امور بندگی کی کتاب ثبت شدہ لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہی ان کی سرنوشت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

سب کے سب قیامت کے دن حق تعالیٰ کے پاس خالی ہاتھ حاضر ہوں گے، دُنیا میں بظاہر وہ جس حیثیت کے مالک تھے قیامت کے دن ان کے پاس سب کچھ بھی نہ ہوگا سب تنہاء اور خالی ہاتھ اکیلے اللہ کے حضور پیش ہوں گے، اللہ سے ملاقات کریں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

”بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے عنقریب رحمان ان کے لیے محبت پیدا کرے گا“۔

صاحبان ایمان کا امتیاز

جو لوگ ایمان لے آئے اور اُنہوں نے نیک اعمال انجام دیئے تو اللہ تعالیٰ دوسروں کے دلوں میں ان کے لیے مودت و محبت قرار دی ہے یا مراد یہ ہے کہ خود ان کے دلوں کو محبت کرنے والا قرار دیا ہے۔ اب یہ امتیاز دُنیا میں ہے یا آخرت میں تو اس بارے آیت خاموش ہے۔ مجمع البیان، جلد ۴، الدر المنثور، جلد ۴ میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے نازل ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السلام کی محبت مومنوں کے دلوں میں جاگزیں کر دی ہے۔ یہ آیت کا تاویلی معنی ہے لیکن آیت کا ظاہر عمومیت پر دلیل ہے جو اپنی جگہ پر باقی ہے۔ ایک خصوصی مصداق سے عموم کی نفی نہیں ہوئی۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

”سو ہم نے فرمان کو تیری زبان میں اس لیے آسان کیا ہے کہ تو اس سے پرہیزگاروں کو خوشخبری سنا دے اور جھگڑنے والوں کو ڈرا دے“۔

قرآن کی بقاء

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن جس حالت میں تھا اور جس حالت میں اب ہے یہ اللہ کے پاس اسی طرح ہی موجود ہے اور قرآن اس وقت جس صورت میں ہے کہ جسے پڑھا جا سکتا ہے اور واضح عربی الفاظ میں ہے جو انسانوں کے سمجھنے کے قابل ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح قرار نہ دیا ہوتا اور عربی زبان میں نہ اُتارا ہوتا تو لوگ اس سے کچھ بھی سمجھ نہ سکتے۔ قرآن الٰہی محضر اور اللہ کی جناب میں باقی و موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو پیغمبر اکرم ﷺ کی زبان میں جاری کیا جو کہ عربی ہے تاکہ یہ قرآن لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سادہ اور آسان زبان بیان میں پیغمبر اکرم ﷺ کی زبان پر جاری کیا ہے تاکہ پیغمبر اکرم ﷺ متقین کو جو اللہ کے اوامر پر عمل کرتے ہیں اور اللہ کی نواہی سے بچتے ہیں انہیں بشارت دیں اور جو اللہ کے انکاری ہیں، اللہ کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور بدترین دشمن ہیں، نافرمان ہیں، ضدی وہٹ دھرم ہیں ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

"اور ہم ان سے پہلے کئی جماعتیں ہلاک کر چکے ہیں کیا تو کسی کی ان میں سے آہٹ پاتا ہے یا ان کی بھنک سنتا ہے"۔

دشمنانِ خدا کا انجام

اس جگہ پیغمبر اکرم ﷺ کو خبر دی گئی ہے کہ دیکھو جو اللہ کے مخالف گذشتہ

صدیوں میں ہو گزرے ہیں، وہ مشرکین سے زیادہ تعداد میں زیادہ بھی تھے اور خود کو بہت ہی طاقتور بھی خیال کرتے تھے، لیکن ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا اور ان میں سے کسی کا نام ونشان نہیں رہا اور نہ ہی ان کے بارے کسی جگہ سے کوئی آواز آتی ہے؛ لہٰذا کوئی بھی اپنی دشمنی سے اللہ کو عاجز نہیں بنا سکتا۔

آج کے منکروں کو بھی معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہلاک کرنے پر بھی قادر ہے۔ اگر ان کو ہلاک نہیں کر رہا تو یہ انہیں اللہ کی طرف سے ڈھیل دی گئی ہے۔ وہ جب چاہے گا انہیں اپنی گرفت میں لے گا اور ان کا حشر بھی پہلے جیسوں کا سا ہو گا۔

سورۃ طٰہ

(مکی۔آیات 135)

اس سورت کے مطالب

بشارت دینا، مخالفین کو ڈرانا، رب تعالیٰ کے مخالفین کی ہلاکت کا بیان، عبرت آموز واقعات، انبیاء کا تذکرہ، جنت و جہنم میں جانے والوں کا بیان، ہدایت کا سامان، حضور پاک ﷺ کی شان کا بیان، اطاعت الٰہی واطاعت رسول ﷺ کے فائدے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰهٰ ۚ﴿۱﴾

"طا،ھا"۔

یہ حروف مقطعات میں سے ہیں۔ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ طٰہٰ بھی یٰسین کی طرح رسول اللہ ﷺ کے ناموں سے ہے۔ طی قبیلہ کی زبان میں محمد ﷺ کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے وَطَأَیَطَأُ سے قرار دیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ طٰہٰ کا معنی جس سے سورہ کا نام دیا گیا ہے؛ لیکن پھر کثرت سے استعمال ہونے کی وجہ سے یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام ہو گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ طٰہٰ میں لفظ طٰہ سے مراد ہے اے طالب حق، اور ھاء سے مراد ہے اے حق کی جانب ہدایت دینے والے (دونوں میں مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں)۔

ان الفاظ کے ذریعہ پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ اے میرے حبیب! تم اپنے دونوں قدم مضبوطی سے زمین پر رکھو، کیونکہ ایسا بیان نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نماز کی حالت میں ایک پاؤں اٹھا لیتے تھے اور دوسرے پاؤں پر کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ اللہ

تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے حبیب! دونوں پاؤں زمین پر رکھا کرو، ایک پاؤں پر کھڑے مت ہو کہ اس طرح تم زیادہ تھک جاؤ گے۔

بعض نے کہا کہ نماز کے حالت میں زیادہ دیر کھڑے رہنے سے آپ کے پاؤں میں ورم ہو گیا تھا، لہٰذا شدت درد کو کم کرنے کے لیے آپ ایک پاؤں کو نماز کی حالت میں اوپر اٹھا دیتے تھے۔ اللہ نے فرمایا: نہیں! آپ نماز کی حالت میں دونوں پاؤں زمین پر ہی رکھیں، ایک پاؤں کو اوپر بلند نہ کریں۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۙ﴿۲﴾

''ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم تکلیف اٹھاؤ''۔

یعنی تبلیغ کے راستہ میں خود کو مشقت میں مت ڈالو اور لوگوں کو حق کی طرف مائل کرنے کے لیے سختی، مشکل میں مت پڑو اور خود کو تکلیف میں نہ ڈالو، پریشانی میں نہ ڈالو۔

اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۙ﴿۳﴾

''بلکہ اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو ڈرتا ہے''۔

تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰى ؕ﴿۴﴾

''اس کی طرف سے نازل ہوا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا''۔

قرآن یادآوری کے لیے ہے

اس جگہ قرآن کی صفت ''تذکرہ'' بیان کی گئی ہے۔ تذکر، تذکرہ، تذکیر، کا معنی ہے کہ یہ ایک بات جو پہلے بیان ہو چکی ہو اسی بات کو دوبارہ یاد کرایا جائے۔ یاد دھانی کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی خلقت میں ہی دین کے کلیات اور اصولوں کو رکھ دیا ہے لیکن زمینی اور دُنیاوی زندگی سے انسان کی دلبستگی اتنی زیادہ ہو گئی کہ نفسانی خواہشات میں وہ

اس قدر غرق ہو گیا کہ وہ دینی حقائق کو بھول گیا اس طرح اللہ نے جو باتیں اس کی خلقت میں ودیعت کی تھیں وہ ان کو بھول گیا۔ نسیان، فراموشی، بھول اس قسم کا اعراض اور منہ موڑ لینا ایک طرح کی بے اعتنائی ہے، اسے مجازاً فراموشی کہا گیا۔ حقیقت میں تو نفسانی خواہشات اور معاملات میں مگن ہونے سے انسان نے اپنے فطری تقاضوں سے انحراف کر لیا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس اعراض اور انحراف کے انجام کی جانب متوجہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتا خود ہی اسے خوف آتا اور وہ اپنی فطرت کے تقاضا کو یاد کر لیتا اور فطری راستہ کو نہ چھوڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر مہربانی فرمائی، قرآن کو نازل فرمادیا تاکہ انسان کے لیے تذکر و یاد دہانی ہو، تاکہ حقائق کو سن کر ان کے باطن میں خشیت ایجاد ہو اور اس کے نتیجہ میں وہ ایمان لے آئیں اور تقویٰ اپنا لیں۔ یہ یاد آوری خشیت کے ظہور کا کم از کم سبب بنتا ہے۔

ان آیات شریفہ میں پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے کہ ہم نے قرآن آپ پر اس نیت سے نہیں نازل کیا کہ تم خود کو مشقت میں ڈالو بلکہ ہم نے اس غرض سے نازل کیا ہے تاکہ خشوع و خضوع رکھنے والوں کو یاد دہانی کراؤ۔

واضح بیان دیا کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے جو بلند و بالا آسمانوں کا خالق ہے، زمین کا خالق ہے یہ اس لیے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بلند شان کی جانب اشارہ ہو۔

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى ۝۵

''رحمان جو عرش پر جلوہ گر ہے''۔

اللہ کا عرش

عرش کا معنی تخت اور وہ جگہ جہاں بادشاہ بیٹھتا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اللہ کی ملکیت و حکمرانی کی وسعت کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ پورے عالَم پر اللہ کی حکمرانی ہے اور ہر شیٔ اللہ کی تدبیر وتقدیر سے موجود ہے۔ رحمٰن، رحمت کا مبالغہ ہے بہت

زیادہ رحمت دینے والا۔ افاضہ وجود اور پھر موجودات کو برقرار رکھنا اللہ کا نظام، تدبیر اور تقدیر یہ سب رحمت سے عبارت ہے۔ اللہ کا پورے عالمِ وجود پر تسلط و غلبہ واضح اور روشن ہے۔ اللہ کے مُلک و مملکت کا استقرار، اس کا قائم رہنا تمام اشیاء پر اس کی علویت و غلبیت تدبیرِ امور کے ذریعہ ہے اور ان کے تمام حالات کی درستگی اور ان کی احتیاجات کو پورا کرنے سے عبارت ہے۔ اللہ کا کائنات کی ہر شئی پر احاطہ ہے۔ اس کے ساتھ ہر طرح کی مماثلت دور ہے۔

استیلاء علی العرش سے ظاہری معنی مراد نہیں کہ اللہ کسی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے جیسا کہ بادشاہوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ اپنی سلطنت کے تخت پر بیٹھ کر احکام جاری کرتے ہیں بلکہ اس سے مقصود جو تخت پر بیٹھنے کی غرض ہوتا ہے وہ مراد ہے یعنی تمام موجوداتِ عالَم کے امور کی تدبیر اور ہر پہلو سے اور ہر اعتبار سے ان پر احاطہ ۔ سورہ اعراف کی آیت ۵۴ میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝٦

”اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ گیلی زمین کے نیچے ہے“۔

اللہ کی ملکیت کی وسعت

جو کچھ زمین پر پھیلا ہوا ہے جاندار ہو یا بے جان ہو اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے جو زمین کے اوپر ہے اور جو کچھ اس کے نیچے ہے چاہے وہ جو ہم جانتے ہیں اور وہ جسے ہم نہیں جانتے سب اللہ سبحان کا مُلک ہے۔ اس آیت میں ربوبیت کے بارے میں بیان ہے اور مالکیت والی آیت سے دوسرے معنی کی بات ہے اللہ ہی ہے جو پورے عالَم وجود پر مسلط و غالب ہے لھذا اسی کی اطاعت کی جائے ربوبیت اسی کی ہے اور الوھیت بھی اسی کی

ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ﴿۷﴾

اور اگر تو پکار کر بات کہے تو وہ پوشیدہ اور اس سے بھی زیادہ پوشیدہ کو جانتا ہے۔

علم الٰہی کی وسعت

اس آیت میں اللہ کے علم کی وسعت کو بیان کیا گیا ہے۔ علم الٰہی اللہ کی تدبیر کو ثابت کرتا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ کی مالکیت کی وسعت کا بیان تھا اس میں علم کی وسعت کا بیان ہے۔ کسی کی کوئی بات اللہ کے علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔ مالکیت کی وسعت علم کی وسعت سے ہے، اس سے اللہ کی مطلق ربوبیت کا اثبات ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴿۸﴾

''اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سب نام اچھے ہیں''۔

اللہ ہی تنہا معبود ہے

یہ بیان سابقہ بیان کا نتیجہ ہے جو اس پوری کائنات کا مالک ہے اور جس کے پاس ہر شئی کا علم ہے اور ہر ایک کی احتیاج سے بھی آگاہ ہے تو قانون اسی کا چلے گا جس کا قانون ہوتا ہے اسی کی اطاعت کی جاتی ہے۔ عبادت حقیقت میں احتیاج کا اظہار و اعلان ہوتا ہے۔ عابد معبود سے کہتا ہے کہ میں تیرا غلام ہوں توں میرا مالک ہے میری ساری احتیاجات کو پورا کرنے والا توں ہے۔ لہٰذا معبود وہی ہوگا جو ہر چیز کا مالک ہو، وہ کسی کا محتاج نہ ہو، سب اسی کے محتاج ہوں اور وہ ہر ایک کی احتیاجات سے آگاہ ہو اور وہ مقتدر ہو اس پر کسی کا اختیار نہ ہو۔ سب اسی کی تدبیر و تقدیر کے تحت ہو، سب کا وجود بھی اسی کی طرف سے ہو اور سب کی ضروریات بھی وہی پورا کر رہا ہو تو سوائے اللہ کے کوئی نہیں ہے لہٰذا اسی کے آگے جھکنا ہوگا اسی کی عبادت کرنا ہو

گی۔

اسماء اللہ کے فیضان پر دلالت کرتے ہیں جو اللہ نے بندگان پر کیا ہے اللہ ہادی ہے کہ بندگان کو ہدایت دیتا ہے اور خالق ہے سب کو اسی نے وجود عطا کیا ہے وہ رازق ہے سب کو وہی روزی فراہم کرتا ہے، وہ رحمٰن ہے کہ وہ سب پر رحمت کرتا ہے اسی طرح اللہ کے باقی اسماء ہیں۔

وَهَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿٩﴾

''اور کیا تجھے موسیٰ کی بات پہنچی ہے''۔

إِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوْٓا إِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿١٠﴾

''جب اس نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید کہ میں اس سے تمہارے پاس کوئی چنگاری لاؤں یا وہاں کوئی رہبر پاؤں''۔

حضرت موسیٰؑ کا واقعہ

اس جگہ سوال کے انداز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کا واقعہ بیان کرنا مقصود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کافی عرصہ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس رہے جو کہ مدائن میں رہتے تھے ،انہوں نے مصر واپسی کا ارادہ کر لیا تاکہ وہاں پر جا کر قوم بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی دلائیں۔ اپنے گھر والوں کو لے کر چلے، وادی طویٰ کے قریب طور سینا میں ایک رات کا واقعہ ہے رات بہت ہی سرد اور تاریک تھی، راستہ بھی گم کر چکے تھے انہوں نے طور کی دائیں جانب مبارک بقعہ میں آگ کی روشنی محسوس کی، اسے یہ خیال گزرا کہ اس کے قریب کسی کو موجود پائیں گے، اس سے راستہ پوچھیں گے اور اگر کوئی نہ بھی ہوا تو کم از کم کچھ

آگ وہاں سے اٹھا کر لے آئیں گے تاکہ سردی کا مداوا کر سکیں۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝۱۱

''پھر جب وہ اس کے پاس آئے تو آواز آئی کہ اے موسیٰ''۔

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۲

''میں تمہارا رب ہوں سو تم اپنی جوتیاں اتار دو، بے شک تم پاک وادی طویٰ میں ہو''۔

وادی طویٰ اور کوہ طور

طویٰ ایک جگہ کا نام ہے جو کوہ طور کے دامن میں موجود تھی، اللہ نے اس جگہ کو وادی مقدس قرار دیا ہے اور حکم دیا کہ اس وادی کے احترام میں جوتے اُتارنے کا حکم دیا گیا۔ اس وادی کے تقدس کا سبب یہ تھا کہ یہ جگہ اللہ سے مناجات اور قرب الٰہی کے حصول کی جگہ تھی۔[1]

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ کی روشنی جس جانب دیکھی تھی جب اس جانب بڑھنے لگے، جیسے قریب پہنچتے ہیں تو ایک نداء کو سنتے ہیں کہ میں تمہارا رب ہوں اب میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اے موسیٰ! اب تم میرے محضر میں آگئے ہو، اس وادی طویٰ کے مقدس ہونے کی وجہ الٰہی ہے۔ ادب واحترام کا تقاضا ہے کہ اب تم اپنے جوتے اسی جگہ اُتار دو، یہ جگہ طور سینا کے قریب واقع تھی۔

یہ کلام ہی اللہ کی بعینہٖ وحی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوئی اس طرح

---

[1]۔ بعض نے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ کا معنی اس طرح کیا ہے کہ موسیٰ سے کہا گیا کہ تم اپنے تمام دُنیاوی اور مادی تعلقات سے تعلق توڑ دو اب تم مقدس جگہ پر آگئے ہو اپنے رب سے مناجات اور راز و نیاز کرو!

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس وحی کے درمیان کوئی واسطہ نہ تھا. براہ راست موسیٰ نے اس آواز کو دریافت کیا جو بڑی واضح تھی۔ اسی بنیاد پر اسے مکالمہ کہا گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے آیا کہ:

وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۟ۚ

ترجمہ: ''اور اللہ نے موسیٰ سے خاص طور پر کلام فرمایا۔''[1]

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۟

''اور میں نے تجھے پسند کیا ہے جو کچھ وحی کی جارہی ہے اسے سن لو''۔

موسیٰؑ کے لیے نبوت کا عہدہ

اللہ کی طرف سے اسی جگہ پر اعلان ہوتا ہے کہ اے موسیٰ میں نے تجھے اپنی وحی کے لیے چُن لیا ہے لہٰذا جو کچھ وحی کی جائے، اسے غور سے سنو!۔ اس بیان سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے نبوت و رسالت کا منصب ایجاد کر دیا۔ اسی کے ساتھ ہی فرمان ہے کہ جو کچھ کہا جائے اسے غور سے سنو اور اس پر عمل کرو!

اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۟

''بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی بندگی کر، اور میری ہی یاد کے لیے نماز پڑھا کر''۔

موسیٰؑ کے لیے پہلا حکمنامہ

اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ تم میرے منتخب ہو، رسول و نبی

---

[1] ۔ سورہ نساء، آیت: ۱۶۴۔

ہو، جو وحی کی جائے اسے غور سے سنو اور اس پر عمل کرو۔ اب وحی کا آغاز در حقیقت رسالت و نبوت کے منصب کے بعد با قاعدہ پہلا حکم نامہ ہے۔

پہلی بات یہ بتائی ہے کہ میں ہی اللہ ہوں۔ ذات کے مشاہدہ سے وصف سے آشنا کیا گیا۔ یہ فرمایا کہ میں ہی اللہ ہوں اس کے بعد کلمہ توحید کی تعلیم دی کہ '' لا الہ الا انا ''۔

یہ جملہ الفاظ اور معنی میں سابقہ جملہ بر ترتیب ہے کہ جب ہر چیز کا آغاز اللہ سے ہے اور اس کے وجود سے ہر چیز کا قیام ہے اور اسی پر اس کا منتہاء ہے وہ ہر چیز کا آغاز ہے اور ہر چیز اس کے وجود سے قائم ہے، وہی سب کے امور کی تدبیر کرنے والا ہے جب ایسا ہے تو پھر اس کا کوئی جواز نہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کی جائے وہی الہ و معبود برحق ہے، لائق عبادت وہی ہے جس کی ہر چیز ہے، جو ہر چیز کا مالک و خالق ہے۔ اسی لیے حکم دیا کہ : اقم الصلاۃ لذ کری۔ تمام عبادات سے نماز کا ذکر کیا ہے، جس میں نماز کی اہمیت کو روشن کیا گیا ہے؛ کیونکہ نماز میں ہر طرح کی بندگی کا وجود ہے، اس میں ذکر خدا مجسم و مُمثّل ہوتا ہے۔ جس طرح ہر جسم میں رُوح ہے اسی طرح ذکر خدا کی حقیقت نماز سے ہی محقق ہوتی ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ اگر مجھے یاد کرنا ہے اور میری عبادت کرنا مقصود ہو تو پھر نماز قائم کرو کہ نماز ہی سے میرا ذکر ہوتا ہے، نماز ہی سے میری عبادت تحقق پذیر ہوتی ہے۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿١٥﴾

''بے شک قیامت آنے والی ہے میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جائے''۔

قیامت کے اَمر کا مخفی رکھا جانا

پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمان جاری کیا کہ تم

میری عبادت کرو اور نماز کو میرے ذکر کے لیے قائم کرو۔ جب ''فاعبدنی'' کہہ دیا تو پھر اطاعت کرنے والوں اور معصیت کرنے والوں میں امتیاز اور جدائی ضروری ہے۔ اگر فرق نہ ہو تو پھر عبادت کا حکم دینا تو بے فائدہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کا اَمر مخفی رکھا ہے کسی کو بھی اس کے وقت بارے آگاہ نہ کیا ہے نہ ہی آگاہ کیا جائے گا تاکہ اچانک وقوع پذیر ہو۔ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ''قیامت تمہارے پاس نہ آئے گی مگر اچانک اور یکدم آئے گی''۔[1]

قیامت کے اَمر کو مخفی رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ تاکہ مخلصین، غیر مخلصین کے درمیان فرق قائم ہو سکے معلوم ہو سکے کہ بندگی کی حقیقت کیا ہے اور کون ہے جو اپنے فائدے اور منفعت کے لیے مصروف ہے اس طرح جس نے سعی و کوشش کی ہے تو اسے ثواب ملے گا۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾

''سو تمہیں قیامت سے ایسا شخص باز نہ رکھنے پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں پر چلتا ہے کہ پھر تم تباہ ہو جاؤ''۔

کافروں کا انکار تمہاری راہ میں رکاوٹ نہ بنے

متوجہ رہیں کہ ایسا نہ ہو جو لوگ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے قیامت کا انکار کرتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لاتے، ان کا یہ انکار آپ پر اثر نہ کرے کہ تم بھی ایمان کو چھوڑ دو کیونکہ کافروں کی وجہ سے اگر آپ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے تو تم ہلاک ہو گے۔ ہم نے اس بات کو پہلے بھی بیان کیا ہے کہ قیامت کا انکار اور اس کی یاد کو بھلانا تمام معصیتوں اور بدبختیوں کا سبب ہے لہٰذا ایمان میں استحکام کے لیے قیامت کے بارے غیر متزلزل یقین ہونا ضروری ہے۔

---

[1]۔ سورہ اعراف، آیت: ۱۸۷۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾

"اور اے موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے"۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَ لِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾

"کہا یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی فائدے ہیں"۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾

"فرمایا اے موسیٰ اسے ڈال دو"۔

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾

"پھر اسے ڈال دیا تو اسی وقت وہ دوڑتا ہوا سانپ ہو گیا"۔

قَالَ خُذْهَا وَ لَا تَخَفْ ٞ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿٢١﴾

"فرمایا اسے پکڑ لے اور نہ ڈر، ہم ابھی اسے پہلی حالت پر پھیر دیں گے"۔

وَ اضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿٢٢﴾

"اور اپنا ہاتھ اپنی بغل سے ملا دے بلا عیب سفید ہو کر نکلے گا یہ دوسری نشانی ہے"۔

موسیٰؑ کے لیے معجزات

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے اپنی اطاعت و عبادت کا حکم دینے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ کے لیے

دیئے گئے معجزات بتائے کہ دو اہم معجزے دیئے گئے۔

ا۔ عصا: جو کہ ایک جامد لکڑی ہے۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ یہ بتاؤ کہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ اے رب یہ تو میرا عصا ہے، اس کا سہارا لیتا ہوں، اس کے ذریعہ بکریوں کو ہانکتا ہوں، اس کے ذریعہ اور بہت سارے کام کرتا ہوں، بکریوں کے لیے درختوں سے چارہ بھی اس کے ذریعہ اتارتا ہوں۔ جب یہ جواب دے دیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب اسے زمین پر پھینک دو۔ جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو زمین پر پھینکا تو وہ سانپ بن کر زمین پر رینگنے لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر تھوڑے ڈر گئے۔ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ ڈرو مت، اب اپنا ہاتھ بڑھاؤ اور اس سانپ کو پکڑ لو۔ جیسے ہی تم اسے پکڑو گے ہم اسے اس کی پہلی حالت میں پلٹا دیں گے اور وہ عصاء ہو گا جو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے پہلا معجزہ تھا تاکہ اس طرح اللہ کے پیغامات کو پہنچاتے وقت منکرین پر ثابت کر سکیں کہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

نکتہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مختصر جواب نہیں دیا کہ یہ میرا عصا ہے بلکہ کے ساتھ عصا سے جو کام انجام دیتے تھے اسے بھی بیان کر دیا۔ بات طولانی اس لیے کہ تاکہ اللہ سے مکالمہ کی لذت سے بہرہ ور ہوں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس گفتگو سے کچھ بے فائدہ بات نہیں کی کیونکہ عصا تو نظر آرہا تھا اور ہر دیکھنے والے کو پتہ ہے کہ یہ لکڑی کا ٹکرا، عصا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے اس عصا کے ذریعہ جو فائدے حاصل ہوتے تھے وہ چاہتا تھا کہ خود موسیٰ علیہ السلام بیان کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے دو فائدے تو بیان کیے۔ ا۔ میں اس کا سہارا لیتا ہوں جب چل رہا ہوتا ہوں۔ ۲۔ اپنی بکریوں کو ہانکتا ہوں درخت سے پتے اس کے ذریعہ جھاڑتا ہوں، اتارتا ہوں اس کے علاوہ اپنی دوسری ضروریات کو اس کے ذریعہ پورا کرتا ہوں اگر زیادہ گوئی کرتے تو ساری احتیاجات جو اس عصا کے ذریعہ پوری کرتے

تھے اسے بیان کرتے۔ اسے بیان نہیں کیا صرف اس پر اکتفاء کیا۔ یہ جامع جواب تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور پیش کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا کو زمین پر پھینکا تو وہ سانپ بن گیا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حیرت ہوئی اور ایک غیر منتظرہ خطرہ کو دیکھا تو اپنے بچاؤ کی فکر، اس جگہ خوف کا مطلب بزدلی نہیں ہے بلکہ چوکنا ہوئے، خطرہ سمجھا تو اللہ نے فرمایا گھبراؤ نہیں، پریشان مت ہو۔ ڈرو مت اسے پکڑ لو۔ اسے ہم ہی نے پہلی شکل میں واپس پلٹانا ہے اور ایسا ہی ہوا۔

ایک اور جگہ سورہ قصص میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ جب بڑا سانپ بن گیا تو موسیٰ علیہ السلام پیچھے کی طرف ہٹ گئے، اس سے دور ہو گئے۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں ہم نے موسیٰ سے کہا کہ دُور نہ جاؤ، واپس آؤ، ڈرو مت۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ انبیاء الٰہی فقط اللہ سے ڈرتے ہیں، خشیت الٰہی ان میں ہوتی ہے اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے یعنی ڈرپوک نہیں ہوتے لیکن جب کسی خطرہ کو بھانپ لیتے ہیں تو اس سے بچنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو سانپ بنا ہوا دیکھا تو حیرت میں ڈوب گئے اور اس سانپ سے خود کو بچانے کی تدبیر کی اور ایک طریقہ اپنایا کہ اس سے دُور ہو جائیں جس پر اللہ نے فرمایا کہ دُور نہ جاؤ، اسے پکڑ لو ہم اسے پہلی حالت میں پلٹا دیں گے۔ انبیاء کے بارے سورۂ احزاب، آیت ۳۹ میں ارشاد ہے:

وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ﴿۳۹﴾

ترجمہ ”اور اللہ سے ڈرتے رہے اور اللہ کے سوا اور کسی سے نہ ڈرتے، اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے“۔

دوسرا معجزہ ید بیضاء تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے ہاتھ گریبان میں لے جاؤ اور پھر اسے باہر نکالو تو یہ نورانی ہوگا۔ تمہارا ہاتھ روشن ہوگا اور کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی۔
پروردگار نے ان دونوں معجزوں کو اپنی نشانی قرار دیا۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾

''تاکہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیوں میں سے بعض دکھائیں''۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معجزات ہیں جو ہم نے آپ کو دیے ہیں۔آپ کے ذریعہ یہ معجزات ظاہر ہوں، یہ معجزات آپ کے ہاتھ پر جاری ہوں گے۔ یہ ہم نے آپ کو اپنی بعض نشانیاں دکھائی ہیں۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾

''فرعون کے پاس جا بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے''۔

فرعون کے پاس جانے کا حکم

پہلی آیات میں رسالت کے بارے بیان تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسالت کا منصب دیا۔ اس منصب کے لیے نبوت کے لیے معجزات دیئے۔ اب انہیں حکم دیا کہ فرعون کے پاس تبلیغ کے لیے جائیں۔اس کی وجہ بھی بیان کی کہ وہ سرکش ہے اس نے ظلم وزیادتی کر رکھی ہے، تمام حدود پھلانگ گیا ہے، ظلم وستم کی انتہاء کر دی ہے، میری بندگی کو چھوڑ دیا ہے ،خدائی کا دعویدار ہے۔اس کے پاس جاؤ۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾

''کہا اے میرے رب میرا سینہ کھول دے''۔

وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾

''اور میرا کام آسان کر''۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾

"اور میری زبان سے گرہ کھول دے"۔

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾

"کہ میری بات سمجھ لیں"۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾

"اور میرے لیے میرے کنبے میں سے ایک معاون بنادے"۔

هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾

"ہارون کو جو میرا بھائی ہے"۔

اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾

"اس سے میری کمر مضبوط کردے"۔

وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾

"اور اسے میرے کام میں شریک کردے"۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾

"تاکہ ہم تیری پاک ذات کا بہت بیان کریں"۔

وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾

"اور تجھے بہت یاد کریں"۔

اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

"بے شک تو ہمیں خوب دیکھتا ہے"۔

اللہ سے موسیٰؑ کی درخواست

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داری لگائی کہ وہ فرعون کے پاس جا کر تبلیغ کریں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ میں کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے چند درخواستیں کیں:

۱۔ میری زبان کو کھول دے۔

آپ کی زبان میں لکنت تھی، آپ نے یہ درخواست کی کہ جب میں کچھ بولوں تو سننے والوں کو میری بات اچھی طرح سمجھ آجائے۔

۲۔ میرا سینہ کھول دے، میرے اندر حوصلہ و ہمت بڑھ جائے تاکہ رسالت کا جو بار و وزن ہے اسے احسن طریقہ سے پورا کر سکوں۔ یہ ذمہ داری بہت ہی بھاری اور وزنی ہے، اے اللہ تیری خصوصی عنایت اور مدد کے بغیر اس کو پوری طرح انجام نہ دے سکوں گا۔

۳۔ اکیلا اس کام کو انجام دینا سخت ہو گا اس لیے میرے خاندان سے میرا بھائی ہارون ہے۔ اسے میرا وزیر بنا دے۔ اس جگہ دو درخواستیں دیں، پہلے تو یہ کہا کہ میرے خاندان سے کسی کو میرا وزیر بنا دے اور ساتھ دوسری عرضداشت پیش کر دی کہ جب میرے خاندان سے کسی کو وزیر بنانا ہے تو میری تجویز اس بارے یہ ہے کہ میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔

درخواست کی وجہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ درخواست اس لیے پیش کی کہ بار رسالت بہت ہی سنگین تھا اور یہ کہ اس کی وسعت اور ہمہ پہلو ہونے کا تقاضا بنتا تھا کہ کوئی مددگار موسیٰ علیہ السلام کے لیے تبلیغی کاموں میں موجود ہو اور رسالت کے بعض امور کو حضرت ہارون

سنبھالیں۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت مضبوط ہو گی اور رسالت کا جو سنگین بار ہے وہ ہلکا ہو جائے گا۔ حضرت کے امر میں مشارکت کی درخواست سے مراد یہ تھا کہ تبلیغی کاموں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد فراہم کرے اس میں یہ نہ تھا کہ وحی مشترکہ آئے بلکہ وحی کے ذریعہ جو ذمہ داریاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لگائی جائیں ان ذمہ داریوں کو احسن انداز سے نبھانے کے لیے ہارون ان کی مدد و معاونت کرے۔ تبلیغ دین میں مشارکت سے یہ مراد نہیں کہ پیغمبر کے وسیلہ سے دعوت دیئے جانے کے بعد پیغمبر کے بتائے ہوئے دستورات کی اشاعت کی جائے کیونکہ یہ تو ہر مومن کا فریضہ ہے کہ جو دعوت پیغمبر نے دی ہوئی ہے وہ اس کی تبلیغ کریں بلکہ اس سے مراد ہے کہ وحی کے ذریعہ جو ذمہ داریاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوں ان ذمہ داریوں کو عوام تک پہنچانے میں حضرت ہارون حضرت موسیٰ کا مددگار بنیں۔ اس دعا کو قبول کیا گیا اس طرح حضرت ہارون پہلے دن سے ہی تبلیغ دین میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریک کار تھے۔ اس طرح حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے لیکن اپنے زمانہ کے رسول کے تابع تھے اور ان کی دعوت دینے کے کاموں میں ان کے شریک تھے۔

حضرت محمد مصطفیؐ کی دعا

شیعہ سنی دنوں کے حدیثی منابع میں یہ بات ثابت ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اسی طرح کی دعا کی اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنے لیے مددگار و ناصر اللہ سے مانگا۔ اسی لیے پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی ابن ابی طالب علیہم السلام کے لیے فرمایا": اے علیؑ تیری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ "یعنی آپ نبی نہیں ہو، لیکن تبلیغ رسالت میں میرے ناصر و مددگار رہو۔

درخواست کی قبولیت کا فائدہ

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس درخواست کو قبولیت کا فائدہ بیان کیا ہے یا یوں سمجھیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا کہ میں نے یہ درخواست کیوں دی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اللہ یہ اس لیے تاکہ

۱۔ تیری تسبیح بہت کریں۔

۲۔ تیرا ذکر بہت کریں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر لوگوں کے درمیان عوامی اجتماعات میں جب لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیں گے تو اللہ تجھے ہر قسم کے نقص و عیب سے منزہ و پاک قرار دیں گے، شرک کی تجھ سے نفی کریں گے اور اس طرح ہر جگہ، ہر مجمع میں تیرا ہی ذکر کریں گے لہٰذا اے اللہ اگر ہارون کو میرا وزیر بنا دے گا تو ہم مل کر پوری قوت سے زوردار طریقہ سے تیری تسبیح کریں گے اور تیرا ذکر بہت زیادہ کریں گے۔ اس طرح میری دعوت دینے کی ذمہ داری مکمل ہو جائے گی۔

اس جگہ یہ بھی مراد لی جا سکتی ہے کہ اے اللہ توں ہم اہل البیت علیہم السلام کے حالات سے آگاہ و واقف ہے تو ہمارے بارے جانتا ہے کہ ہم تیری تسبیح کرنے والے اور تیرا ذکر کرنے والے ہیں۔ توں ہمارے بارے بابصیرت ہے، بعض نے یہ بھی کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ توں آگاہ ہے کہ ہم ضعیف و ناتواں ہیں، ہماری ذمہ ادری کی ادائیگی میں ہمیں جس چیز کی ضرورت و احتیاج ہے توں اس سے بھی آگاہ ہے اور ہمارے اَمر کی تدبیر بھی تیرے ہاتھ میں ہے لہٰذا اس اَمر کے متعلق ہماری مدد فرما!

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾

"فرمایا اے موسیٰ تیری درخواست منظور ہے"۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾

"اور البتہ تحقیق ہم نے تجھ پر ایک دفعہ اور بھی احسان کیا ہے"۔

موسیٰؑ کی دعا کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر جواب دیا کہ اے موسیٰ تو نے جو جو مانگا ہے وہ سب کچھ تجھے دے دیا ہے اور یہ ہمارا اب تیرے اوپر دوسرا احسان ہے۔ پہلے بھی ہم نے تیرے اوپر احسان کیا اب تیری ساری حاجات کو پورا کر کے تیرے اوپر دوسری بار احسان کیا ہے ہم نے رسالت و نبوت کا عہدہ دینے اور دعاؤں کی قبولیت سے پہلے بھی تیرے اوپر احسان کیا کہ تیرے تولد کو مخفی رکھا، دریائے نیل کی لہروں پر تیری حفاظت کی، فرعون کے دامان میں تجھے پروان چڑھایا اور تجھے فرعون کے گھر میں تیری ماں کی آغوش میں تجھے واپس پلٹایا۔

یہ سارے امور اللہ کی عظمت، بلند شان، قدرت الٰہی کے مظاہر ہیں اور فرعون کی تمام کوشش جو نور الٰہی کو خاموش کرنے کے لیے تھیں سب کو ناکام بنا دیا اور اللہ نے اپنے دشمن کے گھر میں اپنے نمائندہ اور اپنے نور کی پرورش کی اور اللہ تعالیٰ نے فرعون کی سازش کو اپنی تدبیر سے ناکام کیا۔

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾

"جب ہم نے تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی"۔

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

"کہ اسے صندوق میں ڈال دے پھر اسے دریا میں ڈال دے پھر دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا اسے میرا دشمن اور اس کا دشمن اٹھا لے گا، اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی، اور تاکہ توں میرے سامنے پرورش پائے"۔

اِذْ تَمْشِيْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ۥ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾

"جب تیری بہن کہتی جا رہی تھی کیا تمہیں ایسی عورت بتاؤں جو اسے اچھی طرح پالے، پھر ہم نے تجھے تیری ماں کے پاس پہنچا دیا کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور غم نہ کھائے، اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر ہم نے تجھے اس غم سے نکالا اور ہم نے تجھے کئی مرتبہ آزمائش میں ڈالا، پھر تو مدین والوں میں کئی برس رہا پھر توں اے موسیٰ تقدیر سے یہاں آیا"۔

موسیٰؑ کا بچپن سے رسالت تک کا سفر

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر جو احسانات فرمائے

ایک ایک کا تذکرہ کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن سے لے کر رسالت تک کے تمام مراحل سے آگاہ کیا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے اور یہ کہ اللہ نے کس طرح اپنے مخالفین کی سازشوں کو ناکام بنایا۔ پہلی بات جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ فرعون کا منصوبہ تھا کہ کوئی لڑکا بنی اسرائیل میں پیدا نہ ہو کیونکہ اسے نجومیوں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو بڑا ہو کر تیرا تخت و تاج ختم کر دے گا اس لیے فرعون نے طے کیا کہ جو بھی بنی اسرائیل کی عورت حمل سے ہو اس کا حمل ضائع کر دیا جائے اور جو بچہ پیدا ہو اسے مار دیا جائے۔ اس طرح ہزاروں بچوں کو مار دیا گیا یا ان کے حمل ضائع کروا دیئے گئے لیکن اس سب کے باوجود اور تمام تر جاسوس عورتوں کی مساعی ناکام ہوتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے تیرے حمل کو ظاہر نہ ہونے دیا، تیری ولادت مخفیانہ ہوئی، کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

دوسری بات جب تم پیدا ہو گئے تو ہم نے تیری اماں کو تیری حفاظت کا منصوبہ دیا کہ وہ ایک خاص طرح کا صندوق لکڑی سے تیار کرے، اس میں تیرے آرام کی مناسب جگہ بنائے اس میں ہوا کا بھی گزر ہو سکے، وہ دریا میں ڈوبے بھی نہیں اور دھوپ بھی آسکے، اوپر ایک شیشہ لگایا گیا ہو گا تا کہ دیکھنے والوں کو پتہ چل جائے کہ اس میں بچہ سو رہا ہے۔ پھر ہم نے تیری اماں کو بتا دیا کہ وہ تجھے اس صندوق میں آرام سے سلا دے اور پھر اس صندوق کو دریائے نیل کی لہروں کے حوالے کر دے، پھر دریا کی لہریں تجھے فرعون کے محل کے ساتھ لا کھڑا کریں اور اس خوبصورت صندوق کو فرعون کے اہل خانہ دیکھیں اور اس کے ذریعہ اسے اپنے گھر میں لے آئیں اور ہم نے تجھے بہت ہی پیارا بچہ بنایا کہ جو بھی دیکھے وہ تجھ سے پیار کرنے لگ جائے اور تجھے نقصان دینے سے رک جائے۔ اس کے بعد جب یہ مرحلہ آیا کہ تیرے لیے غذا کا انتظام ہو تو جو بھی عورتیں آئیں آپ نے کسی کا دودھ نہ لیا۔ آخر کار ہم نے تیرے بندے کو فرعون کے گھر بھیجا کہ وہ غیر محسوس طریقہ سے فرعون کی حویلی میں جائے

اور اک اَن جان اور ناواقف بن کر ان کی پریشانی کا حل پیش کرے کہ جہاں مختلف گھروں کی عورتوں کو تیری تربیت کے لیے بلایا جارہا تھا وہ بولے کہ میں بھی ایک گھروالوں کو جانتی ہوں ،اجازت ہو تو میں اس گھر والی خاتون کو لے آؤں۔

اس طرح اے موسیٰ تیری اماں تیرے پاس آجاتی ہے اور ہم نے بہت ہی دقیق منصوبہ بندی سے تجھے تیری ماں کی گود میں واپس پہنچا دیا۔ اس طرح تیری ماں کی آنکھیں مسرور ہوئیں، اس طرح توں پروان چڑھا۔ فرعون کے ہاں ہی توں جوان ہوگیا، تیرے دل میں ظلم سے نفرت تھی، مصریوں میں ایک نے بنی اسرائیل پر ظلم کیا آپ نے مصریوں کا بندہ مار دیا۔ اس دن تو تم واپس فرعون کے گھر آگئے لیکن دوسری مرتبہ پھر ایسا ہی واقعہ ہونے لگا تو آپ نے ظالم کو مارنے کا ارادہ کیا تو لوگ آپ کی جانب بڑھے کہ فرعون کے پاس پہنچائیں کہ آپ تو قاتل ہیں۔آپ کو خبر مل گئی کہ آپ کے خلاف سخت سزا کی تجویز ہے تو آپ نے مصر سے راہ فرار اختیار کی۔ مدین شہر پہنچ گئے کنوئیں پر دو بچیوں کے لیے پانی حاصل کرنے میں تم نے مدد کی، ان بچیوں نے اپنے باپ سے پانی لانے کا پورا ماجرا سنایا تو شعیب نے آپ کو اپنے پاس بلا بھیجا اور پھر آپ پر احسان کیا کہ شعیب نے اپنی ایک بیٹی سے تیرا نکاح کر دیا اور طے پایا کہ چند سال ان کے پاس رہو گے جب مدت پوری کر لی تو تم اپنے وطن کی طرف واپس آرہے تھے کہ راستہ میں طے شدہ پروگرام کے تحت آپ کوہ طور پر بلالیا اور رسالت و نبوت کا منصب دے دیا اور آپ اس ذمہ داری کو احسن انداز سے نبھانے کے لیے جو جو چاہا ہے وہ سب کچھ ہم نے آپ کو دے دیا ہے۔

اے موسیٰؑ یہ سارے میرے تمہارے اوپر احسانات ہیں تم ان سب واقعات کو یاد رکھو لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہمارا دشمن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، ہم نے تجھے ظاہری اسباب بھی دیئے ہیں اور معجزات کی سپورٹ بھی ہے اور غیبی امداد بھی ہر مرحلہ حاصل رہے گی لہٰذا تم فرعون کے ہاں جاؤ، اسے میری وحدانیت پر ایمان لانے کی دعوت دو اور اسے سرکشی

سے موڑ دو۔

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۚ﴿۴۱﴾

''اور میں نے تجھے خاص اپنے واسطے بنایا۔''

موسیٰؑ اللہ کے خاصان سے

اصطناع کا معنی ہوتا ہے کہ کسی پر اتنی مہربانیاں کرنا کہ عام مشہور ہو جائے کہ وہ تو ان کا خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان کر رہا ہے کہ اے موسیٰ ہم نے تمہارے اوپر اتنے زیادہ احسانات کر دیئے ہیں کہ سب کہتے ہیں یہ اللہ کا خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں نے تمام نعمات سے نوازا ہے اور یہ نعمات تیرے اختیار میں دی ہیں یہ سب میری طرف سے ہے اور میرا تیرے اوپر احسان ہے میرے سوا کسی اور کی اس میں شراکت نہ ہے لہٰذا توں ہی میرا خاص ہے اور میں تیرا خالق و مالک و رب و منعم والِہ ہوں۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ﴿۴۲﴾

تو اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو۔

موسیٰؑ اور ہارون کی ذمہ داری

اس بار حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون کو اکٹھا خطاب کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو حق کی دعوت دو۔ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، میرے معجزات کے ساتھ جاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو معجزے اچانک دیئے گئے تھے جبکہ اللہ نے فرمایا ہے میرے معجزات (آیات) لے کر جاؤ تو ایک لطیف اشارہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر تمہیں اور معجزات بھی عطا ہوں گے؛ میرے اَمر میں یعنی میری طرف

دعوت دینے میں معجزات کے ذریعے تمہاری تائید ہو گی۔

اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾

"فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے۔"

فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی ﴿۴۴﴾

"سو اس سے نرمی سے بات کرو شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔"

فرعون کے پاس تبلیغ کے لیے جانے کا دستور

اس جگہ دوبارہ فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرعون کی سرکشی اور تمام حدود کو پامال کرنے کا حوالہ دیا اور یہ کہ وہ سرکش ہے۔ فرعون سے بات کرتے وقت تندی، سخت لہجہ اختیار نہ کریں، اس سے نرم و ملائم گفتگو کرنا۔ یہ ایک ضابطہ اور قانون ہے کہ جب بھی اللہ کے دین کی دعوت دی جائے تو نرم لہجہ اختیار کیا جائے، خشونت اور سختی سے پرہیز کیا جائے۔ اس ہدایت کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے اس طرح اس کے لیے یادآوری ہو جائے اور وہ موعظہ و نصیحت کو قبول کر لے یا فرعون میں خوف و خشیت پیدا ہو اور وہ سرکشی کا راستہ چھوڑ دے اور حق کا پیرو بن جائے۔ ایسی اُمید اور آرزو مکالمہ و محاورہ میں ہے۔ اللہ تو پورے عالم کے بارے آگاہ ہے اور کسی نے کیا کرنا ہے اس بارے بھی آگاہ ہے۔ تذکر کا مطلب یاددہانی کو قبول کر لینا اور یادآوری کے لوازمات کو انجام دینا ہے جو کہ ایمان سے عبارت ہے۔

اس پورے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ فرعون سے نرم لہجہ میں بات کرنا، ہو سکتا ہے کہ اس طرح وہ آپ کی کچھ باتیں مان لے اور ایمان لانے کے قریب ہو جائے۔

یہ بات معلوم رہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون نے اپنی غلامی میں اس خوف سے لے

رکھا تھا کہ کہیں ان میں سے وہ پیدا نہ ہو جائے جو اس کی سلطنت کا خاتمہ کر دے گا۔ فرعون کا یہ حکم سیاسی تھا، اسے بنی اسرائیل کی نسل و اولاد بڑھنے کا خوف تھا۔ تاریخ کے جابر حکمرانوں کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کتنے بڑے جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں، فرعون کا بنی اسرائیل پر ظلم اس طرح تھا کہ جو بھی لڑکا پیدا ہوتا اسے قتل کر دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتے تھے۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾

''کہا اے ہمارے رب ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا یہ کہ زیادہ سرکشی کرے۔''

فرعون سے خطرہ کا اظہار

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے ظالمانہ اور جابرانہ رویہ سے واقف تھے اور اس بات کو جانتے تھے کہ وہ اپنے خلاف کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ جو بھی بات کرے اس کے خلاف فوری کارروائی کرتا ہے۔ اس لیے دونوں نے عرض کیا یارب ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ جب ہم اسے حق کی دعوت دیں گے اور اپنی بات کے لیے معجزہ دکھانے کا بھی کہیں گے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری بات مکمل ہی نہ ہونے اور وہ ہمارے خلاف احکام جاری کر دے اور ہمیں سزا دے دے یا ہمارے اوپر چڑھائی کر دے۔ یہ بات اس لیے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ سے ایسے خطرہ سے نپٹنے کے لیے راہنمائی حاصل کر لیں یا کوئی ہدایت نامہ لے لیں اور اسی کے مطابق اس خطرہ سے بچنے کے لیے پہلے سے ہی احتیاطی تدابیر کریں۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿٤٦﴾

”فرمایا ڈرو مت میں تمہارے ساتھ سنتا اور دیکھتا ہوں۔“

اللہ کی خصوصی امداد کا اعلان

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو بتا دیا کہ پریشان نہ ہوں، بے دھڑک پیغام سنائیں، میں موجود ہوں اور جو وہ کہے گا یا کرنا چاہے گا تو میں دیکھ رہا ہوں گا اور اس کی بات کو سُن رہا ہوں گا لہٰذا اگر اس نے کوئی سخت اقدام کا فیصلہ کیا تو میں اس کے لیے رکاوٹ بن جاؤں گا اور وہ تمہیں کچھ نقصان نہ دے سکے گا۔ اللہ نے اس فرمان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بتا دیا کہ گھبراؤ نہیں ، تمہاری حفاظت میری ذمہ داری ہے، میری نصرت تمہارے لیے موجود رہے گی۔

فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَ لَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾

”سو تم دونوں اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ بے شک ہم تیرے رب کی طرف سے پیغام لے کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں تکلیف نہ دے، ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں، اور سلامتی اس کے لیے ہے جو سیدھی راہ پر چلے۔“

فرعون کے لیے پیغام رسانی کا انداز

اللہ کی طرف سے جب خصوصی نصرت کا وعدہ لے لیا تو دونوں مل کر فرعون کے پاس پہنچ گئے اور اللہ کا پیغام اسے سنا دیا۔ دونوں نے جاتے ہی اس سے یہ کہا کہ ہم تمہارے

پاس تمہارے رب کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ اسی بیان سے فرعون کو سمجھا دیا کہ تیرا اور ہمارا رب اللہ ہے اور یہ کہ توں رب نہیں ہے۔ پیغام یہ تھا کہ اے فرعون بنی اسرائیل پر ظلم بند کر وا، انہیں آزاد کر دو، جہاں چاہیں وہ جائیں ہم ان کو لینے آئے ہیں۔ '' فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ '' اس میں فرمان فرعون کے لیے دیا جارہا ہے کہ اے فرعون تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ روانہ کر دو اور '' جِئْنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ '' اس میں اپنی رسالت اور یہ کہ اللہ کی جانب سے ہی پیغام لائے ہیں۔ اس حوالے سے دلیل و نشانی کا حوالہ دیا کہ ہمارے پاس ثبوت موجود ہے کہ ہم تیرے پاس تیرے رب کی جانب سے آئے ہیں۔ جو پیغام ہے یہ ہمارا نہیں بلکہ تیرے رب کا تیرے لیے پیغام ہے۔ آیہ کو نکرہ لایا گیا ہے یہ بتانے کے لیے کہ جو نشانی لائے ہیں وہ بہت بڑی ہے اور اس نشانی کو مبہم دکھا تاکہ سننے والے کے لیے جستجو پیدا ہو کہ وہ جان سکے وہ بڑی نشانی کیا ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس موجود ہے۔ آخر میں جو سلامتی کی دعا دے دی تو اشارہ تھا کہ ہماری بات مکمل ہوئی جو پیغام تھا ہم نے پہنچا دیا پس جو بھی اس راہنمائی کے مطابق چلے تو اس کے لیے سلامتی و امن ہے۔ اس میں جو دعا دی ہے وہ عمومی ہے کہ جو بھی اللہ کی راہنمائی کے مطابق زندگی گزارے اس کے لیے سلامتی ہے، امنیت ہے، خیر ہے ایسے افراد جو ہیں وہ زندگی کے راستہ میں کوئی تکلیف نہیں دیکھتے، دُنیا و آخرت میں انہیں خیر ملتی ہے۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

''بے شک ہمیں وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب اسی پر ہوگا جو جھٹلائے اور منہ پھیر لے''۔

الٰہی پیغام کی مخالفت پر فرعون کو عذاب کی دھمکی

اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ جہاں پر حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام نے اللہ کے

پیغام کی راہنمائی میں چلنے والے کے لیے سلامتی اور خیر کی دعا دی ہے وہاں پر یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے یہ دعا اس لیے دی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ وحی فرما دی ہے کہ بدامنی تکلیف اور سزا ان کے لیے جو اللہ کی راہنمائی کر رد کر دے، اس کی نشانیوں کو جھٹلا دے۔ اس پیغام سے روگردانی کر لے، اس میں فرعون کے دُنیاوی عیش و عشرت، خوش گذرانی کی طرف اشارہ ہے۔ بہت ہی عمدہ انداز سے بتا دیا کہ اگر اے فرعون اللہ کے پیغام پر عمل نہ کیا تو پھر تیرے لیے اللہ کا عذاب ہو گا۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾

''کہا اے موسیٰ پھر تمہارا رب کون ہے''۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾

''کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی صورت عطا کی پھر راہ دکھائی''۔

اللہ تعالیٰ کا تعارف

فرعون نے اس جگہ پر سوال کیا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اس جگہ اس نے اللہ سبحانہ کی ربوبیت سے غافل بننے کی کوشش کی یہ سوال نہیں کہا کہ میرا اور تمہارا رب کون ہے بلکہ یہ کہا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تاکہ یہ ظاہر کرے کہ مجھے تمہارے رب کے بارے معلوم نہیں کہ وہ کون ہے ذرا اس کے بارے بتا دو۔

بت پرستوں کا نظریہ

ایک بات بت پرستوں کے ہاں تسلیم شدہ تھی کہ وہ کائنات کے خالق کے قائل ہیں لیکن وہ اسے عقل و وہم خیال سے بالاتر و بلند تر سمجھتے ہیں لہٰذا یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تک جانے کے لیے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے بتوں کو واسطہ بنائیں یا نامور انسانوں،

جنات وملائکہ کو اس تک جانے کا وسیلہ قرار دیں۔ وہ ان کی عبادت اس بت کے ذریعے کرتے ہیں کہ ان کو خوش کرنے سے اللہ ان سے راضی ہو جائے گا۔ بادشاہوں کو ذریعہ بنایا جائے کہ وہ انہیں خالق کائنات کے قریب لے جائیں اسی لیے فرعون نے سوال کیا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اس کا مقصود کائنات کے خالق کا انکار نہ تھا بلکہ اس کے مد نظر یہ تھا کہ وہ یہ جان سکے کہ موسیٰ اور ہارون کا معبود کون ہے جس کا یہ دونوں حوالہ دے رہے ہیں بلکہ وہ تو خود کو سب کا معبود سمجھتا تھا اس کے لیے عجیب تھا کہ وہ کون ہے جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کا مشترکہ معبود ہے لہٰذا سوال کیا کہ تمہارا معبود کون ہے کہا جس کی وہ دونوں کی عبادت کرتے ہیں۔ عام لوگ تو بتوں کی پوجا پاٹ کرتے ہیں اور خود فرعون کو اپنا رب و معبود سمجھتے ہیں تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام، ان دونوں کا رب و معبود کون ہے؟ کیونکہ فرعون کے زمانہ کے لوگ فرشتوں، جنات اور بڑے بڑے سلاطین کی عبادت کرتے تھے اور انہیں اللہ کی عظمت کے مظاہر سے سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بادشاہ و سلطان کے بارے کوئی مانع نہیں سمجھتے تھے کہ خود اس بادشاہ کا کوئی اور معبود ہو۔ فرعون بھی لوگوں کے معبودوں سے ایک تھا جبکہ فرعون نے اپنے لیے معبود اور رب بنا رکھا تھا جس کی وہ پوجا پاٹ کرتا تھا۔

فرعون کو موسیٰؑ کا جواب

موسیٰؑ نے فرعون کو جواب دیا ہمارا معبود اور رب تو وہ ہے جس نے ہر چیز کو وجود عطا کیا ہے پھر اس کی مطلوبہ کمال کی جانب ہدایت فرمائی ہے۔ یعنی اللہ ہی ہے جس نے خلقت کے بعد ہر شئی کو اس کے کمال تک پہنچا دیا ہے یا اسے اس راستہ کی راہنمائی دے دی ہے جو اسے مطلوب تک پہنچاتی ہے۔ پورے عالم کی اشیاء کی ہدایت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کو تکوینی (بنائے ہوئے) ایسی راہنمائی دے دی ہے کہ وہ اپنے کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اپنے کمال کو پا لیتی ہیں جس غرض کے لیے انہیں خلق کیا گیا ہے وہ ہی ان کا مطلوب ہے

وہ اس غرض کو پا لیتے ہیں یا اس تک جانے کے لیے انہیں راہنمائی مل جاتی ہے یعنی پروردگار عالَم وہ ذات ہے جس نے سارے موجودات کے درمیان رابطہ اور تعلق کو قائم کیا ہے۔ ہر موجود کو ہر طرح کی قدرت و وسائل سے نوازا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے ہدف سے مربوط ہو جاتے ہیں اور اسے حاصل کر لیتے ہیں۔

لفظ "ثُمَّ" سے یہ بتایا ہے کہ خلقت کے بعد کمال مطلوب اور خلقت کا ہدف تک جانے کے لیے تدریجی مراحل طے کرنا ہوتے ہیں۔ ایک جگہ سے شروع ہو کر آخر تک جانا ہوتا ہے۔ انسان نطفہ سے شروع ہوتا ہے، مختلف مراحل طے کرتے ہوئے موت تک جاتا ہے اور پھر اگلا مرحلہ طے کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دانہ جب زمین میں ڈالا جاتا ہے وہ اُگتا ہے پھر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے انجام و نقطہ اختتام تک جاتا ہے۔ ہر شئی کا نقطہ آغاز ہے اور نقطہ اختتام ہے۔ خلقت سے شروع ہو کر اختتام یعنی ہدف تک جانے کا سفر اس شئی کو طے کرنا ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس شئی کو جس نے دیا ہے وہ ہی ہمارا رب ہے۔ اس جگہ ہدایت سے مراد عمومی اور تکوینی ہدایت ہے جس کے دامن میں سارے موجودات آتے ہیں۔ اس ہدایت کا مصداق تدبیر الٰہی ہے جس کے تحت پورے عالَم کا نظم قائم ہے۔

اس آیت میں ربوبیت مطلقہ کا برہان موجود ہے جو فقط اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے کیونکہ وہی خالق ہے تو پھر جس نے خلق کیا وہ اس شئی کا مالک ہے جسے اس نے خلق کیا ہے جب وہ مالک ہے تو پھر اس کی تدبیر بھی اسی کے پاس ہے، قانون بھی اسی کا ہے، روزی بھی اسی نے دی ہے، وہی رب ہے۔ جب وہ رب ہے تو پھر معبود بھی وہی ہے۔ اطاعت بھی اسی کی ہے جس کا سب کچھ ہے، جس نے خلق کیا ہے اور خلق کرنے کے بعد جس نے تمام مراحل میں ہدایت دی ہے وہی مالک ہے وہی رب ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾

''کہا پھر پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے''۔

خصوصی ہدایت بارے سوال

یہاں فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ ذکر ہوا ہے کہ فرعون نے آپ سے سوال کیا: ''جو تم کہہ رہے ہو اگر ایسا ہے تو پھر یہ بتاؤ کہ سابقہ اقوام اور امتیں جو مر گئے، نابود ہو گئے ان کا تو کوئی اثر و نشان نہیں ہے۔ اس دُنیا میں ان کا نام و نشان نہیں، ان کا اس وقت کیا حال ہے؟ اُنہوں نے اپنے اعمال کا بدلہ کیسے پایا ہے۔ اس عالم ہستی میں تو ان کا کچھ بھی اثر و نشان نہیں بچا۔ کیا وہ دوبارہ خلق ہوں گے تاکہ اپنے اعمال کا بدلہ حاصل کر سکیں۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عمومی ہدایت کی بات کی تھی، جبکہ فرعون نے معاد کے بارے سوال کر ڈالا۔

اہم نکتہ: حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تو ڈر رہے تھے کہ کہیں فرعون ان کے ساتھ سخت رویہ نہ اپنائے اور ان کی بات کو نہ سنے۔ بات سننے سے پہلے ہی کوئی سخت اقدام نہ اٹھالے۔ اللہ نے وعدہ دیا کہ تم جاؤ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ طولانی ہو گیا۔ یہ اہم تبلیغی نکتہ ہے کہ اللہ کس طرح اپنے نمائندوں کی مدد کرتا ہے۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝٥٢

''کہا ان کا علم میرے رب کے ہاں کتاب میں ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے''۔

علم الٰہی کا تذکرہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سوال کا جواب اللہ کے حکم سے اس طرح دیا

کہ تمام امور کی تفاصیل کا مطلقاً علم میرے رب تعالیٰ کے پاس ہے۔ اللہ ہی گذشتہ صدیوں میں موجود اقوام و ملل کے انجام سے آگاہ ہے۔ ایسا علم ہے جس سے کچھ بھی نہیں چوکتا، ہر شیٔ اس علم کے تحت ہے۔ اس میں جہل کو راہ نہیں ہے وہ قابل فنا نہیں اس علم کا ذکر کر کے اسے ایک کتاب کے ساتھ مقید کر دیا۔

یہ اس لیے کیا تاکہ اس علم کے محفوظ اور ثبوت پر تاکید ہو جائے کیونکہ عام اذھان میں یہی بات آسانی سے بیٹھ جاتی ہے کہ جو بات لکھی جائے وہ محفوظ ہو جاتی ہے اور کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

یہ حوالہ اس لیے دیا کہ یہ ایسا علم ہے جس میں تبدیلی نہیں۔ کتاب کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس کی عظمت و بزرگی کو بیان کیا جائے اور یہ کہ علمی احاطہ کے لحاظ سے وہ کتاب بہت ہی وسیع ہے اور بہت ہی دقیق ہے، چھوٹی بڑی ہر بات اس میں موجود ہے۔

اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ گذشتہ اقوام کے اجر و ثواب اور ان کے انجام کے بارے اقدام اس کے لیے دشوار ہے جس کے پاس انکے متعلق علم نہ ہو لیکن جو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ جو میرا رب ہے وہ ان سب کے حالات بارے آگاہ ہے اس میں کچھ خطاء و بھول چوک اور غلط نہ ہے، وہ نہ ہی زوال پذیر ہے:

"لَّا يَضِلُّ رَبِّیْ" اس جملہ سے اللہ تعالیٰ سے ابتدائی جہل کی نفی کی ہے۔ "وَلَا يَنْسَى" کے جملہ سے علم کے بعد بھول جانے کی نفی کی ہے۔ "ضلال" کا معنی یہ ہے کہ ھدف تک جانے کے لیے قصد و ارادہ کر کے ایسے راستہ پر چلنا جو اس ھدف تک نہ لے جائے اور **نسیان** کا معنی ہے کہ جو معلوم ہے اس سے کچھ کو بھول جائے۔ اللہ تعالیٰ قرون گذشتہ کا عالم ہے، اللہ کے علم میں جب ہے تو وہ نہ جہل ہے اور نہ ہی علم کے بعد نسیان و بھول چوک ہے۔ اللہ تعالیٰ اقوام کو استحقاق کے مطابق انہیں جزاء یا سزا دے گا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾

''جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور تمہارے لیے اس میں راستے بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا، پھر ہم نے اس میں طرح طرح کی مختلف سبزیاں نکالیں''۔

الٰہی ہدایت کے مظاہر

اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان کو سکونت عطا کی اور زمینی حیات کے اسباب بنائے تاکہ انسان زمین پر طبیعی زندگی کے دوران اخروی و سماوی زندگی کے لیے نوشتہ حاصل کر سکے جس طرح ایک بچہ گہوارہ میں ہوتا ہے اور اپنی بعد والی زندگی کے لیے تربیت اور نشوونما پا رہا ہوتا ہے۔

اللہ نے زمین پر راستے بنائے ہیں تاکہ انسان ان راستوں پر چل کر اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کر سکے اور یہ بھی اسے معلوم ہو کہ ان راستوں کو عبور کرکے اللہ کی بندگی کی جاتی ہے۔ اس کی خلقت اس لیے ہے تاکہ اللہ کا قرب پا سکے۔

زمین کو گہوارہ سے تشبیہ دے کر یہ بھی اشارہ کا ہے کہ زمین متحرک ہے لیکن تیز ترین حرکت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرام و سکون کا ذریعہ اسے بنایا ہے۔

آسمان سے زمین پر پانی کو اُتارا ہے اور پھر ہر نباتات کو جوڑا جوڑا بنا دیا۔ قسم قسم کے پودے، جڑی بوٹیاں، درخت، گھاس، اناج اُگا دیئے تاکہ ان سے انسان اپنی غذائی ضروریات پوری کرے، ان سے انسان کا جسم مضبوط ہو اور عقل کو تقویت ملے۔ انسان نشوونما پائے اور اللہ کی جانب خود کو لے چلے۔ نباتات مختلف انواع کے ہیں جبکہ پانی ایک ہی ہے؛ یہ اللہ کی

ربوبیت و خالقیت و مدیریت اور مدبریت پر دلیل ہے۔ اس طرح ہر صاحب عقل کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔

كُلُوْا وَ ارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

''کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ، بے شک اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں''۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

''اسی زمین سے ہم نے تمہیں بنایا اور اسی میں لوٹائیں گے اور دوبارہ اِسی سے نکالیں گے''۔

اللہ کی نشانیاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لیے اللہ کے مزید پیغامات بھی پہنچا دیئے ان میں ایک یہ بات تھی کہ اللہ ہی ہے جس نے سب کو مٹی سے خلق کیا ہے اور پھر اسی میں پلٹا دے گا اور اسی سے دوبارہ نکالے گا۔ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں جن میں عقل و سمجھ ہے تو وہ اس سے ضرور سبق لیں گے۔ عقل کو النُّھٰی کا نام دیا ہے اس لیے کہ عقل انسان کو نفسانی خواہشات سے روکتی ہے۔

زمین کے بارے تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ زمین ایک ایسی جگہ جہاں پر انسان ایک کامل دورہ پورا کرتا ہے۔ اس کا بیان کیا کہ زمین سے انسان کا آغاز ہوتا ہے جب طے شدہ عمر پوری کرتا ہے پھر اسی زمین میں اسے دفن کر دیا جاتا ہے، وہ اس مٹی میں مٹی ہو جاتا ہے اور پھر اللہ ہی ہے کہ جو ان سب کو زمین سے دوبارہ زندہ کرے گا۔ انسان کا آغاز اور انجام بیان کر دیا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری گفتگو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام نے ایک ہی محفل میں کر دی۔

وَ لَقَدۡ اَرَیۡنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰی ﴿۵۶﴾

''اور ہم نے فرعون کو اپنی سب نشانیاں دکھادیں پھر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا''۔

فرعون کا ردعمل

فرعون کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ تمام نشانیان دکھائیں تاکہ وہ اپنی سرکشی سے واپس آجائے لیکن فرعون کا ردعمل سخت تھا۔ اس نے سب نشانیوں کو جھٹلایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو قبول نہ کیا اور بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ بھیجنے سے انکار کر دیا اور بنی اسرائیل پر جو ظلم و ستم ڈھائے جا رہے تھے اسے ختم کرنے سے بھی انکار کر دے۔

قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِكَ یٰمُوۡسٰی ﴿۵۷﴾

''کہا اے موسٰی کیا تو ہمیں اپنے جادو سے ہمارے ملک سے نکالنے کے لیے آیا ہے''۔

موسیٰؑ کو فرعون کا جواب

موسیٰ علیہ السلام کی تمام باتیں سننے کے بعد فرعون اس طرح جواب دیتا ہے کہ اے موسیٰؑ تمہاری ان ساری باتوں کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ تم ہمارے پاس آئے ہو یہ کہنے کے لیے کہ ہم اس زمین سے نکل جائیں اور جو کچھ تم لائے ہو یہ تمہارا جادو ہے تم اپنی جادو گری کے کرتب دکھا کر اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتے ہو تم ہمیں مصر سے باہر نکالنا چاہتے ہو۔

فرعون کا یہ جواب سیاسی تھا وہ اس بات سے قبطیوں کے جذبات بھڑکانا چاہتا تھا کہ

اے قبطیو! یہ موسیٰؑ بڑا ہی جادوگر ہے اس نے ہمارے دربار میں جو کچھ دکھایا ہے اور جو باتیں کی ہیں یہ سب جادوگری ہے اور اپنے ان کرتبوں کے ذریعہ ہمیں مصر سے نکالنے کا ارادہ رکھتا ہے اس موسیٰ کو خیانت کار اور وطن فروش قرار دے دیا کہ وہ اپنی منصوبہ بندی سے چاہتا ہے کہ ہمیں اس زمین سے باہر نکالے جس کا اپنا وطن نہ ہو وہ پھر زندگی نہیں گزار سکتا۔

فَلَنَاْتِیَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

”سو ہم بھی تیرے مقابلے میں ایک ایسا ہی جادو لائیں گے سو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ مقرر کر دے نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تو، کسی صاف میدان میں“۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ یَوْمُ الزِّیْنَةِ وَ اَنْ یُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

”کہا تمہارا وعدہ جشن کا دن ہے اور دن چڑھے لوگ اکٹھے کیے جائیں“۔

فرعون کا موسیٰؑ کو مقابلہ کا چیلنج

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم تو جادوگر ہو۔ جو کچھ تم نے کرتب دکھائے سب تیرا جادو ہی تھا۔ ہمارے پاس بھی جادوگر موجود ہیں، آپ کا مقابلہ کریں گے۔ اس کے لیے کوئی جگہ طے کر لیتے ہیں ہم اس وعدہ کے مطابق میدان میں اُتریں گے آپ بھی اپنے جادو لے کر وہاں آجانا۔ فرعون نے قسم اٹھائی کہ میں اے موسیٰ تیرے مقابلہ میں اپنے جادوگر لے آؤں گا اور تجھے ہم شکست دے دیں گے، کھلے میدان میں مقابلہ ہوگا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کا چیلنج قبول کیا اور فرعون سے کہا ٹھیک ہے ہمارا پروگرام عید کے دن ہونا چاہیے۔ مصریوں کی بڑی عید تھی، اس دن وہ خود کو زینت کرکے نکلتے

تھے، شہر کو آراستہ کرتے تھے، چاشت کا وقت رکھ لیا جائے جب سورج اوپر آجاتا ہے سارے لوگوں کو بلایا جائے، آفتاب کی روشنی میں ہر چیز کو سب کھلے عام دیکھیں گے اس بیان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہ فقط فرعون کے چیلنج کو قبول کیا بلکہ اپنی برتری جتانے کے لیے کہا کہ ٹھیک ہے شرط یہ ہے کہ سب لوگ باہر آنے چاہئیں اور روشن دن میں یہ مقابلہ ہونا چاہیے، اس دن سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات سے واضح ہو رہا ہے کہ آپ کو اپنے اوپر پورا اعتماد اور یقین تھا اس لیے بڑے اعتماد سے فرعون کا چیلنج قبول کیا اور کہا کہ ٹھیک ہے یہ کام عید کے دن ہونا چاہیے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

''پھر فرعون لوٹ گیا اور اپنے مکر کا سامان جمع کیا پھر آیا''۔

فرعون کی تیاری

فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام کی بات سنی تو وہ اپنے وزرا و کارندوں کے پاس گیا اور جو ماہر جادوگر تھے ان سے رابطہ کیا اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ خود کو تیار کیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو شکست دے سکے۔ فرعون نے اپنی تمام توانائی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کے لیے تیار کیا اور طے شدہ دن کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾

موسیٰ نے کہا افسوس تم اللہ پر بہتان نہ باندھو ورنہ وہ کسی عذاب سے تمہیں ہلاک کر دے گا، اور بے شک جس نے جھوٹ بنایا وہ غارت ہوا۔

موسیؑ کا فرعون اور اس کے اعوان وانصار کو خطاب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے اعوان وانصار سے یہ کہا کہ دیکھو تم اللہ کی آیات اور نشانیوں کو سحر اور جادو مت کہو اور الٰہی دعوت کو سیاسی ایشو بنا کر رَد کر رہے ہو اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں چاہتا ہوں تمہیں تمہاری سرزمین اور تمہیں تمہارے وطن سے نکالنے کا منصوبہ رکھتا ہوں، تمہارے اوپر بڑا افسوس ہے کہ تم یہ سوچ رہے ہو کہ الٰہی معجزہ کو اپنے سحر و جادو سے جواب دو گے۔

البتہ یہ باتیں اللہ پر افتراء نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ تم بت پرستی کے اصولوں پر عقیدہ رکھتے ہو، بتوں کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اور تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کے پاس تمہاری سفارش کریں گے، پورے عالَم اور کائنات کی تدبیر اور اس کے ارادہ کی ان بتوں کی طرف نسبت دیتے ہو، تم جن اعمال کا ارتکاب کر رہے ہو اور جو کچھ اللہ کے بارے میں غلط سوچ رکھتے ہو، اللہ پر افتراء باندھتے ہو کہ اللہ ان بتوں کی شفاعت کو تمہارے حق میں قبول کرے گا اور اللہ ان کے ذریعہ کائنات کا نظام چلا رہا ہے تو اللہ کے شریک بنانے کا تمہارا یہ جرم ایسا ہے کہ اسی بنیاد پر اللہ تمہیں عذاب دے گا۔ عذاب کو ''نکرہ'' لایا گیا تاکہ عذاب کی شدت اور سختی کو بیان کرے۔

آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جو بھی اللہ پر افتراء باندھتا ہے وہ مایوس ہی ہوگا یعنی وہ جس نتیجہ کو حاصل کرنے کی اُمید رکھتا ہے اس میں مایوس ہوگا، اس کی وہ آرزو پوری نہ ہوگی کیونکہ افتراء جھوٹ ہی سے ہے۔ جھوٹے اسباب کبھی انسان کو حقیقت تک نہیں پہنچاتے اور نہ ہی سچائی پر مبنی آثار تک پہنچاتے ہیں ان کے نتائج میں باقی رہنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ انسان کو سعادت کی طرف نہیں لے جاتے بلکہ اس کا انجام عاقبت شوم، بدبختی، ناکامی کے سواء کچھ نہ ہے۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾

''پھر ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور خفیہ گفتگو کرتے رہے۔''

موسیٰؑ کی نصیحت کا اثر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو خیر خواہی پر مبنی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی منطقی باتوں کا ان پر اثر ہو کیونکہ جو حق پر مبنی کلام ہوتا ہے وہ دلوں پر اثر چھوڑتا ہے اور کوئی بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اس گفتگو کے نتیجہ میں فرعون اور اس کے اعوان و انصار کے درمیان اور اسی طرح جادو گروں اور فرعونیوں کے درمیان بحث و مباحثہ شروع ہوا۔ اس اختلاف کو دُور کرنے اور موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کے متعلق بحث و مباحثہ کرنے کے لیے خلوت میں چلے گئے گویا مخفیانہ جلسہ برقرار کیا۔ بند دروازوں میں بیٹھ کر آپس میں گفتگو کرنے لگ گئے تاکہ داخلی انتشار ان کی کمزوری کو نمایاں نہ کر دے اور اس طرح وہ شکست نہ کھا جائیں۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

''کہا بے شک یہ دونوں جادو گر ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں اور تمہارے عمدہ طریقہ کو موقوف کر دیں''۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾

''پھر تم اپنی تدبیر جمع کر کے صف باندھ کر آؤ، اور بتحقیق آج جیت گیا جو (آج) غالب رہا''۔

فرعونیوں کا فیصلہ

فرعونیوں نے اپنے خفیہ اجلاس میں باہمی بحث و مباحثہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ دو، یہ بات طے ہے کہ یہ دونوں جادوگر ہیں، ان کا منصوبہ یہ ہے کہ تمہیں بے وطن کردیں اور مصر کی سرزمین سے تمہیں نکال دیں، تمہارے آئین کا خاتمہ کردیں اور خود بھی تمہارے اوپر مسلط ہو جائیں۔ اس بیان سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہما السلام کے رسول ہونے کا انکار کیا اور پھر ان دونوں کو چیلنج دیا تھا اس حوالے سے مکمل تیاری کا فیصلہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو نصیحتیں کی تھیں اسے نظرانداز کردیا۔ اپنی توصیف کو اُجاگر کیا، غیب کی نفی کی، فرعونیون نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی دعوت کا سدباب کریں اور انہیں نابود کردیں، اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ کر متحد ہو کر مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ آپس میں یہ کہا کہ ہم ہی غالب ہوں گے اور ان کو شکست دیں گے کیونکہ آج اس مقابلہ میں جو بھی غالب آئے گا تو وہی کامیاب ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن افراد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مواعظ کے بعد فرعونیوں کے درمیان اختلاف کیا تھا وہ فرعون کے دربار میں جو جادوگر موجود تھے اُنہوں نے اختلاف کیا لیکن فرعون نے انہیں انعامات کا وعدہ دیا اور ساتھ انہیں ڈرایا دھمکایا۔ اس طرح ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے تیار کرلیا اور فرعون نے ہی ان سے کہا کہ آج کے دن جو غالب آئے گا تو وہی کامیاب ہوگا اور وہ میرا مقرب بھی ہوگا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾

”کہا اے موسیٰ یا تو ڈال اور یا ہم پہلے ڈالنے والے ہوں“۔

فرعون کے جادوگروں کا اعلان

فرعون والوں کو اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ وہ غالب آئیں گے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا سحر و جادو ہی سمجھ رہے تھے، اس لیے انہوں نے بڑے اعتماد اور یقین سے کہا کہ اب موسیٰ پہلے تم اپنا عصا پھینکو، یا ہم پہلے اپنا عمل کرکے دکھائیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے لیے اختیار دیا کہ جیسا وہ چاہیں وہی کیا جائے گا۔ بڑا اجتماع تھا، فرعون اپنا تخت لگائے بیٹھا تھا جس طرح دو پہلوان اکھاڑے میں اترتے ہیں پس کچھ ایسا ہی منظر تھا ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اپنا عصا لیے کھڑے تھے تو دوسری طرف فرعون کے درباری اپنے اپنے کرتب کے لیے وسائل لیے میدان میں موجود تھے ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم آغاز کرتے ہو یا یہ لوگ آغاز کریں؟

قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَ عِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى ﴿۶۶﴾

''کہا بلکہ تم ڈالو، پس اچانک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو سے اس کے خیال میں دوڑ رہی ہیں''۔

فَاَوۡجَسَ فِىۡ نَفۡسِهٖ خِيۡفَةً مُّوۡسٰى ﴿۶۷﴾

''پھر موسیٰ نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا''۔

قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى ﴿۶۸﴾

''ہم نے کہا ڈرو مت بے شک تو ہی غالب ہوگا''۔

موسیٰؑ کا فیصلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب پر یقین تھا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ الٰہی معجزہ ہے اور شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم پہلے اپنا ہنر دکھاؤ تو اس اعلان کے بعد فرعون کے جادو گروں نے اپنی اپنی رسیاں مجمع کے درمیان زمین پر پھینکیں۔ جیسے ہی پھینکیں تو فوراً وہ رسیاں سانپ بن گئیں اور ایسا لگا جادو گروں کے اثر سے کہ وہ زمین پر چلنے لگ گئے۔

اس منظر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی مصلحت آڑے آئے اور ان کا توڑ میں پیش نہ کر سکوں۔ ایک طرح کا خوف محسوس کیا۔ اسی واقعہ کو اور جگہ پر اللہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

سَحَرُوٓا۟ أَعْيُنَ ٱلنَّاسِ وَٱسْتَرْهَبُوهُمْ [1]

ترجمہ: "لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا اور انہیں حیرت میں ڈال دیا اور ان کو ڈرایا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کھٹکا ہوا وہ ایسا نہ تھا کہ انہیں اپنے معجزہ بارے شک تھا پھر بھی وہ گھبرا گئے کہ یہ عوام سادہ ہیں ان کے دھوکہ میں آچکے ہیں اب اگلا مرحلہ کیا ہوتا ہے تو اس کا اختیار تو اللہ کے پاس ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً وحی آگئی کہ گھبراؤ نہیں، ان کا جادو بے اثر ہو گا اور معجزہ جو ایک حقیقت ہے وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح حضرت موسیٰ کو تقویت دی اور یہ اطمینان دلایا کہ جادو گروں کا جادو بے اثر ہو گا۔ عقیدہ حقہ جو ہے اس کا باطل مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اے موسیٰ علیہ السلام تیرا توکل اللہ پر ہے اور وہ اپنے لیے فرعون کو سب کچھ خیال کرتے ہیں ان کے تمام تر سعی ناکام ہو گی۔

---

[1] ۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۱۶۔

وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

"اور جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے ڈال دے کہ نگل جائے جو کچھ کہ انہوں نے بنایا ہے، صرف جادو گر کا فریب ہے، اور جادو گر کا بھلا نہیں ہوتا جہاں بھی ہو"۔

موسیٰؑ کے لیے اللہ کا فرمان

فرعونیوں نے جب اپنا جادو دکھایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ تم گھبراؤ نہیں تم اپنا عصا پھینک دو کہ جو انہوں نے اپنا ہنر دکھایا ہے اسے یہ عصا نگل جائے گا۔ وہی ہو گا جو اللہ کی مشیت ہے۔ اس میں لطیف نکتہ ہے کہ عصا جو لکڑی کا ہے لیکن جب اللہ کا ارادہ تعلق پکڑ لیتا ہے تو یہی لکڑی اژدھا بن جائے گا پھر ارادہ کرے تو یہ پھر لکڑی کا عصا بن جائے گا۔ فرعونیوں کے جادو اور قدرت مطلقہ کے درمیان مقابلہ ہے۔ واضح ہے کہ جو باطل ہے اس نے ناکام ہونا ہے۔ اللہ کا کلمہ ہی غالب ہوگا اللہ کی بات ہی غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غلبہ دیا، باطنی غلبہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عمل معجزہ تھا جو آپ کی نبوت و رسالت پر دلیل تھا اسی لیے اللہ نے فرمایا: اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ۔ کہ انہوں نے باطل کو لوگوں کی نظروں میں حقیقت کی شکل میں جلوہ گر کر دیا، ان کا یہ معاملہ سوائے خیال کے اور کچھ نہ تھا۔

آخر میں فرمایا: وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰى "ساحر کے لیے کامیابی نہیں" اسے وہی ملے گا جو تماشہ گروں کے خیال میں آیا ہے۔ ان کے خیال میں آیا تو وہ موہوم امر تھا، حقیقت اور واقعیت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہے کیونکہ باطل نے فنا ہونا ہے، اگر وقتی طور پر زینت اور رونق دے دے اور خود کو حق کا شبیہ بنا کر پیش کرے آخر کار باطل محو اور سرکوب ہونا ہے

جیسے اللہ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بنا اور ان کے جادو کو نگل لیا۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴿۷۰﴾

''پھر جادو گر سجدہ میں گر پڑے کہا ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے''۔

فرعونی ساحروں کا ایمان لانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنا عصا پھینکا تو وہ جس طرح سانپ بنا اور اس نے ساحروں کی رسیوں کو نگل لیا تو جتنے جادو گر تھے ان کو پتہ چل گیا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے وہ تو اک فن و ہنر تھا اس کا ایک سبب تھا جسے وہ استعمال کرکے لوگوں کی نظر بندی کرتے تھے اور رسیاں زمین پر حرکت کرتی نظر آتی تھیں لیکن جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا یہ سچ مچ سانپ بن گیا، انہیں یقین ہو گیا کہ اس عمل کا تعلق ظاہری اسباب سے نہیں بلکہ ان کا تعلق غیب سے ہے اور وہ غیب وہی ہے جس کے بارے موسیٰ و ہارون علیہما السلام پہلے اعلان کر چکے تھے لہٰذا انہوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ ہم تو اس معجزے کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی دعوت برحق ہے اور ہم ان کی دعوت پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ ہم موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔
سجدہ میں گر جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کو مان لیا اور یہ کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ﴿۷۱﴾

''کہا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لے آئے، بے شک یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا، سو اب میں تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹواؤں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا، اور تمہیں معلوم ہو جائے گا ہم میں سے کس کا عذاب سخت اور دیر تک رہنے والا ہے''۔

جادوگروں کے خلاف فرعون کا سخت اقدام

فرعون نے تحقیر آمیز لہجے میں دھمکی دیتے ہوئے اپنے جادوگروں سے کہا کہ تم نے ایسا اعلان کیوں کیا ہے؟ مجھ سے اجازت لینے سے پہلے موسیٰؑ پر ایمان کیوں لائے ہو۔ تم نے میری نافرمانی کی ہے، موسیٰؑ تمہارا بڑا ہے تم نے اس سے ہی سحر و جادوگری کا فن سیکھا ہے، اب سزا کے لیے تیار ہو جاؤ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دُوں گا۔ دائیاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کو مختلف جہتوں سے کاٹنے کے بعد تمہیں کھجور کے درختوں پر پھانسی چڑھاؤں گا اور سخت ترین عذاب دُوں گا تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ کون ہم میں سے سخت تر ہے۔ یہ سب تمہارا سیاسی منصوبہ تھا، تمہارا اور موسیٰؑ کا آپس میں گٹھ جوڑ تھا اب تمہاری سازش پکڑی گئی ہے۔

فرعون نے اس طرح کے اعلان سے عوام کے جذبات کو بھی بھڑکایا۔ پہلے تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر تہمت لگائی تھی کہ تم جادوگر ہو پھر ان کو چیلنج کیا تھا کہ میں نے تمہارا جادو ختم کر دیا گیا ہے مجمع عام میں مقابلے کے لیے اپنے جادوگروں کو لے آیا اور انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا لیکن وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الٰہی معجزہ کے سامنے شکست کھا گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر مبنی ہے لہٰذا انہوں نے اس یقین کی بنیاد پر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ یہ بات فرعون کے لیے ہزیمت کا باعث تھی اور مجمع عام میں اس کی شکست کا کھلا اعلان تھا اب اس نے اپنی گفتگو کا انداز بدلا اور ایک نیا سیاسی پتھر پھینکا اور یہ اس لیے کہا تاکہ عوام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیرو نہ بن جائیں اور اس کی

سلطنت میں رخنہ نہ پڑے۔ اس لیے سخت سزا کا اپنے خاصان کے لیے اعلان کیا تا کہ عوام کو پتہ چل جائے کہ اگر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا تو ان کے ساتھ بھی بدترین سلوک ہو گا۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝

''کہا ہم تجھے ہر گز ترجیح نہ دیں گے ان کھلی ہوئی نشانیوں کے مقابلہ میں جو ہمارے پاس آ چکی ہیں اور نہ اس کے مقابلہ میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، سو تو کر گزر جو تجھے کرنا ہے، تو صرف اس دنیا کی زندگی پر حکم چلا سکتا ہے''۔

جادوگروں کا فرعون کو ترکی بہ ترکی جواب

فرعون کے دربار میں اپنے جادو کا فن جگانے والوں نے فرعون کی دھمکی کا کوئی اثر نہ لیا اور بہت ہی بلیغ و عمدہ جواب دیا۔ ان کی گفتار میں گہرائی اور علم و حکمت ہے۔ یہ جادوگر تھے کہ جو فرعون سے خوفزدہ رہتے تھے۔ فرعون کا ان کے دلوں پر خوف طاری رہتا تھا۔ اُنھوں نے جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھا تو ان کو سمجھ آ گئی کہ یہ سحر و جادو نہیں ہے۔ وہ سب حقیقت کے شیدا ہوئے اور پوری جرأت اور بہادری سے فرعون کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس سے کہا کہ اے فرعون ہم نے حقیقت کو پا لیا ہے، تیرے زرق و برق، تیرا مال و سلطنت، تیرا جادو و جلال، تیری دُنیا و مادی لذات اور تیری دھمکیاں ہم اس راستہ سے پیچھے نہیں ہٹا سکتیں۔ جو کچھ تیرے پاس ہے یہ سراب و باطل ہے۔ جو آیات و نشانیاں ہمارے سامنے آئی ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی ہے۔ اللہ نے ہی ان کو ایجاد کیا ہے، ہم نے اللہ کی ولایت کو قبول کر لیا ہے۔ اللہ کی عزت سے ہی ہماری عزت ہے اس پر کسی اور کو ترجیح

نہیں دے سکتے۔ اللہ عزوجل کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی کسی کا ہمیں خوف ہے۔ تم جو چاہتے ہو کر لو، اور بالکل اپنے اعلان سے پیچھے نہ ہٹو۔ ہمیں پھانسی چڑھا دو تمہیں معلوم ہو کہ تم ہماری جانوں پر تصرف نہیں رکھتے اور ایمان لانے میں تیری اجازت کی ضرورت نہیں، اس کا تعلق دل سے ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ توں ہمارے ابدان اور جسموں پر اختیار رکھتا ہے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ یہ دُنیا فانی ہے، موت تو ایک دن آنی ہے یہ کیا ہی اچھی موت ہے جو اللہ پر ایمان لانے کے جرم کی سزا میں آئے۔ یہ ہمارے لیے جرم نہیں بلکہ سعادت ہے جس کا ہم نے انتخاب کیا ہے اور اس موت کے بعد ابدی حیات ہے جو ہمیں نصیب ہو گی۔ آخرت دار بقاء ہے۔ آخرت ہی یا سعادت ابدی ہے یا شقاوت ابدی ہے۔ سعادت مومنین صالحین کے لیے ہے اور شقاوت معاندین و کافروں اور منکروں کے لیے ہے۔

اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَاۤ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝٧٣

''بے شک ہم اپنے رب پر ایمان لائے ہیں تاکہ ہمارے گناہ معاف کرے اور جو تو نے ہم سے زبردستی جادو کرایا، اور اللہ بہتر اور سدا باقی رہنے والا ہے''۔

جادو گروں کا مجمع عام میں واضح اعلان

جادو گروں نے فرعون کی جبروتیت کا صفایا کرنے کے بعد پوری جرأت کے ساتھ واضح الفاظ میں اعلان کیا اور سابقہ بیان کا نتیجہ اس طرح بیان کیا: ہم اس پر ایمان لائے ہیں جو ہمارا رب ہے، جس کا قانون ہم پر لاگو ہے کیونکہ وہی ہمارا رازق ہے کیونکہ وہ ہمارا مالک ہے اس لیے کہ اس نے ہی ہمیں خلق کیا ہے لہٰذا ہم اس کی اطاعت میں جا رہے ہیں۔ تیرا قانون

ہمارے اوپر لاگو نہیں ہوتا اور ہم اپنے رب سے گذشتہ گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور تو نے ہم سے جو زبردستی اللہ کے رسولؑ کے مقابلہ میں لے آیا اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو گناہ کا رویہ اپنایا اس تازہ گناہ کی معافی مانگتے ہیں۔ اللہ ہی بہترین ہے سب خیر کا مالک وہی ہے اور وہی سب ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ زوال تیرے لیے ہے، تیرے پاس شر ہے، فساد ہے۔ ہم نے خیر کا انتخاب کیا ہے، اس کا انتخاب کیا جہاں بقا ہے، فنا نہیں۔ اللہ ہی تمام صفات کمالیہ وجلالیہ کا مالک ہے جس نے ہمیں خلق کیا ہے اسے چھوڑ کر ہم تیری ربوبیت وحاکمیت میں نہیں رہ سکتے۔ اللہ ہمارا بخشنے والا ہے اپنے بندگان پر مہربان ہے۔ جب ہم اس در پر آگئے تو پھر ہمیں کسی کی پرواہ نہیں۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾

''بے شک جو شخص اپنے رب کے پاس مجرم ہو کر آئے گا سو اس کے لیے دوزخ ہے، جس میں نہ مرے گا اور نہ جیئے گا''۔

مجرموں کے لیے جہنم کی سزا

مجمع عام میں جادوگروں نے فقط اپنے ایمان کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی فقط اپنے گناہوں کی معافی مانگی بلکہ یہ بھی بتادیا اور بڑا زوردار الفاظ کے ساتھ کہ جو اللہ کے نافرمان ہیں، جرائم پیشہ ہیں، جب وہ مریں گے اور اپنے جرائم کے ساتھ رب تعالیٰ کی جناب میں حاضری دیں گے تو ان کے واسطے جہنم کا عذاب تیار اور آمادہ ہے اور جہنم میں جن کو پھینکا جائے گا نہ تو ان کو موت آئے گی کہ وہ اس عذاب سے جان چھڑا سکیں اور نہ ہی زندہ ہوں گے کہ دُنیاوی زندگی کی لذات اُٹھا سکیں۔ مسلسل آگ میں جلتے رہیں گے اور ہمیشہ کے لیے اس عذاب میں رہیں

گے۔

اس ضمن میں سب کو کہہ دیا کہ اللہ رب العالمین پر ایمان لے آؤ، اپنے گناہوں کی معافی اسی دُنیا میں مانگ لو، آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ گے۔ نفرتوں کے جرائم کا بوجھ اُٹھائے آخرت میں جاؤ گے تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سخت ترین عذاب میں ہو گے۔

وَمَنْ يَّأْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾

''اور جو اس کے پاس مومن ہو کر آئے گا حالانکہ اس نے اچھے کام بھی کیے ہوں تو ان کے لیے بلند مرتبے ہوں گے''۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

''ہمیشہ رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اس کی جزا ہے جو گناہ سے پاک ہوا''۔

ایمان اور عمل صالح کے ثمرات

جادو گروں کا بیان ہی چل رہا ہے، جہاں پر مجرموں کی سزا کو بیان کیا وہاں پر ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی جزاء اور ثواب کو بھی بتا دیا۔ اس جگہ یہ بھی بتایا کہ فقط مومن ہونا کافی نہیں بلکہ ایمان لانے کے بعد اعمال صالح کو بجالانا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہا کہ جو ایمان لاتے ہیں اور اعمال صالح بجالاتے ہیں۔ ایمان لانے کے بعد اللہ کے قانون پر عمل کرتے ہیں تو ان کے لیے بڑے مقامات ہیں۔ ان کے لیے خوبصورت، دلکش سرسبز و شاداب باغات اللہ نے بنا رکھے ہیں۔ ایسی جنت ہے، ایک نہیں بلکہ کئی جنتیں ہیں جہاں پر ہمیشہ رہنا ہے جن کا سبزہ اور شادابی ختم نہ ہونے والی ہے۔ یہ سب اجر و ثواب ان کے لیے

جنہوں نے تزکیۂ نفس کیا ہے، خود کو پاکیزہ بنایا ہے، کثافتوں، گناہ کی غلاظتوں و نجاستوں سے خود کو پاک رکھا ہے۔

فرعون شکست کھا گیا، جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کو مکمل طور پر لاجواب بھی کیا، اس کو بے حیثیت قرار دیا اور پورے اجتماع میں موجود لوگوں کے سامنے نہ فقط اپنے ایمان کا اعلان کیا بلکہ ایمان نہ لانے والوں کی سزا کا بتایا اور جو ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں تزکیۂ نفس جنہوں نے اس دنیا میں کیا ہے ان کے لیے جنت الفردوس کی نوید سنائی۔ اس طرح یہ افراد درجۂ شہادت کو پاتے ہیں۔ مگر شہید ہونے سے پہلے بھرپور انداز سے تبلیغ دین کا فریضہ ادا کیا۔

وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِی الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

اور ہم نے البتہ موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا پھر ان کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا دے، پکڑے جانے سے نہ ڈر اور نہ کسی خطرہ کا خوف کھا۔

موسیٰؑ کو مصر سے اپنی قوم لے کر نکلنے کا حکم

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا ہے کہ اب تم اپنی قوم کو لے کر رات کے وقت نکل پڑو۔ جب دریا کے کنارے پہنچو گے تو وہاں دریا کے پانی پر عصا کو مارنا، اس طرح دریا میں خشک راستہ بن جائے گا اور دشمن سے مت ڈرو۔ دشمن جب پیچھے آئے گا تو اس سے مت ڈرو کوئی بھی تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، تم اس حوالے سے مت ڈرو۔

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾

''پھر فرعون نے اپنے لشکر کو لے کر ان کا پیچھا کیا پھر انہیں دریا نے ڈھانپ لیا جیسا ڈھانپا''۔

وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

''اور فرعون نے اپنی قوم کو بہکایا اور راہ پر نہ لایا''۔

فرعونیوں کا غرق آب ہونا

قرآن نے فرعونیوں کے غرق ہونے کا ہولناک منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ جب فرعون اپنے لشکریوں کے ہمراہ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے جاتا ہے تو انہیں دریا کا سامنا کرنا پڑا۔ دریا میں راستے بنے ہوئے تھے، دو طرف سے دریا تھا، درمیان میں راستہ تھا، موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے، فرعون اپنے لشکریوں سمیت اسی راستہ پر چل پڑتے ہیں جیسے ہی فرعون اور اس کے لشکری دریا کے درمیان میں پہنچتے ہیں تو دونوں اطراف سے پانی ان کے اوپر آجاتا ہے اس طرح وہ سارے دریائے نیل کی تند و تیز لہروں میں غرق ہوتے ہیں کوئی ایک بھی غرق ہونے سے نجات نہ پا سکا۔ فرعون نے قوم کو گمراہ کیا وہ جو یہ کہتا تھا کہ وہ اپنی قوم کو صحیح راستہ پر لے کر چلے گا تو وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ فرعون نے اپنی قوم سے یہ کہا تھا:

وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ''میں تمہیں سیدھے راستہ کے سوا کچھ بھی راہنمائی نہیں دُوں گا (میں تو تمہیں پس صحیح و سالم راستہ کی ہدایت کروں گا)۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اس کے دعویٰ کو جھٹلایا ہے کہ اس نے اپنی قوم سے جھوٹ بولا تھا،

---

[1]۔ سورۂ مومن، آیت: ۲۹۔

خود بھی غرق ہوا اور قوم کو بھی غرق کیا۔

دریا میں خشک راستہ کا بن جانا ایک اور معجزہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾

''اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی اور تم سے طور کی دائیں طرف کا وعدہ کیا اور تم پر من و سلوی اتارا''۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾

''کھاؤ جو ستھری چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں اور اس میں حد سے نہ گزرو کہ پھر تم پر میرا غضب نازل ہوگا، اور جس پر میرا غضب نازل ہوا سو وہ گڑھے میں جا گرا''۔

بنی اسرائیل کے لیے الٰہی نعمات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو مہربانیاں فرمائیں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے:۔

۱۔ فرعون جیسے جابر و خونخوار کے ظلم سے نجات دلائی۔

۲۔ بنی اسرائیل کے دشمن کو سزا دی کہ اسے دریا میں غرق کر دیا۔

۳۔ کوہ طور کی دائیں جانب یہ اشارہ ہے کہ چالیس دن کا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وعدہ دیا گیا، بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے کتاب توریت نازل فرمائی۔

۴۔ جب بیابانوں اور صحراؤں میں سر گرداں تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روزی کا انتظام اس طرح کیا کہ آسمان سے بھنے ہوئے پرندے کے گوشت کا آنا اور آسمان سے

شہد مانند (ترنجبین) اُترتی ہے جسے وہ کھاتے ہیں۔

۵۔ عمدہ اور پاکیزہ غذاؤں کا انتظام کیا گیا۔

ان نعمات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تنبیہ کی کہ میری نعمات کا شکر بجالاؤ، ناشکری نہ کرو۔

بنی اسرائیل کی ناشکری

بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نعمات کا کفران کیا اور یہ کہا کہ ہم تو ایک قسم کی غذا کھا کھا کر تنگ آگئے ہیں، ہمیں اور قسم کی غذائیں دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ اگر تم ایسا کروگے تو پھر میرا غضب تمہارے اوپر ہر صورت اُترے گا۔ اللہ کا غضب اس طرح ہے کہ جب اللہ کا ارادہ ہو کہ کسی عبد کو سزا دی جائے تو پھر اس سزاء کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں اور ان اسباب کے تحت انہں سزا ملتی ہے۔

یہ دُنیاوی سزا کے بارے ہے جبکہ اُخروی سزا اللہ کی طرف سے جہنم کی صورت میں آمادہ ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معصیت کی وجہ سے اللہ کا غضب اُترتا ہے۔ جب اللہ کا غضب کسی پر آجائے تو پھر اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس طرح بنی اسرائیل کو متوجہ کیا گیا کہ تم اللہ کی نعمات پر شکرادا کرنے والے بنو، اللہ کی نافرمانی نہ کرو، سرکشی سے باز رہو وگرنہ میرا غضب تمہارے اوپر ایسا آئے گا کہ تم سب ہلاک وبرباد ہو جاؤ گے۔

اللہ کا رحمت اتارنے کا وعدہ

سخت عذاب کا بیان دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی حتمی رحمت کا بیان دیا ہے اور یہ واضح بتا دیا کہ اللہ کی رحمت کن کے لیے ہو گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ نے اپنا وصف غفار بیان کیا ہے یعنی بہت زیادہ بخشش دینے والا۔ اس کے بعد اللہ کی رحمت جن کے لیے ہے ان کے اوصاف بتا دیئے:

۱۔ ایمان والے ہوں

۲۔ نیک عمل کرنے والے ہوں

۳۔ غلطی کرنے کے بعد واپس پلٹ آنے والے ہوں یعنی توبہ کرنے والے

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ایسے افراد ہدایت یافتہ ہیں اور ان ہی پر اللہ کا کرم و فضل ہو گا۔ شرک کو چھوڑ کر توحید کو قبول کرنا، اللہ کے رسولوں، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا اور اللہ کے قوانین پر عمل کرنا، اللہ کے قوانین کی مخالفت نہ کرنا، معصیت کاری کو اطاعت الٰہی میں بدل دیناہی سامان ہدایت ہے۔ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ توبہ سابقہ گناہ سے ہوتی ہے آنے والے اعمال سے متعلق نہ ہے لہٰذا بخشش ان گناہوں سے ہے جو وہ پہلے کر چکا ہے اور توبہ اسی حال میں مفید ہے کہ جب ایک دفعہ سابقہ گناہوں سے توبہ کرلے تو پھر توبہ کرنے کے بعد دوبارہ گمراہ نہ ہو جائے۔ ثم اھتدی۔۔۔۔۔۔ ثم تاخیر کو بیان کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب توبہ کر لی ہے اور گذشتہ گناہوں کی معافی مل گئی تو پھر اس پر قائم رہے دوبارہ گناہ نہ کرے، ثابت قدم رہے۔[1]

سورۂ نور آیت ۵ میں ارشاد ہوا:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ

ترجمہ: ’’مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اور توبہ کے بعد اصلاح کریں۔‘‘

بنی اسرائیل کی سیرت و رویہ

بنی اسرائیل کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان تھا، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کی رہبریت کے بارے توقف کیا ہوا تھا، سستی کرتے تھے، کہنا نہیں مانتے، اس جگہ ’’اھتدا‘‘ کا معنی رسول پر ایمان لانے کے بعد اس کی پیروی کرنا ہے۔ ان کی

---

[1]۔ سورہ آل عمران، آیت: ۸۹۔

بات کو تسلیم کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے یہ طے ہے کہ رسول کو مومنوں پر خود ان کے اپنے اختیار سے زیادہ اختیار ہے۔ مومنوں کی جان و مال آبرو رسول کے اختیار میں ہے۔ رسول کا حق زیادہ ہے اور یہ حق مولویت ہے مولا اور آقا ہونے کا حق ہے۔ اگر ایمان لانے کے بعد ان کی پیروی کریں گے تو گمراہ نہ ہوں گے۔ پیروی شرط ہے۔[1]

وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ﴿۸۲﴾

''اور بے شک میں بڑا بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے کام کرے پھر ہدایت پر قائم رہے''۔

وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۸۳﴾

''اور اے موسیٰ تجھے اپنی قوم سے پہلے جلدی آنے کا کیا سبب ہوا''۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیْ وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ﴿۸۴﴾

''کہا وہ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں اور اے میرے رب میں جلدی تیری طرف آیا تاکہ تو خوش ہو''۔

موسیٰؑ کا اپنی قوم کے خاص افراد کے ہمراہ کوہ طور پر آنا

اس آیت میں قوم سے مراد وہ ستر آدمی ہیں جن کا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے انتخاب کیا تھا لیکن جو وعدہ گاہ تھی اس میں حاضر ہونے کے لیے ان سے پہلے جا پہنچے تو اس بارے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھ لیا کہ تم انہیں پیچھے چھوڑ کر جلدی جلدی اس

---

[1] ۔ ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ'' ''نبی مسلمانوں کے معاملہ میں ان سے بھی زیادہ دخل دینے کا حقدار ہے'' سورۂ احزاب، آیت: ۶۔

جگہ کیوں آئے ہو؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: وہ میرے پیچھے آ رہے ہیں اور میرے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ میں نے جلدی تیری رضایت حاصل کرنے کے لیے کی ہے، کچھ اور بات نہ ہے اور اے اللہ تو خود ہی اس وجہ بارے مجھ سے زیادہ دانا و آگاہ ہے۔

قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾

" فرمایا تیری قوم کو تیرے بعد ہم نے آزمائش میں ڈال دیا ہے اور انہیں سامری نے گمراہ کر دیا ہے"۔

موسیٰؑ کی قوم کی گمراہی

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ جب تم اپنی قوم سے آگے نکل کر اس جگہ آگئے تو تیرے پیچھے سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے، ان کے لیے بچھڑا بنا لیا اور انہیں بچھڑے کی پوجا پر لگا دیا ہے یہ تو ہمارا امتحان تھا اور تیری قوم والے اس امتحان میں ناکام ہو گئے ہیں اب جا کر دیکھو گے تو وہ بچھڑے کی پوجا پر لگے ہوئے ہوں گے۔

فَرَجَعَ مُوۡسٰۤى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ الۡعَهۡدُ اَمۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ يَّحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُمۡ مَّوۡعِدِىۡ ﴿۸۶﴾

"پھر موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ میں بھرے ہوئے افسوس کرتے ہوئے لوٹے، کہا اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر کیا تم پر بہت زمانہ گزر گیا تھا یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غصہ نازل ہو تب تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی"۔

موسیٰؑ کی اپنی قوم کے پاس واپسی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنی قوم کی گمراہی کا پتہ چلا تو انہیں بہت ہی افسوس ہوا اور فوراً غضبناک حالت میں قوم کے پاس واپس پلٹے۔ جب قوم کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ بچھڑے کی پوجا کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ کو بہت دُکھ ہوا۔ قوم کو آگہی دینے کے لیے ان سے فرمایا کیا تمہارے پروردگار نے تمہیں اچھا وعدہ نہ دیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دستور کی کتاب توریت نازل نہیں فرمائی کہ اس میں قوانین موجود ہیں جن کے مطابق تم نے اعمال کرنے ہیں جس پر عمل کرنے سے تمہارے لیے دُنیا و آخرت کی سعادت مندی ہے؟ کیا اللہ نے تمہیں دشمن کے قبضہ سے نہیں چھڑایا؟ اللہ نے تمہیں اپنی نعمات سے نہیں نوازا، کیا میری تم سے جدائی اور مقارفت کو طولانی سمجھ لیا اور یہ تم پر گراں گزرا اور میری واپسی سے نااُمید ہو گئے تھے اس طرح تمہارا داخلی نظام درہم برہم ہو گیا ہے پھر تم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ سرکشی کرتے ہوئے واپس کفر کی طرف پلٹ جاؤ اور اس طرح تم نے گوسالہ کی پوجا شروع کر دی۔

اس طرح تم نے اللہ کے غضب کو اپنے لیے دعوت دے دی ہے تم نے تو مجھے وعدہ دیا تھا کہ میرے بعد تم اچھائی پر قائم رہو گے اس وعدہ کے خلاف تم نے یہ سب کچھ کیا کیا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ان کی وعدہ خلافی یہ تھی کہ انہوں نے میقات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے پہنچنا تھا لیکن انہوں نے اس وعدہ کے خلاف کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے نہ گئے۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وعدہ خلافی یہ تھی کہ اُنہوں نے وعدہ دیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی اطاعت کریں گے لیکن اُنہوں

---

[1]۔ مجمع البیان، ج ۷۔

نے ایسا نہ کیا۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾

''کہا ہم نے اپنے اختیار سے آپ سے وعدہ خلافی نہیں کی لیکن ہم سے اس قوم کے زیور کا بوجھ اٹھوایا گیا تھا سو ہم نے اسے ڈال دیا پھر اسی طرح سامری نے ڈال دیا''۔

قوم کا موسیٰؑ کو جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں قوم نے کہا کہ ہم نے خود سے تو کچھ نہیں کیا ہم جب فرعونیوں سے نکلے تو ہم نے ان کے سونے چاندی کے زیورات اپنے ساتھ اُٹھا لیے تھے۔ یہ بھاری تھا ہم تھک گئے انکا بوجھ اٹھاتے ہوئے تو ہم نے ان کو آگ میں پھینک دیا۔ سامری کے پاس بھی جو کچھ تھا اس نے بھی پھینک دیا۔ جب یہ سونا پگھل گیا تو سامری نے اس پگھلے ہوئے سونے سے الگ گوسالہ بناڈالا یا اس طرح بھی ہو سکتا ہے اس کا معنی کہ جب ہم نے یہ سب زیورات آگ میں پھینک دیئے اور سونا پگھل گیا تو سامری نے اس پگھلے ہوئے سونے سے گوسالہ بناڈالا۔ یہ سب کچھ ہمارے ارادے سے تو نہیں ہوا، خود بخود ایسا ہوتا چلا گیا گویا کہنا چاہتے تھے کہ ہم بے اختیار تھے، غیر ارادی طور پر ایسا ہو گیا کیونکہ اس گوسالہ بنانے میں ہم نے اپنے اموال سے تو کچھ بھی نہیں خرچ کیا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾

"پھر ان کے لیے ایک بچھڑا نکال لایا ایک جسم جس میں گائے کی آواز تھی، پھر کہا یہ تمہارا اور موسیٰ کا معبود ہے، سو وہ بھول گیا ہے"۔

گوسالہ بنائے جانے کا احوال

سامری نے اس پگھلے ہوئے سونے سے گوسالہ بنایا لیکن آیت کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظروں سے مخفی تھا کہ سامری اس سے کیا بنا رہا ہے۔ ایک بے جان جسم بنا جو گوسالہ کا جسم تھا۔ اس گوسالہ سے آواز آرہی تھی اس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا اس عبادت سے پتہ چلتا ہے کہ گوسالہ بنانے والا اکیلا سامری نہ تھا بلکہ اس کے مددگار بھی تھے ۔ خفیہ جگہ پر ان سب نے سامری کا ساتھ دیا جب گوسالہ تیار ہو گیا اور اس سے آوازیں آنے لگیں تو پھر یہ اسے اُٹھا کر لوگوں کے سامنے لے آئے اور سامری اور اس کے ساتھیوں نے مل کر قوم سے یہ کہا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے الٰہ بارے متلاشی تھے تو یہ ہے موسیٰؑ کا الٰہ اور تمہارا الٰہ۔ پس تم اسی کی عبادت کرو۔ اس کے آگے سر جھکا دو، موسیٰؑ تو اللہ کی جستجو و تلاش میں کوہ طور پر گیا ہے اور تمہیں بھی وہاں پہنچنے کا کہا تھا تو یہ ہے موسیٰ کا الٰہ۔ وہ بھول گیا، یعنی سامری اور اس کے ساتھیوں نے قوم سے یہ کہا کہ موسیٰ بھول گیا کہ اس کا معبود تو یہاں پر موجود ہے اور وہ کوہ طور پر چلا گیا ہے اپنے معبود کی تلاش میں۔ بعض نے اس کی ضمیر کو سامری کی طرف پلٹایا ہے کہ سامری جو پہلے ایمان لا چکا تھا وہ بھول گیا کہ اس کا الٰہ، اللہ ہے۔ اس نے ایسا عمل انجام دیا جس سے اس نے پوری قوم کو گمراہ کر دیا۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

"کیا پس وہ نہیں دیکھتے کہ وہ انہیں کسی بات کا جواب نہیں دیتا، اور ان کے نقصان اور نفع کا بھی اسے اختیار نہیں"۔

گوسالہ پرستوں کی مذمت

اس جگہ گوسالہ پرستوں سے سوال کیا جا رہا ہے کہ تم کیسے ناسمجھ ہو کہ گوسالہ تمہارے ساتھ تو باتیں نہیں کرتا اور نہ ہی تمہاری باتوں کا جواب دیتا ہے، ایسی چیز کی پرستش کیوں کر رہے ہو جو نہ تو تمہاری حاجات پوری کر سکتا ہے نہ تمہیں کوئی منفعت دیتا ہے اور نہ ہی تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے جبکہ عقل و فہم کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس کی عبادت کی جائے وہ تمہاری حاجات کو پورا کرے اور تمہارے نفع و نقصان کا مالک ہو۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾

"اور انہیں ہارون نے اس سے پہلے کہہ دیا تھا اے میری قوم اس سے تمہاری آزمائش کی گئی ہے، اور بے شک تمہارا رب رحمان ہے سو میری پیروی کرو اور میرا کہا مانو"۔

حضرت ہارونؑ کا اپنی قوم کو متنبہ کرنا

حضرت ہارون علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دیکھا کہ وہ گوسالہ کی پوجا کر رہے ہیں تو انہوں نے ان سے کہا کہ دیکھو تم اس گوسالہ کے ذریعہ دھوکہ کھا گئے ہو یہ تو تمہارا امتحان ہے، اپنی عقل کی پیروی تم نے نہیں کی اور پیغمبر کے وصی کا کہنا بھی نہیں مانا۔ یہ تو تمہارا امتحان ہو رہا ہے اس میں تم دھوکہ کھا گئے ہو، تمہارا تو رحمٰن ہے اللہ ہے، جو تمہارے اوپر مہربان ہے تم

پر واجب ہے کہ میری پیروی کرو تاکہ میں تمہاری ہدایت کروں، تمہیں صحیح طریقہ بتاؤں۔ صحیح راستہ پر لے کر چلوں لیکن ہارونؑ کی باتوں کا اثر انہوں نے نہیں لیا اور گوسالہ کی پوجا پاٹ پر لگے رہے۔ اس طرح حق سے انحراف کیا اور ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا۔

قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَيۡهِ عٰكِفِيۡنَ حَتّٰى يَرۡجِعَ اِلَيۡنَا مُوۡسٰى ﴿۹۱﴾

''کہا ہم برابر اسی پر جمے بیٹھے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ ہمارے پاس لوٹ کر آئے''۔

ہارونؑ کی مخالفت

حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کی، انہیں غلطی پر تنبیہ کی۔ انہیں جھنجھوڑا لیکن انہوں نے ہارون علیہ السلام کی بات کو نہ مانا اور بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ ہم گوسالہ کی پوجا پر قائم رہیں گے یہاںتک کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آجائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئیں گے تو پھر اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ آکر اس گوسالہ کے بارے کیا فرمان جاری کرتے ہیں۔

قَالَ يٰهٰرُوۡنُ مَا مَنَعَكَ اِذۡ رَاَيۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ۙ﴿۹۲﴾

''کہا اے ہارون تمہیں کس چیز نے روکا جب تم نے دیکھا تھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں''۔

اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيۡتَ اَمۡرِىۡ ﴿۹۳﴾

''تو میرے پیچھے نہ آیا، کیا تو نے بھی میری حکم عدولی کی''۔

قَالَ يَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡيَتِىۡ وَ لَا بِرَاۡسِىۡ ۚ اِنِّىۡ خَشِيۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَيۡنَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَ لَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِىۡ ﴿۹۴﴾

''کہا اے میری ماں کے بیٹے میری داڑھی اور سر نہ پکڑ، بے شک میں ڈرا اس سے کہ تو کہے گا تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میرے فیصلہ کا انتظار نہ کیا''۔

موسیٰؑ کا ہارونؑ سے ناراضگی کا اظہار

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپسی پر جب اپنی قوم کو گوسالہ کی پرستش کرتے دیکھا تو انہیں بہت ہی دُکھ ہوا۔ جب وہ میقات کے لیے گئے تھے تو اپنا خلیفہ حضرت ہارون علیہ السلام کو مقرر کرکے گئے تھے، اس لیے وہ سیدھے حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس گئے اور ان سے بہت زیادہ غصہ کیا کہ تم نے یہ کیا؟ یہ قوم گوسالہ کی پرستش پر جُت گئی ہے اور تم خاموش تماشائی رہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی داڑھی کو بھی پکڑ لیا، شاید انہیں سزا دینے پر تُل گئے ہوں تو حضرت ہارون علیہ السلام نے فوراً ان کے انسانی جذبات و احساسات اُبھارنے کے لیے بہت نرم لہجے میں پیارے انداز سے کہا ماں جائے میری داڑھی نہ پکڑو، مجھ پر اتنا زیادہ غصہ مت ہو، نہ ہی میرے سر کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر جھٹکو۔

ایسا لگتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے سر کے بالوں اور داڑھی کو شدت غضب میں پکڑ لیا تھا تاکہ انہیں سزا دیں اور یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ان کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے صحیح ذمہ داری ادا نہیں کی تو حضرت ہارون علیہ السلام انہیں اس طرح جواب دیتے ہیں کہ بھئی اگر میں انہیں گوسالہ پرستی سے روکتا اور ان پر سختی کرتا بہت ہی تھوڑے میری بات کو مانتے اور اکثرت بغاوت کرتی۔ اس طرح بنی اسرائیل کی یکجہتی درہم برہم ہو جاتی اور یہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے۔

اس طرح بنی اسرائیل میں افتراق و انتشار پیدا ہو جاتا اور ہو سکتا تھا کہ اس طرح ان کے درمیان قتل و غارت گری شروع ہو جاتی۔ خونریزی کا خطرہ تھا مجھے آپ کا فرمان یاد آیا کہ آپ نے ان کے درمیان صلح و یگانگت برقرار رکھنے کی تاکید کی تھی لہٰذا مجھے خوف ہوا کہ اگر میں

ایسا کرتا ہوں اور میرے اقدام سے بنی اسرائیل افتراق و انتشار پھیل جاتا ہے تو آپ مجھے کہیں گے کہ تم نے میرے فرمان کا پاس نہ کیا اور بنی اسرائیل کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ لہٰذا جب میں نے یہ تشخیص دی کہ اکثریت میری بات کو نہ مانیں گے اور گوسالہ پرستی کو نہ چھوڑیں گے تو میں نے خاموشی میں مصلحت جانی اور انہیں گوسالہ پرستی سے منع نہ کیا۔

پیغام: اس بیان سے یہ پیغام ملتا ہے کہ اتحاد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر بھی آمادہ رہنا چاہیے۔ قومی وحدت اتنی اہم ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے گوسالہ پرستی سے منع نہ کیا کہ آپ کی بات اکثریت قبول نہ کرتی اور دو گروہوں میں قوم تقسیم ہو جاتی اور ان کے درمیان قتل و غارت گری شروع ہو جاتی۔ اس سے بڑا سبق ملتا ہے کہ ہم مسلمان نماز میں ہاتھ باندھنے اور ہاتھ کھولنے پر لڑتے ہیں، امامت و خلافت کو بنیاد بنا کر اپنے درمیان افتراق و انتشار کو فروغ دینے پر تیار ہو جاتے ہیں جو کہ اللہ کو بالکل پسند نہیں۔ اسلامی وحدت اہم ترین فریضہ ہے، اس کی حفاظت ہر حال میں ہونی چاہیے۔ اگرچہ بعض برحق مطالب کے بیان کے بارے خاموشی ہی کیوں نہ اختیار کرنی پڑے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾

"کہا، اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے"۔

سامری سے موسیٰؑ کا سوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت ہارون علیہ السلام سے بازپرس کر چکے تو پھر سامری کے ساتھ مکالمہ شروع کیا۔ اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ سامری تم نے یہ کیا کیا؟ اتنا بڑا جرم کر ڈالا۔ کس بات نے تمہیں ایسے جرم کے ارتکاب پر آمادہ کیا۔

قَالَ بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ یَبۡصُرُوۡا بِهٖ فَقَبَضۡتُ قَبۡضَةً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِیۡ نَفۡسِیۡ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: کہا میں نے وہ چیز دیکھی تھی جو دوسروں نے نہ دیکھی پھر میں نے رسول کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی مٹی میں لے کر ڈال دی اور میرے دل نے مجھے ایسی ہی بات سوجھائی۔

سامری کا موسیٰؑ کے لیے جواب

اس آیت کے بارے مفسرین نے تفسیر کرتے وقت اختلاف کیا ہے۔ سامری کے جواب کو دو طرح سے بیان کیا ہے:

۱۔ سامری نے یہ کہا کہ جب جبرئیلؑ فرعونیوں کو غرق آب کرنے کے لیے آئے تو میں نے انہیں دیکھ لیا تھا تو میں نے ان کے پاؤں کی مٹی کو اٹھا لیا تھا وہ مٹی میرے پاس تھی جب میں نے فرعونیوں کے زیورات سے ایک مجسمہ بنایا تو میرے نفس نے مجھے آمادہ کیا۔ میرے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اب جب مجسمہ بنالیا ہے تو جو تمہارے پاس مٹی ہے اسے اس کے اندر ڈال دو۔ پس جب میں نے یہ مٹی اس مجسمہ میں ڈالی تو اس کے اندر سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں پس پھر کیا تھا کہ میں نے اسے مقدس قرار دیتے ہوئے سب سے کہا کہ یہ ہے تمہارا رب۔ پس اس کے آگے جھک جاؤ۔

۲۔ ''اثر رسول'' سے مراد یہ لیا ہے کہ سامری نے کہا کہ آپ نے جس شخص کو فرعونیوں کے زیورات اٹھانے کا حکم دیا تھا میں نے آپ کے اس نمائندے سے کچھ اموال چرا لیے تھے، ان کو میں نے بھٹی میں ڈالا، انہیں مخصوص سانچوں میں ڈھالا اور ایک بت (مجسمہ) بنالیا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس کے بارے میں آگاہ تھا جبکہ دوسرے ایسا کام کرنے سے

واقف نہ تھے۔

جو بات سامری نے اس جگہ کہی وہ یہ ہے کہ اتنے برے جرم کے لیے میرے نفس نے مجھے آمادہ کیا۔ انسانی نفس ہی ہے جو اسے اللہ کی نافرمانی پر اکساتا ہے اور غلط کاموں پر آمادہ کرتا ہے۔

پیغام: نفس کی آرزوؤں پر کان نہ دھرو، عقل و فہم سے کام لو۔ نفسانی خواہشات بربادی کی جانب لے جاتی ہیں، عقل ہی انسان کو صحیح راستہ پر برقرار رکھتی ہے۔

قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِی الۡحَیٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ ۚ وَ انۡظُرۡ اِلٰۤی اِلٰهِكَ الَّذِیۡ ظَلۡتَ عَلَیۡهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِی الۡیَمِّ نَسۡفًا ﴿۹۷﴾

''کہا بس چلا جا تیرے لیے زندگی میں یہ سزا ہے کہ تو کہے گا ہاتھ نہ لگانا، اور تیرے لیے ایک وعدہ ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں، اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو جما بیٹھا تھا، ہم اسے ضرور جلادیں گے پھر اسے دریا میں بکھیر کر بہادیں گے''۔

سامری کی سزا

پہلی سزا کہ وہ لوگوں کے درمیان نہیں رہے گا کسی سے بات چیت نہ کرسکے گا۔

(منہج الصادقین)

ا۔ بعض نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری پر نفرین کی جس کی وجہ سے اسے وبائی بیماری لگ گئی کہ جو بھی اس کے قریب ہوتا تھا اسے بھی وہی بیماری لگ جاتی تھی لہٰذا جو بھی اس کے قریب ہونے لگتا تو اسے کہا جاتا کہ تم دُور رہو۔ سامری خود ہی چیخ چیخ کر کہے گا تم میرے قریب مت آنا۔ بعض نے یہ کہا ہے وہ وسواس کی بیماری میں مبتلاء ہو گیا جب

بھی کوئی اس کے قریب ہوتا تو وہ فوراً اسے کہہ دیتا کہ تم مجھ سے دُور ہو جاؤ۔

۲۔ دوسری خبر اسے یہ دی گئی کہ اس جرم کی سزا بھگتنے کے ساتھ ہی تم ہلاک ہو جاؤ گے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر نفرین کرتے ہیں کہ تم ہلاک ہو جاؤ کہ تم نے اتنا بڑا جرم کیا ہے اور اتنی بڑی تعداد کو کافر بنا دیا، بت پرستی پر لگا دیا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

گوسالہ کا انجام

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان کیا کہ جس گوسالہ کی پوجا کر رہے ہیں ہم اس کو جلائیں گے یہ طلا (سونا) سے بنایا گیا ہے ہم اس کی راکھ کو دریا میں پھینک دیں گے، ایک ذرہ بھی دریا سے باہر نہ چھوڑیں گے۔[1]

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

"تمہارا معبود وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے علم میں سب چیز سما گئی ہے"۔

موسیٰؑ کا بنی اسرائیل کے لیے واضح اعلان

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے بارے جو فیصلہ دیا اور گوسالہ کے انجام کا بتانے کے بعد بنی اسرائیل کو واضح بیان سے سمجھایا کہ تمہارا معبود اللہ ہی ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ گوسالہ اللہ کا شریک نہیں، گوسالہ جو نہ سمجھتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ علم رکھتا ہے نہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے؛ وہ کس طرح تمہارا معبود ہے؟ اللہ ہی معبود ہے، اللہ ہی رب ہے، اللہ ہے جس کے پاس ہر شئی کا علم ہے۔

---

[1]۔ رُوح المعانی، منہج الصادقین۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَ قَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾

''ہم اسی طرح سے تجھے گزشتہ لوگوں کی کچھ خبریں سناتے ہیں، اور ہم نے تجھے اپنے ہاں سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے''۔

سابقہ واقعات کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا کہ ہم آپ کو گذشتہ زمانے کی خبریں بیان کرتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے اپنے حبیب کے لیے ایک فضل و احسان ہے اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ ہم نے آپ کو ذکر (قرآن) عطا کیا ہے جس میں مختلف انواع و اقسام کے معارف موجود ہیں۔ داستانوں، عبرت آموز واقعات کے ضمن میں حقائق ہیں، اخلاقیات کا تذکرہ ہے اور شرائع (قوانین و احکام) کا بیان ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب پر عظیم احسان ہے اور رسول اللہؐ کے لیے یہ شرف ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس طرح مخاطب ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۙ﴿۱۰۰﴾

''جس نے اس سے منہ پھیرا سو وہ قیامت کے دن بوجھ اٹھائے گا''۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَ سَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۙ﴿۱۰۱﴾

''اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے قیامت کے دن برا بوجھ ہوگا''۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۚۖ﴿۱۰۲﴾

''جس دن صور میں پھونکا جائے گا، اور ہم اس دن مجرموں کو نیلی آنکھوں والے کر کے جمع کر دیں گے''۔

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾

''چپکے چپکے آپس میں باتیں کہتے ہوں گے کہ تم صرف دس دن ٹھہرے ہو''۔

قرآن سے منہ پھیرنے والوں کا انجام

قرآن لوگوں کے لیے کتاب ہدایت ہے۔ اس میں عبرت آموز حکایات ہیں۔ سابقہ زمانے کی خبریں ہیں، جس سے حقائق واضح ہوتے ہیں اور ان کے درمیان سے اخلاقیات اور احکام و قوانین کا بیان موجود ہے۔ اب جو افراد قرآن سے اُنس نہیں رکھتے، قرآن سے منہ موڑ لیتے ہیں تو وہ مجرم اور گناہگار ہیں۔ ان آیات میں مجرموں کے لیے جو سزا ہے اس کا تذکرہ موجود ہے اور ساتھ قیامت کے آنے کا تذکرہ ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن سے منہ موڑنا گناہ ہے اور اس گناہ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ایسا شخص قیامت میں آئے گا۔

۲۔ جو گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوگا اسے اس گناہ کی سزا ملے گی اور جو عذاب اسے ملے گا تو وہ اس عذاب میں ہمیشہ رہے گا۔

۳۔ قیامت کے دن اس شخص کے گناہ مجسم ہو جائیں گے اور گناہوں کے بارے بہت ہی سخت سزا ہے۔

۴۔ صور پھونکنے سے سارے مردے زندہ ہو جائیں گے۔

۵۔ مجرموں کی آنکھیں چندھیائی ہوں گے (سوجھی ہوئی ہوں گی)۔ بعض نے کہا ہے مجرم وگناہگار اندھے محشور ہوں گے۔ ایک اور آیت میں ہے:

وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا ؕ

ترجمہ: ''اور ہم نے انہیں قیامت کے دن مونہوں کے بل اندھے گونگے بہرے کر

کے اٹھائیں گے "۔[1]

بعض نے کہا ان کا بدن پیاس اور تھکاوٹ کی وجہ سے کبود (تھکا ہوا، سوجا ہوا، نیل پڑے ہوئے، جیسے کسی کو بہت مارا جائے تو اس کے بدن کا رنگ نیلا ہو جاتا ہے اور آنکھوں پر اس کے اثرات ہوتے ہیں) ہوگا۔[2]

۶۔ اہل محشر اس دن کی ہولناکی کی وجہ سے بہت ہی ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے، گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ اس وجہ سے آپس میں آہستہ آہستہ بات کریں گے اور یہ کہیں گے کہ قیامت سے پہلے ہم نے دُنیا میں بس دس دن ہی گزارے ہیں۔ اس بات سے وہ یہ بیان کر رہے ہوں گے کہ ہم نے دُنیا میں تھوڑا عرصہ گزارا ہے اور اس کا تقابل اس سے کر رہے ہوں گے جو وہ مشاہدہ کر رہے ہوں گے یا جسے وہ جان چکے ہوں گے کہ اس جگہ اُنہوں نے ہمیشہ رہنا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: " کہیں گے ایک دن یا اس سے بھی کم رہے ہیں پس آپ گنتی کرنے والوں سے پوچھ لیں"۔[3]

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

---

[1]۔ سورۂ اسراء، آیت: ۹۷۔

[2]۔ رُوح المعانی، ج ۱۲۔

[3]۔ سورۂ مومنون، آیت: ۱۱۳۔

''ہم خوب جان لیں گے جو کچھ وہ کہیں گے جب ان میں سے بڑا سمجھدار کہے گا کہ تم صرف ایک ہی دن ٹھہرے ہو''۔

اللہ کا علم

اللہ کا علم لامتناہی ہے، اس کی کوئی حدود نہیں وہ لامحدود ہے۔ ہر شئی پر اللہ کے علم کا احاطہ ہے لہٰذا جو کچھ مجرمین اور گناہگار آپس میں باتیں کریں گے اور اپنے دُنیا میں رہنے کے حوالے سے کہیں گے تو اللہ فرما رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ آگاہ ہے کہ وہ دُنیا میں کتنا عرصہ گزار کر آئے ہیں اور انہوں نے دُنیا میں کیا کچھ انجام دیا ہے۔ دُنیا و آخرت کا جو تقابل کر رہے ہیں تو یہ قابل تقابل نہیں ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے لہٰذا جو دُنیاوی زندگی کو ایک دن کے حساب لگا کر یا اس سے کمتر یا دس دن کہے وہ صحیح کہہ رہا ہے لیکن اسے معلوم رہے کہ دُنیا و آخرت کا کوئی مقابلہ نہیں۔

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡجِبَالِ فَقُلۡ یَنۡسِفُہَا رَبِّیۡ نَسۡفًا ﴿۱۰۵﴾

''اور تجھ سے پہاڑوں کا حال پوچھتے ہیں سو کہہ دے میرا رب انہیں بالکل اڑا دے گا''۔

فَیَذَرُہَا قَاعًا صَفۡصَفًا ﴿۱۰۶﴾

''پھر زمین کو چٹیل میدان کر کے چھوڑے گا''۔

لَّا تَرٰی فِیۡہَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمۡتًا ﴿۱۰۷﴾

''تو اس میں کجی اور ٹیلا نہیں دیکھے گا''۔

یَوۡمَئِذٍ یَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَہٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ

فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا ﴿۱۰۸﴾

''اس دن پکارنے والے کا اتباع کریں گے اس میں کوئی کجی نہیں ہو گی، اور رحمان کے ڈر سے آوازیں دب جائیں گی پھر تو پاؤں کی آہٹ کے سوا کچھ نہیں سنے گا''۔

یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوۡلًا ﴿۱۰۹﴾

''اس دن سفارش کام نہیں آئے گی مگر جسے رحمان نے اجازت دی اور اس کی بات پسند کی''۔

شفاعت کا مسئلہ

قرآن مجید میں کئی مقامات پر شفاعت کا حوالہ آیا ہے۔ شفاعت کا معنی ہے کہ کوئی شخص اپنے جرم کی معافی کے لیے کسی سے اُمید لگائے یا اللہ کے حضور اپنے لیے خود ہی خواہش کرے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح بیان دیا ہے کہ عدل کی بنیاد پر فیصلہ ہو گا۔ وعدہ اور وعید الٰہی کے مطابق فیصلہ ہو گا اور اللہ کا حکم جاری ہو گا۔ اس جگہ شفاعت کی نفی کی جانب اشارہ اور اس بات کی طرف ہے کہ مجرم کے جرم کی سزا کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور نہ ہی مجرم سے سزاء کو ٹال سکتا ہے۔ اس کی اجازت کسی کے پاس نہیں ہے۔ مطلق نفی کے بعد ایک استثناء بیان کیا ہے کہ اس دن بات کرنے اور کسی کے حق میں شفاعت کرنے کے لیے اللہ کی اجازت اور اذن کی ضرورت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت کسی کو اس بات کی اجازت دے گا تو پھر اس کی بات کو سنا بھی جائے گا اور اس کی شفاعت کو قبول بھی کیا جائے گا۔ جب اللہ کا کسی کے لیے اذن مل جائے گا تو پھر اس کی جانب سے شفاعت کسی کے لیے کرنا ممنوع نہ ہو گا، ان کی بات کرنے میں کچھ ایسا شامل نہ ہو گا کہ جس میں اللہ کی ناراضگی ہو۔ یہ بات مطلق ہے جو سب کو شامل ہے لیکن تمام انسان تو ایسے نہیں لہٰذا دیکھنا ہو گا کہ وہ ذوات کون سی ہے

کہ جن کی بات میں کچھ خطاء نہیں ہوتی، وہ جو کہتے ہیں اس میں اللہ کی رضا ہوتی ہے اور ان کی بات اللہ کو پسند ہوتی ہے۔ جب قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں تو اس کا مصداق رسول اللہ ﷺ اور ان کی آل اطہار علیہم السلام ہیں جو سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ کا مصداق ہیں:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿۳۳﴾

اسی طرح سورۂ ہود کی آیت ۱۰۵ میں: یَوۡمَ یَاۡتِ لَا تَکَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ۚ فَمِنۡہُمۡ شَقِیٌّ وَّ سَعِیۡدٌ ﴿۱۰۵﴾ میں اس قسم کے مطالب کا بیان موجود ہے۔

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا ﴿۱۱۰﴾

''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے اور پیچھے ہے اور ان کا علم اسے احاطہ نہیں کر سکتا''۔

اللہ کا احاطہ علمی

اس آیت میں جو ضمائر ہیں اگر ان کی بازگشت شفاعت کرنے والوں کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان کا پسندیدہ بیان اللہ سے پوشیدہ نہ ہے اور یہ اللہ کو غیر واقعی اور غیر حقیقی بیان سے دھوکہ نہیں دے سکتے۔

اگر ان ضمائر کا بیان مجرموں کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دُنیا میں انجام دیئے گئے اعمال اور پھر مرنے کے بعد کے حالات اور قیامت میں ان کے اعمال کے ثمرات سب سے آگاہ ہے جب ان کا کسی بھی حوالے سے اللہ سے احاطہ نہیں رکھتے لہٰذا انہوں نے جو کچھ انجام دیا ہے اللہ انہیں اس کی سزا دے گا۔ وہ اللہ کے فیصلہ اور حکم کو رَد نہیں کر سکتے۔ یہ احتمال سیاق اور انداز بیان کی روشنی میں پہلے احتمال سے زیادہ مناسب ہے۔

وَ عَنَتِ الۡوُجُوۡہُ لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ ؕ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾

''اور سب منہ حی و قیوم کے سامنے جھک جائیں گے، اور تحقیق نامراد ہوا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا''۔

مالکیت اللہ کے لیے ہے

اللہ ہی مطلق حیات کا مالک ہے اور اللہ ہی ہے جس نے ہر شئی کو ہستی اور وجود کی نعمت سے نوازا اور اسے باقی رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا ملک اور ملکیت اللہ کے لیے ہے۔ سورہ مومن آیت ۱۶ میں ارشاد ہے: ''قیامت کے دن آواز آئے گی کہ (لِمَنِ الْمُلْكُ) آج ملک و مملکت و اختیار کس کا ہے؟ جواب آئے گا: (لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ)۔ اللہ کے لیے جو واحد ہے غالب ہے۔

اس جگہ اللہ کے تمام اسماء سے **(حی اور قیوم)** ان اسماء کی طرف اشارہ ہوا ہے اس کی وجہ ہے کہ مردوں کے بارے گفتگو ہو رہی ہے اور مرنے کے بعد ان کے دوبارہ زندہ ہونے اور اپنے اعمال کی سزا پانے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جب دوبارہ زندہ ہوں گے تو ان کے لیے تمام دُنیاوی اسباب منقطع ہو چکے ہوں گے۔ یہ مقام اللہ کی حیات مطلقہ اور اس کی ذات کے ساتھ مناسبت رکھتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہر شخص اپنے دوش پر ظلم و ستم کا بار اُٹھا کر آئے گا۔ مجرمین جو ایمان نہیں لائے، قیامت کے دن مایوس ہوں گے۔ اُن کے لیے بدترین جزاء اور ان کے اعمال کی ہو گی کیونکہ ان کے لیے کسی کی جانب سے شفاعت نہ ملے گی کیونکہ شفاعت کے لیے اللہ کا اذن ضروری ہے اور یہ مجرمین جن کو دُنیا میں اپنا شفیع خیال کرتے تھے ان کے لیے اللہ کا اذن موجود نہ ہو گا۔ اس لیے یہ اس حوالے سے مایوس اور نااُمید ہوں گے، ان کے لیے بالکل شفاعت نہ ہو گی، بدبختی و شقاوت ہو گی۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ

لَا هَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾

" اور جو نیک کام کرے گا اور وہ مومن بھی ہو تو اسے ظلم اور حق تلفی کا کوئی خوف نہیں ہوگا"۔

ایمان اور عمل صالح

اگر عمل صالح کو ایمان کے ساتھ مقید کیا ہے یہ اس لیے ہے کہ کفر کے ہوتے ہوئے عمل بے اثر ہو جاتا ہے۔[1]

اس جگہ یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ جس کا عمل صالح ایمان کے ساتھ ملا ہوگا تو اس کا اجر پورا پورا ملے گا اس سے کچھ کم نہ ہوگا۔ اس اعلان سے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو یہ تسلی دی ہے کہ وہ جب ایمان رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ نیک عمل کرتے ہیں تو پھر بے فکر ہو جائیں، انہیں پورا اجر دیا جائے گا ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

وَ كَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفۡنَا فِيۡهِ مِنَ الۡوَعِيۡدِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ اَوۡ يُحۡدِثُ لَهُمۡ ذِكۡرًا ﴿۱۱۳﴾

" اور اسی طرح ہم نے اسے عربی قرآن نازل کیا ہے اور ہم نے اس میں طرح طرح سے ڈرانے کی باتیں سنائیں تاکہ وہ ڈریں یا ان میں سمجھ پیدا کر دے"۔

قرآن کا عربی زبان میں اترنا

ہم نے قرآن کو عربی زبان میں اُتارا ہے اسے پڑھا جاتا ہے اس میں ہم نے کافروں

---

[1] ۔ ھضم نقص اور کم ہونے کے معنی میں آتا ہے، فلاں نے اس کا اجر ہضم کر لیا یعنی اسے اجر نہیں دیا۔ اس کا جو حق تھا وہ اسے نہیں ملا۔

کے لیے مختلف انداز اور طریقوں سے عذاب کے وعدے دیے، انہیں ڈرایا دھمکایا تاکہ وہ ہٹ دھرمی اور ضد بازی سے باہر آجائیں، عبرت حاصل کریں ان کے دلوں میں خطرات کا خوف بیٹھ جائے اور خود کو عذاب سے بچانے کے لیے ایمان لے آئیں، گناہ چھوڑ دیں، نیک اعمال کو بجالائیں۔ قرآن معجزہ ہے جس سے یہ یقین دلایا گیا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں، اللہ رحمٰن کا کلام ہے اور انسان کو یاد دہانی کرانے کے لیے ہے۔ لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ ''تاکہ اس کو یاد دلائے اور وہ خشیت اور خوف کھائے''۔[1]

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾

'' سو اللہ بادشاہ حقیقی بلند مرتبے والا ہے، اور تو قرآن کے لینے میں جلدی نہ کر جب تک اس کا اترنا پورا نہ ہو جائے، اور کہہ اے میرے رب مجھے اور زیادہ علم دے''۔

اللہ کی بلند شان اور قرآن کا نزول

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تقدیس و تسبیح کو بیان کیا ہے کہ اللہ ہر نقص سے پاک و منزہ ہے، وہ ہر نقص سے بلند ہے۔ اللہ کو ملک حق کی وصف سے بیان کیا ہے۔ اللہ، علی الاطلاق مالک ہے مالکیت اللہ کی ہے اور اللہ کی حکمرانی ہے۔ مُلک بھی اسی کا مملکت بھی اسی کی۔ وہ اپنے ملک میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے وہ نیک اعمال پر اجر دیتا ہے۔ برے اعمال پر سزا دیتا ہے۔ قیامت کے دن سب کو احتساب کے لیے حاضر کرے گا، اس کے لیے کوئی مانع و رکاوٹ نہ ہے۔ اس کا فیصلہ حکمت اور مصلحت کے تابع ہے۔ وہ آخر ہے اور آخرت کا مالک ہے

---

[1]۔ سورۂ طٰہٰ، آیت ۴۴۔

اور وہ بادشاہ ہے وہ حق ہے جو زل سے ہے۔ دُنیا و آخرت میں اسی کا حکم ہے۔ وہ ازل سے ہے اور اسی طرح ہے۔ وہ خود ہی حق ہے وہ خود ہی حقیقت ہے وہ ہر نقص سے منزہ ہے۔

رسول اللہؐ کے لیے خصوصی فرمان

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر وحی اُتر رہی ہوتی تھی تو آپ وحی کے اختتام سے پہلے ہی اس آیت کو پڑھ دیتے تھے تو اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ میرے پیارے وحی جب آرہی ہوتی ہے اسے پورا بیان ہونے دیا کریں جب وحی مکمل ہو جائے تو پھر اسے پڑھا کرو۔ ایک اور جگہ فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾

ترجمہ: ”آپ (وحی ختم ہونے سے پہلے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے تا کہ آپ اسے جلدی جلدی (یاد کر) لیں۔ بے شک اس کا جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔“

اس کے بعد فرمایا کہ وحی کے ختم ہونے سے پہلے پڑھنے کی بجائے یہ دعا مانگو کہ اے رب میرے علم میں اضافہ فرمادے جیسا علم آپ کے پاس ہے اس پر اکتفاء نہ کریں بلکہ اور علم مانگو۔ ان آیات میں تو رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔ اس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے کہ قرآن دو مرتبہ اُتارا گیا ایک دفعہ قرآن کو مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر اُتارا گیا پھر اسی قرآن کو تدریجاً آیت آیت کرکے اُتارا گیا۔ اسی لیے جب وحی کا آغاز ہوتا تھا تو رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو جاتا تھا کہ آگے کیا بیان ہونا ہے۔ اس لیے وحی کے اختتام سے پہلے ہی پورے بیان کو پڑھ دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے آپ کو روک دیا۔ جب روک دیا تو پھر آپ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی آیات کے بارے علم نہ ہوتا تو آپ ان کے پڑھنے میں جلدی کیسے کر سکتے تھے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

"اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے بھی عہد لیا تھا پھر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں پختگی نہ پائی"۔

حضرت آدمؑ سے عہد و پیمان

اس آیت میں اس عہد و پیمان کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت آدمؑ سے لیا گیا تھا لیکن وہ فراموش کر گئے، جو ذمہ داری تھی اسے پورا نہ کیا جس کا لازم یہ ہے کہ ان میں عزم و ارادہ کا فقدان تھا، پائمردی نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت سے جو عہد لیا تھا اس کو بیان کرنے میں قسم اُٹھائی ہے لیکن حضرت نے اس پر عمل نہ کیا کیونکہ اس میں عزم و جزم صبر کے ساتھ نہ پایا۔ اس سفارش سے مراد وہی تھی جو درخت کے قریب جانے سے روکا تھا اور حضرت آدمؑ اس درخت کے قریب چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ انسان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرے، اس بارے عزم و ارادہ اور صبر کا راستہ اختیار کرے اور اس کے کمال کے لیے جو دستورات دیے گئے ہیں ان کے مطابق عمل کرے۔

وَ اِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا، اس نے انکار کیا"۔

ابلیس کا سجدہ سے انکار

اس جگہ آدمؑ کی شان کو بیان کیا ہے کہ ہم نے تو تمام فرشتوں سے یہ کہہ دیا کہ وہ حضرت آدمؑ کا سجدہ کریں، ہمارے اس حکم کی تعمیل سب فرشتوں نے کی لیکن ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح ابلیس نے انسان سے اپنی دشمنی کا کھلا اعلان کر دیا۔

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

''پھر ہم نے کہا اے آدم بے شک یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے سو تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے کہ پھر تو تکلیف میں پڑ جائے''۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾

''بے شک تو اس میں بھوکا اور ننگا نہیں ہو گا''۔

وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

''اور بے شک تو اس میں نہ پیاسا ہو گا اور نہ تجھے دھوپ لگے گی''۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

''پھر شیطان نے اس کے دل میں خیال ڈالا کہا اے آدم کیا میں تجھے ہیشگی کا درخت بتاؤں اور ایسی بادشاہی جس میں ضعف نہ آئے''۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؗ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

''پھر دونوں نے اس درخت سے کھایا تب ان پر ان کی برہنگی ظاہر ہو گئی اور اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے، اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی پھر بھٹک گیا''۔

ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

''پھر اس کے رب نے اسے سرفراز کیا پھر اس کی توبہ قبول کی اور راہ دکھائی''۔

آدمؑ کے لیے اللہ کی وصیت

اللہ تعالیٰ نے آدم کی خیر چاہی، اسے بتا دیا کہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا کھلا دشمن ہے اس سے دُور رہنا۔ ان آیات سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ حضرت آدمؑ ایسی جنت میں تھے جو جنت خُلد نہ تھی، جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے کیونکہ جنت خُلد میں جانے کے بعد وہاں سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔

۲۔ جنت خُلد میں اللہ کا دشمن اور نافرمان نہیں جا سکتا۔ جبکہ اس جنت میں ابلیس جو اللہ کا نافرمان تھا وہ موجود تھا۔

۳۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس جنت میں حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کے علاوہ تیسرا شخص ابلیس تھا۔

۴۔ یہ حضرت آدمؑ اور اماں حوا کا امتحان تھا۔

۵۔ دونوں کو بتا دیا گیا کہ ابلیس سے خود کو بچائیں یہ تمہارا دشمن ہے۔

۶۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو شوق تھا کہ ایسی جنت میں جائیں جہاں سے پھر نکالا نہ جائے اس میں ہمیشہ رہیں اور یہ معلوم تھا کہ جس جگہ وہ موجود ہیں یہ جنت خُلد نہیں ہے اسی بنا پر ابلیس نے ان کی اس خواہش سے فائدہ اٹھایا۔

۷۔ ابلیس نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو جنت خُلد کا وعدہ دیا اور انہیں اس ممنونہ درخت سے کھانے کا مشورہ دیا۔ جنت خُلد کی تڑپ میں بھول گئے کہ ابلیس ان کا دشمن ہے اور یہ کہ اللہ نے نہیں منع کیا ہے کہ اس باغ جنت میں سب کچھ کھائیں، پئیں، مزے کریں کوئی تکلیف انہیں نہ ہو گی بس اس خاص درخت سے کچھ نہ لیں۔ پس یہ بھول ان سے ہوئی اور وہ

جنت خُلد کی خاطر اس درخت سے کھا بیٹھے۔

۸۔اس باغ میں بہشتی زندگی تھی، مشقت نہ تھی، لیکن جب ممنوعہ شجر سے کھا بیٹھے تو پھر دنیاوی زندگی کی مشقتیں ان کے حصہ میں آگئیں۔

۹۔ابلیس بھی کچھ غلط نہ تھا کہ اس درخت کو کھا کر ہی جنت خُلد میں جانا ہوگا اور وہی ہوا کہ آدمؑ اور حوا دونوں اس آرام دہ جگہ سے باہر نکل گئے اور دُنیاوی زندگی ان کے نصیب ہو گئی اور زمین کو آباد کرنے آگئے۔

۱۰۔ جب حضرت آدمؑ اور حوا کے جسم سے کپڑے اُتر گئے اور ننگے ہو گئے تو جان گئے کہ ان سے غلطی ہوئی ہے اور ابلیس تو ان کا دشمن تھا اس نے اپنی دشمنی خوب دکھائی۔

۱۱۔ یہ ترکِ اولیٰ تھا، حرام کا ارتکاب نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ اگر اس درخت کے قریب نہ جاؤ تو تمہیں یہاں پر آسائش ملے گی اور دُنیاوی مشقت سے بچ جاؤ گے۔ جب اس درخت کے قریب چلے گئے تو پھر دنیاوی زندگی کی مشقتیں ان کے حصہ میں آئیں۔ جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً توبہ کی۔ اللہ نے توبہ قبول کر لی اس جگہ آدمؑ کا ذکر کیا ہے جب دونوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ درخت کے قریب نہ جائیں، ابلیس کو اپنا دشمن جانیں۔

۱۲۔ پھر فرمایا آدم جنت سے نکلے، آدم نے معصیت کی، آدم نے توبہ کی، شیطان نے آدم کو بہکایا۔ حوا نے آدم کی پیروی کی لہٰذا یہ کہنا کہ عورت کے ذریعہ شیطان نے آدم کو بہکایا تو یہ غلط تصور ہے اور قرآن کے بیان کے خلاف ہے۔

۱۳۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کی توبہ کو قبول کیا ان کی گواہی میں اماں حوا کی توبہ بھی قبول ہو گئی۔ اس جگہ لطیف نقطہ ہے آدمؑ کی توبہ کا ذکر ہے، اماں حوا کی توبہ کا ذکر نہیں تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے اصل نافرمانی مرد سے ہوئی، عورت نے اس کی پیروی کی۔ جب آدمؑ کی توبہ قبول ہو گئی تو حضرت حوا کی توبہ بھی قبول ہو گئی۔

۱۴۔ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے مجتبیٰ بنا دیا اپنی وحی کا امین بنا دیا اور راہ کمال کی ہدایت فرما

دی کہ وہ زمین کو آباد کرے، انسان کی نسل بڑھائے اور سب انسان اپنے اختیار، ارادہ و عزم، جزم و صبر سے اللہ کے قوانین پر عمل کرکے جنت الفردوس میں جانے کا اہتمام کریں اور جنت خُلد جہاں جانے کا حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو شوق تھا وہاں جائیں لیکن اپنے اختیار و ارادہ سے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

" فرمایا تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ، تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہے، پھر اگر تمہیں میری طرف سے ہدایت پہنچے، پھر جو میری ہدایت پر چلے گا تو گمراہ نہیں ہوگا اور نہ تکلیف اٹھائے گا"۔

آدمؑ و حوا کے لیے الٰہی فرمان

تکلم کا انداز بدل دیا، غائب کی بجائے موجود سے خطاب کیا، فرمان سنانے کا انداز یہی ہے اس فرمان کے مطابق حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ دونوں کو ان کے مقام و منزلت سے نیچے گرا دیا۔ نیچے اُترنے سے مراد مادی اور جسمانی نہیں کہ ایک اوپر والی جگہ سے چل کر نیچے آجائیں بلکہ اس سے مراد معنوی مقام و منزلت ہے۔ اس کے بعد زمین میں جانے کے بعد کی کیفیت بیان کی کہ زمین پر سکونت کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں پر رہنے والے اپنے اپنے مفادات کو چاہیں گے اور اس طرح ایک دوسرے سے مزاحمت ایجاد کریں گے جس کے نتیجہ میں دشمنیاں ہوں گی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ زمین پر زندگی پر امن اور بغیر دشمنی کے گزارنے کے لیے میری طرف سے ہدایت آئے گی (اس ہدایت سے مراد یہ ہے کہ زمین پر زندگی گزارنے کا نظام نامہ تمہارے لیے میری جانب سے آئے گا) اگر تم لوگ اس ہدایت کے

مطابق زندگی گزاروگے تو پھر اپنے اصل راستہ سے نہیں بھٹکوگے۔ دُنیا کی زندگی بھی خوشحال ہو گی، لڑائی جھگڑا نہ ہو گا اور اس کے نتیجہ میں آخرت بھی سنور جائے گی۔ ہدایت الٰہی فطری دین (نظام) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے وسیلہ سے انسانوں کے لیے بھیجا ہے۔

فطری دین اعتقادات اور اعتقادات کی روشنی میں اعمال کا مجموعہ ہے۔ انسانی فطرت ایسے اعمال کا تقاضا کرتی ہے جو اسے خوش بخت بنا دے۔ ہر چیز وہاں تک جانا چاہتی ہے جن اہداف کے لیے اس چیز کی خلقت ہوتی ہے اور وہی اصل میں اس چیز کی نسبت ہے۔

انسان کی خلقت اس لیے ہوئی کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کمال کی منزل کو پائے۔ اس کمال تک جانے کے لیے دُنیاوی زندگی میں اعمال کرتے ہیں اور یہ اعمال ان اعتقادات کے سائے میں انجام پاتے ہیں جسے انسان فطرتاً جانتا ہے کہ اس کا خالق اللہ ہے اور اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی بات کو سنتا اور مانتا ہے۔ جو دین فطرت کی پیروی کرتا ہے تو وہ گمراہ نہیں ہوتا اور نہ ہی بدبخت ہو گا اس کے واسطے دُنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی ہے۔

وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّ نَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى ﴿۱۲۴﴾

"اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی معشیت (روزگار) بھی تنگ ہو گی اور اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے"۔

اللہ کے فرمان کی پیروی نہ کرنے کا نتیجہ

اس آیت میں انسان کے لیے واضح بیان دے دیا کہ یاد رکھو جس کسی نے حق کی پیروی نہ کی اور میرے بیان کردہ احکام کے مطابق اپنی زندگی کے امور کو منظّم نہ کیا تو اس کی زندگی دشوار ہو گی کیونکہ جو بھی اللہ کو بھلا دے تو اس کے پاس دُنیا کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ اس

سے وہ دل لگائے، وہ اپنے تمام اعمال اور تمام کوششیں اسی دُنیاوی زندگی کے لیے کرے گا اور اس میں آگے بڑھنے کے لیے تگ ودو کرے گا خود کو کسی ایک حد میں محدود نہ کرے گا۔ اس طرح وہ جہاں پر پہنچے گا اسے آرام نہ آئے گا اور اس کا حرص ولالچ اسے آرام سے نہ بیٹھنے دے گا۔ ھل من مزید کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھنے میں مصروف رہے گا لیکن اس کے باوجود کہ اس کے پاس بہت کچھ آجائے گا لیکن پھر بھی وہ خود کو محتاج و فقیر خیال کرے گا اور چاہے گا کہ اسے کچھ اور مل جائے اس طرح اس کا دل تنگی میں ہو گا، جو کچھ حاصل کر چکا ہے اس کے بچانے کی فکر اسے لاحق ہو گی ہر وقت خوف کے عالم میں ہو گا، اس کے لیے سکون وآرام نہ ہو گا وہ اس سوچ میں ہو گا کہ کہیں کچھ ناگہانی آفات سے اس کا سب کچھ تباہ نہ ہو جائے۔ اسی طرح اپنے حاسدوں اور دشمنوں کا خوف بھی اسے طاری رہے گا۔ بیماری اور موت کا خوف بھی اسے لاحق ہو گا اور یہ کہ موت کے آنے سے سب کچھ اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ جو کچھ اس نے دُنیا سے کمایا ہے، ایک لحظہ کے لیے بھی اپنے سے دُور نہیں کرنے دے گا اور اتنی آرزوئیں جو اس کی پوری نہیں ہوئیں، اس کی فکر علیحدہ اسے کھائے جارہی ہو گی۔

اس سب کے برعکس اگر وہ خدا شناس ہو، خدا کو اس نے فراموش نہ کیا ہو، ہمیشہ اللہ کی یاد اسے رہتی اور سب کچھ اللہ کی عنایت وودیعت سمجھتا اور یہ کہ کچھ بھی وجود میں نہیں آسکتا مگر اللہ کے اذن اور اجازت سے اور یہ کہ دائمی حیات اور لذت بخش زندگی، اطمینان و سکون اللہ کے پاس ہے تو پھر اس کی دُنیا کی زندگی خوشحال گزرتی۔

دُنیا میں خدا فراموشی جہاں دُنیا میں انسان کا سکون تباہ کر دیتی ہے وہاں پر جب وہ آخرت میں آئے گا جیسے وہ اندھا ہو جس طرح دُنیا میں سب کچھ جانتے ہوئے، آنکھیں رکھتے ہوئے عقل و بصیرت سے خالی رہا اور اپنی سعادت ہاتھ سے دے بیٹھا تو آخرت میں بھی اندھا ہی ہو گا کہ وہ سعادت کی راہ پر نہ جاسکے گا۔ اس سے دُور رہے گا اور ابدی بدبختی، بے سکونی اور جہنم کا راہی ہو گا۔

پیغام: دُنیا میں اللہ کا ذکر، اللہ کی یاد کو نہ بھلاؤ۔ اللہ کی یاد میں سکون ہے اور سعادت مند زندگی ہے۔ دُنیا و آخرت کا سکون اللہ کی یاد میں ہے، اللہ کی یاد ہی انسان کو صحیح مسلمان بناتی ہے، اللہ کی عبودیت کا مظہر ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾

"کہے گا اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا حالانکہ میں بینا تھا"۔

قیامت کے دن کفار کی پریشانی

قرآن مجید میں کچھ اور آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قیامت کے دن مجرمین میدان محشر کے ہولناک مناظر کا مشاہدہ کریں گے۔ لہٰذا اس آیت میں مجرمین کا اندھا ہونا ان آیات کے ساتھ منافات رکھتا ہے اس کی بعض نے یہ توجیہہ بیان کی ہے کہ وہ آنکھوں کا اندھا نہ ہوگا دل کا اندھا ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ آغاز میں تو وہ بینا محشور ہونگے لیکن بعد میں اندھے ہو جائیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے بینا اُٹھیں گے پھر اندھے ہو جائیں گے اور اس کے بعد بینا ہو جائیں گے۔

لیکن یہ سب اقوال بغیر دلیل و ثبوت کے ہیں اور قیامت کے حالات کا دُنیا کے ساتھ قیاس کیا گیا ہے جبکہ آخرت پر جو نظام حاکم ہے وہ اس نظام سے مختلف ہے جو دُنیا میں حاکم ہے لہٰذا معلوم نہیں کہ قیامت کے دن بینائی اور اندھے پن سے مراد وہی ہے جو دُنیا میں مراد لیا جاتا ہے یا اس سے مختلف ہے۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قیامت کے مجرمین اندھے محشور ہوں گے جو کہ آیت کے ظاہر سے پتہ چلتا ہے تاکہ وہ اُخروی سعادت اور کامرانی کو نہ دیکھ سکیں اور اپنے پروردگار کے انعامات کا نظارہ کرنے سے محروم ہوں گے لیکن وہ اپنے نامہ اعمال کو دیکھیں گے جو ان پر ان کے اعمال کا گواہ ہوگا اور اسی طرح میدان قیامت کی ہولناکی اور اس کی وحشت ناک مناظر کا بھی مشاہدہ کریں گے۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

''فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیتیں پہنچی تھیں پھر تو نے انھیں بھلا دیا تھا، اور اسی طرح آج تو بھی بھلایا گیا ہے''۔

مجرموں کے سوال کا جواب

جب مجرموں کا سوال ہو گا کہ اے رب تو نے ہمیں کیوں اندھا محشور کیا ہے تو اللہ کا ان کے لیے جواب ہو گا: تو نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا، جب میری آیات تیرے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تو ان کو نہیں سنتا تھا سن کر انہیں بھلا دیتا تھا، تم ہماری آیات کا دُنیا میں انکار کرتا تھا، آج اسی کا نتیجہ تجھے مل رہا ہے لہٰذا آج تجھے ہم نے بھلا دیا ہے اور آج کے دن تم ہماری کرامت و رحمت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، جو کہ تیرے دُنیاوی رویے کی سزا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ

ترجمہ: ''برائی کا بدلہ برائی ہے۔''[1]

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، شر کا بدلہ شر ہی ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے آغاز میں حضرت آدم کی لغزش و فرو گذاشت کو اللہ سے کیے گئے عہد و پیمان کو بھلا دینا قرار دیا ہے۔

اس بنا پر حضرت آدمؑ کی داستان اپنی تمام خصوصیات سمیت ایک مثال ہے تمام افراد بشر کے لیے کہ آئندہ کی سرنوشت و تقدیر اسی کی روشنی میں ہے اور قیامت تک کے منظر کو مجسم کر لیا ہے جس طرح حضرت آدمؑ سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ شجرہ ممنوعہ کے قریب نہ جائیں گے لیکن وہ اس کے قریب چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کو عہد فراموش قرار دیا۔

---

[1] ۔ سورہ شوریٰ، آیت: ۴۰۔

اس مثال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان جب بھی نافرمانی رب تعالیٰ کی کرتا ہے تو وہ اللہ سے کیے گئے عہد و پیمان کو بھول جاتا ہے البتہ آدمؑ کی آزمائش شریعت کی قانون سازی سے پہلے تھی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جس سے منع فرمایا تھا تو وہ نہیں ارشادی تھی تحریمی نہیں تھی، اس لیے ان کی مخالفت ترک اولیٰ شمار ہوئی۔ لیکن فرزندان آدم کی آزمائش آئین الٰہی کے تحت قانون سازی کے بعد ہے لہٰذا جو بھی اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا تو اس نے اللہ کے امر مولوی (فرمان الٰہی) کی نافرمانی کی ہے اس لیے یہ معصیت شمار ہو گی۔

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

"اور اسی طرح ہم بدلہ دیں گے جو حد سے نکلا اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہیں لایا، اور البتہ آخرت کا عذاب بڑا سخت اور دیرپا ہے"۔

اللہ کے ذکر سے منہ موڑنے والے

جو بھی اللہ کی یاد بھلا دیتے ہیں اللہ سے رُخ موڑ لیتے ہیں، اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو ان کو جواب دینا پڑے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ انہیں سزا ملے گی کوئی انہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ عبودیت کی حدود میں رہے، عبد ہونے سے تجاوز نہ کرے، آخرت کا عذاب دُنیا کے عذاب سے زیادہ سخت ہے اور باقی رہنے والا ہے کیونکہ آخرت کا عذاب ظاہر کے علاوہ انسان کے باطن پر بھی محیط ہو گا اور اس عذاب نے زائل نہیں ہونا۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ ع

''سو کیا انہیں اس بات سے بھی سمجھ نہیں آئی کہ ہم نے ان سے پہلے کئی جماعتیں ہلاک کر دی ہیں یہ لوگ ان کی جگہوں پر پھرتے ہیں، بے شک اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں''۔

گذشتہ اُمتوں کے حالات سے سبق آموزی

کافروں سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا کہ جن مکانات میں اس وقت تم رہائش پذیر ہو تم سے پہلے کچھ اور اقوام تھیں جو انہی جگہوں پر رہتے تھے انہوں نے جب ہماری نافرمانی کی اور ہماری آیات کا مذاق اڑایا، کھلے بندوں ہماری مخالفت کی تو ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ اسی طرح تمہارے ساتھ بھی ہو گا۔ ہم دُنیا میں بھی تمہیں ہلاک کرنے پر قادر ہیں اور آخرت میں بھی ہمارا عذاب تمہارے لیے تیار ہے۔ آخرت کا عذاب دُنیاوی عذاب سے سخت تر، وسیع تر اور باقی رہنے والا ہو گا۔ جب وہ عذاب کسی پر اُترے گا تو پھر ختم نہ ہو گا لہٰذا جو بھی عقل و خرد رکھتے ہیں وہ ان آثار قدیمہ کے گھر میں ٹھہریں، ان اقوام کے بارے معلومات لیں، ان کے انجام کو جانیں اور ان سسب سے عبرت پکڑیں اور ہماری آیات کو نہ جھٹلائیں ان پر ایمان لے آئیں۔

وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾

''اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے طے شدہ نہ ہوتی اور معیاد معین نہ ہوتی تو عذاب لازمی طور پر ہوتا''۔

عذاب کی تاخیر کا سبب

اللہ کا فیصلہ ہے کہ اس نے مجرموں کو سزا دینی ہے لیکن اس سزا کے لیے اللہ تعالیٰ نے دار آخرت کو مقرر کر دیا ہے اس وجہ سے جو لوگ اب اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں اور

اللہ کے قوانین کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان پر عذاب نہیں آرہا تو اس کی وجہ اللہ کا وہ فیصلہ ہے جو پہلے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس نافرمان کو مہلت دی جا رہی ہے اگر توبہ کر لے تو بچ جائے گا اور اگر اسی حالت میں مرا تو پھر اس کے واسطے ہمارا عذاب آمادہ و تیار ہے۔ اگر اللہ کا یہ فیصلہ نہ ہوتا تو پھر ہر جرم کی سزاء اسی وقت مل رہی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر ملت کے لیے ایک مدت معین کر دی ہے۔ اس مدت تک اس اُمت کے لیے مہلت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اُمتوں کے خاتمہ کا قانون صادق آتا۔ یہ قانون ہے کہ ان کو جرم کی سزا وقت مقررہ پر دی جائے گی۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

''پس صبر کر اس پر جو کہتے ہیں اور سورج کے نکلنے اور ڈوبنے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر، اور رات کی کچھ گھڑیوں میں اور دن کے اول اور آخر میں تسبیح کر تا کہ تجھے خوشی حاصل ہو''۔

رسول اللہؐ کے لیے خصوصی فرمان

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے جب اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ کافروں کو مہلت دے رکھی ہے، مجرموں کی سزا کا وقت متعین ہے تو اے میرے رسول آپ کو صبر ہی کرنا ہوگا، اللہ کی تسبیح کریں، اللہ کی قدرت و پاکیزگی کو بیان کریں اور اس کی نعمات پر اللہ کا شکر بجا لاؤ۔ اس بہترین عمل کے لیے اوقات بتا دیئے، غروب کے بعد اور طلوع آفتاب سے پہلے، دن کے آخری لمحات میں اور رات کے کچھ حصہ میں تسبیح و حمد اور تہلیل کرتے رہو۔ ایک اور آیت میں رسول اللہؐ کو نماز پڑھنے اور استقامت کا حکم دیا ہے اور نماز و صبر سے مدد لینے کا کہا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ [1]

ترجمہ: ''اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لیا کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

بعض نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ تسبیح و حمد میں خود کو مصروف رکھو تاکہ مقام شفاعت کو پا لو اور گناہگاروں کی سفارش کر سکو اور تمہیں بلند مقام حاصل ہو جائے۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو وعدہ دے رکھا ہے تم اس کو حاصل کر سکو، اس لیے تسبیح و تحمید کی عبادت بجالاؤ۔ [3]

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

ترجمہ: ''اور کسی وقت رات میں تہجد پڑھا کرو جو تیرے لیے زائد چیز ہے، قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں پہنچا دے۔'' [4]

بعض مفسرین نے ان اوقات کو نماز پنجگانہ کے اوقات سے تطبیق دیا ہے۔ غروب کے بعد نماز مغرب و نماز عشاء، طلوع سے پہلے نماز فجر اور دن کے آخری حصہ میں نماز ظہر و نماز عصر مراد ہیں۔

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾

---

[1] ۔ سورہ البقرہ، آیت: ۱۵۳۔
[2] ۔ مجمع البیان، ج ۷۔
[3] ۔ منہج الصادقین، ج ٦۔
[4] ۔ سورہ اسراء، آیت: ۷۹۔

" اور تو اپنی نظر ان چیزوں کی طرف نہ دوڑا جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیاوی زندگی کی رونق کے سامان دے رکھے ہیں تاکہ ہم انہیں اس میں آزمائیں، اور تیرے رب کا رزق بہتر اور دیر پا ہے"۔

رسول خداؐ کے لیے اللہ کا خصوصی فرمان

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو متوجہ کیا ہے کہ دُنیاوی رزق اور رونقیں، بیویاں، اولاد یہ سب دُنیا کی زینت ہیں یہ انہیں ہم نے دے رکھی ہے لیکن اس پر نظریں نہ گاڑھیں، یہ سب امتحان اور آزمائش کے لیے ہے، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم نے جو نعمات دُنیا میں دی ہیں تو کیا ان نعمات کا یہ لوگ شکر ادا کرتے ہیں یا شکر ادا نہیں کرتے۔ جب آخرت آئے گی تو اس میں ہم ایسا بدلہ آپ کے لیے دیں گے جو دُنیاوی نعمات سے بہتر ہی ہوگا اور اسے بقاء بھی ہوگی۔ اس آیت کے مشابہ سورہ توبہ کی آیت ۸۵ ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اے میرے رسول ان کے مال اور اولاد پر حیران نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال اور ان کی اولاد کے ذریعہ ان کا امتحان لیا ہے کیونکہ اللہ چاہتا ہے کہ اسی چیز کو بنیاد بنا کر آخرت میں انہیں نافرمانی اور ناشکری کی سزا دی جائے۔ اسی طرح سورہ حجر آیت ۸۸ میں اللہ نے اپنے حبیبؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اے رسولؐ ان کے بعض گروہوں کو ہم نے جو کچھ دیا ہے اس پر زیادہ توجہ نہ دو اور ان کے حالات پر غمگین بھی نہ ہو کہ ان کو اتنا مال دیا ہے اور ہمارے پاس کچھ نہیں۔ آپ مومنین کے لیے اپنی تواضع اور انکساری کے بازو کھلے رکھیں۔

ان تمام آیات میں خطاب تو پیغمبر ﷺ کو کیا گیا لیکن اصل مومنوں کو سمجھانا ہے کہ جب تم اللہ کے مخالفین کے پاس مال و دولت کے انبار دیکھتے ہو، ان کی اولاد کی کثرت مشاہدہ کرتے ہو، دُنیاوی زرق و برق کا مشاہدہ کرتے ہو تو اس سب پر اپنی نظریں مت جماؤ اور نہ ہی

پریشان ہو کیونکہ یہ سب کچھ امتحان ہے، یہ سب نعمات اللہ کی دی ہوئی ہیں اور ان کی آزمائش کے لیے ہیں۔ پھر یہی مال و دولت اور اولاد اور ان کا مقام، منصب اور دُنیاوی جاہ و جمال ان کے لیے وبال جان بنے گا اور یہی چیزیں آخرت میں ان کے واسطے عذاب کا وسیلہ ہوں گی جبکہ اللہ جو کچھ مومنوں کو دے گا وہ دُنیاوی مال و متاع سے بہتر بھی ہے اور اس نے باقی بھی رہنا ہے جبکہ جو کچھ دُنیا میں مال و متاع ہے اور عیش و عشرت کے سامان ہیں ان سب نے زائل ہو جانا ہے۔

وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

"اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور خود بھی اس پر قائم رہ، ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے، ہم تجھے روزی دیتے ہیں، اور پرہیزگاری کا انجام اچھا ہے"۔

پیغمبرؐ کے لیے اپنے عیال بارے خصوصی فرمان

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرمان دیا کہ آپ اپنے عیال کو نماز پڑھنے کا حکم دیں کہ نماز معبود (رب تعالیٰ) کے سامنے عبودیت کا اظہار ہے، پھر یہ فرمایا کہ نماز کا حکم اس لیے نہیں کہ ہم (اللہ تعالیٰ) نماز کے محتاج ہیں۔ تمہاری نماز کی ہمیں ضرورت نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ ہم تجھ سے رزق و روزی کا سوال کریں کچھ ہمارے پاس کم ہے اور اس کمی کو دُور کرنے کے لیے تجھ سے سوال کرتے ہیں اور تجھے حکم دیتے ہیں کہ اپنے عیال کو نماز پڑھنے کا حکم دو بلکہ ہم تم سے بالکل بے نیاز ہیں اور کسی کی ہمیں احتیاج نہیں ہے بلکہ تم ہو کہ ہمارے محتاج ہو، ہم تمہیں روزی دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی۔ اس آیت میں یہ واضح کہا گیا ہے کہ سب اللہ کے محتاج ہیں، جب رسول اللہ ﷺ اللہ کے محتاج ہیں تو پھر اور کون ہے جو اللہ کا محتاج نہ ہو؟

سب فقراء ہیں، غنی بالذات اللہ کی ذات ہے۔ اچھا انجام ان کے لیے ہے جو تقویٰ والے ہیں۔ اہل تقویٰ ہی بہشت میں جائیں گے اور ہمیشہ کا سکون اور آرام پائیں گے۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾

''اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے پاس اپنے رب سے کوئی نشانی کیوں نہیں لے آتا، کیا ان کے پاس پہلی کتابوں کی شہادت نہیں پہنچی''۔

مشرکین کی بہانے تراشیاں

اس آیت میں مشرکین کا رویہ بیان ہوا کہ وہ قرآن کو معمولی سمجھتے تھے اور اس عظیم معجزہ کی توہین کا ارتکاب کرتے تھے اور قرآن کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور معجزہ مانگتے تھے اور کہتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے لیے قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ لے آئیں تو ہم ایمان لائیں گے تو ان کو اس آیت میں جواب دیا گیا ہے کہ کیا تمہارے پاس قرآن سے پہلے والی کتابیں توریت، زبور، انجیل اور دوسرے آسمانی صحیفے نہیں آئے ان میں واضح بیان اور نشانی موجود نہ ہے؟ ان کتابوں میں نشانی موجود تھی اب قرآن ایک ایسا شخص لایا ہے جو ان پڑھ ہے خود یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے۔ گذشتہ اُمتوں نے اپنے انبیاء سے معجزے طلب کیے جب وہ معجزات لے آئے تو پھر یہ لوگ ان پر ایمان نہیں لائے۔ اس طرح ان معجزات کا انکار ان کی ہلاکت اور دنیوی عذاب آنے کا سبب بنا۔ اس سب کو جاننے کے باوجود اس دور کے لوگ متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ اقرآن کے ہوتے ہوئے دوسرے معجزے کی ضرورت نہ ہے اس کی ضرورت کیوں ہے؟

وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰی ﴿۱۳۴﴾

"اور اگر ہم انہیں اس سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو کہتے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم ذلیل و خوار ہونے سے پہلے تیرے حکموں پر چلتے"۔

قرآن کے نزول سے پہلے عذاب

اللہ فرما رہا ہے کہ ان لوگوں نے کفر اختیار کرنے میں تمام حدود پامال کر دی ہیں اور حدود سے تجاوز کیا ہے اس کے باوجود ہم نے ان پر عذاب نہیں اُتارا۔ یہ اس لیے تھا کہ پہلے ان پر روشن دلیل اُتار دی تاکہ پھر یہ نہ کہیں کہ اے رب اگر تو نے ہمارے پاس عذاب دینے سے پہلے رسول کو بھیجا ہوتا، تیری جناب سے نشانی و معجزہ آجاتا تو ہم ایمان لے آتے لیکن اب ہم نے اپنا رسول بھی بھیج دیا ہے اور قرآن جیسا بڑا معجزہ بھی بھیجا ہے، اب ان کا سوال کرنا بے جا ہے۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَ مَنِ اهْتَدٰی ﴿۱۳۵﴾

"کہہ دو ہر ایک انتظار کرنے والا ہے سو تم بھی انتظار کرو، آئندہ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سیدھی راہ پر کون ہے اور ہدایت پانے والا کون ہے؟"

نتیجہ کا انتظار

اس جگہ کافروں سے کہا گیا کہ جو تمہارا رویہ ہے اور ہمارا جو بیان ہے اب سوال یہ ہے

کہ کون صحیح ہے اور کون غلطی پر ہے تو اللہ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ ان سے واضح کہہ دو کہ تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے ہمیں خبر دے دی ہے کہ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے دین کو تمہارے اوپر غلبہ دے گا اور اپنے نور ہدایت کو پورا کرے گا۔ یہ وقت آجائے گا تم انتظار کرو اور دیکھو کہ کیا تم سچے ہو کہ حق شکست کھائے اور باطل چھا جائے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اور کوشاں ہے۔ اس جگہ ان کفار کو ڈرایا گیا ہے، دھمکی دی ہے کہ دیکھ لیں گے، پتہ چل جائے گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو گا کہ کون راہ مستقیم پر ہے اور کون غلط راستے پر ہے۔ راہ مستقیم ہی ہدف تک پہنچاتا ہے، راہ راست سے مطلوب ملتا ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کے لیے غیبی وعدہ ہے کہ کامرانی اور کامیابی مسلمانوں کے لیے ہے، مشرکین کے لیے معصیت ہے، غلبہ مسلمانوں کا ہو گا اور مشرک مغلوب ہوں گے۔ صراط سَوِیّ وہی دعوتِ حق، دین اسلام اور اللہ کا پیغام ہے جسے ہر حال میں غلبہ ملنا ہے۔

سورۃُ الانبیاء

(مکی، آیات 112)

اس سورت کے مطالب

توحید و نبوت، رسالت کا بیان، انبیاء کے احوال، احتساب، دعوت حق، کفر اختیار کرنے کا انجام و دیگر ابحاث۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ ۱

ترجمہ: ”لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں پڑ کر منہ

پھیرنے والے ہیں۔"

قیامت کے دن احتساب

حساب دینے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن انسان اللہ کے حضور پیش ہوں گے اور اپنے اعمال کا حساب دیں گے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے حساب دینے کا وقت قریب آگیا ہے لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی جانب دعوت دینے والے کی آواز کو سنیں اور حق کو قبول کرلیں لیکن ان کی حالت کو بھی ساتھ بیان کیا گیا کہ حق کی دعوت دینے والا تو موجود ہے اور وہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ خواب غفلت میں ہیں اور غفلت کی وجہ سے حق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اسی بے خبری میں حساب دینے والی جگہ پر اللہ کے حضور پہنچ جائیں گے۔

مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ۟ۙ﴿۲﴾

ترجمہ: " ان کے رب کی طرف سے سمجھانے کے لیے کوئی ایسی نئی بات ان کے پاس نہیں آتی کہ جسے سن کر ہنسی میں نہ ٹال دیتے ہوں۔"

ذکر الٰہی سے منہ موڑنا

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ غفلت کی حالت میں رہے اور حق کی دعوت سے منہ موڑ لیا اب ایسی بات کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ جب ان کے سامنے حق بیان کیا گیا اور یہ نئی بات تھی انہوں نے اسے توجہ سے نہیں سنا اسے کھیل تماشہ جانا اور لہو ولعب اور بے ہودہ کاموں میں مصروف رہے اور اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

ذکر الٰہی سے مراد وحی الٰہی ہے جو اللہ کی جانب سے اپنے رسولوں کے لیے نازل کی

گئی تاکہ وہ انسانوں تک اللہ کے پیغام کو پہنچائیں۔ قرآن ذکر الٰہی ہے جو ان کے لیے توریت اور انجیل کے بعد نیا ذکر تھا، نیز قرآن کی کچھ آیات جب نازل ہوئیں تو وہ پچھلی آیات کے بعد نئی معلوم ہوئیں تو اس طرح وہ نیا ذکر الٰہی سمجھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے جو بھی اللہ کی طرف سے تازہ حکم ان کے پاس آتا ہے تو وہ لہو و لعب اور کھیل تماشا کی حالت میں لیتے ہیں اور ان کے دلوں پر اس کا اثر ہی نہیں ہوتا اور دُنیاوی کاموں میں مشغول رہتے ہیں جبکہ ذکر تو بار بار آرہا ہے اور انہیں اللہ کی یاد دلا رہا ہے۔ اللہ کے احکام کو بتا رہا ہے لیکن ان کے دل دُنیاوی عیاشیوں میں سرگرم ہیں اور ان کا اثر نہیں لیتے، یہ غفلت ہی نہیں تو اور کیا ہے؟

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۗ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۗ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳

ترجمہ: ”ان کے دل کھیل میں لگے ہوئے ہیں، اور ظالم پوشیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ تمہاری طرح ایک انسان ہی تو ہے، پھر کیا تم دیدہ دانستہ جادو کی باتیں سنتے جاتے ہو۔“

دلوں کا لہو ولعب

لہو کا معنی ہوتا ہے ایسے امور میں خود کو مصروف کرلینا جو انسان کو بنیادی اور تقدیر ساز امور سے روکے رکھے جس کی وجہ سے اہم کام چھوٹ جائیں، فضول اور بے فائدہ یا کم فائدہ والے کاموں میں مصروف رہنا۔

آیت میں بتایا جارہا ہے کہ یہ مادیات میں مگن ہیں اس وجہ سے خود کو اپنے اہم کاموں سے دُور رکھا ہوا ہے یہ لوگ قرآن کو سنتے ہیں پھر آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں

کہ جو کچھ ان کے لیے بیان کیا جا رہا ہے یہ جادو ہے۔ آپس میں کہتے ہیں کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرح ایک بشر ہی تو ہے۔ اس کے پاس کہاں سے وحی آگئی جو کچھ بیان کر رہا ہے یہ جادو ہی تو ہے کیونکہ یہ بات تو ناممکن ہے کہ ہم جیسا ایک آدمی ہو اور اس کے پاس غیب سے وحی آئے، وہ آسمان سے خبریں وصول کرے؛ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، ہمیں دھوکہ دے رہا ہے یہ شخص جادوگر ہے یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ اس قسم کے بے ہودہ خیالات سے وہ قرآنی آیات کو جھٹلاتے تھے اپنے ساتھیوں سے کہتے کہ تمہاری دو آنکھیں ہیں تم ان سے دیکھ رہے ہو یہ شخص تمہارے درمیان ہی تو بڑا ہوا ہے اس کا تمہارے سے کیا امتیاز ہے نہ اس کے پاس مال و دولت ہے نہ جاہ و حشم، پس تم اس کے جھوٹ کو کیوں تسلیم کرتے ہو؟ کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم جانتے بوجھتے ہوئے ایک ساحر اور جادوگر کے آگے تسلیم ہو جاو۔ اس طرح سے وہ دعوت حق سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۫ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴

ترجمہ: ''رسول نے کہا میرا رب آسمان اور زمین کی سب باتیں جانتا ہے، اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

مشرکین کے لیے جواب

مشرکین جو اوُل فُول بک رہے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مخفیانہ جو اُنہوں نے آپس میں اس قرآن کے بارے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے باتیں کی ہیں اس سے متعلق کسی کو خبر نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہا کہ میرا رب آسمان اور زمین میں جو بھی بات ہوتی ہے وہ اس سے آگاہ ہے۔ تم جو میرے اوپر افتراء باندھ رہے ہو اور مجھے جھٹلا رہے ہو اس کا اللہ کو علم ہے۔ مشرکین نے پہلے پہل تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات بارے یہ کہا کہ اس شخص کو خواب آتے ہیں وہ اپنے خواب ہمیں سنا رہا ہے اور اپنے خوابوں کو کتاب کی

شکل دے کر اسے معجزہ کے عنوان سے پیش کر رہا ہے اور اسے آسمانی کتاب کہہ رہا ہے لیکن اس کی ساری باتیں جادو سے بھی کم درجہ کی ہیں اور بے اعتبار ہیں کیونکہ سحر اور جادو بھی تو ایک فن و علم تو ہے لیکن جو کچھ یہ شخص کہہ رہا ہے یہ تو سب کچھ خیالات اور وہمیات سے زیادہ نہیں۔ دوسرے مرحلے میں یہ ایک مرحلہ آگے بڑھے کہ یہ شخص جھوٹ گھڑتا ہے اور ہمارے سامنے آکر بیان کرتا ہے کیونکہ جو خواب دیکھنے والا ہوتا ہے وہ جو خواب دیکھتا ہے اسے ہی بیان کر دیتا ہے جھوٹ نہیں بول رہا ہوتا۔ لیکن دوسرے مرحلہ میں مشرکین نے ایک قدم آگے بڑھایا کہ اس کے بیانات خواب نہیں بلکہ بنایا ہوا اور گھڑا ہوا جھوٹ ہے۔ یہ شخص عمداً افتراء پرداز ہے لہٰذا اس کی بات کو تسلیم نہ کیا جائے۔ پھر تیسرے مرحلہ پر اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھے کہ یہ شخص تو شاعر ہے جو کچھ کہہ رہا ہے یہ ایک شاعر کے خیالات ہیں جو اس کے خیال میں آتا ہے اس کو آپس میں ترتیب دیتا ہے اور ہمارے سامنے آکر بیان کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے جبکہ ایسا کچھ بھی نہیں۔ (العیاذ باللہ)

اس طرح وہ عقلی دلائل کا بعض دفعہ انکار کر دیتا ہے اور ہر باطل پر مصر رہتا ہے کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ سچائی کو جھٹلا دیتا ہے اور جھوٹ کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ قرآن یا تو پریشان خواب ہے یا افتراء اور جھوٹ کا پلندہ ہے یا شعر ہے لہٰذا اس کی نبوت کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ قرآن کے علاوہ کوئی اور نشانی ہمارے لیے لے کر آئے جیسا کہ گذشتہ دور میں انبیاء مختلف نشانیاں لے کر آئے جس طرح حضرت صالح علیہ السلام نے پہاڑ سے اونٹنی کو نکالا، موسیٰؑ کا عصا اژدھا بن گیا۔ یہ شخص ہمارے لیے اس قسم کے معجزات لے آئے جیسا گذشتہ نبیوں نے اپنی رسالت کے بارے ثبوت فراہم کیے۔

لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ مشرکین بنیادی طور پر نبوت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہ تھے۔ یہ سب ان کے بہانے تھے اس کے بعد چوتھے مرحلے پر کہنا شروع کر دیا کہ یہ سب کچھ بیان کرنے والا ہماری طرح کا ایک بشر ہی تو ہے۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ اللہ نے اسے ہمارے

اوپر اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہو۔ یہ لوگ اپنے غلط مؤقف کے ثبوت کے لیے مُصر تھے کہ کیا کہیں۔ آخری بات اُنھوں نے یہ کہہ دی کہ یہ سب کچھ سحر و جادو ہے۔ اصل میں ان کی بہانہ تراشیاں تھیں اور وہ قرآن کے علاوہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی اور معجزہ طلب کرنا چاہ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس تقاضا پر فرمادیا کہ پہلے بھی تو نشانیاں لوگوں کے لیے آئیں، ان کے مطالبہ پر معجزات دکھائے گئے پھر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے اور ان کو اس انکار پر دُنیاوی عذاب دیا گیا۔ تمہارا حال بھی ان سے مختلف نہ ہے اگر قرآن کے علاوہ اور معجزات بھی دکھائے جائیں تو بھی تم لوگ ایمان نہ لاؤ گے۔ جو کچھ مشرکین آپس میں مل کر بیانات تیار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کارد کریں رسول اللہ ﷺ نے وہ سب کچھ ان کے سامنے بیان کر دیا۔

اس سب بیان کو جو اوپر ذکر ہو چکا ہے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو پہلی آیت کے تسلسل میں آئی ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵

ترجمہ: ”بلکہ کہتے ہیں کہ یہ بیہودہ خواب ہیں بلکہ اس نے جھوٹ بنایا ہے بلکہ وہ شاعر ہے، پھر چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جس طرح پہلے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔“

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

ترجمہ: ”ان سے پہلے جو بستی ایمان نہیں لائی تھی جسے ہم نے ہلاک کیا، کیا اب یہ ایمان لائیں گے۔“

معجزات کے انکار پر عذاب الٰہی

مشرکین کو بتایا جارہا ہے کہ تم سے جو پہلے تھے انہوں نے انبیاء سے معجزات طلب کیے جب کہ ان کے سامنے معجزات پیش کیے گئے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اس بنا پر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ اب تم قرآن کے علاوہ دوسرا معجزہ طلب کر رہے ہو تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم لوگ پھر ایمان لے آؤ گے۔ اللہ فرمارہا ہے کہ سب انسانوں کا رویہ ایک ہی جیسا ہے لہٰذا اے مشرکو قرآن کے علاوہ جتنے اور معجزات آجائیں پھر بھی تم ایمان نہ لاؤ گے تم پچھلے لوگوں سے مختلف نہیں ہو۔ یہ سب ایک دوسرے کی مانند اسراف گر ہیں، حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں، ستم گر و ظالم ہیں حق سے منہ موڑنے والے ہیں اور غافل ہیں یہ حق کے آگے تسلیم نہ ہوں گے ان کا اصرار جاری رہا تو معجزہ ان کے لیے آجائے گا اور انکار کے نتیجہ میں یہ بھی سابقہ لوگوں کی طرح ہلاک ہوں گے۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝۷

ترجمہ: ''اور ہم نے تم سے پہلے بھی تو آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا ان کی طرف، ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو۔''

کافروں کے اعتراض کا جواب

کافروں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم جیسا بشر ہو اور اس پر وحی اُتری ہو، اللہ فرمارہا ہے تو کیا جتنے انبیاء سابقہ ادوار میں آئے وہ سب انسان نہ تھے۔ اب تم چاہ رہے ہو کہ تمہارے لیے جو پیغمبر آئے وہ مافوق البشر ہو، وہ انسان نہ ہو؟ بنیادی طور پر نبوت اور بشر ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سارے انبیاء بشر ہونے میں سارے انسانوں کے ساتھ

شریک ہیں، فقط فرق اس میں ہوتا ہے کہ جو انبیاء ہوتے ہیں ان پر وحی اُترتی ہے ان کے پاس نبوت و رسالت کا منصب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ وحی ایک خاص صفت ہے جو ہر دور میں کسی ایک کے لیے مخصوص ہوتی ہے اور یہ اللہ کا اپنا اختیار ہے کہ وہ اس صفت کو کسے دیتا ہے۔ کافروں کے اعتراض کا یہ جواب ہے کہ جب سابقہ ادوار میں سارے انبیاء بشر ہی تھے تو اس دور میں بھی نبی بشر ہی ہوگا لہٰذا یہ بات نادرست ہے کہ بشر پر اللہ کی وحی آنا ناممکن ہے۔ اگر پہلے وحی انسانوں پر آتی رہی ہے تو اب بھی آسکتی ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی بات کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔۔۔(سورۂ کہف، آیت ۱۱۰)

ترجمہ: ''کہہ دو کہ میں بھی تمہارے جیسا آدمی ہی ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔۔۔''۔

اس کے بعد اللہ کے اس کلام کی تائید کے لیے بیان کیا گیا کہ اگر تمہیں اس بارے شک ہے یا تم اسے نہیں جانتے تو پھر اھل کتاب کے علماء جو تمہارے نزدیک محترم ہیں ان سے سوال کرلو کیونکہ رسول اللہؐ کی مخالفت کرنے میں وہ بھی مشرکین کے ہمنوا تھے۔ یہ انسان کے مدعیٰ پر بہترین دلیل ہو گی کہ اس کا دشمن بھی اس کے دعویٰ کی تصدیق کرے۔ ''فاسئلوا'' میں علماء اور جہلاء سب کو کہا گیا کہ تم جا کر اس بارے اھل کتاب کے علماء سے پوچھ لو، وہ تمہیں بتائیں گے کہ سارے انبیاء انسان تھے اور ان پر بھی اللہ کی وحی اُترتی تھی۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ﴿٨﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے ان کے ایسے بدن بھی نہیں بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔''

انبیاء کی زندگی بارے

اس آیت میں واضح بیان دیا ہے کہ انبیاء ایسی مخلوق نہیں کہ وہ چلتے پھرتے ہوں، جسم و جان رکھتے ہوں لیکن غذا نہ کھاتے ہوں اور یہ کہ ان کو موت نہ آئے اور زندگی کی خصوصیات سے عاری ہوں کہ انہیں کھانے پینے کی ضرورت ہی نہ ہو اور موت سے محفوظ رہیں اور ہمیشہ کی زندگی رکھتے ہوں۔ وہ بھی باقی انسانوں کی طرح انسان ہیں، تمام انسانی ضروریات ان کے لیے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، شادیاں کرتے ہیں، زندگی کے تمام احوال سے ان کا سامنا ہوتا ہے لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ کی نمائندگی ہے اور ان کے پاس وحی آتی ہے جس سے وہ باقی انسانوں سے ممتاز ہیں۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹

ترجمہ: ''پھر ہم نے ان سے وعدہ سچا کر دیا تب انہیں اور جسے ہم نے چاہا نجات دی اور ہم نے حد سے بڑھنے والوں کو ہلاک کر دیا۔''

انبیاء کی نصرت

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو یہ وعدہ دیا کہ اللہ ان کی نصرت کرے گا اور ظالموں پر انہیں غلبہ دے گا، کلمہ حق کو سربلند رکھنے کا وعدہ دیا گیا۔ انبیاء اور مومنین کے لیے اللہ نے جو وعدہ دیا اسے پورا کیا۔ اللہ نے اپنی مشیت کے تحت انہیں ہلاکت سے بچایا، جبکہ مشرکین، سرکشوں اور ظالموں کو ہلاک کیا کیونکہ انہوں نے بندگی کی حدود کو پھلانگا اور اللہ کی حدود کا پاس نہ کیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝۱۷۱ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝۱۷۲ (سورۂ صافات، آیت: ۱۷۱ تا ۱۷۲)

ترجمہ "اور ہمارا حکم ہمارے بندوں کے حق میں جو رسول ہیں پہلے سے ہو چکا ہے۔ بے شک وہی مدد دیے جائیں گے۔"

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

ترجمہ: البتہ تحقیق ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہاری نصیحت ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے۔

اللہ کا احسان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان اور تفضّل کو بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُمت اسلامی پر قرآن اُتار کر احسان کیا ہے۔ (ذکرکم) سے مراد وہ ذکر ہے جو اس اُمت کے لیے فرض ہے۔ ایسا ذکر ہے جو اس اُمت کے شایان شان ہے، یہ ذکر ہے جس میں اعلیٰ درجہ کے معارف ہیں جن کو بشر دریافت کر سکتا ہے، اس میں انسان کی سعادت ہے۔ بلند ترین پروگرام جو انسان کی سعادت کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اللہ نے بھیجا ہے۔ بعض مفسرین نے ذکر سے مراد شرف قرار دیا ہے۔ سورہ یونس آیت ۱۰۳ اس بارے ہے اس آیت کا اس طرح معنی کیا ہے "تمہاری شرافت اور آبرو قرآن کے گروی ہے"۔[1] لیکن یہ معنی آیت کے سیاق سے دُور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے لیے ذکر کو دیا اور وہ ذکر قرآن ہے جس میں انسان کی ترقی وکمال کے معارف موجود ہیں۔ اس انداز سے بیان ہوئے ہیں جسے ہر ایک سمجھ سکتا ہے اور اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ اس سے استفادہ کر سکیں یہ اللہ کا اس اُمت پر احسان ہے۔

---

[1]۔ تفسیر مجمع البیان، ج ۷۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ظالم تھیں غارت کر دیا ہے اور ان کے بعد ہم نے اور قومیں پیدا کیں''۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی تو وہ فورًا وہاں سے بھاگنے لگے۔

لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: ''مت بھاگو اور لوٹ جاؤ جہاں تم نے عیش کیا تھا اور اپنے گھروں میں جاؤ تاکہ تم سے پوچھا جائے''۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: کہنے لگے ہائے ہماری کم بختی بے شک ہم ہی ظالم تھے۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: سو ان کی یہی پکار رہی یہاں تک کہ ہم نے انہیں ایسا کر دیا جس طرح کھیتی کٹی ہوئی ہو اور وہ بجھ کر رہ گئے۔

ظالموں پر عذاب الٰہی اور ان کا رد عمل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں اور ستمگاروں پر دُنیا ہی میں عذاب کے اُترنے

کو بیان کر دیا ہے اور اس عذاب کو دیکھ کر جو کیفیت ان کی ہو گی اسے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں چند امور کا بیان اس طرح ہے:۔

- ظلم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہنستی بستی آبادیوں کو ہلاک کر دیا اور ان کا نام ونشان مٹ گیا۔
- جن آبادیوں کو ہلاک کیا گیا ان کی جگہ اللہ تعالیٰ اور اقوام کو لے آیا لہٰذا کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہم نہ رہے تو پھر زمین کی آبادی کیسے ہو گی اور یہ خیال کرے کہ ہم سے جہان آباد ہے۔ ایسا نہیں ہے۔
- عذاب کے مشاہدہ کے وقت لوگ اس عذاب سے بچنے کے لیے ادھر اُدھر بھاگیں گے لیکن ان سے کہا جائے گا کہ اب تم کہاں بھاگ رہے ہو ٹھہر جاؤ تم سے سوال کیا جانا ہے جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس کے بارے باز پرس ہونی ہے۔
- ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ تمہارے پاس نعمات کی فراوانی تھی تمہارے گھر آباد تھے، آسودگی میں تم رہتے ہو، دُنیاوی زرق برق میں ایسے غرق ہوئے کہ اللہ کو بھول گئے جس نے تمہارے لیے یہ سب نعمات کی فراوانی دی تھی۔ تم یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ سب کچھ تم سے کوئی چھین نہیں سکتا، اب واپس پلٹو اور اپنے گھروں میں جاؤ۔ دیکھو تمہارا کیا بچا ہے؟
- ستمگار ان حالات میں اس بات کا اعلان کرتے نظر آئیں گے کہ ہم تو ظالم تھے، اللہ کی حدود کا ہم نے پاس نہ رکھا، اس کی تمام حدود کو پھلانگ گئے۔
- اس وقت پشیمان ہوں گے، یہ کہیں گے کہ ہمارے اوپر وائے ہو کہ ہم نے کیوں نہ اللہ کے فرامین کا لحاظ رکھا۔ اس حالت میں وہ اللہ کی ربوبیت و حاکمیت کو تسلیم کرتے نظر آئیں گے لیکن اضطرار اور مجبوری کے عالم میں ندامت اور پشیمانی نے ان کے حال پر کچھ اثر نہ چھوڑا، عذاب ان پر آگیا اور ان کا صفایا ہو گیا۔

پیغام: تمام زمانہ کے ستمگاروں کے لیے یہ پیغام ہے کہ تمہارا حساب ہو گا، جو کر رہے ہو اس کا بدلہ تم سے چکایا جائے گا، عذاب تمہارا مقدر ہو گا جب عذاب آئے گا تو پھر ندامت اور پشیمانی کا فائدہ نہ ہو گا لہٰذا ابھی وقت ہے کہ توبہ کر لو!، اللہ کی اطاعت میں آجاؤ تا کہ اللہ کی گرفت اور پکڑ سے اس دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بچ جاؤ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾

ترجمہ: اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾

ترجمہ: اور اگر ہم کھیل ہی بنانا چاہتے تو اپنے پاس کی چیزوں کو بناتے اگر ہمیں یہی کرنا ہوتا۔

ظالموں پر عذاب اُتارنے کی وجہ

ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ ستمگاروں اور ظالموں پر عذاب کیوں اُتارا جاتا ہے، اس کا سبب کیا ہے؟ یہ حجت برہانی ہے معاد کو ثابت کرنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ اس حجت کے ذریعے نبوت کا اثبات بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس انسان کے لیے معاد ہے اس نے مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا ہے اور اللہ کے حضور پیش ہونا ہے وہاں اس کا حساب کیا جانا ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ الٰہی ہدایت کے تحت وہ شر اور خیر میں تمیز کرے، ہدایت الٰہی اصل بنیاد ہے جسے انبیاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فراہم کیا ہے۔ دعوت حق الٰہی نبوت کی اصل پر قائم ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ساری خلقت بے ہودہ اور بے مقصد قرار پاتی، یہ سب بازیچہ اور کھیل کا میدان ہوتا، جسے سجایا گیا ہے جس کا کوئی اثر و نتیجہ نہ ہوتا، ایسا

فقط ملامت کو رفع کرنے پر خستگی اور تھکاوٹ کو دُور کرنے یا اسی قسم کے واھی مقاصد کے مد نظر ہوتا جو کہ اللہ کی ذات سے دُور ہے کیونکہ وہ ذات کامل ہے اسے کھیل تماشا کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اسے اس طرح کا کام کرنے کی ضرورت ہے کہ جس سے اس کی تھکاوٹ دُور ہو وہ لطف اندوز ہو یہ سب انسانی مزاج کے تقاضے ہیں اللہ کی ذات ان سب سے مبرا و پاک ہے۔

(لہو) ایسے کام کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم اور ضروری کاموں سے روکتا ہے، کھیل کود انسان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے بعض دفعہ وہ کھیل میں مصروف ہو کر بہت ہی اہم کاموں کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اس وجہ سے کھیل بھی لہو و لعب میں آتا ہے لیکن لہو و **(لعب)** کھیل تماشا بھی اسی وقت محقق ہوتا ہے جب کسی کی کوئی ضرورت و حاجت ہوتی ہے وہ اس عمل سے اسے پورا کرنا چاہتا ہے، خود کو کھیل میں مصروف رکھنے کے لیے بھی کوئی غرض ہوتی ہے اگرچہ وہ غرض عقلائی ہی کیوں نہ ہو جیسے تھکاوٹ اور اکتاہٹ کو دُور کرنا یا کچھ کمزوری کا احساس اسے ہوتا ہے وہ اسے اس عمل سے دُور کرتا ہے لہٰذا لہو یا کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے یا اپنے اندر کی کمزوری کو دُور کرنے کے لیے ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا وجود ہر قسم کی احتیاج، نقص، کمزوری، ترکیب سے پاک و منزہ ہے۔ اس کی ذات میں یہ امور کچھ بھی اپنا اثر نہیں چھوڑتے اور کوئی چیز اسے بدل نہیں سکتی، اس کی ذات مجرد محض ہے، اس میں ترکیب نہیں ہے وہ اجزاء کا مجموعہ نہیں لہٰذا یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالیٰ لہو و لعب کے عمل کو انجام دے، اگر بغرض محال اللہ کے لیے لہو و لعب کا عمل جائز قرار دیں اور یہ اس ذات سے اسی صورت میں ہی سرزد ہو گا کہ اس کی ذات کا غیر نہ ہو جبکہ جو مخلوقات ہیں وہ تو اللہ کا غیر ہیں کیونکہ یہ اللہ کا فعل ہے اور اللہ ہی سے صادر ہوا ہے لہٰذا اس نظر سے بھی اس کی مخلوقات اللہ کا کھیل ہو سکتیں، ایسا لہو و لعب جو اللہ کی ذات سے صادر نہ ہوا ہو تو ایسا اس کتاب میں موجود ہی نہیں اس وجہ سے اللہ کے لیے لہو نہ ہے۔

آیت شریفہ یہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم بازیچہ اور کھیل تماشہ چاہتے تو اپنی ذات سے اسے اخذ کیا جاتا، اس کا مرحلہ خلقت سے پہلے کا ہے۔ لہو کی خلقت ہمارا فعل ہے اور ہمارا فعل ہماری ذات سے خارج ہے۔ اگر ہم اس کا ارادہ کرتے تو اسے بھی انجام دیتے۔ اس گفتار سے اس امر کے ممتنع ہونے کی تاکید مزید کی گئی ہے اس ترتیب سے معاد پر برھان مکمل ہو اور اسی کے ساتھ نبوت کا بھی برھان قرار پایا حالانکہ اللہ تعالیٰ اھل لہو و لعب سے نہیں ہے۔ اس لیے پورے عالَم کی خلقت ایک عقلانی غرض کے تحت ہے۔

یہ غرض یہی ہے کہ تمام مخلوقات کی بازگشت اللہ کی طرف ہے تاکہ ان کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے اور اعمال کی بنیاد پر انہیں اجر و ثواب یا جزا و سزا دی جائے۔ جب ایسے ہے تو پھر اللہ پر ہے کہ وہ انبیاء کو مبعوث کرے تاکہ وہ لوگوں کے لیے خیر و شر کا راستہ بیان کریں اور وہ انسانوں کی ہدایت کریں۔ اس کے لوازمات سے یہ ہے کہ جو مومنین ہیں انہیں بشارت دی جائے اور جو منکرین و معاندین ہیں انہیں ڈرایا دھمکایا جائے اور جنہوں نے ظلم و کفر میں اسراف کیا ہے تو وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یا اللہ انہیں مہلت دے قیامت تک کے لیے ان پر عذاب کو مؤخر کر دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام اعمال کی عقلائی غرض موجود ہے سب کی حکمت ہے کچھ بھی لہو و لعب نہ ہے۔ ایسا تو ہر گز نہیں ہو سکتا کہ اللہ دُنیا کی لذات کو لہو و لعب کے عنوان سے ان کی مذمت کرے اور پھر خود ہی ایسا فعل انجام دے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں پھر وہ باطل کا سر توڑ دیتا ہے پھر وہ مٹنے والا ہوتا ہے، اور تم پر افسوس ہے ان باتوں سے جو تم بناتے ہو۔

باطل کی نابودی اور حق کا غلبہ

حق ایسے امر کو کہتے ہیں جو ثابت ہے، برقرار ہے۔ جبکہ باطل وہ ہے جسے ثبات و استقرار نہیں لیکن خود کو حق بنا کر ظاہر کرتا ہے اور ایسا تاثر دیا جاتا ہے کہ ان کے واسطے بھی استقرار ہے لیکن جب حق اور باطل کا آپس میں سامنا ہوتا ہے تو اس وقت باطل نابود ہو جاتا ہے اور حق جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ عالم ہستی میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں مگر یہ کہ اس میں باطل کا نشان موجود ہوتا ہے لیکن ذات باری تعالیٰ ہی ہے جو حق مطلق ہے وہاں باطل کو راہ نہیں ہے ''ان اللہ ہو الحق'' بلاشک اللہ ہی حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ہم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے اور یہ ہمارا ارادہ ہے کہ باطل کو حق کے ذریعہ سرکوب کر دیں، اسے ہلاکت میں ڈالیں اور باطل کو فنا کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام صفات کمالیہ و جلالیہ اور جمالیہ کی جامع ہے، ہر شئی کے کمال کا منشاء و منبع اللہ کی ذات ہے لیکن باقی جتنی اشیاء ہیں اور جتنے موجودات ہیں، حیوانات کا آپس میں تقابل کیا جائے تو ان کے درمیان فرق و تفاوت موجود ہے جس کا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ ایک حیوان کسی پہلو سے کامل ہے تو دوسرے میں کوئی نقص ہے، دوسرے میں ایک جہت کمال کی ہے تو دوسری جہت اس میں نقص کی بھی ہے۔ لہٰذا عالَمِ خلقت اپنے تمام نظامات سمیت جو ان میں موجود ہیں، حق و باطل کی ملاوٹ سے عبارت ہے، لیکن باطل سیلاب کی جھاگ ہے آخر کار اس نے فنا ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ باطل کو جس قدر بھی مہلت دے آخر کار جب بھی اس کا حق سے سامنا ہوگا تو حق باطل کو نابود کر دے گا۔ (سورہ رعد، آیت ۱۷)

اسی بناء پر عقائد حقہ زمین میں کبھی بھی ریشہ کن نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کبھی بھی حق کی نصرت سے دریغ نہ کرے گا اللہ کا جاری و ساری قانون یہ ہے کہ باطل کو حق کے ذریعہ ہی پامال کرے چاہے وہ باطل کسی مطلب سے عبارت ہو یا عقیدہ ہو یا کوئی عمل اور رویہ ہو۔

آخر کار جو حق ہے اس نے باقی رہنا ہے جو باطل ہے اس نے نابود ہونا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے گذشتہ اقوام کے ستمگاروں کو نابود اور ہلاک کیا اسی طرح سے باطل اعمال، باطل نظریات کا بھی خاتمہ کردے گا۔ آیت کے آخر میں ستمگاروں کو دھمکایا ہے کہ جب ایسا ہے اور یہ الٰہی قانون اٹل ہے تو پھر جو کچھ تم باتیں کر رہے ہو اور وصف بیان کرتے ہو اپنے باطل خیالات کی تو تمہارے اس رویہ پر وائے اور پھٹکار ہو۔

وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۚ﴿۱۹﴾

ترجمہ: ''اور اسی کا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو اس کے ہاں ہیں اس کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔''

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: ''رات اور دن تسبیح کرتے ہیں سستی نہیں کرتے۔''

اللہ کا ملک و مُلک

پوری کائنات پر اللہ کا مکمل تسلط اور غلبہ ہے، یہ ملکیت تمام موجودات پر ہے کہ وہ ہی تو ان سب کا خالق ہے جب خالق ہے تو مالک بھی وہی ہے لہٰذا مخلوقات سے کوئی بھی نہیں جو اللہ کی طرف بازگشت سے خود کو روک سکے، سب اس کے پاس جائیں گے اور سب سے حساب لیا جائے گا۔

فرشتوں کی خصوصیات

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق، فرشتگان کے بارے بیان کیا ہے کہ فرشتوں

کے لیے اللہ کا قرب حاصل ہے، فرشتے شب و روز اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، اللہ کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کی عبادت کرنے میں سستی کرتے ہیں۔ ان کا دائمی تسبیح کا عمل انہیں تھکاتا نہیں وہ اس عمل سے اُکتاتے بھی نہیں۔

دُنیاوی بادشاہوں کے جو غلام و نوکر ہوتے ہیں وہ جس قدر اپنے سرداروں اور بادشاہوں کے اطاعت گزار اور ان کے فرمانبردار ہوں تو ان عارضی مالکیت والوں کے کارندے تمام تر وفاداریوں کے باوجود تھک جاتے ہیں، کام کرتے کرتے اُکتا جاتے ہیں، ان کے کاموں میں سستی و کاھلی بھی آجاتی ہے۔ جب نوکر چاکر اپنے مالک کے مقرب ہوتے ہیں تو ان پر مالک زیادہ مہربان ہوتا ہے ان کی ذمہ داریوں میں تخفیف بھی کر دیتے ہیں، عفو و در گزر بھی ان کی لغزشوں بارے کیا جاتا ہے کیونکہ انسانی معاشرہ اور اجتماع کی بنیاد باہمی تعاون اور ایک دوسرے سے راہ و رسم رکھنے، باہمی فائدہ پہنچانے کی بنیاد پر قائم ہے۔ جس طرح رعیت بادشاہوں کی محتاج ہے تو بادشاہ بھی رعیت کے محتاج ہیں اور مولا اپنے مقرب غلاموں کا زیادہ محتاج ہوتا ہے لیکن اللہ کی مالکیت حقیقی ہے، اللہ اپنے بندگان کا مالک حقیقی ہے اور ہر حاجت سے بے نیاز ہے۔ سب اللہ کے محتاج ہیں، اللہ کسی کا محتاج نہیں اللہ کے قریب تر جتنا ہوتا جائے گا تو وہ اتنا زیادہ اللہ کی عظمت سے آگاہ ہوگا اور خود کو اور زیادہ اللہ کے سامنے حقیر و ضعیف سمجھے گا۔ اپنی بے چارگی سے اور زیادہ واقف ہو جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی عبادت، اللہ کے سامنے خضوع و خشوع میں اور زیادہ غرق ہو جاتا ہے وہ اللہ کی عبادت کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں، سوائے عبادت کے اس کے وہم و خیال اور ذہن و شعور میں کچھ اور آتا ہی نہیں جیسا کہ ہم نے پہلے سورہ اعراف کی آیت ۲۰۶ میں "ان الذین عند ربك" کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے مراد مقرب فرشتے بھی نہیں اور وہ انسان بھی ہے جو اللہ کا مقرب ہو۔ مقربین کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ کی عبادت سے نہ نکلتے ہیں، نہ اُکتاتے ہیں اور نہ ہی سست پڑتے ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِهَةً مِّنَ الۡاَرۡضِ هُمۡ يُنۡشِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: "کیا انہوں نے زمین کی چیزوں سے ایسے معبود بنا رکھے ہیں جو زندہ کریں گے۔"

لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اگر ان دونوں (زمین وآسمان) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں خراب ہو جاتے، سو اللہ عرش کا مالک ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

اس مطلب کو متعدد جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ بت پرستوں اور توحید پرستوں کے درمیان جو جھگڑا ہے وہ معبود کی یگانگی یا تعدد کا نہیں ہے اور اس بات میں اختلاف ہے کہ واجب الوجود معبود جس نے تمام جہانوں کو خلق کیا ہے وہ ذات ایک ہی ہے۔ بت پرستوں اور توحید پرستوں، دونوں کا عقیدہ تھا کہ کائنات کا خالق اللہ ہے لیکن اصل جھگڑا اللہ کی ربوبیت بارے ہے۔ بت پرستوں کا نظریہ تھا کہ جو معبود خالق کے مقرب ہیں اور شریف موجودات ہیں وہ پورے عالم کی تدبیر کرتے ہیں، بت پرستوں کا خیال یہ تھا کہ عالم کی تدبیر میں خالق کا کوئی کردار نہیں، اللہ نے پورے عالم کی تدبیر مختلف معبودوں کے سپرد کر دی ہے۔ ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کریں اور ہماری شفاعت کریں جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾ (سورۂ زخرف، آیت: ۸۷)

ترجمہ: "اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے اللہ نے، پھر کہاں بہکے جا رہے ہیں"۔

اس آیت میں پوری قطعیت کے ساتھ بت پرستوں کے نظریات کی بنیاد ہی کو ڈھا دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالم کے متعدد معبود (رب) ہوں جو اللہ کے علاوہ ہوں تو یہ ضروری ہے کہ ان کے درمیان اختلاف ہو، عالم کی تدبیر بارے جو انہوں نے ارادہ کیا تو اس میں اختلاف ہونا ضروری ہے، ان کا مختلف ہونا بھی طبیعی امر ہے۔ اگر اختلاف نہ ہو تو پھر متعدد نہ ہوئے، ان کی ذات کا اختلاف ان کے ارادوں اور فیصلوں میں اختلاف کا سبب ہوگا ہر ایک کی طبیعت دوسرے سے مختلف ہوگی ہر ایک کی تدبیر دوسرے کی تدبیر کو فاسد کر دے گی لیکن پورے عالَم میں وحدت موجود ہے، ہم آہنگی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو چلانے والا اللہ رب ایک ہی ہے، پورے عالَم کا الٰہ و معبود اور رب وہی ہے جو اس کا خالق ہے۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس طرح کا اختلاف و مزاحمت تو عالم کے علل و اسباب میں بھی ہم دیکھتے ہیں، یہی بات فساد اور عدم وحدت کا ثبوت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نظامِ عالَم میں جو تزاحم نظر آتا ہے یہ دو علت اور دو اسباب کے درمیان تزاحم اور اختلاف سے عبارت ہے۔ یہ ایک تدبیر اور ایک ارادے کے تحت ہے لہٰذا ان کے درمیان اختلاف ایسا نہیں کہ ایک دوسرے کو باطل کر دیں اور اپنے اس اختلاف سے جو عالَم وجود پر کلی اور عمومی قوانین حاکم ہیں ان کو نہیں توڑتا۔

ایک اور بات کی جا سکتی ہے کہ ان معبودوں (بتوں) کے ارادہ اور فیصلہ میں تزاحم اور ٹکراؤ تو اس صورت میں وقوع پذیر ہوگا کہ وہ آگاہ اور باشعور نہ ہوں لیکن اس میں کونسا مانع موجود ہے کہ چند الٰہ ہوں، وہ شعور و منطق و دلیل سے باہمی تعاون سے اتفاق کر کے

پورے عالم کے امور کو چلائیں اور یہ فیصلہ کریں گے ان کے اعمال ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے ایسا فرضیہ غیر معقول ہے ایسا انسانوں کے درمیان معمول ہے کہ وہ عقلی قوانین کے تقاضوں کے مطابق ان کے افعال واعمال خارجی حقائق کے تحت لے کر آپس میں مطابقت کرتے ہیں تاکہ ایک مشترکہ ہدف تک پہنچ سکیں لیکن رب عالم اور پوری کائنات کے الٰہ کے بارے ایسا نہیں بلکہ جو خارج میں نظام موجود ہے وہی اس کا فعل و عمل ہے۔ دوسری عبارت میں تمام مصالح و مفادات اللہ کے فعل کے تابع ہیں، پس کس طرح ہو سکتا ہے کہ چند الٰہ اور معبود عالم کے مصالح و مفادات کی خاطر وحدت نظر اور وحدت عمل پیدا کر لیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس بارے اپنے بیان کا اختتام کیا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے بارے جو اوصاف بیان کرتے ہیں اللہ کی ذات ان سب سے منزہ و پاک ہے۔ عرش کا لفظ اس جگہ مالکیت کے معنی میں ہے کہ اللہ تو پورے عالم کا مالک اور مدبر ہے وہ ان اوصاف سے منزہ ہے جو مشرکین بیان کرتے ہیں۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾

ترجمہ: جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جاتا، اور وہ پوچھے جاتے ہیں۔

خدا سے نہیں، غیر خدا سے سوال ہو گا

اللہ سے سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے، اس کی وجہ ایک تو یہ ہے اللہ حکیم ہے اس کا ہر عمل حکمت و مصلحت کے تحت ہے جو فعل و عمل حکیمانہ ہوتا ہے عقلاء کے نزدیک اس کے بارے سوال نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق ہے وہ کسی بھی کام کو بغیر مصلحت و حکمت کے انجام نہیں دیتا۔ اس وجہ سے اللہ سے سوال کرنے کا کوئی سبب

موجود ہی نہیں۔

لیکن غیر اللہ جو ہے اس کی حکمت مطلق نہیں ہے اس کے اعمال بارے سوال بنتا ہے کیونکہ غیر خدا کے عمل میں باطل، بے ہودگی، لغویات سب کچھ ہو سکتا ہے، ان کے بارے ممکن ہے کہ ان کے اعمال مصلحت کے مطابق ہوں، ہو سکتا ہے مصلحت کے مطابق نہ ہوں ہو سکتا ہے ان کا کام حق پر مبنی ہو، ہو سکتا ہے وہ کام باطل اور غیر صحیح ہو، اگر باطل ہو گا تو اس کی مذمت ہو گی یا اسے سزا ملے گی کہ اس نے اپنے مولا کے امر کی خلاف ورزی کی ہے۔

اکثر مفسرین نے اسی طرح اس آیت کا معنی بیان کیا ہے لیکن زیادہ صحیح اس طرح ہے کہ اللہ حکیم ہے ہر چیز کا مالک ہے پورا عالم اس کی ملکیت ہے اس امر کا تقاضا یہ ہے کہ خداوند جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو حکم دینا چاہے دے سکتا ہے، اللہ کے غیر کے لیے ایسا نہیں ہے کہ وہ اس طرح کر سکے۔ اسی دلیل سے کوئی بھی اللہ کے فیصلہ جات اور اعمال بارے سوال کرنے کی حیثیت ہی نہیں رکھتا جبکہ اللہ تعالیٰ غیر خدا سے سوال کر سکتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے کہ سب اللہ کی مخلوق ہیں۔

اللہ کی ربوبیت کے براھین سے ہے کہ اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا وہ تمام موجودات کا مالک ہے جیسا کہ عدم ربوبیت کے برھان سے یہ ہے کہ اللہ کے سب مملوک ہیں تو ان کا مؤاخذہ ہو گا کیونکہ جو فاعل اپنے فعل کا مسئول نہیں ہے وہ مطلق فعل کا مالک ہے لیکن جس فاعل سے سوال کیا جائے گا ایسے فعل کا جس کا وہ مالک نہیں ہے اب اس کا فعل مصلحت کے مطابق ہے، حقیقت میں فعل کی ملکیت اس مصلحت کے لیے ہے وہی مصلحت ہے جو فاعل سے جوابدھی کی ذمہ داری کو اٹھا لیتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس فاعل کا فعل مصلحت کے مطابق ہے اس لیے اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا۔

پروردگار عالم وہ ذات ہے جو تدبیر کی بغیر شرکت غیرے مالک ہے یہ مالکیت اس کے لیے اس کی ذات کی جہت سے ہے نہ کہ کسی اور نے اسے اس مالکیت کو دیا ہے اس لیے اللہ

تنہا عرش کا رب ہے۔ اس کے غیر سب اس کے مملوک اور مربوب ہیں۔ اللہ ہی تدبیر کا مالک ہے وہی حکم دیتا ہے اس کا ہر حکم مصلحت کے تحت ہوتا ہے اس مصلحت کا مالک بھی وہ خود ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً ؕ قُلۡ ہَاتُوۡا بُرۡہَانَکُمۡ ۚ ہٰذَا ذِکۡرُ مَنۡ مَّعِیَ وَ ذِکۡرُ مَنۡ قَبۡلِیۡ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۙ الۡحَقَّ فَہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ : کیا انہوں نے اس کے سوا اور بھی معبود بنا رکھے ہیں، کہہ دو اپنی دلیل لاؤ، یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں موجود ہیں، بلکہ اکثر ان میں سے حق جانتے ہی نہیں، اس لیے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

کافروں سے دلیل لانے کا مطالبہ

اس آیت میں معاد کے منافی احتمالات جو دیے جاتے ہیں ان میں ایک کا رَد موجود ہے۔ بات یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور بتوں کی پرستش پر لگے ہوئے ہیں، اللہ کی اطاعت اور عبادت سے گریزاں ہیں جو معاد کے عقیدہ کا مستلزم ہے۔ یہ لوگ اللہ کی ولایت واطاعت سے نکل کر حساب وکتاب دینے سے فراری ہیں اور خود کو بے نیاز قرار دیتے ہیں اور یہ اس طرح انبیاء کی جانب سے جو دعوت حق الٰہی ہے اسے قبول نہ کرنے کا جواز گھڑ لیتے ہیں۔ اس آیت میں کہا گیا ہے اگر ایسا صحیح ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنایا جائے تو پھر اپنے اس عمل بارے کوئی دلیل ہے تو لے آؤ۔ ان کے پاس کوئی دلیل اپنے اس عمل کے بارے موجود نہیں ہے بلکہ ان کے دعویٰ کے خلاف دلیل موجود ہے۔ اس قسم کے برھان کو فن مناظرہ میں مخالف کی بات کو سند کے ساتھ، ثبوت اور حوالہ سے رَد کرنا، جو دعویٰ بغیر دلیل کے ہو تو وہ اس قابل نہیں کہ اس کی سماعت

کی جائے یا اسے قبول کیا جائے اس پر اعتماد بھی نہیں کیا جا سکتا یہ عقل سلیم کا فیصلہ ہے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میری دلیل تمہارے اس دعویٰ کے خلاف یہ ہے کہ میرے پاس اللہ کی کتابیں ہیں، میں بھی اللہ کا کلام لایا ہوں، مجھ سے پہلے بھی انبیاء اللہ کا کلام لاتے رہے ہیں۔ آسمانی کتب اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہیں، یہ کتابیں نہ فقط تمہارے دعویٰ کو رد کرتی ہیں بلکہ بت پرستی کی سخت مخالف ہیں، قرآن بھی اللہ کی کتابوں سے ایک آسمانی کتاب ہے یہ کتاب بھی باقی آسمانی کتابوں کی طرح الوھیت اور عبادت کو فقط اللہ کی ذات میں منحصر کر رہی ہے، وجوب عبادت فقط اللہ کے لیے ہے اسے یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

آخر میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرکے اس خارجی حقیقت وواقعیت کو بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کی اکثریت حق و باطل کے درمیان تمیز نہیں کرتی، دلیل و منطق اور عقل سلیم کی پیروی نہیں کرتی، جس کے نتیجہ میں حق کے بارے دلیل کو بھی نہیں مانتے اور حق سے روگردانی کرتے ہیں۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵

ترجمہ: اور ہم نے تم سے پہلے ایسا کوئی رسول نہیں بھیجا جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔

اللہ کا اپنی معبودیت کا اعلان

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے سابقہ انبیاء کے پاس جو اللہ کا فرمان آیا اسے بیان کیا ہے اور اس دور کے لوگوں کو بھی بتا دیا ہے کہ وہ اللہ کا فرمان یہ تھا جسے سارے انبیاء اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے کہ اللہ فرما رہا ہے کہ "لا الہ الا انا" کہ مجھ اللہ

کے سوا کوئی معبود نہ ہے۔ یہ دینِ حق ہے، جو توحید پر قائم ہے اور شرک کی ہر جہت سے نفی ہے یہ الٰہی قانون ہے، دینی دعوت کی رُوح اور جان، توحیدِ ربوبی ہے۔ ربوبیت فقط ایک کی ہے اور وہ اللہ ہے، وہی کارساز ہے اور وہی نظام ہستی کو چلا رہا ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، لیکن وہ معزز بندے ہیں۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: بات کرنے میں اس سے پیش قدمی نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم پر کام کرتے ہیں۔

مشرکین کا فرشتوں کو اللہ کی اولاد قرار دینا

اس جگہ مشرکین کی بات کو نقل کیا گیا ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی اولاد ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تقدیس کو بیان کیا کہ ایسی نسبت اللہ کی طرف صحیح نہیں ہے وہ ذات اس سے منزہ ہے کہ کسی کو اپنی اولاد بنائے۔ اس کے بعد اکرام کی صفت سے بات کو ایک منزل بڑھا کر بیان کر دیا کہ جن فرشتوں کے بارے یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں تو معلوم رہے وہ اللہ کے بندگان ہیں، اللہ کی مخلوقات سے ہیں اور عبودیت کی منزل میں کمال کو پہنچے ہوئے ہیں وہ محترم ہیں باوقار ہیں انہوں نے بندگی کی حقیقت کو مجسم کیا ہوا ہے، ان کی بندگی کے آثار سے یہ ہے کہ وہ گفتار میں اللہ کے فرمان پر سبقت نہیں لیتے اور کردار میں یہ ہے کہ جو اللہ کا فرمان ہے اس پر عمل کرتے ہیں ان کا اپنا ارادہ ہی نہیں، وہ خود وہی چاہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو اللہ کی مشیت و ارادہ ہے۔ وہ قول و فعل دونوں میں رب

تعالیٰ کے فرمان کی پیروی میں ہیں، وہ کچھ بھی نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ رضایت رب تعالیٰ ان کا منظور و مقصود ہے۔ بندگی کا کمال بھی یہ ہے کہ بندے کا ارادہ بھی مولا کا مملوک ہو، فرشتوں کا عمل اللہ کے اوامر کے تحت ہے وہاں خود خواہی کا تصور اس لیے نہیں کہ ان میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں، جو بھی ہے عمل کرنا ہے، امر کی پیروی ہے یہی ان کی کرامت اور ان کے لیے شرف ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: وہ جانتا ہے جو ان کے آگے اور جو ان کے پیچھے ہے، اور وہ شفاعت بھی نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جس سے وہ خوش ہو، اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔

فرشتوں کے متعلق خصوصی بیان

مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کے اعمال بارے جو گذشتہ اقوال و اعمال ہیں اور ان کا مستقبل جس طرح کا ہے اس سب کا علم رکھتا ہے اسی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے حالات کے مراقب و متوجہ ہیں۔

لیکن اس کا صحیح تر معنی اس طرح ہے یہ آیت سابقہ کے نزول کی وجہ بیان کر رہی ہے سابقہ بیان میں تھا کہ اللہ نے ان فرشتوں کے لیے قرار دیا ہے کہ وہ مکرم و معزز ہیں اور ان کے وجودی آثار کی تعریف کی ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کی گفتار اور ان کے کردار سے اور وہ اسباب بھی جن کی وجہ سے وہ موجود ہوئے ہیں، اللہ آگاہ ہے اور ان کے منشاء، ان کی اصل کو بھی جانتا ہے اس کے بعد اللہ نے فریا کہ وہ فرشتے ان کے لیے شفاعت کریں گے جو ارتضاء والے ہوں گے یعنی ان کا دین صحیح ہو گا اور اللہ ان سے راضی ہو گا جبکہ مشرکین فرشتوں

کو اپنا شفیع قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے وہ ان فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ فرشتے فقط ان کی شفاعت کریں گے جو توحید پرست ہوں گے، اہل ایمان ہوں گے۔ فرشتوں کو اللہ کے عذاب اور اللہ کی ناراضگی کا خوف ہے، ڈر بھی ہے لیکن وہ خود کو محفوظ ہی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ گناہ نہیں کرتے لیکن جو عصمت ان کے لیے ہے تو اللہ کی قدرت کو محدود نہیں کرتی، ملکیت کی حدود اور مملکت پر اقتدار اور غلبہ اللہ کے پاس ہے بلکہ اللہ تو ہر امر پر اور ہر حال میں قادر ہے۔

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۹﴾

ترجمہ: اور جو کوئی ان میں سے یہ کہے کہ بے شک میں اس کے سوا خدا ہوں تو اس پر ہم اسے جہنم کی سزا دیں گے، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیا کرتے ہیں۔

غیر خدا کی الوھیت کا دعویٰ

بالفرض اگر فرشتوں سے کوئی الوھیت کا دعویٰ کرے گا تو وہ ظالم ہے، اس کی سزا جہنم ہے کیونکہ جہنم ہی ظالموں کے لیے سزا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ قضیہ شرطیہ کا مطلب شرط کا تحقق نہیں ہوتا یعنی اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی فرشتہ ایسا ہے کہ وہ الوھیت کا دعویدار ہے بلکہ یہ فرض کے طور پر بتایا گیا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ایسا کرنے والا ظالم ہوگا اور ظالم کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: کیا منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین جڑے ہوئے تھے پھر ہم نے

انھیں جدا جدا کر دیا، اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا، کیا پھر بھی یقین نہیں کرتے۔

توحید ربوبی اور تدبیر عالَم پر برہان

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیات میں ربوبیت میں توحید کو بیان کیا ہے کہ کائنات کا رب ایک ہے۔ پورے عالَم کی تدبیر ایک ذات کے ہاتھ میں ہے اس سب کا خلاصہ یہ ہے موجودات میں کچھ ایسے ہیں کہ جن کی خلقت تدبیر کے ساتھ ملی ہوئی ہے، ایسے موجودات کو گنوایا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لیا ہے تدبیر خلقت سے جدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ بات حتمی ہے کہ جس کسی نے ان موجودات کو خلق کیا ہے وہی ذات ان سب کی مدبر ہے۔ (الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا) سے مراد اس جگہ بت پرست ہیں جنھوں نے خلقت اور تدبیر کائنات کے درمیان جدائی ڈالی ہے۔ خلقت کی نسبت اللہ کی طرف دی ہے جبکہ تدبیر کی نسبت بتوں کے لیے قرار دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان بت پرستوں کی توجہ ایسے موجودات کی طرف دلائی ہے کہ جن کی خلقت اور ان کی تدبیر میں جدائی نہیں جیسے آسمان اور زمین کی خلقت کہ ان کی خلقت یکدم تھی، اللہ تعالیٰ نے بعد میں انہیں جدا جدا کیا کہ یہ بتا دیا جائے خلقت تدبیر سے جدا نہیں ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے خلقت تو اللہ کے ہاتھ میں ہو اور ان کو الگ کرنا اور پھر ان کی تدبیر دوسرے کے ہاتھ میں ہو؟

ہم مسلسل زمینی اور آسمانی مرکبات کے تجزیہ اور ان کے ایک دوسرے سے جدا جدا ہونے کا مشاہدہ کر رہے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح نباتات کی انواع زمین سے جدا ہوتی ہیں اور حیوانات دوسرے حیوانات سے الگ ہوتے ہیں، زمین ایک ہے لیکن گندم کے دانہ سے گندم، سیب کے دانہ سے سیب، کینو کے دانہ سے کینو، کھجور کی گٹھلی سے کھجور اور کیکر کے بیج سے کیکر اور بیر کے بیج سے بیر کا درخت، اسی طرح زمینی موجودات کو دیکھتے جاؤ کہ وہ

رنگ برنگے ہیں، ھیئت شکل میں مختلف ہیں اپنی افادیت میں مختلف ہیں لیکن سب کا منبع ایک ہے اور وہ زمین ہے۔ اسی طرح آسمان پر نظر کریں کس طرح اجرام فلکی ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنا اثر چھوڑ رہے ہیں مادہ و میٹر کے تمام قوانین پورے عالم پر جاری و ساری ہیں۔ مشاہدات میں یہ ہے کہ جزئیات مرکب زمین سے الگ ہو رہی ہیں اور ترکیبات اور مواد کی شکل میں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ اسی طرح جو مواد فضاء میں ایجاد ہوتے ہیں وہ سب ہماری راہنمائی اس طرح کر رہے ہیں کہ ایک مرحلہ ایسا گذرا ہے کہ یہ سارے موجودات متصل اور ایک دوسرے سے جدا جدا ہونے کے باوجود منظّم اور باہم متصل ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دوسرے سے ممتاز اور علیحدہ علیحدہ کیا ہے۔ ہر ایک کو ایک منظّم اور محکم تدبیر کے تحت مرتب کیا ہے۔ اسی طرح ان گنت موجودات ہر ایک کے باطن سے وجود میں آرہے ہیں کہ ہر ایک ان میں اپنی خصوصیت رکھتے ہیں ان کے آثار اور تاثیرات جدا جدا ہیں۔ یہ مطلب آج کی سائنسی ایجادات کے مطابق ہے اور یہ بات سائنس میں اثبات ہو چکی ہے کہ عالم محسوس (محسوسات کی دُنیا) متعدد اور مشترک عناصر سے ترکیب شدہ ہے جو ایسے عناصر ہیں جن کی عمر محدود اور معین ہوتی ہے۔

"**رتق**" کا لفظ آیت میں آیا ہے، شاید اس سے مراد یہ ہو کہ کچھ بھی آسمان سے زمین پر نہیں آن پڑتا اسی طرح کچھ بھی زمین سے جا کر آسمان سے نہیں ٹکراتا۔ ہم نے آسمان کو کھول دیا اور اس سے پانی برسنا شروع ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں زمین نے اپنا اثر دینا شروع کر دیا، اسی لحاظ سے یہ فرمایا کہ ہم نے ہر چیز کو پانی سے حیات دی ہے۔[1] یہ معنی اس لفظ "**رتق**" سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

---

[1] ۔ جیسا کہ سورۂ نور کی آیت ۴۵ میں ہے : "**وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ**"۔ "اللہ نے ہر رینگنے والے کو پانی سے خلق کیا ہے"۔

اس جگہ لفظ "جعل" "خلق" کے معنی میں ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کی موجودات زندہ میں پوری دخالت ہے، یہ بات آج سائنس میں بھی ثابت ہو چکی ہے کہ جہاں پر پانی ہے وہاں پر حیات کے آثار موجود ہیں اس کے برعکس جہاں پر پانی نہیں وہاں پر حیات کے آثار نہیں۔ سب توحید و ربوبیت پر واضح براہین ہیں جن کو دیکھ کر ہر انصاف پسند عاقل اللہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔[1]

وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ : اور ہم نے زمین میں بھاری پہاڑ رکھ دیے تاکہ انہیں لے کر اِدھر اُدھر نہ جھکنے پائے اور ہم نے اس میں کشادہ راہیں بنا دی ہیں تاکہ وہ راہ پائیں۔

زمین سے استفادہ کا انتظام

زمین ایک متحرک موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو انسانوں کی سکونت و آرام کے لیے قرار دیا ہے اس نے اپنی عطا کردہ نعمت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم نے زمین میں پہاڑوں کی مضبوط اور محکم میخیں گاڑھ دی ہیں تاکہ زمین ہلتی نہ رہے اس پر زندگی گزارنا آسان ہو۔ پھر ان پہاڑوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کھلے راستے اور وادیاں قرار دی ہیں تاکہ لوگ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے راستے موجود پائیں جیسا کہ آج کی سائنس میں یہ بات

---

[1] ۔ بعض مفسرین (رُوح المعانی) نے آسمانوں اور زمین کے رتق کے معنی کے متعلق کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ عدمیت (جب یہ نہ تھے) میں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا نہ تھے تو اس معنی کے اعتبار سے عدم سے جب انہیں وجود عطا کیا گیا تو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا جدا قرار دیا۔ اسی خلقت کے ساتھ ان کا نظم وابستہ ہے نظم خلقت سے جدا نہیں ہیں پس جو ان کا خالق ہے وہی ان کا ناظم اور رب ہے۔

ثابت ہو چکی ہے کہ پہاڑوں کا زمین پر موجود ہونا زمین کو قابل رہائش و سکونت بنانا ہے اور پہاڑ ہی سبب ہیں کہ زمین ہر وقت لرزتی نہیں رہتی۔ اس میں تحرک کے ساتھ اس طرح کا سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کے اوپر کی نازک تہہ مضطرب ہوتی، مسلسل اس میں ارتعاش اور لرزہ رہتا جس سے سکونت مشکل ہو جاتی، خود زمین کی خلقت اور اسے اس طرح قرار دینا ایک اور ثبوت ہے کہ اس کا نظم ایک رب کے ہاتھ میں ہے متعدد ارباب نہیں۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا، اور وہ آسمان کی نشانیوں سے منہ موڑنے والے ہیں۔''

آسمان کو محفوظ بنانے کی بات

سورہ حجر کی آیت ۱۷ کے تناظر میں جس میں کہا گیا ہے کہ ''اور ہم نے آسمان کو دھتکارے ہوئے شیطان سے محفوظ قرار دیا ہے'' اس آیت '' ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت قرار دیا ہے کہ اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا''[1] کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے آسمان کو شیاطین کے شر سے محفوظ قرار دیا ہے۔[2]

---

[1] ۔ بعض مفسرین (رُوح المعانی) نے آسمانوں اور زمین کے رتق کے معنی کے متعلق کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ عدمیت (جب یہ نہ تھے) میں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا نہ تھے تو اس معنی کے اعتبار سے عدم سے جب انہیں وجود عطا کیا گیا تو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا جدا قرار دیا۔ اسی خلقت کے ساتھ ان کا نظم وابستہ ہے نظم خلقت سے جدا نہیں ہیں پس جو ان کا خالق ہے وہی ان کا ناظم اور رب ہے۔

[2] ۔ اس جگہ آسمان کا محفوظ چھت ہونے سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین کو پتھروں اور شہاب اور دوسرے آسمانی اجرام کے نقصان پہنچانے سے محفوظ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ لیکن یہ لوگ ہماری آیات اور نشانیوں سے منہ موڑتے ہیں اور جو فضاء کے حوادث کے باوجود اس سے اثر نہیں لیتے یہ سب اس بات کے ثبوت ہیں کہ مدبر ایک ذات ہے، متعدد رب نہیں، وگرنہ ان حوادث کے وقوع پذیر ہونے میں نظم و ترتیب موجود نہ ہوتی۔ لیکن یہ لوگ اس سب کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بت پرستی پر قائم ہیں جو کہ افسوس ناک ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: ”اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے، سب اپنے اپنے چکر (مدار) میں پھرتے ہیں۔“

اجرام سماوی کا حرکت میں رہنا

تمام فلکی اجرام حرکت میں ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو شب و روز وجود میں نہ آتے (رات جو ہے زمین کے سامنے مخروطی شکل میں آئے اور دن سورج کے مقابل میں آنے سے وجود میں آتا ہے نیز سورج اور چاند میں سے ہر ایک کے لیے فلک کا اثبات ہوا ہے، فلک سے مراد ہر ایک کا مدار ہے جس کے گرد وہ گھومتے ہیں۔ اللہ فرما رہا ہے کہ یہ اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کلمہ (یَّسۡبَحُوۡنَ) اس بات پر دلالت کرتا ہے ان کے لیے حرکت ہے ان کے آثار اور مقاصد تعین نہ ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جیسا کہ یہ اجرام ہوش مند ہیں، طے شدہ سسٹم کے تحت یہ اپنا کام انجام دے رہے ہیں یہ سب تدبیر کی وحدت کا ثبوت ہیں۔

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے نہیں دیا، پھر کیا اگر تو مر گیا تو وہ رہ جائیں گے۔“

مشرکین کے دعویٰ کا جواب

مشرکین کا یہ دعویٰ تھا کہ رسول اللہ ﷺ تو مر جائیں گے اس طرح وہ ان کی دعوت سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے اور ان کے معبود رسول اللہ کے طعنوں سے بچیں گے اور ہمارے معبود نجات پالیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ ہم نے تو کسی اور پیغمبر کو عمر جاودانی نہیں دی۔ اس طرح آپؐ کو بھی موت آئے گی لیکن یہ سارے لوگ بھی مر جائیں گے لیکن تیرے مرنے کا ان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا وہ ہمیشہ نہیں رہیں گے اور نہ ہی اپنی عمر کے دوران امتحان الٰہی سے بچ سکیں گے نہ ہی آخرت میں، نیز اللہ کی قدرت اور سلطنت میں ہوں گے۔ آخر کار انہوں نے اللہ کی طرف واپس پلٹ کر جانا ہے، اللہ تعالیٰ تمام کے اعمال کا حساب چکائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: ”ہر ایک جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے، اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی سے آزمانے کے لیے جانچتے ہیں، اور ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

موت کا حتمی ہونا

(نفس) ہر چیز میں نفس اسی معنی میں لیا جاتا ہے جس کی طرف اس نفس کی نسبت ہوتی ہے، نفس انسان سے مراد خود انسان ہے۔ موت سے مراد دُنیاوی حیات کا نہ ہونا، حیات

کے آثار سے شعور اور ارادہ ہے۔ موت کا تعلق بدن سے ہے رُوح سے نہیں ہے۔ بہر حال ہر نفس کے لیے موت کا امر حتمی اور اٹل ہے اور ہر ایک کی زندگی آزمائش اور امتحان ہے۔ ہم انسان کا فقر و غنی، بیماری و صحت، خوشحالی اور بدحالی سے امتحان لیتے ہیں، یہ معلوم ہے کہ امتحان بطور مقدمہ ہے، اصل ہدف ذی المقدمہ کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ ہر امتحان کے بعد ایک مؤقف ہے کہ اس میں امتحان کا نتیجہ معلوم ہو لہٰذا مقصد حیات جاودانی نہیں ہے۔

جو بھی صاحب حیات ہے اس کے لیے موت ہے۔ واپسی اور بازگشت اللہ کی جانب ہے تاکہ اس واپسی پر ان کا حساب لیا جائے ان کے متعلق انصاف سامنے آئے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ دُنیا مومن کے لیے زندان ہے اور کافر کے لیے بہشت ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے اللہ جب کسی بندے سے پیار کرتا ہے تو اسے مشکل میں ڈال دیتا ہے، اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں نفس سے مراد انسان لیا گیا ہے۔ اس لیے یہ آیت فرشتوں اور حیوانات کو شامل نہیں ہے کیونکہ رُوح ایسے امور سے نہیں کہ وہ موت سے متصف، موت کا معنی ہے حیات کا مفقود ہونا اور فقدان حیات کا معنی شعور اور ارادہ کا ختم ہو جانا ہے۔ بدن سے نفس کی مفارقت یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، یہ ایسے اُمور سے ہے جو موت سے واقع ہوتی ہے لیکن بے ہوشی موت کے علاوہ ہے اگرچہ کسی حد تک موت کی بے ہوشی سے شباہت ہے۔ بے ہوشی میں ہوش آجاتا ہے لیکن موت کے بعد ایسا نہیں ہوتا۔

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: ”اور جہاں تمہیں کافر دیکھتے ہیں تو انہیں تجھ سے سوائے ٹھٹھا کرنے کے اور کوئی کام نہیں، کہ کیا یہی شخص ہے جو (روکنے کے لیے) تمہارے معبودوں کا نام لیتا ہے، اور وہ (کافر خود) رحمان کے نام سے منکر ہیں۔“

رسول اللہؐ کے ساتھ کفار کا رویہ

کافروں کی صورتحال یہ تھی کہ وہ حضور پاک ﷺ کا ٹھٹھہ مذاق اُڑاتے تھے، آپس میں جب بیٹھتے تو یہ کہتے کہ دیکھو اس شخص کو کہ وہ تمہارے معبودوں کے بارے گھٹیا جملے بولتا ہے، ان سب کو بے حیثیت قرار دیتا ہے اور ہمارے خداؤں کی بے حرمتی کرتا ہے اس کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ تحقیر کے ساتھ آپؐ کی طرف اشارے کرتے اور حقارت پر مبنی جملے کستے تھے کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ ان سے کہتے تھے کہ تم ان بتوں کے پرستش کر رہے ہو جو کسی کو نفع و نقصان نہیں دے سکتے۔ مشرکین اپنے معبودوں کی حمایت میں رسول اللہ ﷺ پر غصہ کرتے تھے آپ کی اہانت اور آپ کا مذاق اڑاتے تھے، کلام حق کو نہیں سنتے تھے، تعصب کا رویہ اپناتے تھے ان کو تو چاہیے تھا کہ اللہ رحمٰن کا ذکر کرتے ایسی غیرت اور حمیت اللہ رحمٰن کے بارے دکھاتے نہ کہ بے جان اور بے ضرر نام نہاد بتوں کے بارے جن کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ بعض مفسرین نے اس جگہ ذکر سے مراد قرآن لیا ہے کہ اللہ کے کلام کے وہ انکاری تھے جبکہ ان پر تھا کہ وہ اللہ کے کلام کو تسلیم کرتے اور اس سے دُوری اختیار نہ کرتے۔[1]

خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ''آدمی جلد باز بنایا گیا ہے، میں تمہیں اپنی نشانیاں ابھی دکھاتا ہوں سو جلدی مت کرو۔''

مشرکین کا عذاب مانگنے میں جلدی کرنا

مشرکین فقط رسول اللہ ﷺ کا تمسخر ہی نہیں اڑاتے تھے، قرآن کے انکاری بھی تھے

1۔ تفسیر مجمع البیان، ج ۷، تفسیر کافی، ج ۳۔

، اللہ رحمٰن بھی انہیں یاد نہیں تھا۔ اس تمام نافرمانی پر بڑے ڈھٹائی سے کہتے تھے کہ اگر ہم غلط ہیں اور اللہ نے عذاب دینا ہے تو پھر اس عذاب میں تاخیر کیوں ہے، یہ عذاب جلدی آجائے۔ وہ عذاب کے نہ آنے کو اپنے حق پر ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے جبکہ ان کے پاس اللہ کی آیات اور معجزات آچکے تھے۔ اس پر انہوں نے قناعت نہ کی اور ان سب کو کافی نہ جانا۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت اور مزاج بارے بیان کیا ہے کہ انسان کی خلقت ہی ایسی ہے کہ وہ ہر کام میں جلدی میں ہوتا ہے یعنی انسان بہت ہی جلد باز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پوری بلاغت کے ساتھ اس آیت میں بیان کر دیا انہیں جلدی ہے کہ ان کی خلقت کا تقاضا ہے لیکن ہم جلدی نہیں کریں گے ان کے پاس گریز کا کوئی راستہ نہیں ہے ہم جب چاہیں انہیں عذاب دے سکتے ہیں، یہ سب ہماری قدرت میں ہے اگر اس دُنیا میں تباہ کن عذاب میں مبتلاء نہ ہوئے تو آخرت کا عذاب تو ان کے انتظار میں موجود ہے جس سے وہ فرار نہ کر سکیں گے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

ترجمہ: ”اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو۔“

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ: ”کاش! یہ منکر اس وقت کو جان لیں کہ اپنے مونہوں اور اپنی پیٹھوں سے آگ کو روک نہیں سکیں گے اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے۔“

بَلۡ تَاۡتِیۡهِمۡ بَغۡتَةً فَتَبۡهَتُهُمۡ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ رَدَّهَا وَ لَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: ''بلکہ وہ ان پر ناگہان آئے گی پھر وہ ان کے ہوش کھو دے گی پھر نہ اسے ٹال سکیں گے اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔''

عذاب کا اچانک آجانا

کافروں کو دھمکایا گیا ہے اور انہیں لفظ کاش سے متوجہ کیا ہے کہ کاش ان کافروں کو اس وقت کا علم ہو جاتا کہ جب آتش جہنم ہر طرف سے انہیں گھیر لے گی اور وہ اس آگ سے فرار نہ کر سکیں گے اور یہ جہنم کی آگ اچانک ان پر آن پڑے گی۔ ایسی جگہ سے آئے گی کہ ان کو علم بھی نہ ہو گا۔ اس وقت یہ حیرت زدہ اور مبہوت ہوں گے اور آگ نے انہیں گھیر رکھا ہو گا، آگ کے شعلے بلند ہوں گے، ان کے ظاہر و باطن کو جلائے گی۔ اس طرح کہ نہ تو اسے اپنے سے دُور کر سکیں گے اور نہ ہی اس آگ کے آنے سے پہلے کسی قسم کی مہلت انہیں ملے گی، اس وقت سوائے حیرت و حسرت کے ان کے لیے کوئی چارہ نہ ہو گا۔

اللہ کی پکڑ

۲۱ مارچ ۲۰۲۰ء ہے، کئی ماہ سے کورونا کی وباء آئی ہوئی ہے اس وقت پوری دُنیا (۱۷۵ ممالک) میں لاک ڈاؤن ہو چکا ہے، سب پر موت کا خوف ہے۔ عبادت گاہیں، کھیل کے میدان، مئے کدے، سرکاری دفاتر، اسمبلیاں، چھوٹے بڑے سب ادارے بند ہیں۔ ایسی بیماری ہے کہ جس کا علاج نہیں ہے۔ انسان سوچ رہا تھا کہ وہ ۲۰۲۲ء تک موت کا توڑ ڈھونڈ لائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو ایک ایسے وائرس میں مبتلاء کر دیا ہے کہ اس سے بچنے کا راستہ انہیں نہیں مل رہا۔ یہ اللہ کا دُنیاوی عذاب ہے اچانک چین کے شہر ووھان سے شروع ہوا

ہے اس نے اب پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ہر آنے والا دن مزید خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ کعبۃ اللہ خالی، حرمین مقدس خالی، نماز ھائی جمعہ کے اجتماعات محدود، شادی بیاہ کی محفلیں ختم، ایک دوسرے سے ملنا ملانا ختم، عجیب وحشت ہے، بس اللہ سے رحم کی اپیل ہے اور یہ کہ اللہ اپنے ولی صاحب العصر (عج) کے ظہور میں تعجیل فرما دے اور اس دھرتی کو امن کا گہوارہ بنا دے، خوف کے بعد امن آئے گا جب اس دھرتی کو زہرا سلام اللہ علیہا کے فرزند نور العین کا ظہور پرنور ہو گا۔ اللھم عجّل لولیك الفرج والتائید والنصر (جامعۃ سیدہ خدیجۃ الکبریٰؑ، پکی شاہ مردان میانوالی، ۲۱ مارچ ۲۰۲۰)

آج 8 اپریل 2021ء ہے کورونا کی وباء نے شدت اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں اسے کورونا کی تیسری لہر کہا جا رہا ہے اور یہ پہلی دو لہروں سے زیادہ شدید ہے اور اس وباء کے لیے ویکسین ایجاد ہو چکی ہے لیکن وہ کارگر اور مؤثر نہیں ہے۔ ویکسین کے استعمال کے بعد بھی ہلاکت کے واقعات ہو رہے ہیں یہ سب الہیٰ عذاب کی ایک جھلک ہے تاکہ انسان بیدار ہو اور اپنے رب کی طرف رجوع کرے وہی رب ہی ہے جو رحمٰن ہے، اپنے بندوں سے اس وباء کو ٹال سکتا ہے اور اس کے لیے دوائی کا انتظام بھی کر سکتا ہے اور بنائی ہوئی ویکسین کو تاثیر بھی وہی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنا کرم اپنی مخلوق پر کر دے اور اپنے آخری نمائندہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے لیے حالات بنا دے کہ وہ اس روئے زمین پر آکر اللہ کا نظام نافذ کر دیں اور ہر جگہ اَمن قائم ہو، ظلم کا خاتمہ ہو اور پوری دنیا میں اَمن و سکون ہو "اللھم عجّل لولیك الفرج"۔[1]

---

[1] ۔ (اردو مترجم۔ شہزاد ٹاؤن اسلام آباد)۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤١﴾

ترجمہ: ''اور تجھ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ٹھٹھا کیا گیا ہے پھر جس عذاب کی بابت وہ ہنسی کیا کرتے تھے ان ٹھٹھا کرنے والوں پر وہی آ پڑا۔''

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٤٢﴾

ترجمہ: ''کہہ دو تمہاری رات اور دن میں رحمان (کی پکڑ) سے کون نگہبانی کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑنے والے ہیں۔''

اللہ کے عذاب سے بچاؤ

اس آیت میں رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے ان کافروں سے ذرا یہ سوال تو کرلیں کہ یہ بتائیں اگر اللہ کی طرف سے عذاب آجائے تو پھر دن اور رات میں کون ہے جو تمہیں اس عذاب سے بچائے گا۔ یہ بات کافروں کو متوجہ اور جگانے کے لیے ہے کیونکہ سب کا ضمیر تو یہ گواہی دے گا کہ اللہ کا عذاب آجائے تو پھر کوئی بچانے والا نہیں ہے جس کے لیے ماضی کی مثالیں ان کے سامنے تھیں، یہ ایک طرح سے خبردار کیا گیا کہ وہ دعوتِ حق کا انکار نہ کریں، لیکن اس بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے کافروں کی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگ خبردار کرنے کے باوجود اثر نہیں لیتے اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں۔ موعظہ اور نصیحت ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور دعوتِ حق سے رُخ موڑ لیتے ہیں۔ (مجمع البیان، ج ۷)

أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُونِنَا ۚ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُونَ ﴿٤٣﴾

ترجمہ: ''کیا ہم سے ان کے معبود انہیں بچائے رکھتے ہیں، وہ تو خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ہمارے مقابلہ میں ان کا کوئی ساتھ دے گا۔''

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

(اَم) نحوی اصطلاح میں منقطعہ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس ایسے معبود اور الہٰ موجود نہیں ہیں جو انہیں ہمارے عذاب سے بچا سکیں کیونکہ یہ لوگ جن کی پرستش کرتے ہیں وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں چہ جائیکہ وہ ان کی مدد کریں جو ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ ان کی ہماری طرف سے بھی کوئی مساعدت اور مدد نہیں، اللہ مشرکین اور ان بندگان کی کیسے مدد کر سکتا ہے جو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''بتحقیق اللہ ان کو معاف نہیں کرتا جو شرک کرتے ہیں یعنی مشرکین کے لیے اللہ کی جانب سے معافی نہیں ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هَٰؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۗ أَفَلَا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۚ أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾

ترجمہ: ''بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامان دیا یہاں تک کہ ان پر ایک عرصہ دراز گزر گیا، کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ بے شک ہم زمین کو ہر طرف سے گھٹاتے چلے جاتے ہیں، سو کیا یہ لوگ غالب آنے والے ہیں؟''

اللہ کا انعام

اس آیت میں اللہ نے اپنی نعمات کا حوالہ دیا ہے کہ ہم نے ان مشرکین اور ان کے آباء کو زندگی کی نعمت سے بہرہ ور کیا، ہماری عطا کردہ نعمات سے انہیں لمبی لمبی عمریں نصیب ہوئیں لیکن یہ لوگ مغرور ہو گئے اوراپنے رب کو بھلا دیا اور اللہ کی عبادت سے روگردانی کرلی۔ قریش قبیلہ کی سوسائٹی ایسی ہی تھی کہ اللہ نے انہیں بہت ساری نعمات سے نوازا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد ان کے رشتہ داروں اور ان کی اولاد نے مکہ میں سکونت اختیار کرلی ان کے ہاتھوں میں قسم قسم کی نعمات آئیں، جن سے وہ بہرہ ور ہوئے لیکن یہ لوگ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے دین کو بھول گئے اور بت پرست بن گئے جبکہ یہ سب کچھ ان کو معلوم ہے تو کیا انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم ہی تو ہیں جو اس زمین کے اطراف واکناف میں کمی کرتے رہتے ہیں، آبادیاں ہوتی ہیں پھر وہ بالکل ختم ہو جاتی ہیں، زمین پر کئی اقوام ساکن تھیں جو بعد میں بالکل ہی ختم ہو گئیں۔ اس طرح زمین پر بسنے والوں کی تعداد کم ہو گئی، پس لوگ اس کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے اگر اللہ ان کی ہلاکت اور تباہی کا فیصلہ کرلے تو کون انہیں بچا سکتا ہے؟ یہ لوگ بالکل اس کے فیصلہ کو روک نہیں سکتے۔ امر خدا کو ہی غلبہ ہے ان کی بات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَ لَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: ”کہہ دو کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تمہیں ڈراتا ہوں، اور یہ بہرے جس وقت ڈرائے جاتے ہیں سنتے ہی نہیں۔“

اللہ کا خبر دار کرنے کا انتظام

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خطرات سے خبر دار کرتا ہے۔ اللہ فرمارہا ہے تمہیں جو کچھ بتایا جاتا ہے اور جن خطرات سے خبر دار کیا جاتا ہے اور عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ سب ہماری طرف سے وحی ہے۔ لیکن تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اس کا کچھ اثر نہیں لیتے ہو جس طرح ایک بہرا شخص اس پر جو کچھ بولا جائے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا ہوتا تو وہ اثر کیا لے گا؟ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم سب کچھ سنتے ہو اور جاننے کے بعد اس کا اثر نہیں لیتے ہو۔ یہ کمزوری تمہاری طرف سے ہے، قرآن سے نہیں۔ لہٰذا اس کا انجام بھی تمہیں بھگتنا ہوگا۔

وَ لَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَیَقُوْلُنَّ یٰوَیْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: ''اور البتہ اگر انہیں تیرے رب کے عذاب کا ایک جھونکا بھی لگ جائے تو ضرور کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی بے شک ہم ظالم تھے۔''

عذاب کو دیکھنے کے بعد کفار کا اظہار

کافروں نے اللہ کی طرف سے خبر دار کے عمل کو غیر معمولی نہ جانا، اس پر کچھ اثر نہ لیا اور سب بیانات کو ٹھکرا دیا لیکن جب قیامت کے دن ان پر عذاب آئے گا اور یہ اپنی آنکھوں سے عذاب کے منظر کا مشاہدہ کریں گے تو اس وقت یہ چیخ چیخ کر کہیں گے کہ ہم ہی ظالم تھے، ہم نے انذار پر کان نہ دھرا اور دعوتِ حق کو رَد کر دیا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْــٴًـاؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَاؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِیْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: ''اور قیامت کے دن ہم انصاف کی ترازو قائم کریں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی عمل ہو گا تو اسے بھی ہم لے آئیں گے، اور ہم ہی حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔''

قیامت کے دن اعمال کا حساب لیا جانا

قیامت کے دن مخلوقات کے لیے میزان نصب ہوں گے جن میں ان کے تمام اعمال کا پورا پورا جائزہ لیا جائے گا کسی پر کوئی ظلم وستم نہ ہو گا ہر عمل چھوٹا ہو یا بڑا ہو اگرچہ رائی کے دانہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو چھوٹے سے چھوٹے عمل کا حساب ہو گا سب کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا۔ اللہ ہی اپنے بندگان کے احتساب کے لیے کافی ہے کیونکہ اس نے چھوٹے بڑے کسی عمل کو چھوڑا نہیں ہے ان کے سب اعمال کو شمار کیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٨﴾

ترجمہ: ''اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ کرنے والی اور روشنی دینے والی اور پرہیزگاروں کو نصیحت کرنے والی کتاب دی تھی۔''

کتاب توریت کا وصف

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرقان دیا، یہ فرقان اور ذکر کے اوصاف توریت کے لیے بیان کیے ہیں۔ توریت فرقان تھی یعنی حق و باطل کو جدا کرنے والی کتاب تھی، توریت نور تھی جو جہالت کی تاریکی، کفر و باطل کے اندھیرے اپنے نور سے ختم کرتی تھی۔ اس کی نورانی تعلیمات جہالت کی ظلمت کو ختم کرنے کا سبب تھی۔

تیسری صفت یہ کہ توریت ذکر تھی، یادآوری کا ذریعہ تھی، لوگوں کو اللہ کی یاد

دلاتی، معاد یاد دلاتی، موت کو یاد دلاتی تھی۔

اس کتاب میں مواعظ اور نصائح تھے جو اھل تقویٰ کے لیے فائدہ دیتے تھے اس کتاب میں حکیمانہ باتیں تھیں اور عقل و خرد والوں کے لیے اس میں عبرتیں موجود تھیں۔ لیکن اس ذکر سے اھل تقویٰ ہی کو فائدہ ہوا جو منکرین اور کافر ہوئے انہیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿٤٩﴾

ترجمہ: ''جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور قیامت کا بھی خوف رکھنے والے ہیں۔''

اہل تقویٰ کا وصف

اس آیت میں اہل تقویٰ کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ اہل تقویٰ وہ ہیں جو اپنے پروردگار کے مقام سے خوف میں رہتے ہیں اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں اللہ کی رضایت کے لیے کوشاں رہتے ہیں، عذاب دیکھے بغیر عذاب الٰہی سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کو غیب پر پختہ ایمان ہے۔ اللہ نے انہیں جو کچھ غیب کے بارے بیان کیا ہے وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں، وہ آخرت سے ڈرتے ہیں، قیامت کا خیال انہیں لرزاں کر دیتا ہے وہ غضب الٰہی سے ہراساں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ امور جو نفسانی خواہشات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اس سے دُور رہتے ہیں اللہ کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿٥٠﴾ ع

ترجمہ: ''اور یہ ایک مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، پھر کیا تم اس کے بھی منکر ہو۔''

قرآن کے بارے بیان

اس آیت میں قرآن کو مبارک کے وصف سے یاد کیا گیا ہے، قرآن اس لیے مبارک ہے کہ وہ ثابت و دائم ہے اور بابرکت ہے اس سے مومن بھی بہرہ ور ہوتے ہیں اوراس کی آسائش سے منکرین بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ کافروں کے لیے سوسائٹی میں آرام وسکون کا ضامن ہے، اس مطلب پر دلیل ہے کہ اس وقت انسان نے جو مادی ترقی کی ہے یہ قرآن سے استفادہ کی برکات ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام نے بھی اپنی وصیت میں قرآن سے استفادہ اغیار کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن پر عمل کرنا، ایسانہ ہو کہ قرآن پر اغیار عمل کریں اور وہ تم سے آگے بڑھ جائیں۔

یہ قرآن کی عمومی برکات عطا کرنے کی دلیل ہے اب انسان اپنی زبان سے اس کا اقرار کرے یا اس کا انکار کرے۔

رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن فرمائیں گے :

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ (سورۂ فرقان، آیت: ۳۰)

ترجمہ: ''اور رسول کہے گا اے میرے رب بے شک میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا۔''

حالانکہ بعض کافروں نے قرآنی حقائق اور انسانی معاشرہ کے آداب کو قرآن ہی سے لیا ہے، سائنسدان بھی اس کے معترف ہیں اور کچھ جانتے ہوئے بھی انکاری ہیں تاکہ مسلمانوں کو تقویت نہ ملے۔ یہ سب قرآن کے بابرکت ہونے کا ثبوت ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے پہلے ہی سے ابراہیم کو اس کی صلاحیت عطا کی تھی اور ہم اس

سے واقف تھے۔"

ابراہیمؑ کے لیے خصوصی انعام

رشد کا معنی ہے واقعیت و حقیقت تک رسائی پا لینا، خیر و شر کی اصلیت سے واقف ہو جانا۔ ابراہیم علیہ السلام کی جو فطری ہدایت موجود تھی تو یہ توحید اور دیگر معارف حقہ کی وجہ سے تھی، اللہ تعالیٰ اسی مطلب کو بیان کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ ہم نے حضرت موسیٰؑ پر توریت نازل کی اور ابراہیم علیہ السلام کو وہ رشد اور ہدایت عطا کر دی جس کے وہ لائق ہیں اور ہم اسے جانتے تھے اس کے حالات، اس کی صلاحیتوں اور اس مقدار کا ہمیں علم تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان سے پتہ چلتا ہے کہ عقائد حقہ تنہا فطرت سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں اگرچہ اس میں رسالت اور اللہ کی طرف سے خصوصی پیغام نہ بھی ہو کیونکہ عقل خالق کی وحدانیت اور کائنات کے بارے اللہ کی ربوبیت کا ادراک کر سکتی ہے۔ کتاب آنے سے پہلے ہی ابراہیم کے لیے فطرت مددگار تھی کہ وہ توحید پرست تھے اور عقل کے ساتھ ان کے پاس رشد موجود تھا اور یہ رشادت (خیر و شر، اچھے اور برے کی شناخت) میں تھی کہ وہ بچپن ہی سے بتوں سے بیزار تھے اور بت شکن بن گئے اور پھر اسی فطرتی تقاضا کے تحت ہی بت پرستوں کو متوجہ کیا کہ یہ بے جان بت جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے جو خود کو نفع و نقصان نہیں دے سکتے وہ تمھیں کیا دیں گے؟

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: "جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیسی مورتیں ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو۔"

ابراہیمؑ کا اپنی قوم کو ہدایت دینا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی مخفی پناہ گاہ سے جہاں پر وہ موجود تھے اور ان کی والدہ نے انہیں لوگوں کے شر سے محفوظ جگہ پر رکھا ہوا تھا وہ اس جگہ سے باہر آتے ہیں اور پہلی مرتبہ معاشرہ میں آتے ہیں اور اپنی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ بتوں اور مجسموں کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور ان بتوں کے سامنے قربانی بھی دے رہے ہیں۔ اسی طرح سے ان کی پرستش کرتے ہیں، ان کی تکریم و تعظیم کرتے ہیں لہٰذا انہیں اس حالت میں دیکھ کر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ فوت ہو چکے تھے ،آزر ان کے چچا تھے وہ انہیں باپ کہہ کر پکارتے تھے اس لیے ان سے ہی کہا کہ بابا تم کیا دیکھ رہے ہو کہ ان بتوں کے آگے جھکتے ہو اور ان کی پوجا پاٹ کرتے ہو۔ اس حالت سے ابراہیم علیہ السلام کو حیرت ہوئی تھی اور یہ سوال ان کی فطرت کا تقاضا تھا کہ یہ عمل اُن کی فطرت کے خلاف تھا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ”انھوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہیں کی پوجا کرتے پایا ہے۔“

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: ”کہا البتہ تحقیق تم اور تمہارے باپ دادا صریح گمراہی میں رہے ہو۔“

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

ترجمہ: ”انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس سچی بات لایا ہے یا توں دل لگی کرتا ہے۔“

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: ''کہا بلکہ تمہارا رب تو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے انہیں بنایا ہے، اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔''

ابراہیمؑ کا اللہ کی ربوبیت کا اعلان

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کا مکالمہ ان بت پرستوں سے ہے، ابراہیم علیہ السلام ان سے مخاطب ہوئے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو، بے جان بتوں کے سامنے جھکتے ہو، ایسا کیوں ہے؟

بت پرست: ہم نے تو اپنے آباء کو ایسا دیکھا ہے ان کی سنت پر عمل کر رہے ہیں یہ ہماری قومی روایت ہے۔

ابراہیمؑ: تم خود بھی غلطی پر ہو اور تمہارے آباء بھی کھلی گمراہی پر تھے۔

بت پرست: ابراہیمؑ تم جو بات کر رہے ہو تو کیا یہ سچ کہہ رہے ہو؟ تم کوئی اللہ کی طرف سے بیان لائے ہو یا ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟ تم نے یہ کھیل تیار کیا کہ ہمارے اوپر اور ہمارے آباء پر اس طرح حملہ آور ہو۔

ابراہیمؑ: نہیں میں جو کہہ رہا ہوں یہ حق بات ہے اور تم پر واضح رہے کہ یہ بت تمہارے رب نہیں، ربوبیت اس کے لیے جو سارے آسمانوں اور زمین کو وجود دینے والا ہے، جس نے خلق کیا وہی اس سارے نظام کو چلانے والا اور اسے نظم دینے والا ہے۔ وہی سب کا رب ہے، اللہ جو خالق ہے اس کے سوا کوئی اور معبود، مدبر اور مدیر موجود نہیں ہے اور میں اللہ کی الوھیت، ربوبیت اور وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے

اس واضح بیان سے انہیں سمجھا دیا کہ وہ جو بات کر رہے ہیں وہ مذاق نہیں ہے مگر حقیقت پر مبنی بات ہے۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾

ترجمہ: ”اور اللہ کی قسم! میں تمہارے بتوں کا علاج کروں گا جب تم پیٹھ پھیر کر جا چکے ہو گے۔“

بت پرستوں کو ابراہیمؑ کی دھمکی

واضح مکالمہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بت پرستوں کو کہا کہ جب تم ان بت کدوں سے چلے جاؤ گے تو میں ان بتوں کے بارے کوئی تدبیر یا دیگر کسی طریقہ سے ان کا انتظام کرتا ہوں، یہ اس طرف اشارہ تھا کہ میں ان کا تیا پائنچا کر دوں گا۔ اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کبھی کبھی شہر سے باہر جاتے تھے عید کے دن یا کسی میلہ کے لیے اور شہر کو خالی کر جاتے تھے کیونکہ اسی صورت میں ہی ابراہیم علیہ السلام اس بت خانہ میں موجود پتھر اور لکڑیوں کے بتوں کے بارے اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے البتہ یہ بات دُور کی لگتی ہے کہ یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اس پوری قوم سے کہی ہو کیونکہ وہ طاقتور اور معزز قوم تھی اور بتوں کے بارے تعصب کا شکار بھی تھے۔ اگر سب سے یہ بات کی ہوتی تو پھر وہ اس کا تدراک کرنے کی بھی کوشش کرتے، لگتا ہے کہ یا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چند لڑکوں سے یہ کہا ہو گا یا اپنے چچا کو بتایا ہو گا البتہ جو پہلا مکالمہ ہے وہ کھلے عام ہوا۔ اس بارے سب کو پتہ چلا یا جو ان کے بڑے تھے ان کے سامنے ہوا اور اُنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوالوں کا جواب بھی دیا اور ابراہیمؑ نے انہیں حقیقت سے آگاہ کیا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٨﴾

ترجمہ: ''پھر ان کے بڑے کے سوا سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تاکہ اس کی طرف رجوع کریں۔''

ابراہیمؑ کا بتوں کو توڑنا

حضرت ابراہیم علیہ السلام موقع کی تلاش میں تھے، ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ موقع ملا وہ ان کی عید کا دن تھا جس میں سب لوگ شہر سے باہر چلے جاتے تھے کوئی ایک بھی شہر میں نہ بچتا تھا، ابراہیمؑ نے بہانہ بنایا کہ میری طبیعت کچھ بہتر نہ ہے میں تمہارے ساتھ آج باہر نہیں جاؤں گا کیونکہ بت پرستی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت ہی پریشان کر رکھا تھا اور آپ کے دل پر بہت بوجھ تھا، اس بات کو آپ نے اپنی بیماری سے تعبیر کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہتھوڑا ہاتھ میں لیا اور بت خانہ میں داخل ہوئے اور سب بتوں کا تیا پانچا کر دیا، ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور پھر اس بڑے بت کے کاندھے پر ہتھوڑا کو رکھ دیا۔ بڑے بت کو چھوڑنے کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ واپس آئیں گے اور شور مچائیں گے کہ یہ سب کس نے کیا ہے تو ان سے کہا جائے گا کہ یہ کام اس بڑے بت کا ہے جس کے کاندھے پر ہتھوڑا بھی موجود ہے تو اس طرح ان کی فطرت کو جگانا مقصود تھا کہ وہ اپنی اس مشرکانہ طرز سے واپس اپنی فطرت کی طرف پلٹ آئیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے ''الیہ'' کا اشارہ اللہ کی طرف کیا ہے کہ شاید اس طرح کے عمل سے وہ لوگ اللہ کی طرف واپس پلٹ جائیں اور ان کی فطرت جاگ جائے لیکن پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔ (روح المعانی، ج ۱۴)

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

ترجمہ: ''انہوں نے کہا ہمارے معبودوں کے ساتھ کس نے یہ کیا ہے، بے شک وہ

ظالموں میں سے ہے۔"

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾

ترجمہ: "انہوں نے کہا ہم نے سنا ہے کہ ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے اسے ابراہیم کہتے ہیں۔"

بت پرستوں کا ردعمل

جب وہ لوگ شہر واپس آتے ہیں تو اُنہوں نے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے دیکھے اور آپس میں کہنے لگے یہ سب کس نے کیا ہے؟ جس نے بھی ان بتوں کو توڑا ہے وہ ظالم ہے، اس نے زیادتی کی ہے۔ جب یہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے تو ان میں کچھ نے یہ کہا کہ ایک لڑکا ہے کہ جسے ابراہیم کہا جاتا ہے وہ ان بتوں کو برا کہتا ہے، شاید یہ اس کا عمل ہے۔ وہ ابراہیمؑ کے اس عمل کو اپنے مقدسات کی اہانت قرار دیتے ہیں اور جس نے یہ کام کیا ہے ان کے نزدیک وہ بڑا مجرم ہے، پہلے تو اسے تلاش کرنا ہے اور پھر اسے سزا دینی ہے۔

ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کے بارے جو گفتگو ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی کہ میں ان کے بارے کوئی تدبیر کرتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات سب کے سامنے نہ تھی بلکہ اس بات کو کچھ لوگوں نے سنا تھا اسلیے انہوں نے کہا کہ ابراہیم نامی نوجوان ہے، وہ بتوں کی برائی کرتا ہے یہ کام اسی کا ہوگا۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾

ترجمہ: "کہنے لگے اسے لوگوں کے سامنے لے آؤ تاکہ وہ دیکھیں۔"

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: "کہنے لگے اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کیا ہے۔"

قَالَ بَلۡ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيۡرُهُمۡ هٰذَا فَسۡـَٔلُوۡهُمۡ اِنۡ كَانُوۡا يَنۡطِقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

ترجمہ : ''کہا بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ کیا ہے سو ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں۔''

فَرَجَعُوۡۤا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّكُمۡ اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ : ''پھر وہ اپنے دل میں سوچ کر کہنے لگے بے شک تم ہی بے انصاف ہو۔''

ابراہیمؑ کی گرفتاری اور ان سے باز پرس

بت پرست اکٹھے ہوتے ہیں، اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ :

- ابراہیم کو گرفتار کرکے اس مجمع میں لایا جائے۔
- اجتماع بت خانہ ہی کے پاس تھا۔
- مجمع میں لانے کا مقصد تھا کہ ان کے خلاف کچھ گواہی دیں کہ یہی نوجوان ہے جو ان بتوں کے خلاف باتیں کرتا تھا۔
- حضرت ابراہیمؑ کو مجمع میں لایا گیا ان سے سوال کیا گیا۔
- او لڑکے کیا یہ سب تم نے کیا ہے، یہ تمہاری کارستانی ہے کہ ہمارے معبودوں کو تو نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے؟
- جن لوگوں نے ابراہیمؑ کے بارے گواہی دے دی کہ یہ وہ ہے جو بتوں کو بُرا کہتا ہے، وہ چاہ رہے تھے کہ ابراہیمؑ اپنے جرم کا اعتراف کرے اور اسے سزا دی جائے۔
- ایک جرم ہو چکا تھا، اس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کے عامل کا سوال تھا، اس لیے ابراہیمؑ سے یہ کہا کہ یہ تمہاری کارستانی ہی تو ہے۔ ان کو معلوم

تھا کہ ابراہیمؑ ان کے بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔

- ابراہیمؑ نے دشمن کو لاجواب کرنے اور ان کے بتوں کی الوھیت اور معبودیت کے بطلان کو بھی بیان کرنے کے لیے فوراً کہا کہ تم اس بڑے بت سے سوال کرو یہ اسی کا کام ہے۔ یہ ایک مفروضہ کے طور پر کہا گیا اور انہیں لاجواب کرنے کے لیے تھا کیونکہ یہ سن کر انہوں نے کہنا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو ایسا کام کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اگر یہ بات کر سکتا ہے تو اس سے پوچھ لو کہ کس نے ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، وہ تمہارا جواب دے تاکہ اس طرح وہاں پر موجود لوگ خود اس کا اعتراف کریں کہ یہ بت تو نہیں بول سکتا۔
- ابراہیم کی گفتگو سے ان بت پرستوں پر حجت تمام ہو گئی ان میں سے ہر ایک نے اس بات کی گواہی دی کہ یہ بت بے جان اجسام ہیں ان میں تو کسی کام کو کرنے کی قدرت نہیں ہے ان میں تو بات کرنے کی طاقت بھی موجود نہیں۔ اس طرح سب نے اپنے آپ ہی دل ہی دل میں یہ اعتراف کر لیا کہ وہ لوگ غلطی پر ہیں اور خود ہی اپنے لیے فیصلہ دیا کہ وہ ستمگر ہیں۔ آپس میں دل ہی دل میں کہا کہ تم کس قدر ظالم ہو کہ ان بے شعور جمادات کی پرستش کر رہے ہو۔

ثُمَّ نُكِسُوا عَلٰى رُءُوسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾

ترجمہ: "پھر انہوں نے سر نیچا کر کے کہا تو جانتا ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے۔"

بت پرستوں کی ہٹ دھرمی

اُنہوں نے حق جسے سمجھ چکے تھے اس کی جگہ اپنے باطل کو قرار دیا اور الٹی منطق کے تحت کہا اے ابراہیمؑ تم کو تو معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی تم ہم سے

کہہ رہے ہو کہ ہم ان سے پوچھ لیں کہ کس نے ایسا کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس جرم کا ارتکاب تم نے ہی کیا ہے لہٰذا تیرا دفاع قبول نہیں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یَضُرُّكُمْ ۟ؕ﴿۶۶﴾

ترجمہ: ''کہا پھر کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی پوجا کرتے ہو جو نہ تمہیں نفع دے سکے اور نہ نقصان پہنچا سکے۔''

اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: ''میں تم سے اور اللہ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو بیزار ہوں، پھر کیا تمہیں عقل نہیں ہے۔''

بت پرستوں کو ابراہیمؑ کی دعوت

ابراہیمؑ نے جب ان کی زبانوں سے یہ اعتراف کروالیا کہ یہ سب بول نہیں سکتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بجائے اس کے کہ وہ اپنا دفاع کرتے انہیں حق کی دعوت دیتے ہوئے ان سے کہتے ہیں جب ایسا ہے کہ وہ بولنے پر قادر نہیں، کسی کو فائدہ دے نہیں سکتے نہ ہی نقصان، تو پھر تم ان کی پرستش کس وجہ سے کرتے ہو؟ خود معترف ہو کہ یہ بے جان جمادات ہیں، ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو ان کے اعتراف کا لازمہ ہے۔ اس طرح ابراہیم علیہ السلام نے انہیں متوجہ کیا ایسے جمادات جن سے کچھ فائدہ اور نقصان نہیں تو پھر ان کی عبادت کس لیے کرتے ہو۔ یہ تمہارا عمل بے ہودہ اور لغو ہے۔ پھر آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے رویہ اور عمل سے بیزاری کا اظہار کیا، افسوس ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم پرستش کر رہے ہو۔ میں تمہاری اس رونق اور ان بتوں سے جن کی تم پرستش کرتے ہو بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾

ترجمہ: ”انہوں نے کہا اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔“

ابراہیمؑ کو سزا دینے کا فیصلہ

اس مکالمہ کے بعد جب ابراہیمؑ کی منطق کے سامنے وہ لاجواب ہو گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں مغلوب کر دیا۔ ان کے بتوں کو آپ نے توڑا تھا، آپ نے اس حوالے سے اپنا کچھ دفاع نہ کیا۔ اس طرح انہوں نے اس کے جرم کو ثابت قرار دیا، لوگوں کے دینی جذبات بھڑکانے، عوامی احساسات اُبھارنے اور ان کی غیرت دینی کو جگانے کے لیے یہ اعلان کیا کہ اگر تم لوگ عمل کرنے والے ہو، گفتگو کے دھنی نہیں بلکہ عمل بھی کرنے والے ہو تو پھر اپنے ان خداؤں کی مدد کرو اور اس لڑکے نے جو بڑا جرم کیا ہے اسے سزا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اسے آگ میں جلا دو۔ تمام دنیا میں جابروں اور وڈیروں کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ جب دلیل و منطق سے کچھ ثابت نہیں کر سکتے تو پھر دھونس و دھاندلی اور جبر کرتے ہیں، سختی کرتے ہیں اور ابراہیم کو آگ میں پھینکنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اس اجتماع میں ہر طرف سے آوازیں بھی آنے لگیں کہ اسے جلا دو! جلا دو!۔ اس کے بعد ابراہیمؑ کو آگ میں جلانے کا ذکر ہے۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾

ترجمہ: ”ہم نے کہا اے آگ! ابراہیم پر سرد اور راحت ہو جا۔“

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾

ترجمہ: ”اور انہوں نے اس کی برائی چاہی سو ہم نے انہیں ناکام کر دیا۔“

ابراہیمؑ کی حفاظت کا انتظام

بت پرستوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا فیصلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو بچانے کا فیصلہ کیا، اللہ نے انہیں خسارہ میں ڈالا اور اللہ کی تدبیر ہی غالب آئی۔ اُنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا۔ اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم سے آگ کی جلانے کی تاثیر ختم ہو گئی کیونکہ ہر سبب کی تاثیر اللہ نے رکھی ہے، اللہ کی مشیت سے تاثیر باقی رہتی ہے جب اللہ چاہے اس سبب کی تاثیر کو ختم کر دیتا ہے اسی طرح آگ کی جلانے کی تاثیر ختم ہو گئی بلکہ اس کی ٹھنڈک اتنی نہ ہوئی کہ حیات کے لیے نقصان دہ ہو، اس لیے یہ کہا کہ ٹھنڈ ایسی جو سلامتی کا سبب ہو۔[1] آگ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گلستان ہو جانا یہ ایک اور دلیل تھی جو بت پرستوں کے خلاف جاتی تھی اور جو کچھ ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا وہ برحق تھا۔ اس طرح ابراہیمؑ کو اللہ نے بت پرستوں پر غلبہ دیا اور وہ بہت زیادہ خسارہ میں آگئے۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾

ترجمہ: ''اور ہم اسے اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف لے آئے جس میں ہم نے جہان کے لیے برکت رکھی ہے۔''

---

[1] ۔اصول کافی میں علی بن ابراہیم نے احمد بن محمد بن ابی نصر سے اس نے ابان بن عثمان سے اور اس نے حجر سے اور اس نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی: ''یا احد و یا واحد یا صمد یا صمد، یا من لم یلد و لم یولد و لم یکن لہ کفوا احد'' اس کے بعد فرمایا: ''توکلت علی اللہ''۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی دعا پر فرمایا: میں تمہارے لیے کافی ہوں۔ لہٰذا آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم کے ٹھنڈی ہو جائے۔ جس کے کے نتیجے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اتنی سردی لگی کہ ان کے دانت ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ ''سالم ہو جاو'' جس پر حضرت ابراہیم کو آرام و سکون ملا۔ اس کے بعد جبرئیل نازل ہوئے اور آپ سے گفتگو کی۔

ہجرت کا حکم

اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سرزمین بابل سے شام کی جانب ہجرت کا حکم دیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ حضرت لوط بھی موجود تھے اس لیے ان کا حوالہ دیا ہے، لوط وہ شخصیت تھے جو حضرت کی دعوت پر ایمان لائے تھے لہٰذا دونوں کو شام کی جانب ہجرت کا حکم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم انہیں ایسی سرزمین میں لے گئے جو پاکیزہ تھی اور اس طرح ہم نے انہیں دشمنوں کے شر سے نجات دلائی۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ۔۔۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۲۶)

ترجمہ: "پس لوط ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر ایمان لے آئے اور یہ کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرکے جانے والا ہوں۔۔۔"۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

ترجمہ: " اور ہم نے اسے اسحاق بخشا اور انعام میں یعقوب دیا، اور سب کو نیک بخت کیا۔"

یعقوب اسحٰق کے فرزند ہیں، اللہ تعالیٰ نے اسحٰق اور اس کے بیٹے کو حضرت ابراہیم کے لیے عطیہ قرار دیا ہے۔[1]

[1] ۔ الکافی میں علی ابن ابراہیم سے اس نے احمد بن محمد بن ابی نصر سے اس نے ایان بن عثمان سے اس نے حجر سے اس نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت بیان کی ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کا فیصلہ ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا پڑھی یا احد یا احد یا احد یا صمد، یا صمد یا من لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفو احد۔ اس کے بعد یہ جملہ پڑھا توکلت علی اللہ۔ میں نے اللہ پر توکل کیا۔ تو اللہ نے ابراہیمؑ کی دعا قبول کی اور فرمان جاری کر دیا "یا نار کونی برداو سلاماً"۔ آگ ٹھنڈی ہو گئی تو ابراہیمؑ کے ٹھنڈ کی وجہ سے دانت بجنے لگے تو اللہ نے فوراً فرمان جاری کیا اے آگ سلامتی والی ہو جا۔ تو اتنا

وَ جَعَلۡنٰهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا وَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَيۡرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيۡتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوۡا لَنَا عٰبِدِيۡنَ ۙ﴿۷۳﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہنمائی کیا کرتے تھے اور ہم نے انہیں اچھے کام کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کا حکم دیا تھا، اور وہ ہماری ہی بندگی کیا کرتے تھے۔''

اللہ کی ہدایت

ہدایت کا معنی راہنمائی ہے، راستہ دکھانا ہے لیکن اللہ کی جانب سے ہدایت فقط راستہ دکھانا نہیں جیسے اللہ نے امام بھیجنے کو ہدایت والے کاموں سے قرار دیا، امام کا مقام نبوت کے بعد ہے۔ امامت کا معنی مطلوب تک پہنچانا ہے یہ ایک قسم کا تکوینی تصرف ہے نفوس میں کہ اس تصرف کے وسیلہ سے اس راستہ پر چلنے والے دلوں کو کمال کی جانب لے جانا ہے اور انہیں بالاتر مقامات کی جانب منتقل کرنا ہے لہٰذا امامت اور ہدایت اللہ کے امر سے معنوی فیوضات سے ہے اور یہ باطنی مقامات کی جانب ہے کہ مومنوں کو عمل صالح کے ذریعہ ان کی طرف ہدایت ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت سے وہ بہرہ ور ہوتے ہیں جبکہ امام جو ہوتا ہے اسے ہر ایک سے پہلے ہدایت کا لباس پہنا دیا جاتا ہے اور ان کے بعد دوسرے افراد جو ہیں وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا

درجہ حرارت ہو گیا جو انسانی زندگی کے لیے ضروری تھا۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور ابراہیم ٹھنڈ سے بھی آسودہ ہو گئے اور ابراہیم علیہ السلام سے جبرئیل علیہ السلام نے گفتگو کی۔

ہے کہ امام لوگوں کے لیے ظاہری اور باطنی فیوضات لینے کے لیے واسطہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح (اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ) یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فعل خیرات (اچھے کام) ان سے تحقق پذیر ہو چکے ہیں، وحی ان کے عمل کے بارے میں جو ان سے صادر ہوا ہے اور عمل خیرات ان سے وجود میں آچکا ہے یہ وحی اس وحی کے علاوہ ہے جو شریعت کے بیان کے لیے اُترتی ہے اس وحی میں ان کے عمل کی گواہی دی گئی ہے کیونکہ اس کے بعد بلافاصلہ فرمایا: (وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾) آئمہ وحی سے پہلے اللہ کی عبادت کرتے تھے اور ان کے اعمال وحی تشریعی کے مطابق تھے لہٰذا یہ وحی ان کی تائید اور ان کی درستگی کے بارے ہے۔ اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ آئمہ رُوح القدس سے مؤید ہوتے ہیں۔ رُوح کی طہارت میں ہیں اور ربانی قوت سے تائید شدہ ہیں۔

وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: ”اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا اور ہم اسے اس بستی سے جو گندے کام کیا کرتی تھی بچا کر لے آئے، بے شک وہ لوگ برے نافرمانی کرنے والے تھے۔“

حضرت لوطؑ کی شان

اس جگہ حضرت لوط کے بارے اللہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے اسے علم دیا اور علم کے ساتھ ساتھ دانائی اور حکمت بھی عطا کی۔ ان دو نعمتوں کے ساتھ ساتھ ہم نے انہیں اس بدکار آبادی سے نکلنے میں مدد دی، جس بستی میں وہ قیام پذیر تھے وہ بہت خبیث اور بدکار تھے، گناہ کرتے تھے، بدفعلی کا ارتکاب کرتے تھے۔ ان فاسقوں، بدکاروں سے ہم نے ہی حضرت لوط

کو نجات دی۔ اس بستی والے بندگی کے قانون سے باغی تھے، غیر فطری افعال انجام دیتے تھے۔

وَ اَدۡخَلۡنٰهُ فِیۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ: ''اور اسے ہم نے اپنی رحمت میں لے لیا، بے شک وہ نیک بختوں میں سے تھا۔''

حضرت لوطؑ کے لیے نبوت کا مقام

اس جگہ رحمت سے مراد عام رحمت نہیں بلکہ اس سے خاص رحمت مراد ہے اس رحمت سے مراد مقام ولایت اور مقام نبوت ہے کہ اللہ فرمارہا ہے ہم نے انہیں نبوت کے منصب سے نوازا کیونکہ ان میں اس کی قابلیت موجود تھی وہ صالحین سے تھے جس وجہ سے اس بلند مقام کو حاصل کرنے کے مستحق ٹھہرے، یہ ان کی کامیابی اور سعادت و نجات ہے۔

وَ نُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّیۡنٰهُ وَ اَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: ''اور نوح کو جب اس نے اس سے پہلے پکارا پھر ہم نے اس کی دعا قبول کرلی پھر ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو گھبراہٹ سے بچالیا۔''

نوحؑ کا تذکرہ

اس جگہ حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ اے میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ، نوح کو بھی یاد کرو، ان کے حالات کو جانو، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں جن کے ناموں کا ذکر ہوا ہے حضرت نوح ان سب سے پہلے تھے، انہوں

نے اپنے زمانہ میں جب اللہ سے مناجات کی اور اللہ کے حضور اپنی حاجات پیش کیں تو اللہ نے ان کی حاجات کو پورا کیا۔

قرآن نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰ (سورۂ قمر، آیت ۱۰)

ترجمہ: ''اے میرے رب میں بلاشک بہت ہی مغلوب ہوں تو ہی میری مدد فرما۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی مدد فرمائی، حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں اور ان کے خاندان کو گناہگاروں اور فاسقوں و فاجروں کے شر سے بچا لیا اور منکروں کو پانی کے طوفان میں غرق کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا اور خود نوح علیہ السلام ان کے خاندان اور پیروکار کشتی میں سوار ہو گئے اور آسمان سے بارش آگئی، زمین نے خفیہ خانوں سے پانی کو اُگل دیا۔ طوفان آیا حضرت کے خاندان کے دو افراد جن میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا جس کے بارے اللہ نے فرمادیا کہ اے نوح یہ تیرا نافرمان ہے اس لیے یہ تیرے خاندان سے نکل چکا ہے۔ اسی طرح ان کی بیوی بھی کافرہ تھی، ان کے علاوہ باقی افراد کو بچا لیا۔

وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۷۷

ترجمہ: ''اور ہم نے اس کی مدد کی ان لوگوں پر جو ہماری آیتیں جھٹلاتے تھے، بے شک وہ برے لوگ تھے پھر ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔''

قوم نوحؑ پر عذاب الٰہی

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے بیان کیا ہے کہ وہ ایسی قوم تھی جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا، حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں حق کی دعوت دی، اُنہوں نے قبول نہ کیا وہ بہت ہی ظالم و ستمگار تھے، گناہگار تھے، اپنے گناہ پر انہیں اصرار تھا، توہم نے ان پر سخت عذاب پانی کی صورت میں اُتار دیا اور انہیں اس میں غرق کر دیا اور اس طرح ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو بچالیا اور جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا تھا انہیں بھی ہم نے نجات دی۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ اِذۡ یَحۡکُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِیۡہِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ ۚ وَ کُنَّا لِحُکۡمِہِمۡ شٰہِدِیۡنَ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: ”اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ کھیتی کے جھگڑا میں فیصلہ کرنے لگے جب کہ اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت جاپڑیں، اور ہم اس فیصلہ کو دیکھ رہے تھے۔“

داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا قصہ

داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل میں بادشاہ تھے اور سلیمان علیہ السلام اپنے باپ کی اجازت سے معاملات نپٹانے میں دخالت کرتے تھے۔ اس جگہ ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ایسا نہیں کہ ایک ہی واقعہ میں دو فیصلہ دینے والے ہوں۔ اس جگہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حاکمانہ صلاحیت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اس فیصلہ میں دونوں نے آپس میں مشاورت کی ہو گی اور اس کے بعد سلیمانؑ نے فیصلہ سنایا ہو گا۔ ظاہری طور پر ایسا ہے کہ دو آدمیوں میں جھگڑا ہوتا ہے، وہ شکایت لے کر داؤد علیہ السلام کے پاس آتے ہیں وہ اس جھگڑے

کو حل کرنے کی ذمہ داری حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اُنہوں نے جو فیصلہ کیا ہم اس پر گواہ تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو فیصلہ کا اختیار اور نبوت سے نوازا ہے۔ اللہ فرمارہا ہے جس وقت فیصلہ دیا جارہا تھا اور مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مکالمہ تھا ہم ان کی گفتگو کو سن رہے تھے اور اس کے لیے راہنمائی بھی کر رہے تھے، واقعہ اس طرح ہے کہ ایک شخص نے رات کے وقت اپنے ریوڑ کو چھوڑ دیا وہ ریوڑ دوسرے شخص کے کھیت کو ویران کر دیتا ہے، چرواہا اس ریوڑ کے ساتھ موجود نہ تھا، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ یہ تھا کہ گوسفند کا مالک کھیت کے مالک کو تاوان دے کہ اُنہوں نے زراعت کو تلف کیا ہے لہٰذا گوسفندوں کا مالک اس تلف شدہ کھیت کا ضامن ہے اس جگہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام میں اختلاف نظر تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا کہنا تھا کہ گوسفند کھیت کے مالک کو دیئے جائیں جبکہ سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ یہ تھا کہ جتنا نقصان ہوا ہے اتنی مقدار گوسفندوں کا مالک، کھیت کے مالک کو دے دے۔ یہ سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد تھا اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے فیصلے کی تصدیق کر دی، سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ دیا کہ گوسفندوں نے کھیت سے جو منافع حاصل ہوتا ہے اس کو تلف کیا ہے لہٰذا گوسفندوں کے جو منافع ایک سال تک ہیں جیسے اُون، دودھ وغیرہ زراعت کے مالک کو دے کیونکہ ان گوسفندوں نے ایک سال کی محنت کسان کی تلف کر دی تھی۔ اس طرح گوسفندوں کے ایک سالہ منافع زراعت کے مالک کو دیا جانا ہی مناسب تھا۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: ”پھر ہم نے وہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا، اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم

دیا تھا، اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑ اور پرندے تابع کیے جو تسبیح کیا کرتے تھے، اور یہ سب کچھ ہم ہی کرنے والے تھے۔"

وَ عَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّکُمۡ لِتُحۡصِنَکُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِکُمۡ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ شٰکِرُوۡنَ ﴿۸۰﴾

ترجمہ: "اور ہم نے اسے تمہارے لیے زرہیں بنانا بھی سکھایا تاکہ تمہیں لڑائی میں محفوظ رکھیں، پھر کیا تم شکر کرتے ہو؟"

سلیمانؑ پر اللہ کا فضل و کرم

ہم نے سلیمانؑ کو حکمرانی اور قضاوت کی تعلیم دی، ہم نے داؤد اور سلیمانؑ دونوں کو دانائی دی، حکمت سے نوازا، علم دیا، اس جملہ سے اللہ نے سلیمان کے فیصلہ کی تائید فرمائی ہے اور اس کے فیصلہ کو اللہ کے ہاں جو واقعی حکم ہے اسے قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فیصلہ علم پر مبنی تھا، ظن و گمان پر مبنی نہ تھا۔

اس کے بعد پہاڑوں اور پرندگان کی تسبیح کا حوالہ دیا ہے یہ خود بھی تسبیح کرتے ہیں لیکن جب حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح کرتے تھے تو یہ سب حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے ہمراہ تسبیح کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ واضح کر دیا کہ یہ ہمارا طریقہ، سنت اور قانون ہے کہ ہم اس طرح اپنے مواہب، عطایا اور نعمات دیتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک اور احسان کا تذکرہ کیا ہے کہ ہم نے لوہے سے زرہ بنانے کی صلاحیت داؤد کو عطا کی تاکہ دشمنوں کے مقابل میں زرہ کو اپنے دفاع کے لیے استعمال کر سکیں۔ پھر فرمایا یہ بھی ہمارا انعام ہے لہٰذا آپ کو اس کا شکر بجالانا چاہیے۔

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا ؕ وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ ﴿۸۱﴾

ترجمہ: ''اور زور سے چلنے والی ہوا سلیمان کے تابع کی جو اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی جہاں ہم نے برکت دی ہے، اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔''

سلیمانؑ کے لیے انعام

حضرت سلیمانؑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انعام دیا کہ ہوا کو ان کے تابع قرار دے دیا، تند و تیز ہوا ان کے اختیار میں تھی جیسے چاہتے ویسے ہی ہوا چلتی اور جہاں چاہتے ہوا اسی جگہ کی طرف چلتی اور وہ ہوا کے دوش پر سیر کرتے وہ جہاں پر بھی ہوتے ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کو شام کی سرزمین پر لے آتی، یہ سب امور اللہ کے حکم و امر اور قدرت کے تحت حضرت سلیمان علیہ السلام کے اختیار میں تھے اللہ ہی سب امور سے آگاہ ہے۔

وَ مِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ ۚ وَ کُنَّا لَہُمۡ حٰفِظِیۡنَ ﴿ۙ۸۲﴾

ترجمہ: ''اور کچھ ایسے جن تھے جو دریا میں اس کے واسطے غوطہ لگاتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے، اور ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔''

شیاطین کا سلیمانؑ کے اختیار میں ہونا

اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو حضرت سلیمانؑ کے اختیار میں قرار دیا، اس سے مراد جنات ہیں، غواص سے مراد سمندر کی گہرائیوں سے مروارید جواہرات کو نکال کر لے آنا، جو اعمال شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے انجام دیتے تھے اس سے مراد وہی اعمال ہیں جن کو

سورہ سبا میں بیان کیا ہے جیسے محراب بنانا، مجسمے بنانا، بڑے بڑے تھال، دیگیں بنانا۔ (سورہ سبا، آیت: ۱۳) شیاطین کی نگہبانی اور حفاظت سے مراد یہ ہے جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے کام میں مصروف ہوتے تھے تو اللہ ان کی حفاظت فرماتا تھا اور انہیں وہاں سے فرار نہیں ہونے دیا جاتا تھا یا مراد یہ ہے کہ انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی نافرمانی کرنے اور کاموں کو خراب کرنے سے روکا جاتا تھا۔ اس طرح یہ شیاطین پوری طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے اختیار اور کنٹرول میں تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ان جنات سے تعمیرات کے کام بھی کرواتے تھے، جو چاہتے وہ کام یہ شیاطین انجام دیتے تھے۔ بعض شیاطین کا اشارہ بتاتا ہے کہ تمام نہیں تھے کچھ گروہ تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے اختیار میں دیئے گئے تھے۔

وَ اَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۸۳﴾

ترجمہ: ''اور جب کہ ایوب نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے روگ لگ گیا ہے حالانکہ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔''

حضرت ایوبؑ کی دعا

(ضُر) سے مراد وہ تکلیف ہے جو انسان کے جسم کو براہ راست لاحق ہو، جیسے بیماری یا جسمانی کمزوری، اس جگہ (ضُر) سے تمام انواع کے مصائب مراد لیے گئے ہیں۔ ایوب سے الٰہی امتحان تھا، ہر قسم کی مصیبت و تکلیف ان پر آچکی تھی مال و دولت ختم ہو گیا، اولاد ختم ہو گئی، بیماری آگئی تو اس وقت ایوب نے دعا کے ہاتھ بلند کیے اپنے رب کی جناب میں فریاد کی کہ اے میرے رب! تو جانتا ہے کہ کونسے مصائب میرے اوپر حملہ کر چکے ہیں، میری التجاء ہے ان کو مجھ سے دُور کر دے، تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ پس اے اللہ جو تیرے دربار میں آیا ہے، تیری پناہ چاہتا ہے تو اس پر رحم فرما۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی

دعا کو قبول کرلیا اور ان سے مصیبت کو ٹال دیا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: ''پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو اسے تکلیف تھی ہم نے دور کر دی، اور اسے اس کے گھر والے دیے اور اتنا ہی ان کے ساتھ اپنی رحمت سے اور بھی دیا اور عبادت کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔''

ایوبؑ کی دعا کی قبولیت

اللہ تعالیٰ نے ایوبؑ کی دعا کو قبول کرلیا، بیماری دُور ہو گئی، جو اولاد مر چکی تھی اس کے دوبرابر اس کے لیے واپس لوٹا دی، یہ اس لیے کہ خدا کی رحمت ان پر ہوتی ہے جو عبادت گذار بندگان ہیں اور ان کے لیے یاد دہانی بھی ہو کہ اللہ اس طرح اپنے اولیاء پر مہربانی فرماتا ہے، ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے پھر رحم فرماتا ہے۔ ان کے اجر کو دوبرابر کر دیتا ہے اور اللہ صالحین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔[1]

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

ترجمہ: ''اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو، یہ سب صبر کرنے والے تھے۔''

وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

ترجمہ: اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کرلیا، بے شک وہ نیک بختوں میں

[1]۔ تفسیر قمی کے مولف نے اپنی سند سے عبداللہ بن بکر سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ جو اولاد حضرت ایوب علیہ السلام کی مر چکی تھی اللہ تعالیٰ نے وہی اولاد انہیں واپس لوٹادی بلکہ اس میں اضافہ بھی کر دیا۔

سے تھے۔

تین انبیاء کا تذکرہ

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تین انبیاء کا ذکر کیا ہے: (۱) اسماعیل، (۲) ادریس (ذوالکفل) ان کے بارے بیان کیا ہے کہ یہ سب صالحین تھے۔ اللہ کے احکام کے تابع تھے، صابرین سے تھے، مشکلات میں صبر کرتے تھے، حضرت ادریسؑ کی داستان سورہ مریم میں بیان کی گئی اور حضرت اسماعیلؑ کا تذکرہ سورہ صافات میں آئے گا اور ذوالکفل کا ذکر سورہ محمد ﷺ میں ہوگا، ان پر اللہ کی خصوصی رحمت تھی کیونکہ یہ سب اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے تھے اور وہ سب صالحین سے تھے، یہ سب اللہ کے پسندیدہ اور منتخب بندگان تھے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: ’’اور مچھلی والے کو جب (وہ اپنی قوم سے) غصہ ہو کر چلا گیا پس خیال کیا کہ ہم اسے نہیں پکڑیں گے پھر اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو بے عیب ہے، بے شک میں بے انصافوں میں سے تھا۔‘‘

حضرت یونسؑ کا قصہ

حضرت یونس علیہ السلام متّی کے بیٹے تھے، انہیں اہل نینویٰ کے لیے مبعوث کیا گیا کہ وہ انہیں اللہ کے دین کی دعوت دیں لیکن وہ لوگ اللہ پر ایمان نہ لائے جس پر حضرت یونس علیہ السلام نے ان کے لیے نفرین کی اور اللہ سے ان پر عذاب اُتارنے کی درخواست کر دی لیکن جیسے ہی عذاب الٰہی کے آثار ظاہر ہوئے تو ان لوگوں نے اللہ کے حضور گڑگڑا کر توبہ کر لی۔ (مشہور یہ ہے کہ ایک عالم جو حضرت یونس علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا وہ ان میں موجود تھا،

حضرت یونس علیہ السلام نے جب نفرین کی تو وہ اس کے حق میں نہ تھا، جب حضرت یونس علیہ السلام قوم کو چھوڑ کر جا رہے تھے یہ عالم ان کے ساتھ نہ گیا، جب عذاب کے آثار ظاہر ہوئے تو اس عالم نے سب کو آواز دی کہ دیکھو عذاب آگیا ہے سب ہلاک ہو جاؤ گے، اب بھی آؤ اور مل کر توبہ کر لو، ماؤں سے انکے شیر خوار بچوں کو الگ کیا، حیوانات سے انکے بچے علیحدہ کیے گئے، سب نے آہ و فغان شروع کر دی اور گریہ کیا۔ اس طرح اللہ کو ان پر رحم آگیا اور ان سے اللہ نے عذب کو ٹال دیا۔)

حضرت یونس علیہ السلام عذاب کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے نفرین کرنے کے بعد اس علاقہ کو چھوڑ کر ناراضگی کی حالت میں سمندروں کا رُخ کیا اور اپنی قوم کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے اس انداز کو پسند نہ فرمایا اور ان کی گرفت کی۔ جیسے ہی سمندر کے قریب پہنچتے ہیں کہ ہوت (ایک بڑی مچھلی) نے منہ کھولا اور حضرت یونس علیہ السلام کو نگل لیا اس طرح حضرت یونس علیہ السلام اس کے پیٹ میں چلے گئے اور دریا کی تہوں میں مچھلی کے پیٹ میں موجود رہ کر گھومنے لگے، اللہ نے مچھلی کو انہیں کھانے کی اجازت نہ دی حضرت یونس نے ان تاریکیوں سے اللہ کو آواز دی، بہت تاریکیاں تھیں، مچھلی کے شکم کی تاریکی، سمندر کے پانی کی تاریکی اور رات کی تاریکی۔ اللہ کو آواز دی اور جو عمل کیا تھا اس سے پشیمانی کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے اللہ کے حکم و اجازت کے بغیر ہی نفرین کرنے کے بعد اپنی قوم کو چھوڑ دیا تھا اور یہی بات تھی جسے حضرت یونس علیہ السلام نے ظلم سے تعبیر کیا ہے کہ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ تیرے حکم کا انتظار نہ کیا۔ اے رب اب مہربانی کر دے، معافی دے دے، کیونکہ اس کے عمل سے لگا کہ اللہ کے سوا کوئی اور پناہ گاہ ہے جس سے وہ واپس چلے جائیں گے تو اس عذاب سے بچ جائیں گے۔ اس طرح حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا۔ اگرچہ جو کچھ حضرت یونس علیہ السلام نے کیا تھا وہ معصیت اور گناہ تو نہ تھا کیونکہ اللہ کے کسی فرمان کی مخالفت نہ کی تھی لیکن ایک طرح کی

زیادتی کی تھی۔ اللہ نے اس واقعہ سے اپنے پیغمبر کو ادب سکھایا اور ان کی تربیت فرمائی کہ ہر طرح کی کوتاہی سے پاک ہو کر اللہ کے حضور خود کو پیش کر دے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸

ترجمہ : ”پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے غم سے نجات دی، اور ہم ایمان داروں کو یونہی نجات دیا کرتے ہیں۔“

یونسؑ کی دُعا کی قبولیت

حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی مناجات میں واضح طور پر اپنی خواہش کو بیان نہیں کیا بلکہ اللہ کی وحدانیت اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ پاک و منزہ ہے، اللہ کی تحمید و تمجید کی ہے لیکن اسی مناجات کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے یونسؑ کو نجات دے دی اور ان سے وہ غم ٹال دیا جس میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ شکم ماہی سے باہر آگئے، اللہ تعالیٰ نے اسی ضمن میں تمام مومنوں کو وعدہ دیا ہے کہ اللہ ہی مومنوں کو غم واندوہ سے نجات دے گا لیکن وہ مومن جو یونسؑ کی طرح اللہ کی طرف رجوع کرے گا اور تمام دُنیاوی اسباب سے خود کو جدا کر لے گا فقط اللہ کو اپنی پناہ گاہ قرار دے گا اور یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی کارساز ہے اور مشکلات سے نجات دینے والا ہے تو اللہ مومنوں کی دعا کو سنے گا اور انہیں اسی طرح مشکلات و مصائب سے نجات دے گا جس طرح حضرت یونسؑ کو نجات دی۔[1]

[1] ۔ (علماء عاملین کا تجربہ ہے کہ آیت کریمہ: ”لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۷“ کا ورد کرے گا اور اپنی مشکلات سے نجات کے لیے اللہ سے دعا مانگے گا تو اللہ اس ورد کے صدقے اس کی مشکل کو حل کر دے گا۔ اس آیت کا ورد کرنے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ روایات میں بھی اس آیت کی تلاوت بارے تاکید وارد ہوئی ہے)۔

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝٨٩

ترجمہ: ''اور زکریا کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے۔''

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝٩٠

ترجمہ: ''پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا، بے شک یہ لوگ نیک کاموں میں دوڑ پڑتے تھے اور ہمیں امید اور ڈر سے پکارا کرتے تھے، اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔''

زکریاؑ کا تذکرہ

زکریا بوڑھے ہو گئے ان کے ہاں اولاد نہ تھی، حضرت مریمؑ ان کے زیر تربیت تھیں جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت مریمؑ کے پاس محراب عبادت میں پھل و میوے قسم قسم کے موجود ہیں جب اس بارے سوال کیا تو بی بی مریمؑ جو جوان تھیں اور اب عبادت میں مشغول رہتی تھیں، جب زکریا نے اللہ کے اس انعام کو دیکھا تو حضرت زکریاؑ کے دل میں ایسی ھوک اٹھی کہ میرا بھی ایک وارث ہونا چاہیے اور پوری دلجمعی سے اللہ سے مناجات شروع کر دی کہ اے اللہ تو مجھے تنہا نہ چھوڑ، میرا وارث مجھے دے دے۔ بہترین وارث تو تو خود ہی ہے۔ اس دعا میں اللہ سے فرزند کی آرزو کی کہ وہ بچہ میرا اور یعقوب کے خاندان کا بھی وارث قرار پائے پھر یہ بھی اس دعا میں تعریفی کلمات کہہ دیئے کہ اللہ اس پوری کائنات میں تو ہی حقیقی وارث

ہے اور ہر ایک کے اعمال کی دیکھ بھال کرنے والا اور ان کے ذکر و یاد کو باقی رکھنے والا تو ہی ہے اور تیرے ساتھ کسی کی شراکت نہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو خوشخبری دے دی کہ ہم تمہیں بیٹا دیں گے اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ یہ خبر جب ان کی بیوی نے سنی تو اس نے چیخ کر کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں بوڑھی اور بانجھ ہوں اور میرا شوہر بوڑھا کھوسٹ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس جگہ فرمادیا کہ ہم نے اس کی بیوی میں بچہ جننے کی صلاحیت قرار دے دی جبکہ وہ پہلے بانجھ تھی، ہم نے یحییٰ عطا کیا اس انعام کی وجہ یہ تھی کہ یہ پورا گھرانہ نیک کاموں کے کرنے میں تیزی دکھاتا تھا، امید و بیم کی حالت میں خشوع و خضوع کے ساتھ ہمیں پکارتا تھا تو اللہ کی رحمت کا اُمیدوار رہنا اور اللہ کے غضب سے ڈرتے رہنا رغباً ورھباً کا معنی بنتا ہے۔ یہ سب عبادت کرتے تھے ان کے دل اللہ کی عظمت و جلالت کا مشاہدہ کرنے سے متاثر ہوتے تھے۔

پیغام: کسی بھی حال میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ سے ہر حاجت مانگ سکتے ہیں جو ظاہرہ اسباب سے وقوع پذیر نہ ہو سکے تو بھی اللہ اسے کر دیتا ہے۔ اللہ سے اُمید رکھی جائے کہ وہ رحمت کرے گا، اللہ کے غضب سے ڈرتے رہیں اور نیک اعمال کرنے میں تیزی دکھائی جائے، اللہ کی عبادت کی جائے، ہمیشہ خشوع و خضوع میں رہیں۔

وَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾

ترجمہ: ”اور وہ عورت جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا پھر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور اسے اور اس کے بیٹے کو جہان کے لیے نشانی بنایا۔“

جناب مریمؑ اور عیسیٰؑ کا تذکرہ

اس میں بی بی مریمؑ کی پاکدامنی کی اللہ نے گواہی دی ہے اور یہ کہ اُنھوں نے اپنے اختیار و ارادے سے خود کو ہر برائی سے محفوظ رکھا، وہ عصمت ماب تھیں، اللہ تعالیٰ نے دوسرا انعام اس بی بی کے لیے یہ دیا کہ اللہ نے اپنی ایک مخلوق براہ راست ان کے رحم میں رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پھونک مارنے سے (کُنۡ فَیَکُوۡنُ) کا مظاہرہ ہوا اور اللہ کا کلمہ اللہ کے وجود کی نشانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے رحم میں ودیعت کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے بی بی کی پاکدامنی کا اعلان کیا تاکہ یہودی آپ پر تہمت لگائیں اس کا جواب پہلے ہی سے موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی روح کہا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ اللہ مرکب ہے اور اس نے اپنے وجود سے ایک حصہ اٹھا کر بی بی مریم کے رحم میں رکھ دیا، نہیں ایسا نہیں! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیاتی مادہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت دی ہے اس کی عظمت و شرافت کو بیان کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت آدم اور حضرت حوا کو بغیر ماں اور باپ کے خلق کیا اور بغیر اس کے کہ کوئی پہلے سے مثال موجود ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فقط ماں سے خلق کیا بغیر باپ کے۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی ہے اور اللہ کے وجود پر دلیل و ثبوت ہے۔ یہ پورے عالم کے واسطہ نشان قدرت اور حق تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے مریم اور ان کے بیٹے عیسیٰ کو اپنی آیت اور نشانی قرار دیا ہے، یہ ایسی تولد (ولادت) تھی جس میں مادی اسباب جو ولادت کے لیے درکار ہوتے ہیں نہ تھے یہ فقط غیبی قدرت سے ہی ہوا جس طرح اور معجزات ہوتے ہیں کہ ظاہری اسباب کا ان میں عمل دخل نہیں ہوتا جیسے عصا کا اژدھا بن جانا، ہاتھ سے نور کا ساطع ہونا، آگ کا گلزار بن جانا۔

إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ﴿٩٢﴾

ترجمہ: ''یہ لوگ تمہارے گروہ کے ہیں جو ایک ہی گروہ ہے، اور میں تمہارا رب ہوں پھر میری ہی عبادت کرو۔''

اُمت واحدہ کا تصور

اُمت واحدہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک ہدف کے تحت اکٹھے ہوئے ہوں جیسے اُمت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین اسلام نے اکٹھا کیا ہے۔ اس آیت میں اُمت سے مراد نوع انسان ہے کہ پوری نوع انسانیت کا ایک ہدف اور مقصد ہے اور وہی مقصد ان کی سعادت اور خوش بختی کا ضامن ہے لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ ایسی اُمت کے لیے کئی معبود ہوں یا ان کا ایک رب کے علاوہ کئی رب ہوں کیونکہ ربوبیت اور الوہیت کوئی قرار دادی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور واقعیت ہے جس کا معنی کائنات کا منبع ایجاد اور اس کی تدبیر مراد ہے کیونکہ سارے انسان ایک نوع سے ہیں اور جس نظام کے تحت اس موجود کے امور چل رہے ہیں وہ نظام بھی ایک ہے۔ نظام واحد کا مالک اور مدبر ایک ہی ہو سکتا ہے لہٰذا اس کا کوئی معنی ہی نہیں کہ انسانوں کو ربوبیت کے بارے اختلاف ہو یہ بھی واضح امر ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان کا ہر گروہ اپنے لیے علیحدہ رب بنالیں یا عبادت کے لیے الگ الگ الہ بنالیں۔ سب کا عبادت میں ایک ہی معبود ہے کئی نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آخر میں فرمایا ہے کہ میں تمہارا مالک اور مدبر ہوں، لہٰذا تم سب میری عبادت کرو اور اپنے لیے خیالی دوسرے معبود مت قرار دو۔

وَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۖ كُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ ﴿٩٣﴾

ترجمہ: ''اور ان لوگوں نے اپنے دین میں اختلاف پیدا کر لیا، سب ہمارے پاس ہی آنے والے ہیں۔''

انبیاء کی توحیدی دعوت

انبیاء نے توحیدی دین کی طرف دعوت دی اور سب کے لیے دین ایک ہی بیان کیا لیکن لوگوں نے انبیاء کی دعوت کو پامال کر دیا اور دین کو آپس میں تقسیم کر دیا۔ ہر گروہ نے دین کا ایک حصہ اپنا لیا اور دوسرے حصہ کو چھوڑ دیا اور جو اختیار کیا اسے ہی کل دین قرار دے دیا جیسے بت پرست، یہود، نصاریٰ، مجوس و دیگر گروہ، ہندو، سکھ، بدھ مت صبائی، ایزدی وغیرہ وغیرہ۔

اللہ نے انسان کے اس رویہ کی سخت مذمت کی ہے اور ان کا پیغمبروں کی دعوت کی نافرمانی اور بعض اوقات عقیدے میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے پر سرزنش کی ہے اور واضح بیان دیا کہ اللہ کے ہاں دین ایک ہی ہے اور آخر میں سب نے ہماری طرف پلٹ کر آنا ہے تو دین میں اختلاف اور گروہ بندی کی انہیں سزا دی جائے گی۔[1]

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

ترجمہ: ”پھر جو کوئی اچھے کام کرے گا اور وہ مومن بھی ہوگا تو اس کی کوشش رائیگاں نہ جائے گی، اور بے شک ہم اس کے لکھنے والے ہیں۔“

1۔ (جیسے ہندوستان کے بودائی مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہیں اور پاکستان میں کچھ اہل سنت شیعہ برادری کا قتل عام کرتے ہیں۔ (مصحح)

اعمال صالحہ کا ریکارڈ

افراد بشر سے جو بھی اللہ پر ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے تو یہ سب درج ہوں گے اور ان کا پورا پورا حساب کیا جائے گا اور انہیں ان کے اعمال کا اجر و ثواب دیا جائے گا۔ کسی کا اجر ضائع نہ ہو گا، اعمال صحیفہ میں ثبت ہو جاتے ہیں لہٰذا کسی کا عمل نہ تو بھولا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا انکار ہو گا۔ یہ اس بات پر بھی دلیل و ثبوت ہے کہ عمل صالح اس صورت میں قبول ہو گا اور اس کا آخرت میں بدلہ دیا جائے گا اگر ایمان کے ساتھ بجالایا جائے گا بغیر ایمان لائے عمل صالح کا اجر و ثواب آخرت میں نہ لے گا۔ اس معنی پر کثیر تعداد میں قرآن میں آیات موجود ہیں کہ ایمان اور عمل صالح ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان بغیر عمل صالح کے بے اثر ہے اور عمل صالح بغیر ایمان بے نتیجہ ہے۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾

ترجمہ: ''اور جن بستیوں کو ہم فنا کر چکے ہیں ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ پھر لوٹ کر آئیں۔''

ہلاک شدگان کی دُنیا میں واپسی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک بیان جاری کیا ہے کہ ہر وہ آبادی اور بستی جس کو ہم نے ان کے کفر کی وجہ سے ہلاک کیا اور انہیں دُنیا میں ہی سزا دی تو وہ اس دنیا میں واپس نہیں پلٹائے جائیں گے تاکہ واپس آکر اپنے فوت شدہ اعمال کی تلافی کر سکیں۔ جو عمر اور زندگی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں وہ انہیں واپس مل جائے تو ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ آیت سابقہ آیت کے مدمقابل آئی ہے کہ جو ایمان نہیں لائیں گے اگر عمل صالح کیے ہوں تو ان کی سعی و کوشش بے نتیجہ و بے اثر ہو گی، مرنے کے بعد بھی ان کے لیے دُنیا میں واپس آنے کا کوئی چارہ نہیں

ہے کہ وہ فوت شدہ اعمال کا تدراک کریں۔

اس آیت میں جمع کے الفاظ لائے گئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی فرد غلط کام کرتا ہے تو اس کے اثرت پورے معاشرے پر پڑتے ہیں کہ جس وجہ سے اس معاشرہ پر عذاب حتمی ہو جاتا ہے اور سب ہلاک ہو جائیں گے لہٰذا وہ آبادی جن کا عمل صالح ایمان کے ساتھ ملا ہو انہیں اس کا انجام ہلاکت پر ہوا، ہلاکت کے بعد ان کا زندہ ہونا محال ہے کہ وہ اپنے اعمال کو قابل قبول بنا سکیں، لہٰذا دُنیا میں جو موقع انسان کو ملا ہے اسے سوچ سمجھ کر استعمال میں لائے، اللہ پر ایمان لائے اور عمل صالح بجالائے۔

حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَ مَاۡجُوۡجُ وَ هُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: ''یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے چلے آئیں گے۔''

وَ اقۡتَرَبَ الۡوَعۡدُ الۡحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبۡصَارُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ؕ یٰوَیۡلَنَا قَدۡ كُنَّا فِیۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا بَلۡ كُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: ''اور سچا وعدہ نزدیک آ پہنچے گا پھر اس وقت منکروں کی آنکھیں اوپر لگی رہ جائیں گی، ہائے کم بختی ہماری! بے شک ہم تو اس سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔''

بند یاجوج ماجوج کا کھل جانا

اللہ فرما رہا ہے کہ یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہے گا کہ مومنوں کے اعمال صالح درج ہوتے رہیں گے، ان کو اس کا اجر ملے گا۔ کافروں اور ظالموں کی آبادیاں ویران ہوتی رہیں گی اور دُنیا میں انہیں سزائیں ملتی رہیں گی، یہاتنک کہ وہ زمانہ آجائے گا یاجوج ماجوج کے شر سے

بچنے کے لیے جو بند باندھا گیا تھا وہ کھل جائے گا تو اس وقت وہ بلندی سے زمین کی جانب رواں دواں ہوں گے اور لوگوں پر حملہ آور ہوں گے، یہ امر قیامت کے آنے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

جیسا کہ ہم نے سورہ کہف کی آیت ۹۸،۹۹ میں اس کی تشریح بیان کی ہے اس زمانے میں اعمال کا لکھا جانا روک دیا جائے گا کیونکہ قیامت کا دن، بدلہ دینے کا دن ہے، اعمال کو درج کرنے کا دن نہیں۔ احوال قیامت کو دیکھ کر کفار اس قدر حیرت اور تعجب میں ڈوب جائیں گے کہ ان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی، پتھرا جائیں گی، ایک ہی جگہ اٹک جائیں گے اس حالت کی ہولناکی کی وجہ سے اس کے علاوہ کچھ خیال نہ کریں گے اور نہ ہی انہیں کسی اور طرف دیکھنا ہو گا۔ ایک ہی منظر پر ان کی آنکھیں جم جائیں گے۔ کافر اس حالت میں اپنے اوپر لعنت بھیجنا شروع کر دیں گے، خود ہی اپنی مذمت وملامت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم اس منظر سے غافل تھے۔ شروع میں تو اس انداز سے کہیں گے کہ گویا دوسروں نے انہیں اس دن سے غافل کیے رکھا۔ خود ان کا اپنا قصور نہ تھا لیکن آخر میں خود اس کا اعتراف کرلیں گے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہم خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے کہ وہ ایسے کاموں میں مشغول رہے کہ جن کی وجہ سے وہ آخرت سے غافل ہو گئے اس لیے کہیں گے کہ ہم ہی ظالم وستمگار تھے۔

اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: ”بے شک تم اور اللہ کے سوا جو کچھ تم پوجتے ہو دوزخ کا ایندھن ہے، تم سب اس میں داخل ہو گے۔“

لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَ كُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: ''اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے، اور سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾

ترجمہ: ''ان کے لیے دوزخ میں چیخیں ہوں گی اور وہ اس میں کچھ نہیں سنیں گے۔''

مشرکین اور بت پرستوں کا انجام

اس جگہ مشرکین کو خطاب کیا ہے اور جن پتھروں، لکڑیوں کی مورتیاں بنا رکھی ہیں اور ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں ان سب کے بارے بتایا جا رہا ہے کہ اے مشرکین تم خود بھی اور جن بتوں کی تم پرستش کرتے رہے ہو وہ بھی آتش جہنم کا ایندھن بنیں گے اس طرح لفظ ''ما'' کا استعمال کیا ہے جو ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہے اس جگہ انسان اور جمادات و نباتات سب کو خطاب کیا گیا ہے اور ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں مراد ہیں۔ ذوی العقول جو کہ مومنین، انبیاء، فرشتگان ہیں ان کا معبود فقط ایک ہے اور وہ اللہ واحد قہار ہے پھر ان مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے گھڑے ہوئے معبود اگر تمہارے نجات دہندہ اور اللہ کے پاس تمہاری سفارشی ہوتے تو یہ خود کو آتش جہنم سے بچا لیتے جبکہ تم اور تمہارے گھڑے ہوئے بناوٹی معبود سب ہی آتش جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔

کافروں اور مشرکین سے خطاب کو مومنوں اور حضور پاکؐ کی طرف پلٹا دیا ہے اور انہیں جہنم میں مشرکین کی حالت و کیفیت کو بیان کیا ہے کہ آتش جہنم میں چیخ و پکار ہو گی، چنگھاڑتے ہوئے بے ہنگم شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے گی اور یہ سب آتش کی گرمی کی وجہ سے ہو گا کہ وہ اس بھڑکتی آگ میں واویلا کریں گے۔ کوئی کسی کی مدد کو نہ پہنچے گا گویا کوئی کسی کی چیخ و چنگھاڑ کو نہیں سن رہا ہو گا ہر شخص اپنے درد میں مبتلاء ہو گا جیسا کہ دُنیا میں یہ لوگ حق کی آواز پر کان نہ دھرتے تھے اور بات کو اَن سنا کر دیتے تھے۔ روایت میں آیا ہے کہ

جب یہ آیت اُتری تو اھل مکہ پر بہت زیادہ وحشت اور خوف طاری ہوا۔ عبد اللہ بن ابی رسول اللہ ﷺ سے مخاصمت اور جھگڑا کرنے کے لیے آگیا اور کہا کہ کعبہ کے رب کی قسم میں تمہارے ساتھ مخاصمت کروں گا اس مسئلہ پر جھگڑوں گا اور تمہیں لاجواب کر دُوں گا یہ تم نے ہمیں جو ڈرایا ہے یہ سب جھوٹ تماشا ہے کیا یہودی عزیر کی پرستش نہیں کرتے تھے کیا نصاریٰ عیسیٰ کی پرستش نہیں کرتے اور کیا بنو ملیح فرشتگان کی پرستش نہیں کرتے تھے؟ تو کس طرح اللہ حضرت عزیر نبی، حضرت عیسیٰؑ روح اللہ اور فرشتوں کو کیسے آتش جہنم میں ڈالے گا؟

پیغمبر خدا نے جواب میں فرمایا: ہر گز ایسا نہیں ہے تم نے بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا، یہودیوں، نصرانیوں اور بنو ملیح جو حضرت عزیر، حضرت عیسیٰ اور فرشتوں کی عبادت کرتے تھے تو ان کو ان کی عبادت پر شیاطین نے آمادہ کیا تھا، درحقیقت انہوں نے شیاطین کے کہنے پر ایسا کیا اور اس آیت میں یہ کہا گیا کہ تم خود پرستش کرنے والے اور تمہارے جو خدا ہیں کہ جن کا تم کہنا مانتے ہو اور جن سے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں کہاں ہیں وہ آج تمہاری مدد اور سفارش کے لیے کیوں نہیں آتے، کیسے آتے کیونکہ غیر اللہ کی طرف دعوت دینے والے خود آج جہنم کا ایندھن بنیں گے۔[1] آیت میں بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ان سے کہا تھا کہ وہ تمہاری پوجا کریں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب میں فرمائیں گے کہ اے اللہ تو بہتر جانتا ہے میں نے تو ایسا نہیں کہا تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۙ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ: ”بے شک جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔“

1۔ تفسیر قمی میں اس روایت کو ابی الجارود نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔ (مترجم)

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۚ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: ”اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے، اور وہ اپنی من مانی مرادوں میں ہمیشہ رہیں گے۔“

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: ”اور انہیں بڑا بھاری خوف بھی پریشان نہیں کرے گا اور ان سے فرشتے آ ملیں گے، یہی وہ تمہارا دن ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔“

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: ”جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹیں گے جیسے خطوں کا طومار لپیٹا جاتا ہے، جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا کیا تھا دوبارہ بھی پیدا کریں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے، بے شک ہم پورا کرنے والے ہیں۔“

متقین، مومنین و صالحین کا انجام

ان آیات میں مومنین صالحین کے انجام کا ذکر ہوا ہے، مومنوں کو نجات کا وعدہ دیا گیا، بہشت بریں ان کا ٹھکانہ ہوگا، وہ خوش و خرم اور اطمینان اور سکون میں ہوں گے۔ اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوگا جیسا کہ اللہ نے سورۂ توبہ آیت ۷۲ میں فرمایا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ ۔۔۔

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو جنات کا وعدہ دیا

ہے۔۔۔"۔

سورۂ مریم آیت ۷۲ میں ہے:

ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا ﴿۷۲﴾

ترجمہ: "پھر ہم انہیں بچالیں گے جو ڈرتے ہیں اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں پر گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔"

مومنین صالحین اس جہنم سے دور رہیں گے، اس کے قریب بالکل نہ جائیں گے وہ ان کی ہلکی سے آواز کو بھی نہیں سنیں گے۔ یہ سب ان تمام خواہشات کو پالیں گے جو ان کی تھیں اور جنت میں ہمیشہ ہوں گے، جو چاہا وہی پایا۔ سورۂ ق آیت ۳۵ میں ہے:

لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَ لَدَیْنَا مَزِیْدٌ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: "انہیں جو کچھ وہ چاہیں گے وہاں ملے گا اور ہمارے پاس اور بھی زیادہ ہے"۔

ان افراد کی خصوصیات سے نفخ صور کے وقت جو وحشت مخلوقات کے لیے ہو گی اللہ فرماتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں وحشت ہو گی، خوف ہو گا، سب پریشان ہوں گے۔ سورۂ نمل آیت ۸۷ میں ہے:

وَ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ كُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِیْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: "اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے سب ہی گھبرائیں گے مگر جسے اللہ چاہے، اور سب اس کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے۔"

اس کے بعد قیامت کے دن کے حالات کو بیان کیا ہے، اس دن آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح لکھے ہوئے طومار کو لپیٹا جاتا ہے کہ ایک طرف لکھی ہوئی چیز دوسری طرف معلوم نہیں ہوتی اس طرح کہ ان کا کچھ اثر اور نشانی باقی نہیں رہتی۔ یہ بات غیب کے خزائن کی طرف واپسی ہے جبکہ ان خزائن سے ان کا مقدار اور جو کچھ تھا نازل ہوا تھا۔

پھر فرمایا کہ ہم مخلوق کو اسی طرح واپس پلٹائیں گے جیسے ہم نے آغاز میں انہیں خلق کیا تھا یعنی خلقت سے پہلے والی حالت میں پلٹا دیں گے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ہم مخلوق کو مبعوث کریں گے جس طرح ہم نے انہیں پہلے خلق کیا تھا اسی طرح انہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کریں گے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جن کو پہلے خلق کیا تھا پھر انہیں مار کر دوبارہ اسی طرح زندہ نہ کیا جا سکے کیونکہ ابتداء میں جب خلق کیا تو اس سے پہلے اس کی مثال تک نہ تھی جب کہ مردوں کو زندہ کرنا تو ان ہی کو واپس پلٹانا ہے جن کو پہلے خلق کیا تھا ان کی تو مثال موجود ہے۔ قیامت کا دن حساب کتاب کا دن ہو گا، اجر و ثواب، سزا و عقاب، مارنے کے بعد اس کو دوبارہ حساب کے لیے زندہ کرنا یہ سب ہمارا وعدہ ہے، ہم نے اس وعدہ کو پورا کرنا ہے۔ ہم جو وعدہ کرتے ہیں اسے ضرور پورا کرتے ہیں یہ ہمارا قانون ہے۔[1]

وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: "اور البتہ تحقیق ہم نصیحت کے بعد زبور میں لکھ چکے ہیں کہ بے شک زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے۔"

اِنَّ فِیۡ ہٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوۡمٍ عٰبِدِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ؕ

1۔ (البتہ اللہ پر کوئی اور کسی امر کو واجب نہیں کر سکتا، اللہ خود ہی اپنے اوپر اپنی صفات کمالیہ جمالیہ کے بعد اپنے اوپر لطف و کرم کو لازم قرار دیتا ہے جیسے خود اللہ ہی اپنے لیے بیان کرتا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر ایسا قرار دیا ہے کہ ہم یہ کریں گے اور جو ہم کہتے ہیں ویسے ہی کرتے ہیں)۔ (مترجم)

ترجمہ: ''بے شک اس میں خدا پرستوں کے لیے ایک پیغام ہے۔''

زمین پر صالحین کی حکومت

اس آیت میں ذکر سے مراد توریت ہے زبور توریت کے بعد نازل ہوئی ہے (بعض مفسرین نے ذکر سے مراد قرآن لیا ہے اور زبور سے بھی قرآن کے بعض مطالب مراد لیے ہیں لیکن یہ ظاہر کے خلاف ہے)

اللہ تعالیٰ نے ایک واضح اعلان کیا ہے کہ زمین پر صالحین کی حکومت کا قیام ہوگا اور یہ اللہ کا فیصلہ ہے اس بات کو توریت میں بھی لکھا گیا اور زبور میں بھی یہ بات بیان کی گئی۔ زمین کے تمام منابع، منافع اور تمام جہان کی سلطنت و حکمرانی اللہ کے نیک بندوں کی طرف منتقل ہو جائے گی زمین کی تمام برکات صالحین کے لیے ہوں گی اور زمین شرک، بت پرستی، ظلم و الحاد اور معصیت کی نجاست سے پاک ہو جائے گی پھر اس زمین پر اللہ کے نیک عبادت گذار بندے زندگی گزاریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نور کی آیت ۵۵ میں خبر دی ہے:

ترجمہ: ''جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو اُمن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے اور اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔''

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ!

''صالحین وہ ہیں جنہوں نے دُنیا میں رہ کر تقرب الٰہی کے مقامات کو اپنے لیے کسب کر لیا ہے یہ مقامات زمینی زندگی، زمینی زندگی کی برکات سے عبارت ہیں اگرچہ اصلیت میں یہ آخرت کی کامیابی ہے''۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اس جگہ اور اس سورہ میں بیان کیا ہے کہ کائنات کا رب ایک ہے اور سب پر واجب ہے کہ وہ انبیاء کی دعوت کو قبول کریں اور ایک اللہ کی عبادت کریں۔ ہم نے بتا دیا کہ کافروں کا انجام کیسا ہو گا اور مومنین صالحین کے لیے کیا انعامات ہیں اور اس جگہ ہم نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس زمین پر نیک لوگوں کا اقتدار آئے گا۔ زمین کے تمام منافع اللہ کے نیک بندوں کے اختیار میں ہوں گے اور یہ بیان عبادت گزاروں کے لیے کافی ہے اگر وہ اسے وصول کر لیں گے اور اس پر عمل کریں گے تو وہ اپنی آرزو کو پہنچ جائیں گے۔ **(بلاغ)** کا معنی ہے کافی ہونا، اپنی آرزو کو پا لینا، اپنا ہدف حاصل کر لینا۔ ہدف تک پہنچ جانا۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝١٠٧

ترجمہ: ''اور ہم نے تو تمہیں تمام جہان کے لوگوں کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

رسول اللہؐ کا اعزاز

اس جگہ رسول اللہؐ کو اللہ نے جو اعزاز بخشا ہے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اے میرے پیارے! ہم نے تو آپ کو عالمین کے لیے رحمت بنا کر اس زمین پر بھیجا ہے۔ آپ انسانوں کے تمام گروہوں، قوموں کے لیے رحمت ہیں کیونکہ آپ کی دعوت کو قبول کر لینا اور جو پیغام آپ کو دیا گیا اس پر عمل کرنا اور اسے قبول کرنے میں سب کے لیے دنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی ہے، آپ پوری دُنیا والوں کے لیے رحمت ہیں جو پیغام لائے ہیں یہ پیغامِ رحمت ہے۔ یہ مطلب اس وقت واضح و روشن ہو جاتا ہے جب اسلام سے پہلے کے انسانی معاشروں سے اس کا تقابل کیا جائے۔

قُلۡ اِنَّمَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝١٠٨

ترجمہ: ”کہہ دو مجھے تو یہی حکم آیا ہے کہ تمہارا معبود ایک معبود ہے، پھر کیا اس کے آگے سر جھکاتے ہو؟“

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: ”پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دو کہ میں نے یکساں طور پر خبر دے دی ہے، اور مجھے معلوم نہیں کہ نزدیک ہے یا دور ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔“

اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: ”بے شک وہ جانتا ہے جو بات پکار کر کہو اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو۔“

وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۱۱﴾

ترجمہ: ”اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لیے امتحان ہو اور ایک وقت تک دنیا کا فائدہ پہنچانا منظور ہو۔“

لوگوں کے لیے واضح پیغام

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے عوام کے لیے واضح پیغام پہنچانے کا حکم دیا کہ: معبود سب کا ایک ہے، ایک اللہ کی عبادت کرو جب حقائق واضح ہیں، دلائل پیش کر دیئے گئے ہیں اور تم کو توحید اور توحید کی فروعات، سب بیان کر دی ہیں تو پھر تم سب مسلمان ہو جاؤ اگر ایمان نہ لائیں اور دعوت کو رد کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے تو سب کو سب کچھ برابر بیان کر دیا ہے اور تمہیں خطرات سے خبردار کیا، تم اس دعوت کو ٹھکرانے کی وجہ سے خطرے میں ہو اور تمہیں عذاب دیا جائے گا۔ اب یہ عذاب اور سزا تمہیں کب ملے گی تو اس کے بارے

معلوم نہیں لیکن سزا ضرور ملے گی۔ عذاب کی تاخیر بھی ایک آزمائش ہے اللہ چاہتا ہے کہ تم اپنی طے شدہ عمر پوری کرو اور اسی سے فائدہ اٹھاؤ۔ اب یہ عذاب جلدی آنا ہے یا دیر سے تو اس بارے مجھے معلوم نہیں البتہ تم اسلام کے بارے جو طعنہ زنی کرتے ہو جو ٹھٹھہ مذاق اڑاتے ہو اللہ اس بارے پورا آگاہ ہے اللہ پر کچھ مخفی و پوشیدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو میری ذمہ داری لگائی ہے کہ میں یہ سب کچھ تمہیں پہنچا دوں یہ سب تمہاری آزمائش ہو تاکہ جو کچھ تمہارے باطن میں ہے اسے آشکار کر دو۔ کچھ مدت اور تمہیں مل جائے اس طرح گناہوں میں اضافہ ہو جائے اور سزا میں بھی اضافہ ہوگا۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: ''کہ اے رب انصاف کا فیصلہ کر دے، اور ہمارا رب بڑا مہربان ہے اسی سے مدد مانگتے ہیں ان باتوں پر جو تم بیان کرتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ سے رسول خداؐ کی درخواست

جب اتمام حجت ہو گیا اور کافروں سے جو بحث و مباحثہ ہوا اس کا جواب دے دیا جب کافروں نے رُخ منہ موڑ لیا اور دعوت حق کو قبول نہیں کیا تو رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی عرضی پیش کرتے ہیں، آپ کہتے ہیں اے رب حق کے مطابق داوری فرما ''بالحق'' کی تاکید توضیحی ہے، احترازی نہیں ہے کیونکہ اللہ کا ہر حکم حق کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اے اللہ! اپنے برحق حکم کے تحت ہمارے درمیان داوری فرما اور حق کو ظاہر فرما اور باطل کو سرکوب کر، اس درخواست کے بعد پھر کافروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: ہمارا رب بخشنے والا ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور حق سے منہ موڑ رہے ہو، اللہ ہی بہترین یاور و مددگار ہے اور جو تم اس کی طرف نسبت دیتے ہو وہ اس سے مبرّا و منزہ ہے۔

سورۃ الحج

(مدنی۔ آیات 78)

اس سورت کے مطالب

اصول دین کے بارے مشرکین سے گفتگو، احکام و قوانین کا بیان، عبادات کی وضاحتیں، مخالفت پر عذاب کا بیان، مومنین کے لیے نماز، حج، اعمال خیر، جہاد اور قتال کا بیان۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱﴾

ترجمہ: ”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، بے شک قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے۔“[1]

1۔ کتاب درالمنثور میں عمران بن حصین نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: یہ دن آگ کے شعلوں کے بلند ہونے کا دن ہے۔ اصحاب نے اس کے معنی کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ہر ہزار بندوں میں سے نو سو ناوے بندے جہنم میں جائیں گے اور فقط ایک بندہ بہشت میں جائے گا۔

تمام انسانوں سے خطاب

مومن کافر سب کو جو موجود ہیں یا جو آئندہ موجود ہوں گے خطاب ہے کہ اے لوگو! اپنے رب سے خوف کھاؤ، خود کو بچاؤ، کافر خود اللہ کے غضب سے ڈرے اور مومن اللہ کے اوامر و نواہی کی مخالفت سے ڈرے۔ پھر اس ڈرانے کی وجہ بتادی ہے کہ قیامت کا زلزلہ بہت ہی بڑا امر ہے۔ زلزلہ سے مراد وہ ہولناک حرکت ہے جو قیامت کے روز زمین پر طاری ہوگی، ساعت سے مراد قیامت ہے وہ دنیا کا آخری دن ہوگا یہ آشکار ہے کہ قیامت کے دن بارے خبردار کیا گیا ہے اور قیامت کی نشانیوں سے ایک زمین میں زلزلہ ہے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿۲﴾

ترجمہ: ''جس دن اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے کو بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی اور تجھے لوگ مدہوش نظر آئیں گے اور وہ مدہوش نہ ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔''

قیامت کی ہولناکی

قیامت کے دن عجیب خوف ہوگا اس کی ہولناکی کو مثال سے بیان کیا ہے۔

دودھ پلانے والی عورت اپنے شیر خوار بچے کو دودھ پلا رہی ہو گی وہ اس ہولناک کیفیت میں بھول جائے گی۔

حمل والی عورت اس قدر خوف سے لرزے گی کہ وہ اپنا حمل گرا دے گی۔

لوگوں کی حالت ایسی ہو گی کہ ان کو لگے گا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہیں، دیوانگی کی حالت میں نظر آئیں گے۔ جبکہ وہ دیوانے یا نشہ میں نہ ہوں گے حالانکہ ان کی عقل صحیح و سالم ہو گی، قیامت کے خوف سے ایسی کیفیت ان پر طاری ہو گی، ان کی مستی کی حالت شراب پینے کی وجہ سے نہ ہو گی۔

یہ سب کچھ اللہ کے عذاب کی شدت کی وجہ سے ہو گا کہ لوگ دہشت زدہ اور خوف میں ہونگے، جس زلزلہ کا ذکر ہوا ہے یہ نفخہ اولیٰ سے پہلے کی کیفیت بارے ہے کہ جس کی وجہ سے آسمانوں اور زمین میں موجود مدہوش ہو جائیں گے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ﴿۳﴾

ترجمہ: ''اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے معاملے میں بے سمجھی سے جھگڑتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کے کہنے پر چلتے ہیں۔''

اللہ کے بارے، بغیر دلیل جھگڑا کرنا

علم کے بغیر مجادلہ کرنے کا مطلب یہ ہے ان مسائل جن کی بازگشت اللہ کے افعال و صفات کی طرف ہے ان کے بارے جہالت اور بغیر علم کے بات کی جائے اور پھر اسی بات پر

اصرار کیا جائے۔ ایسے لوگوں کا ہر باطل بات پر اعتقاد ہے اور اسی پر عمل کریں گے کیونکہ ان کا راہنما خبیث اور پلید شیطان ہے جو فاسد ہے، خیر سے خالی ہے۔ در حقیقت انہیں شیطان نے اغواء کر رکھا ہے، گمراہ افراد باطل کی پیروی کرنے میں کسی ایک حد پر نہیں رکتے کیونکہ ان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت اور قابلیت نہیں ان کا دل باطل میں گرفتار شدہ ہے۔

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۴

ترجمہ: ”جس کے حق میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اسے ساتھی بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا اور اسے دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا۔“

شیطان خبیث کی خاصیت

اللہ تعالیٰ نے شیطان خبیث کے متعلق یہ بات طے کر دی ہے کہ جو بھی اس کی پیروی کرے گا جو اسے اپنا دوست بنائے گا تو شیطان اسے گمراہی میں پھینکے گا اور اسے جلانے والی آگ کی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ شیطان سے دوستی کا نتیجہ آتش جہنم اور گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں، یہ بات طے شدہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمۡ ؕ وَ نُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ۚ وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِكَیۡلَا یَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ تَرَی الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَ رَبَتۡ وَ اَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِیۡجٍ ﴿۵﴾

”اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے تو ہم نے تمہیں مٹی سے پھر قطرہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کی بوٹی نقشہ بنی ہوئی اور بغیر نقشہ بنی ہوئی سے بنایا تاکہ ہم تمہارے سامنے ظاہر کردیں، اور ہم رحم میں جس کو چاہتے ہیں ایک مدت معین تک ٹھہراتے ہیں پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر باہر لاتے ہیں پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو، اور کچھ تم میں سے مرجاتے ہیں اور کچھ تم میں سے نکمّی عمر تک پہنچائے جاتے ہیں کہ سمجھ بوجھ کا درجہ پاکر ناسمجھی کی حالت میں جاپڑتا ہے، اور تم زمین کو سوکھی دیکھتے ہو پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو تروتازہ ہو جاتی ہے اور ہر قسم کے خوش نما نباتات اگ آتے ہیں۔“

انسان کی خلقت کے مراحل

اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد زندگی کے مسئلہ کو سمجھانے کے لیے انسان کی خلقت کے

مراحل کو بیان کیا ہے اور مشرکوں کو ایک مشکل میں ڈال دیا کہ تم کو اگر موت کے بعد زندگی میں شک ہے تو انسان بننے کے آغاز سے لے کر مرنے تک کے جو مراحل ہیں ان پر تو غور کرو، وہ سب کچھ تو تمہاری نظروں کے سامنے ہیں۔ انسان کی ابتداء تو ایک بے جان خاک و مٹی سے ہے، مٹی سے ہی نباتات اُگیں، اس سے غذائی اجناس اور پھر حیوانات وجود میں آئے، غذا کو تیار کیا گیا، اسے انسان نے کھایا اور اسی غذا سے نطفہ تیار ہوا اور نطفہ رحم میں پہنچا اور پھر اس کے اگلے مراحل شروع ہوئے۔ نطفہ سے پہلے خون جما پھر وہ گوشت کا لوتھڑا بنا پھر گوشت پر تصویر کشی ہوئی، کچھ کی تصویر بنی اور اس نے اگلے مراحل طے کیے اور کچھ وہیں پر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کا مرحلہ ہوا کہ وہ ایک بچہ بنا، روح اس میں ڈالی گئی پھر صحیح وسالم بچہ پیدا ہو گیا، بچے نے نشو ونما پانا شروع کی۔ اس طرح اس نے زندگی کے مراحل گذارے، کچھ تو پہلے ہی مر گئے اور کچھ نے آخری عمر کا حصہ گذارا، بدنی نشو ونما ہوئی، کچھ اپنے بڑھاپے کو پہنچ گئے اور وہ ایسی عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ یادداشت بھی ختم کر بیٹھتا ہے۔[1]

اس کے بعد بعث کے مسئلہ کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال دی ہے کہ سردیوں میں زمین خشک و ویران ہو جاتی ہے پھر اللہ اس پر بارش اتارتا ہے، زمین میں حرکت آتی ہے اور خشک زمین سے نباتات اُگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ خشک درخت سے کونپلیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں موسم بہار آجاتا ہے ایک نئی زندگی زمین پر نظر آتی ہے، مردہ زمین کو پھر سے حیات ملتی ہے۔ یہ دو مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے اسی طرح جب سب مر جائیں گے

1 - سورہ یٰسؔ آیت ۶۸: ''وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِى الۡخَـلۡقِ‌ؕ اَفَلَا يَعۡقِلُوۡنَ'' ''جس کسی کو ہم طولانی عمر دیتے ہیں تو ہم اس کی خلقت میں کمی کرتے ہیں''۔

تو پھر اللہ تعالیٰ ایک ہی آواز سے سب کو زندہ کر دے گا اس کے لیے بچہ کے پیدائش کے مراحل اور مردہ زمین کا پھر زندہ ہونا یہ معاد کو قریب کرتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ۝۶

ترجمہ: ''یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔''

اللہ ہی حق ہے

انسان کی خلقت کے تمام مراحل بیان کرنے اور زمین کی ویرانی اور آبادی کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔ اسی کے ہاتھ میں تمام نباتات، جمادات، زمین، انسان، حیوانات سب کی آفرینش اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ہی حق ہے، اسی نے مردوں کو زندہ کرنا ہے کل ہستی کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ حاجی سبزواری نے اس بات کو خوبصورت شعر میں نظم کیا ہے:

ما ذاته بذاته لذاته　　　　موجد الحق العلی صفاته

''وہ جس کی ذات اس کی ذات سے قائم ہے اور اس کی ذات کے واسطے ہی ہے وہ ایسا موجود ہے جو حق ہے اور اس کی صفات بلند ہیں (وہ اپنی صفات میں بلند شان ہے)''

جس طرح اللہ تعالیٰ نے مردہ خاک سے زندہ موجود انسان کو خلق کیا ہے اور زمین سے پانی کے وسیلہ سے نباتات کو نکالتا ہے یہ امور اس ذات کے لیے آسان ہیں کیونکہ وہ ہر امر پر توانا ہے، وہ ہی ایجاد کرنے والا اور تدبیر کرنے والا ہے۔ پورے موجودات کی خلقت اور ان سب کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی خلقت اور تدبیر اسی طرح نباتات کی خلقت اور تدبیر اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ اللہ کی قدرتِ عام ہر شئی کو شامل ہے۔

وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ ۝۷

ترجمہ: ''اور بے شک قیامت آنے والی ہے جس میں کوئی شک نہیں، اور بے شک اللہ قبروں والوں کو دوبارہ اٹھائے گا۔''

قیامت کے دن مُردوں کا زندہ ہو جانا

یہ آیت سابقہ آیت پر عطف ہے۔ پچھلی آیت میں بعث کے مسئلہ کو اللہ کے حق ہونے سے ثابت کیا گیا اور یہ بتایا کہ خداوند سے ہمیشہ حق اور باطل سے عاری فعل صادر ہوتا ہے، اگر اللہ نے پورے عالم کے لیے کوئی مقصد و ھدف قرار نہ دیا ہو تو پھر یہ فعل عبث اور بے ہودہ ہو گا اور اللہ سے لغو اور بے ہودہ عمل سرزد نہیں ہوتا، لہٰذا بعث (دوبارہ اٹھایا جانا) اور معاد (واپس آنا) ہونا چاہیے جو اس خلقت کی غائت اور نہایت قرار پائے یہ بات اللہ کے حق ہونے سے استفادہ ہو کہ قیامت نے آنا ہے اور مردوں نے دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ جب سب زندہ ہوں گے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ ان کا احتساب ہو گا اس میں کسی قسم کا شک نہ ہے لیکن قیامت کی گھڑی ناگہانی آئے گی اور بغیر مقدمات کے آن موجود ہو گی کوئی بھی قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے آگاہ نہیں سوائے اللہ کے۔ اس گھڑی میں اللہ سارے سوئے ہوئے مردگان کو زندہ کر دے گا، انہیں قبروں سے باہر نکالے گا، سب کو حساب و بازپرس کے لیے لائے گا، سب عدل الٰہی کے سامنے پیش ہوں گے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ۙ ۝۸

ترجمہ: ''اور بعضًا وہ شخص ہے جو اللہ کے معاملہ میں بے سمجھی اور دلیل اور روشن کتاب کے بغیر تکبر سے جھگڑتا ہے۔''

معاد کے منکروں سے متعلق

اس آیت میں کچھ اور منکرین قیامت کا حوالہ دیا جارہا ہے کہ جنہوں نے حق سے رُخ موڑ لیا۔ کشف الکشاف کے بقول ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پیشواؤں کے بارے میں آیا ہے جن کے پیروکاروں کا آیت ۳ میں ذکر ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے افراد جو خود کو راہنما سمجھتے ہیں وہ دوسرے افراد کی گمراہی کا سبب بنتے ہیں خود ان کی حالت یہ ہے کہ بغیر دلیل، منطق اور علمی دلیل کے جھگڑا و مجادلہ کرتے ہیں، انکے پاس کوئی عقلی دلیل نہ ہے یہ لوگ ہدایت سے محروم ہیں، دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، ہاں علم پر مبنی دلیل ان کے پاس ہوتی ہے جو اللہ کی خالص بندگی کرتے ہیں، اللہ نے ان کے دل کو نور معرفت سے روشن کیا ہے وحی الٰہی اور طریق نبوت کے علاوہ تین ذرائع علم مطلق کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ ۱۔ عقل۔ ۲۔ آنکھ۔ ۳۔ کان۔ آخری دو حواس خمسہ سے ہیں۔ دو طریقے ہیں ایک باطنی ہے جو عقل سے عبارت ہے اور ایک ذریعہ ظاہری ہے جو کہ حواس سے ہیں، ان میں نمایاں آنکھ اور کان ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے بارے ایسی گفتگو کرتے اور اس پر اصرار کرتے ہیں جس کی بنیاد عقل و منطق پر نہیں اور نہ ہی اس کی عملی بنیادیں ہیں اس لیے ان کی بات کی کوئی حیثیت نہیں۔

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹

ترجمہ: ''تاکہ اللہ کی راہ سے بہکائے، اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، اور قیامت کے دن بھی ہم اسے دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔''

منحرف پیشواؤں کی کارستانیاں

(ثانی عطفہ) کا معنی اپنے پہلو کو توڑ ڈلا، یہ اعراض اور روگردانی سے کنایہ ہے۔

مشرکین کے رؤساء اور گمراہ پیشوا اس طرح ہیں کہ اللہ کے بارے جہالت پر مبنی مجادلہ و جھگڑا کرتے ہیں اور حق سے روگردانی کرتے ہیں، بڑے بنتے ہیں اس طرح عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دھمکاتے ہوئے فرمایا: ان کے لیے دُنیا میں ذلت و خوارگی ہے، رسوائی ہے اور قیامت کے دن جلانے والا عذاب ہے۔ اس بات کو سب نے دیکھا کہ قریش کے بڑوں کا دُنیا میں کیا حشر ہوا اور آخرت میں جلانے والا عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ؏ ۱۰

ترجمہ: ''یہ تیرے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

عذاب میں جلنے والوں سے خطاب

مشرکین کے جن راہنماؤں کو دُنیا میں ذلت و رسوائی کا سامنا ہو گا اور آخرت میں جلانے والا عذاب، تو جب وہ عذاب میں پھینکے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا یہ عذاب ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے انجام دیئے اور آگے بھیجے۔ اللہ اپنے بندگان پر ظلم نہیں کرتا، ہر اک کو وہی ملتا ہے جو اس کے اعمال کا تقاضا ہوتا ہے ہر ایک کو وہ ملتا ہے جس کا وہ حق دار ہوتا ہے جو کچھ اس نے اپنی زبان سے، اپنے ہاتھ سے، اپنے کردار اور گفتار سے انجام دیا ہوتا ہے۔ اس کا ہی اسے بدلہ دیا جاتا ہے، کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: ''اور بعض وہ لوگ ہیں کہ اللہ کی بندگی کنارے پر ہو کر کرتے ہیں، پھر اگر اسے کچھ فائدہ پہنچ گیا تو اس عبادت پر قائم ہو گیا، اور اگر تکلیف پہنچ گئی تو منہ کے بل پھر گیا، دنیا اور آخرت گنوائی، یہی وہ صریح خسارہ ہے۔''

اللہ کی مشروط عبادت کرنے والے

(حرف) کا معنی کنارہ، پہلو، جانب ہوتا ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ لوگوں سے ایک گروہ ایسا ہے جو ایک پہلو سے اللہ کی عبادت کرتا ہے اللہ کی مشروط عبادت کرتا ہے، اچھائی ملے تو خوش ہو جائے اور اللہ کی تعریف کرے اور اگر تکلیف پہنچے تو پھر شکوہ کی زبان کھول دے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر صالح اور بے ایمان قرار دیا ہے۔ یہ لوگ اللہ کی پرستش دُنیاوی مفاد کے لیے کرتے ہیں جس کا لازمہ یہ ہے کہ دین دنیا کے لیے قرار پائے۔ ایسے آدمی کو اگر دُنیاوی خیر اور فائدہ مل جائے تو وہ اللہ کی عبادت کو جاری رکھتا ہے اور اللہ سے دل لگاتا ہے۔ اطمینان اس میں آجاتا ہے لیکن اگر آزمائش و امتحان ہو، رنج، تکلیف، درد، بیماری، نقصان کا سامنا ہو تو اللہ سے رُخ موڑ لیتا ہے دین سے پھر جاتا ہے، دین کو بدبختی قرار دیتا ہے، اس فتنہ اور آزمائش سے نجات کی اُمید میں دین سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

اللہ فرماتا ہے یہ لوگ سرگرداں ہیں ان کا کوئی سہارا نہیں ہے یہ لوگ دُنیا میں بھی خسارہ میں ہیں کہ انہیں مشقت و تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے، اللہ سے رُخ موڑنے اور دین کو چھوڑنے کی وجہ سے آخرت کا بھی خسارہ ہے یہ خسارہ کھلا اور واضح ہے، دُنیا کی خیر نصیب ہو گی

نہ آخرت میں آرام نصیب ہو گا، ان کا انجام جہنم ہے۔

يَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَ مَا لَا يَنۡفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِيۡدُ ۚ﴿۱۲﴾

ترجمہ: ''اللہ کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو نہ اسے ضرر دے سکے اور نہ اسے فائدہ پہنچا سکے، یہی وہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے۔''

يَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰى وَ لَبِئۡسَ الۡعَشِيۡرُ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: ''ایسے کو پکارتا ہے جس کا ضرر اس کے نفع سے نزدیک تر ہے، ایسا کارساز بھی برا اور ایسا رفیق بھی برا ہے۔''

غیر خدا کی پرستش کرنے والے

وہ لوگ جو اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا معبود بناتے ہیں اور ان سے اپنی حاجات پوری کروانا چاہتے ہیں (غیر خدا سے مراد اس جگہ وہ پتھر کے گھڑے بت ہیں جن کی مشرکین پرستش کرتے تھے) یہ معبود نہ انہیں فائدہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان میں شعور ہے نہ ارادہ، ان کے ہاتھ میں اسباب کی باگ ڈور نہیں ہے۔ یہ بت عبادت کرنے والوں کو کوئی فائدہ دے سکتے ہیں نہ نقصان، اور اگر اس شخص کو کوئی فائدہ ملے گا تو وہ خود اسی عبادت کا ملے گا جو اس نے کی ہے اس معبود کی طرف سے اسے کچھ نہ ملے گا جس کی وہ عبادت کر رہا ہے۔

پھر ان کے بارے اس طرح بیان کیا کہ جو شخص بتوں کی پرستش کرتا ہے وہ خود ہی قیامت کے دن ان بتوں کا اس طرح وصف بیان کرے گا کہ میں نے دُنیا میں جسے اپنا مولا اور آقا قرار دیا اور اسے اپنا مصاحب بنایا اس کا نقصان نفع سے زیادہ تھا اور میں قسم اٹھا کر یہ کہتا

ہوں کہ یہ کتنا ہی برا مولا تھا اور کتنا برا ہمنشین تھا۔ بت پرست جب قیامت کے دن بت پرستی کے برے اثرات کا مشاہدہ کرے گا جو کہ عذاب جاودانی ہے اور ہمیشہ کی ہلاکت، تو اسی بناء پر وہ اس قسم کی گفتگو کرے گا جو کہ حقیقت پر مبنی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: ”بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

مومنین و صالحین کا انجام

اولیاء کفر کا انجام بیان کرنے کے بعد مومنین و صالحین کے انجام کو بیان کیا جا رہا ہے۔ شیطان پرستوں، بت پرستوں اور وسواس پرستوں کے انجام کو بیان کیا، ان کے مدمقابل ایک اور گروہ ہے جو مومنین و صالحین ہیں، اللہ پر ایمان ہے اور اللہ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں، عبادت گذار ہیں، صالح ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے حسن عقیدہ اور عمل صالح کی بناء پر انہیں بہشتی باغات میں وارد کرے گا جہاں ہر طرح کی آسائش اور خوش گذارنی کا سامان موجود ہوگا۔ باغات کے نیچے صاف و شفاف پانی کی نہریں جاری ہوں گی، اللہ جو ارادہ کرے اسے انجام دیتا ہے۔ اللہ ہی نے ایسے افراد کے اچھے انجام، ان کے لیے عزت و کرامت و حرمت کا ارادہ کیا ہے اور جو چاہا ہے وہ انہیں عطا کیا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۝۱۵

ترجمہ: ''جسے یہ خیال ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی ہر گز مدد نہ کرے گا اسے چاہیے کہ چھت میں ایک رسی لٹکائے پھر اسے کاٹ دے پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اس کے غصہ کو دور کرتی ہے۔''

اسباب کے متعلق مشرکین کا غلط خیال

ہر وہ چیز جس کے ذریعہ دوسری چیز حاصل ہو جائے تو اس پہلی چیز کو دوسری کا سبب کہا جاتا ہے۔ مشرکین کا خیال یہ تھا کہ جو دین رسول اللہ ﷺ لائے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور یہ دین صداقت پر مبنی نہیں ہے، اس کی بنیاد محکم نہیں ہے اسی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ اللہ ان کی مدد نہیں کرے گا، ان کی دعوت عام نہ ہو گی اور ان کی دعوت ختم ہو گی لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ہجرت کی، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کی نصرت فرمائی اور اللہ کا دین عالمگیر ہو گیا۔ یہ واقعہ غیر متوقع تھا جس سے مشرکین کو سخت غصہ آیا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان مشرکین کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ مشرکین خیال کرتے ہیں کہ اللہ اپنے نبی، رسول کی نصرت نہ کرے گا اور دُنیا میں ان کا نام بلند نہ ہو گا اور آخرت میں اللہ کی رحمت اور مغفرت ان کے شامل حال نہ ہو گی اور ان کے پیروکاروں کی بھی نصرت نہ کرے گا۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس کا دین پھیل رہا ہے ایسی باتیں کرنے والوں کو چاہیے کہ ایک بڑا رسہ لیں اور اسے ایک بلندی سے باندھ دیں اور اسے نیچے کی طرف لٹکا دیں اور خود کو اس میں لٹکا دیں اور پھر خود دیکھیں کہ ان کا یہ غم و غصہ ختم ہوتا ہے یا نہیں!

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ اپنے رسول کی دُنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا تو وہ آسمان پر جائے پھر اس مسافت کو طے کرے پھر دیکھے یہ ان کی سازش اور غصہ کی باتیں جو کر رہے ہیں اور انہیں اللہ کے فیصلہ پر غصہ آرہا ہے کہ یہ لمبی مسافت تمہیں اس غضب سے نجات دے سکتی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: "اور اسی طرح ہم نے اس قرآن کو واضح آیتیں بنا کر نازل کیا ہے، اور بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

قرآنی آیات کا وصف

اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات کا وصف اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم نے ان آیات کو اُتارا ہے اور یہ آیات واضح اور روشن ہیں۔ یہ بات اسی طرح ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے اس کو حُسنِ عقیدہ اور حُسنِ عمل کی طرف ہدایت فرماتا ہے اور جس نے سوءِ عقیدہ کیا ہے اور فسق و گناہ میں ہے تو اللہ ان کے لیے ہدایت نہیں دیتا کیونکہ اس نے خود ہی اپنے لیے ایسا راستہ اپنایا ہے کہ وہ اللہ کی واضح اور روشن آیات کے باوجود ان سے ہدایت نہ لے۔ اس لیے قرآنی ہدایت ان کے لیے نہیں ہے ان آیات کی تاثیر ان پر نہ ہو گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـِٕيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا ۖۗ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: "بے شک اللہ مسلمانوں اور یہودیوں اور صابیوں اور عیسائیوں اور مجوسیوں اور مشرکوں میں قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، بے شک ہر چیز اللہ کے سامنے

ہے۔"

مختلف گروہوں کا تعارف

مومنین سے اہل اسلام مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہیں، یہود سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے جو انبیاء گزرے ان کے پیرو مراد ہیں، ان کی کتاب توریت ہے، بخت نصر جو بابل کا بادشاہ تھا اس نے ساتویں صدی قبل از مسیح ان پر غلبہ کیا، انہوں نے توریت کو جلا دیا اور کافی عرصہ یہ بالکل ہی نابود ہو گئے یہاں تک کہ (کورش) بادشاہ ایران کے زمانہ میں عزرای کاھن نے بابل کو فتح کیا اور بنی اسرائیل کو اس سے نجات دلائی اور مقدس سرزمین کو واپس لے لیا اور وہ توریت کو تحریر میں لے آیا۔ صائبین سے مراد وہ ہیں جو یہود اور مجوس کے درمیانی عرصہ میں تھے ان کی آسمانی کتاب کی نسبت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرف ہے کہ جس میں وہ انسانوں کی سرنوشت اور تقدیر میں کواکب اور برجوں کی تاثیر کے قائل تھے۔[1]

نصاریٰ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے پہلے آنے والے انبیاء کے معتقدین مراد ہیں۔ ان کی چار مقدس کتابیں ہیں (لوقا، مرقس، یوحنا، متی) جو عہد قدیم کی کتب ہیں۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ مسیحیوں کی کتاب انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، مجوس سے مراد وہ قوم ہے جو زرتشت کے معتقد تھے، ان کی مقدس کتاب اوستا نام کی ہے۔[2] جب اسکندر نے ایران پر غلبہ حاصل کیا تو یہ بالکل نابود ہو گئے بعد میں ساسانی بادشاہوں کے دور میں دوبارہ ان کی کتاب کو تحریر کیا یہ لوگ پورے عالم کو اھورامزدا سے

1۔ صائبیوں کے بارے یہ بھی ہے کہ وہ ادریس کو اپنا نبی قرار دیتے ہیں، قرآن کے مطابق وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے پیغمبر ہوئے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں اوپر اٹھالیا ہے اور وہ بلند مقام پر زندہ ہیں۔

2۔ قوی احتمال ہے کہ مجوس وہی گروہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معتقد تھے۔

منسوب قرار دیتے ہیں لیکن عالم کی تدبیر کے دو منبع ہیں۔ ا۔یزداں۔ ۲۔ اھر یمن، یا نور اور ظلمت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ عناصر بسیط بالخصوص آگ کو مقدس سمجھتے ہیں۔[1]

مشرکین سے مراد بت پرست ہیں یا وثنی ہیں جن کے مذھبی گروہ تین ہیں: ا۔ وثنیت صابئہ۔ ۲۔ وثنیت برھمائیہ۔ ۳۔ بدھ مت۔ لیکن ان تین کے علاوہ بھی کچھ اور ہیں جو بت پرست ہیں بغیر اس کے کہ وہ اپنی پرستش کے بارے کسی منظّم اصل پر استوار نہیں ہے ان میں حجاز اور دوسرے علاقوں کے بت پرست شامل ہیں۔ یہ صورتحال ہے کہ انسانوں میں کون کون سے عقائد موجود ہیں اور کون کون سے مذاھب وادیان وروشیں اپنائے ہیں۔

اللہ نے واضح اعلان کر دیا کہ قیامت کا دن جب آئے گا تو سب ہی وہاں حاضر ہوں گے ان کے اختلافی نظریات و خیالات کے باوجود سب کا فیصلہ اللہ کے حضور ہو گا حقدار اور باطل پرستوں کا پتہ چل جائے گا اس کے آخر میں فرمایا کہ اللہ ہر ایک پر گواہ ہے لہٰذا اللہ ہی کا حکم و فیصلہ برحق ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيۡرٌ

1۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور امر الٰہی سے وہ ٹھنڈی ہو گئی اور گلستان ہو گئی اس لیے وہ اسے مقدس قرار دیتے ہیں۔

مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چار پائے اور بہت سے آدمی اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت سے ہیں کہ جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے، اور جسے اللہ ذلیل کرتا ہے پھر اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا، بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

اللہ کا سجدہ کرنے والے

اس جگہ تمام ان لوگوں کو خطاب کیا ہے جو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آیت میں رؤیت (دیکھنے) سے مراد جاننا اور سمجھنا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس جگہ خطاب فقط رسول اللہ ﷺ کو ہو، اگر ایسا ہو تو اس جگہ رویت قلبی مراد ہو گی۔

سجدہ کو جب غیر عقلاء کی طرف نسبت دی جائے تو اس سے سجدہ تکوینی مراد ہے کہ سب اللہ کے فرمان کے تابع ہر وہ کام کر رہے ہیں جن کے لیے اللہ نے انہیں خلق کیا ہے یعنی وہ اللہ کی اطاعت میں ہیں۔ اس جگہ سجدہ تشریعی و تکلیفی نہیں، جو ذوی العقول کے لیے خاص ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ تمام موجودات اللہ کی عظمت کے سامنے حقیر و پست ہیں اور سب اللہ کے سامنے مطیع و فرمانبردار ہیں، سب اللہ کی سلطنت میں ہیں اور ''من'' کا لفظ جو ہے ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کو شامل ہے اور انسانوں میں مومن و کافر سب شامل ہیں کیونکہ ذوی العقول بھی تکوینی طور پر اللہ کی اطاعت میں ہیں اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ سب اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ کی عظمت و کبریائی کے سامنے مطیع ہیں حتیٰ کہ کافر اپنی معصیت و

نافرمانی کے باوجود اللہ کے تسلط سے باہر نہیں ہیں۔ سجدہ کرنے والوں میں آسمان و زمین اور دیگر موجودات کا ذکر انسان کے ساتھ کر دیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ سمجھانا مقصود ہے کہ تکوینی سجدہ میں تمام مخلوقات عُلوِی ہوں یا سفلی، ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول، عقلمند ہوں یا غیر عاقل، سب کے سب اپنے وجود میں، اپنی موجودیت کے اعتبار سے اللہ کی عظمت، عزت و کرامت اور کبریائی کے سامنے ذلیل، خاضع اور مطیع ہیں۔ مسلسل اپنی ہستی اور موجودیت کے تحت تکوینی اور اضطراری سجدہ کر رہے ہیں۔

انسانوں کا سجدہ کرنا

انسانوں کے بارے بیان کیا کہ بہت سارے اللہ کا سجدہ کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے مرحلہ پر سجدہ سے مراد تکوینی سجدہ ہے اور دوسرے مرحلہ پر جب انسان کو علیحدہ کرکے بیان کیا ہے تو اس سے سجدہ تشریعی اور تکلیفی مراد ہے، سجدہ تکلیفی میں بندگی کی حقیقت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ نوع اول کے سجدہ سے مختلف ہے کیونکہ اس جگہ وہی سجدہ مراد ہوتا تو پھر سب انسانوں کو (کافر و مومن) شامل ہوتا، پھر یہ نہ کہا جاتا کہ انسانوں کی کثرت سجدہ کرتی ہے اور جو سجدہ نہیں کرتے ان پر عذاب ہوگا۔

بتایا کہ بہت سارے ہیں کہ سجدہ تشریعی نہیں کرتے وہ دین حق سے رُخ موڑے ہوئے ہیں تو اللہ نے ان کے لیے عذاب کو حتمی قرار دیا ہے اس جگہ عذاب کے حتمی ہونے کی وجہ ان کے سجدہ نہ کرنے کو قرار دیا ہے تو یہ اس بات کو بتاتا ہے کہ یہ ان کا عمل ہی ہے جو عذاب میں تبدیل ہو جائے گا اور اگلے جملہ کے لیے تمہید بھی ہے کہ اللہ جسے ذلیل و خوار کر دے تو پھر اسے کوئی بھی عزت دینے والا نہیں ہے کیونکہ عذاب بھگتنے والے سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوں گے تو آخرت میں انہیں بالکل کرامت اور خیر و بہتری نہ ملے گی۔ آخر میں قدرت الٰہی کے کمال اور عمومیت کو بیان کرنے اور پہلے کے بیان کی وجہ بیان کرنے کی

غرض سے فرمایا کہ اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اللہ ہر امر پر قادر ہے کوئی بھی اللہ کے حکم سے مانع نہیں ہو سکتا۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ ۱۹

ترجمہ: ''یہ دو فریق ہیں جو اپنے رب کے معاملہ میں جھگڑتے ہیں، پھر جو منکر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے گئے ہیں، ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔''

انسانوں کے دو گروہ

اس جگہ دو گروہ جو آپس میں جھگڑتے اور مخاصمت کرتے ہیں اس سے انسانوں کے دو گروہ مراد ہیں، مومن اور کافر۔ ا۔ سجدہ کرنے والے اور مومن صالح ہیں۔ ۲۔ سجدہ کا انکار کرنے والے، کافر، ملحد، مشرک ہیں۔

لہٰذا تمام انسانوں کو دو گروہوں میں منحصر کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ حق پر چلنے والے۔ ۲۔ باطل پر چلنے والے۔

اس مطلب کو بہت ہی لطافت اور عمدگی سے بیان کیا ہے کہ ان کا جھگڑا اللہ کی ربوبیت کے بارے ہے۔ جو حق والے ہیں وہ اپنے رب کو ان صفات و اسماء سے یاد کرتے ہیں جن کا وہ لائق ہے۔ ایسے افعال کی نسبت اس کی طرف دیتے ہیں جو اس کی شان کے لائق ہے اور وہ اپنے رب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کے تقاضا کے تحت وہ اعمال صالح انجام دیتے ہیں۔

دوسرا گروہ کافروں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کرتے ہیں، ایجاد اور خلقت کو طبیعت اور مادہ کی طرف نسبت دیتے ہیں یا رسالت اور نبوت کے منکر ہیں یا دین میں جو ضروری

امور ہیں ان کا انکار کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں حق کا انکار کر دیتے ہیں اور کفر اپنا لیتے ہیں۔ حق پر پردہ ڈالتے ہیں پھر ان دونوں جماعتوں کی توصیف کو بیان کیا ہے۔ کافروں کے بارے پہلے بتایا ہے کہ انہیں آگ سے تیار لباس پہنایا جائے گا اور ان کے سروں پر کھولتا گرم گرم پانی ڈالا جائے گا اس کے بعد بتایا کہ اس گرم پانی کے نتیجہ میں ان کی انتڑیاں اور جسم کی ہڈیاں اور چمڑا سب پگھل جائے گا۔ چوتھی بات ان پر لوہے کے گرز برسائے جا رہے ہوں گے، گرم سلاخوں سے انہیں عذاب دیا جا رہا ہو گا آگ کے ہتھوڑے ان پر برس رہے ہوں گے۔ عذاب کی حالت میں یہ چیختے چلاتے ہوئے وہاں سے نکلنا چاہیں گے تو انہیں دوبارہ بھڑکتی آگ میں پھینک دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ تم بھڑکتے جلاتے عذاب کا مزہ چکھو۔ انہیں دوزخ کے عذاب سے چھٹکارا نہ ملے گا وہ عذاب سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے لیکن انہیں دوبارہ اس میں ڈال دیا جائے گا۔

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾

ترجمہ: ''جس سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اور کھالیں جھلس دی جائیں گی۔''

وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾

ترجمہ: ''اور ان پر لوہے کے گرز پڑیں گے۔''

كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: ''جب گھبرا کر وہاں سے نکلنا چاہیں گے تو اسی میں لوٹا دیے جائیں گے، اور دوزخ کا عذاب چکھتے رہو۔''

اِنَّ اللّٰهَ یُدۡخِلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّ لُؤۡلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمۡ فِیۡهَا حَرِیۡرٌ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں انہیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔''

وَ هُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ ۚۖ وَ هُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: ''اور انہوں نے عمدہ بات کی راہ پائی، اور تعریف والے اللہ کی راہ پائی۔''

مومنوں کے لیے انعام

ان آیات میں کافروں کے مدمقابل مومنوں کو جو کچھ ملے گا اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

1) مومنین صالحین جنت الفردوس میں ہوں گے۔

2) جنت کے اندر نہریں جاری ہوں گی۔

3) طلائی اور مروارید جڑے زیورات میں آراستہ ہوں گے۔

4) خوبصورت لباس پہنے ہوں گے۔

5) ان کے لیے بہترین مقامات ہیں اور وہ بہترین کیفیت میں ہوں گے۔

6) وہ پاکیزہ گفتگو کریں گے جس میں بے ہودگی اور لغو بات نہ ہو گی، اللہ نے انہیں یہ صلاحیت عطا کی ہے۔

7) انہیں صراط مستقیم کی ہدایت ہوئی کہ ان سے پسندیدہ اعمال ہی سرزد ہوتے

ہیں، بات اچھی کرتے ہیں اور اعمال خوبصورت ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ ؕ وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: ''بے شک جو منکر ہوئے اور لوگوں کو اللہ کے راستہ اور مسجد حرام سے روکتے ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے کہ وہاں اس جگہ کا رہنے والا اور باہر والا دونوں برابر ہیں، اور جو وہاں ظلم سے کجروی کرنا چاہے تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

مشرکین مکہ کے بارے

اس جگہ '' اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا '' سے مشرکین مکہ مراد ہیں جو اسلام کی پیروی سے سختی سے لوگوں کو روکتے تھے اور انہیں مسجد الحرام میں شعائر الٰہی (عبادات) انجام دینے سے منع کرتے تھے۔ اس پر وہ قائم تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کو متوجہ کیا ہے کہ دیکھو مسجد الحرام سب کے لیے ہے، جو مکہ کے رہائشی ہیں ان کے لیے بھی ہے اور جو مسافر آئے ہوئے ہیں ان کے لیے بھی ہے۔ پھر مسجد الحرام تو سب لوگوں کے لیے عبادت کی جگہ ہے یہ تو کسی خاص گروہ کے لیے نہیں، پھر مشرکین کو دھمکی دی ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ حد سے تجاوز اور کھلا الحاد ہے اس کی سزا سخت ہے اور ہم تمہیں دردناک عذاب کا ذائقہ چکھائیں گے۔

وَ اِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰہِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِکۡ بِیۡ شَیۡئًا وَّ طَہِّرۡ بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡقَآئِمِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے کعبہ کی جگہ معین کر دی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھ۔''

ابراہیمؑ کے لیے فرمان

اس جگہ پر اس گھر کے بنانے کا تذکرہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ عبادت کرنے والے آکر اس جگہ عبادت کریں اسے اپنے لیے رہائش گاہ نہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نبی ابراہیم کو وحی بھیجی کہ وہ اس گھر کو عبادت کے لیے قرار دے۔ پھر یہ بھی ان سے کہہ دیا کہ کسی کو میرا شریک نہ ٹھہرایا جائے اس جگہ شرک سے منع کرنے سے مراد یہ ہے کہ عبادت کرنے میں میرا شریک کسی کو نہ بنائیں کیونکہ اس گھر میں عبادت کی بات ہو رہی ہے۔ حج کی عبادت میں جو اعمال ہیں، تلبیہ ہے، طواف ہے، سعی ہے، وقوف ہے اور دیگر اعمال و مناسک سب میں اللہ کی رضا اور قرب مد نظر ہو۔

پھر وضاحت کے ساتھ فرما دیا کہ اس گھر کو پاک کرنے کا حکم دیا طواف کرنے والوں، سجدہ کرنے والوں، رکوع کرنے والوں کے لیے شرک کی نجاست و پلیدی سے اس گھر کو پاک کر دو، اس گھر میں عبادت کرنے والوں کے لیے کوئی شرک والی چیز موجود نہ ہو یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صحیح عبادت کی تعلیم دی جو ہر قسم کے شرک سے عاری و خالص ہو۔

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: ”اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے کہ تیرے پاس پا پیادہ اور پتلے دبلے اونٹوں پر دور دراز راستوں سے آئیں۔“

حج کی عبادت کا اعلان

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ بلند آواز سے لوگوں میں حج کے اعمال بجا لانے کا اعلان کریں۔ حج کا لغوی معنی قصد و ارادہ ہے۔ حج الی اللہ یعنی اللہ کی طرف قصد کرنا، اللہ کے گھر کا حج یعنی اللہ کے گھر پہنچ کر اللہ کی عبادت بجالانے کا قصد و ارادہ، اس اعلان میں عمومیت ہے کہ چاہے وہ پیدل آنے والے ہوں یا سواریوں پر، ایسے حیوانات پر جو سفر کی وجہ سے لاغر اور کمزور پڑ گئے تھے، قریب سے آئیں یا بہت دور سے آئیں، سب کے لیے حج کے مناسک کا اعلان کریں اور انہیں حج کے اعمال بجالانے کی تعلیم دیں۔ کل سے مراد سب یا تمام نہیں بلکہ اس سے سب لوگوں کی کثرت ہے کہ زیادہ تعداد میں دُور دراز علاقوں سے آنے والوں کو حج کے اعمال کی تعلیم دو اور یہ بتاؤ کہ انہوں نے اس عبادت کو کیسے انجام دینا ہے۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: ”تاکہ اپنے فائدوں کے لیے آ موجود ہوں اور تاکہ جو چارپائے اللہ نے انہیں دیے ہیں ان پر مقررہ دنوں میں اللہ کا نام یاد (قربانی) کریں، پھر ان میں سے خود بھی کھاؤ اور محتاج فقیر کو بھی کھلاؤ۔“

حج کے فوائد اور جانوروں کی قربانی

یہ لوگ آپ کی آرزو پر لبیک کہتے ہوئے حج کے لیے آئیں گے تاکہ دُنیاوی منافع کو دیکھ سکیں۔ جب دُنیا بھر سے لوگ مختلف ملتوں، قبیلوں سے متعلق ہوں گے جب وہ اس جگہ آئیں گے، رنگ و نسل زبان مختلف، لیکن سب ایک جگہ جمع ہوں گے یہ اس جگہ ایک دوسرے سے آگاہ ہوں گے، آپس میں تعلقات بنیں گے، سب ایک ہی کلمہ حق پر متحد ہیں بس کعبۃ اللہ کے گرد طواف کر رہے ہیں، سب ایک رب کے آگے تسلیم ہیں ان کا یہ روحانی اتحاد جسمانی وحدت کا سبب بنے گا جس کی بناء پر ایک چھوٹی سوسائٹی بڑے معاشرہ کو تشکیل دے گی، اس طرح ایک بڑی اُمت اور ملت بن جائے گی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں اکٹھی ہو کر ہی ایک بڑی جماعت بنتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی مشکلات کو حل کرتے ہیں، اس طرح ان میں پیار و محبت پیدا ہو جاتی ہے ایسی مربوط اور باہم متحد اُمت کو پھر کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

اس کا دوسرا حصہ اُخروی منافع بیان کر رہا ہے کہ جب مختلف عبادتی اعمال سے اللہ کا تقرب حاصل کیا جائے گا آدمی کا عمل اور گفتار دونوں میں وحدت کا مظاہرہ ہو گا۔ حج کا عمل ایسا ہے جس میں بہت ساری عبادات موجود ہیں بعض لذائذ کو ترک کیا جاتا ہے جو عام حالات میں حلال اور جائز ہے اسے بھی چھوڑا جاتا ہے۔ اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے دُنیاوی اعمال میں محدودیت آجاتی ہے۔ عبادت میں طواف، سعی کی مشقت برداشت کی جاتی ہے۔ لمبے سفر کی صعوبت اٹھائی جاتی ہے، وقوف کی مشقت اٹھائی جاتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کے پاس نماز ادا کرنا، انفاق کرنا، جانور کی قربانی دینا، ایک لباس اور ایک مقصد کے تحت آجانا اس کے علاوہ چھوٹے بڑے حج کے اعمال ان میں سے ہر ایک عمل انسان کے جسم اور جان میں تبدیلی لانے کا سبب ہے لہٰذا حج کا عمل عبودیت کے لیے ایک مکمل عبادتی تربیتی ورکشاپ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ توحید کے سارے مراحل، شرک کی نفی اور عبودیت میں اخلاص کو ان اعمال میں مجسم کر دیں۔ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ واضح کہہ دیا کہ یہ گھر بنایا ہے کہ لوگ اس کے پاس آئیں، اس کا رُخ کریں، وحدت کا عملی مظاہرہ کریں اور پھر اس جگہ مخصوص اعمال انجام دے کر عملی طور پر توحید پرستی اور عبادت میں اخلاص کا مظاہرہ کریں۔ حج کے اعمال میں ایک عمل کو بیان کیا کہ چند مخصوص دنوں میں اللہ کا ذکر کیا جائے اس سے مراد ایام تشریق ہیں۔ (دس، گیارہ، بارہ، تیرہ، ذوالحجہ) ان دنوں میں خاص طور پر ذکر الٰہی کا حکم دیا گیا ہے۔

قربانی کا حکم

اس کے بعد ایک اور حکم دیا ہے اور وہ ہے جانوروں کی قربانی کرنا۔ پہلے تو یہ واضح بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو آپ کی روزی کا ذریعہ بنایا ہے، اب حکم دیا ہے کہ ان جانوروں کو ذبح کرو، ان پر اللہ کا نام پڑھو اور پھر اس کے گوشت کو کھاؤ۔ مشرکین بتوں کے سامنے جانوروں کو لے جا کر ذبح کرتے، اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی کر دی اور بتا دیا کہ اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کیے جائیں پھر اس کے گوشت کے بارے فرمایا کہ اس سے خود کھاؤ اور فقراء اور محتاجوں کو اس گوشت سے کھلاؤ۔ پہلا حکم اباحی اور ترجیحی ہے یعنی اس گوشت سے خود کھانا واجب اور ضروری نہیں لیکن دوسرا حکم جو ہے وہ الزامی اور واجب ہے کہ محتاجوں اور فقراء کو ضرور کھلائیں۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝٢٩

ترجمہ: ”پھر چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں۔“

صفائی ستھرائی کا حکم

"نفث" سے بدن کی میل کچیل مراد ہے، بڑھے ہوئے ناخن، بال وغیرہ۔ اس جگہ حکم دیا ہے کہ احرام پہننے کی وجہ سے بدن میں جو میل کچیل آگئی ہے جیسے ناخنوں کا بڑھ جانا، بالوں کا بڑھ جانا اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ یہ امر کنایہ ہے احرام کی حالت سے باہر آجاؤ۔ تقصیر کے حکم کی طرف اشارہ ہے اسی طرح یہ بھی بتایا کہ اگر نذر و عہد کے ذریعہ کچھ واجب ہو چکا ہے تو اسے انجام دو اس سے مراد اھل البیت علیہم السلام کی تفسیر کے مطابق طواف نساء ہے اسے انجام دو کیونکہ احرام سے باہر آنا اور احرام کی وجہ سے جو امور حرام ہوئے تھے ان سب کا حلال ہونا، طواف نساء کو انجام دینے کے بعد ہی ہو گا۔ مناسک حج کا یہ آخری عمل ہوتا ہے۔

بیت عتیق

کعبہ کو پرانا گھر کہا گیا ہے کیونکہ جس طرح قرآن نے بیان کیا ہے کہ زمین پر پہلا گھر جو بنایا گیا وہ یہی کعبہ ہی تھا، اللہ کی عبادت کے لیے پہلا گھر بنایا گیا۔ اس زمانہ میں جب یہ آیت آتی ہے تو اس گھر کی تعمیر پر دو ہزار سال گزر چکے تھے اب ساڑھے چار ہزار سال سے زیادہ ہو رہے ہیں۔[1]

1۔ واضح رہے کہ یہ جو مدت بیان کی گئی ہے یہ اس وقت سے ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کی تھی وگرنہ اس گھر کی سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کی تھی جسے دس ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اگر ہمارے آدم سے پہلے ادوار کی بات کریں تو پھر اس کی عمر لاکھوں سال ہو گی۔ (۲۶ مارچ ۲۰۲۰ء، یکم شعبان ۱۴۴۱ھ ق، ۱۳۹۹ھ ش)

ذٰلِكَ ۗ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾

ترجمہ: ’’یہی حکم ہے اور جو اللہ کی معزز چیزوں کی تعظیم کرے گا سو یہ اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بہتر ہے، اور تمہارے لیے مویشی حلال کر دیے گئے ہیں مگر وہ جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، پھر بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی پرہیز کرو۔‘‘

اللہ کے احکام کا احترام

اللہ کے سارے احکام محترم ہیں، ان کی اہانت حرام اور ناجائز ہے۔ اللہ کی حرمتوں کا پاس کیا جائے، اللہ کے فرامین اللہ کی حرمت ہے۔ اس جگہ اللہ فرمارہا ہے کہ ہم نے جو حج کے شعائر اور مناسک کو بیان کیا یہ سب اللہ کے محرمات ہیں، لوگوں کی تشویق کے لیے فرمایا کہ جو بھی الٰہی محرمات کو محترم شمار کرے، ان کی عزت کرے، ان کا پاس و لحاظ رکھے اور اللہ کی حدود سے آگے نہ بڑھے تو اس کا یہ عمل اللہ کے ہاں نیکی شمار ہوتا ہے اس کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو حلال رزق انسان کے لیے قرار دیا ہے ان میں جانوروں کا گوشت ہے اور یہ جانوروں کے دوسرے منافع کے علاوہ ہے البتہ ان میں وہ شئی نہیں جن کا استعمال جائز نہیں ہے انہیں دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورہ انعام میں اسے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کن جانوروں کا گوشت حلال ہے اور کون کون سی چیزیں ان کے بدن سے حلال نہیں اور اسی طرح کونسے جانور ہیں جن کا گوشت حلال نہیں ہے۔ حلال گوشت جانور کے لیے بتایا کہ اللہ کا ذکر کرکے انہیں ذبح کروگے تو تمہارے لیے ان کا گوشت کھانا حلال ہوگا۔

سورہ انعام میں ہے کہ جانور کو غیر خدا کے نام پر ذبح کرنے سے گوشت حرام ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عمل سے روک دیا ہے آخر میں فرمایا: بے ہودہ اور باطل گفتگو مت کرو، بتوں کی نجاست اور پلیدی سے بچو کیونکہ مشرکین بتوں کا قرب حاصل کرنے کے لیے قربانی پر بتوں کا نام لیتے تھے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے پلیدی اور نجاست قرار دیا ہے اور یہی باطل ہے جس سے منع کیا ہے۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: ''خاص اللہ کے ہو کر رہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر اسے پرندے اچک لیتے ہیں یا اسے ہوا اڑا کر کسی دور جگہ پھینک دیتی ہے۔''

اللہ کے موحد بندے

حنیف اسے کہتے ہیں جو افراط اور تفریط سے بچے اور درمیانی راستے کا انتخاب کرے، اس جگہ حنفاء سے مراد وہ لوگ جنہوں نے بتوں کی پرستش کو چھوڑ دیا، شرک سے پرہیز کیا، دو جملوں سے اس مطلب کو بیان ہے۔ حنفاء للہ اور غیر مشرکین، اس میں خطاب مشرکین سے ہے، پچھلی آیت میں کہا گیا اے لوگو! تم باطل بات کو چھوڑ دو اور بتوں کے نام پر قربانی مت کرو جبکہ تم تو غیر خدا سے رُخ موڑنے والے اور اپنے اعمال میں شرک نہ کرنے کے پابند ہو، تو پھر باطل گفتگو کیوں اور بتوں کے نام پر قربانی کیوں؟ کیونکہ مشرکین حج کے عمل میں تلبیہ پڑھتے تھے اس میں تو کہتے تھے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے پھر کہتے ہو مگر وہ شریک جس کا تعلق خود تیری ذات سے ہے، اے اللہ تو اور تیرا اپنا شریک توں اس شریک کا

بھی مالک ہے اور اس کا بھی مالک ہے جس کا وہ مالک ہے؛ تو اللہ نے فرمایا کہ اللہ کا کسی کو شریک قرار نہ دو اور مشرکین نہ بنو۔ پھر فرمایا جو شرک کرے گا شرک پر مبنی عمل میں جا پڑتا ہے اور انسانیت کے درجات سے سقوط کرکے گمراہی کی وادی میں جا گرتا ہے، اس طرح شیطان اس کا شکار کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے آسمان سے نیچے گرا ہو کہ شکاری پرندہ اسے فوری اُچک لیتا ہے یا تند و تیز ہوا اسے کہیں دُور پھینک دے گی۔ دونوں صورت میں اس نے ہلاک ہی ہونا ہے۔ اس پورے بیان سے مشرکین پر یہ واضح کیا ہے کہ شرک کی سزا ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: ''بات یہی ہے اور جو شخص اللہ کی نامزد چیزوں کی تعظیم کرتا ہے سو یہ دل کی پرہیزگاری ہے۔''

اللہ کے شعائر کی تعظیم

شعائر ''شعیرہ'' کی جمع ہے جس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ اس سے مراد وہ نشانیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے لیے قرار دیا ہے جیسے صفا و مروہ، کہ اللہ نے انہیں شعائر اللہ کہا ہے۔ اسی طرح کعبۃ اللہ، عرفات، منیٰ، میقات، تمام جگہیں محترم ہیں اور سب ہی شعائر اللہ سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا واضح فیصلہ سنایا ہے کہ معاملہ اس طرح ہے کہ شعائر الٰہی کا احترام اور تعظیم واجب ہے اور ان شعائر کو بزرگ اور بڑا قرار دیا جائے تو یہ عمل تقویٰ ہے دلوں کا کیونکہ تقویٰ کی حقیقت اور تقویٰ کے مصادیق سے یہ ہے کہ انسان خداوند کی ناراضگی اور ناخوشی سے بچیں اور اللہ نے جن اُمور کو حرام قرار دیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے اور دُوری اختیار کی جائے کہ ایسے عمل کا تعلق معنوی امر ہے اور دل سے مربوط ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: ”تمہارے لیے ان میں ایک وقت معین تک فائدے ہیں پھر اس کے ذبح ہونے کی جگہ قدیم گھر کے قریب ہے۔“

قربانی کے جانوروں بارے بیان

تمہارے لیے ان شعائر میں بالخصوص قربانی والے اونٹوں (جانوروں) میں منافع ہے جیسے ان پر سوار ہونا، ان سے دودھ لیناجب اس کی ضرورت ہو۔ معین مدت تک ایسا ہو سکتا ہے اور یہ اس وقت تک ہے پھر ان کی قربانی کرنا ہے تو قربانی کریں اور جب قربان کرنے کا وقت پہنچ جائے اس کے ذبح کرنے کا جو خانہ کعبہ تک پہنچ جانے کا وقت ہے یہ بات آئمہ اہل البیت علیہم السلام کی روایات کے مطابق ہے لیکن بعض مفسرین نے یہ کہا ہے۔ تفسیر کشاف، ج ۳ میں انہوں نے کہا ہے کہ شعائر سے مراد مناسک حج ہیں اور منافع سے مراد خرید و فروخت اور کاروبار ہے جو خانہ کعبہ کے گرد حج کے مناسک کو انجام دینے کے دوران ہوتا ہے کہ اس میں جو آخری عمل ہوتا ہے وہ خانہ کعبہ کا طواف ہوتا ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: ”اور ہر اُمت کے لیے ہم نے قربانی مقرر کر دی تھی تاکہ اللہ نے جو چار پائے انہیں دیے ہیں ان پر اللہ کا نام یاد کیا کریں، پھر تم سب کا معبود تو ایک اللہ ہی ہے پس اس کے فرمانبردار رہو، اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنادو۔“

الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ الصّٰبِرِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَہُمۡ وَ الۡمُقِیۡمِی الصَّلٰوۃِ ۙ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر مصیبت آئے تو صبر کرنے والے ہیں اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اُمتوں کے لیے عبادت کا پروگرام

اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ گذشتہ اُمتوں کے مومنین کے لیے کچھ عبادات قرار دیں جن میں قربانی اور ذبح کرنا تھا، یہ کہ وہ ان جانوروں پر جو ہم نے ان کے لیے روزی کے طور پر دیے ہیں کہ وہ قربانی کے وقت ان پر اللہ کا نام یاد رکھیں لہٰذا آپ لوگ جو ابراہیمی اُمت ہیں تم پہلی اُمت نہیں کہ جسے یہ کہا جارہا ہے کہ وہ قربانی کے وقت اللہ کا نام لیں۔ تمہارا اللہ وہی یکتا معبود ہے تم سے پہلی اُمتوں کے لیے جن احکام کی قانون سازی کی گئی تھی وہی آپ کے لیے بھی ہے لہٰذا تم اسلام لے آؤ اور اللہ کے فرمان کے سامنے تسلیم ہو جاؤ، عمل کو فقط اللہ کے لیے انجام دو، اللہ کے لیے مخلص رہو، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کیا ہے۔ مخبتیں، (عجز و انکساری کرنے والے) کو بشارت دے دو جس جس نے حج کے حوالے سے خود کو اللہ کے سپرد کر دیا اور ان میں اخلاص تھا تو وہی وہ ہیں جو مخبتین ہیں اور پھر مخبتین کا وصف بیان کیا ہے کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور اللہ کی یاد کے وقت خاشع و خاضع ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں خوف ہوتا ہے، سختیوں میں صابر ہوتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، خود اللہ کی عبودیت کے مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کے لیے روزی دی ہے وہ اس سے انفاق کرتے ہیں یہ چھار صفات مخبتین کے لیے ہیں اور یہ سارے اعمال حج کی عبادت میں

متحقق و موجود ہوتے ہیں۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾

ترجمہ: ”اور ہم نے تمہارے لیے قربانی کے اونٹ کو اللہ کی نشانیوں میں سے بنایا ہے تمہارے لیے ان میں فائدے بھی ہیں، پھر ان پر اللہ کا نام کھڑا کرکے لو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں تو ان میں سے خود کھاؤ اور صبر سے بیٹھنے والے اور سائل کو بھی کھلاؤ، اللہ نے انہیں تمہارے لیے ایسا مسخر کر دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔“

اونٹ کے ذبح کرنے کا طریقہ

”بدن“ سے مراد موٹا تازہ اونٹ ہے، یہ اللہ کی راہ میں حج کے دوران قربان کیا جاتا ہے، اسی لیے اسے شعائر اللہ سے قرار دیا ہے۔

”صَوَآفَّ“ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹ کھڑا ہو، اس کے اگلے پچھلے پاؤں کو باندھ دیا گیا ہو اور اس کے پاؤں مساوی اور برابر ہوں، آگے پیچھے نہ ہوں۔

”وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا“ حیوان کا پہلو کے بل زمین پر گرنے کے معنی میں ہے۔ حیوان کا مرنا۔

”فَكُلُوْا مِنْهَا“ گوشت سے کھاؤ۔ تو یہ **حکم اِباحی** ہے کہ قربانی دینے والا قربانی کے گوشت سے کھا سکتا ہے، یہ واجبی حکم نہیں ہے۔

”وَالْمُعْتَرَّ“ اس سے مراد ایسا فقیر ہے جو اپنی حاجت روائی کے لیے سوالی بن کر کسی

کے پاس آئے۔

آیت کے مطالب کا خلاصہ

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے اونٹ کو شعائر سے قرار دیا ہے اور ان میں تمہارے لیے منافع ہیں کہ ان کے گوشت اور دودھ سے فائدہ اٹھاؤ۔ اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے کھڑا کرکے ذبح کیا جائے، اس پر اللہ کا نام پڑھ کر نحر کیا جائے، جب زمین پر حیوان گر پڑے تو پھر اس کا گوشت بناؤ اور پھر اس گوشت سے خود بھی کھاؤ اور فقراء و مساکین اور سوالیوں کو بھی گوشت کھلاؤ۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ”اللہ کو نہ ان کا گوشت اور نہ ان کا خون پہنچتا ہے البتہ تمہاری پرہیزگاری اس کے ہاں پہنچتی ہے، اسی طرح انہیں تمہارے تابع کر دیا تاکہ تم اللہ کی بزرگی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت کی، اور نیکوں کو خوشخبری سنا دو۔“

اللہ کے لیے دلوں کا تقویٰ کا

اس جگہ ایک غلط فہمی کو دُور کیا گیا ہے کہ کہیں کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اللہ کو قربانی کے گوشت اور خون کی ضرورت ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ گوشت اور خون اللہ کے پاس نہیں جاتا کیونکہ اللہ کی ذات پاک و منزہ ہے، جسم و جسمانیات اور جسمانی ضروریات سے پاک ہے۔ اس کے پاس فقط تمہارا تقویٰ ہی جاتا ہے۔ متقین ہی اس عمل کے وسیلہ سے اللہ

کا قرب حاصل کرتے ہیں (خدا ترسی انسان کو اللہ کے قریب پہنچاتی ہے) یہ ایک طرح کا معنی مرتبہ و درجہ کا حصول قربانی کے وسیلہ سے ہے جسے خدا کا نام لے کر قربان کیا جاتا ہے۔ جب اللہ کے نام سے منسوب ہو جائے تو پھر وہ مقدس و محترم ہو جاتا ہے۔[1]

حیوانات کی تسخیر انسان کے لیے اللہ نے اپنے فضل و کرم سے کر دی ہے تاکہ یہ تسخیر تمہاری ہدایت کا ذریعہ بنے اور تم لوگ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے عمل کرو، تکبیر کہو، اللہ کی بزرگی بیان کرو کہ اللہ نے تمہارے لیے ہدایت کا انتظام کیا ہے۔

جو لوگ نیکوکار ہیں انہیں بشارت دینے کا حکم دیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ حج کے اعمال کے دوران جانور کی قربانی دیتے ہیں اور اس طرح کے نیک اعمال بجالاتے ہیں اور اپنے مال سے اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں ان کے لیے بشارت دی جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾

ترجمہ: ”بے شک اللہ ایمان والوں سے دشمنوں کو ہٹا دے گا، اللہ کسی دغاباز ناشکر گزار کو پسند نہیں کرتا۔“

اللہ کی جانب سے مومنوں کا دفاع

اللہ مومنوں کا مشرکین کے شر سے دفاع کرتا ہے؛ جو کہ بہت زیادہ خباثت کار ہیں

1۔ اللہ کا حکم یہی ہے کہ اسے منیٰ میں ذبح کیا جائے تاکہ احرام سے خارج ہو جائیں۔ (مصحح)

اور یہی زیادہ ناشکرے ہیں کیونکہ اللہ مومنوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ خیانت کار مشرکوں اور ناشکرے مشرکین کو دوست نہیں رکھتا، مومنوں نے اللہ کی امانت کا پاس رکھا، دین الٰہی کا لحاظ رکھا، اللہ کی نعمت پر شکر ادا کیا جبکہ مشرکین نے دین الٰہی کی امانت میں خیانت کی اور دعوت برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو رد کیا جبکہ توحید کی دعوت کو ان کی فطرت میں رکھا گیا تھا تاکہ دُنیا اور آخرت کی سعادت کو پاسکیں لیکن مشرکین نے اس کا پاس نہ کیا اور اللہ کی دی ہوئی امانت (جوکہ دین فطرت ہے) میں خیانت کی، دین کی نعمت کا کفران کیا۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾

ترجمہ: ''جن سے کافر لڑتے ہیں انہیں بھی لڑنے کی اجازت دی گئی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔''

جارحیت کئے جانے والوں کے لیے جہاد کی اجازت

''اُذِنَ'' کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے اجازت کا اعلان کیا ہے۔ وہ مومنین جن پر مشرکین حملہ آور ہوں، انہیں اجازت دی ہے کہ وہ ان کے خلاف جہاد کریں، جنگ کریں۔ اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں پر ستم کیا، ان کے ساتھ خیانت کی، ان پر جبر روا رکھا، اللہ کی حدود کو پھلانگ گئے۔ ''اُذِنَ'' کا لفظ مجھول لایا گیا، یہ اس امر کی عظمت کے لیے ہے آخر میں اس فعل مجھول کے لیے فاعل کو بیان نہ کرکے اس پر اشارہ ہے کہ اللہ عظمت و کبریائی کے اس مقام پر ہے کہ اس کے لیے یہ امر بہت ہی آسان ہے۔ مومنوں کی مدد کرنا اللہ کے لیے کوئی بڑا کام نہیں، اللہ ان کی نصرت و امداد کرنے پر قادر ہے۔ یعنی جس کے پاس قدرت مطلق ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے تو اس کے لیے اپنے ماننے

والوں کی مدد کرنا کونسا بڑا امر ہے یہ ایک معمولی بات ہے۔

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۴۰

ترجمہ: "وہ لوگ جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے صرف یہ کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا تو تکیئے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا، بے شک اللہ زبردست غالب ہے۔"

عبادت گاہوں کو آباد کرنا

(صوامع) صومعہ کی جمع ہے جو مخروطی نوک دار شکل میں زاہدوں اور عبادت گزاروں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

(بیع) بیعۃ کی جمع ہے، یہود اور نصاریٰ کی عبادت گاہوں کو کہا جاتا ہے۔

(صلوات) صلوۃ کی جمع ہے اس سے یہودیوں کے مصلے مراد ہیں جہاں وہ کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔

(مساجد) مسجد کی جمع ہے، مسلمانوں کے عبادت کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

مشرکین کے مظالم

اس آیت میں مسلمانوں پر مشرکین کے جبر و زیادتی کا تذکرہ موجود ہے۔ مشرکین نے کسی جواز کے بغیر مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکال دیا ان پر بُری طرح کا ظلم ستم روا رکھا، شکنجے دیئے، دھوپ پر لٹایا، کوڑے برسائے، گرم سلاخوں سے ان کے پیروں کو جلایا، ان سے گھر، اموال، خانہ و کاشانہ سب کچھ چھین لیا۔ ان پر مظالم اس وجہ سے کیے گئے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے جو یکتا ہے بتوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔ مشرکین نے اسی وجہ سے انہیں تکالیف اور اذیتیں پہنچائیں اور انہیں اپنے گھروں سے نکالنے کا جواز بنایا۔ مشرکین اس قدر جاہل، سرکش و منحرف تھے کہ اُنہوں نے کلمہ حق کہنے کو حرام قرار دیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ بیان کیا کہ اگر بعض لوگ نقص و شرک سے اپنا دفاع نہ کرسکے اور جہاد و قتال کا قانون نہ ہوتا تو دینی معاشرے دشمنوں کے شر سے محفوظ نہ رہتے اور تمام دینی مراکز اور عبادت گاہیں ویران ہو جائیں۔

لہٰذا لوگوں کا اپنے امور کا دفاع کرنا اور اپنی زندگی کی وضعیت میں استقامت دکھانا ایک فطری قانون ہے اگر یہ بات لوگوں میں جاری و ساری نہ ہوتی جو اللہ کے طے شدہ نظام سے مربوط ہے تو معاشرے تباہ و برباد ہو جاتے، اللہ ہی انسان کی واضح ہدایت کرتا ہے اسے دوسرے موجودات کی طرح وسائل سے معمور کیا ہے اسے دفاعی وسائل دیے ہیں، انسان کے پاس سوچنے کی قوت ہے، اس قوت کے ذریعے وہ دفاعی وسائل اپنے لیے تیار کرسکتا ہے لیکن جنگ، قتل و قتال کے ذریعہ دفاع کرنا آخری وسیلہ ہے اور اسے اس وقت اختیار کرتا ہے جب کوئی اور ذریعہ نہیں رہتا کیونکہ جنگ و قتال کا لازمہ اس طرح ہوگا تو کچھ افراد مر جائیں گے اور خود کو دفاع کے راستے میں قربان کردیں گے تاکہ باقی بچ جانے والے آسودہ زندگی گزاریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اور یہ کہ دین دار بالکل ختم نہ ہو جائیں تو جہاد اور

قتال کا قانون بنا دیا کہ بعض افراد جو دوسروں کے شر سے خود کو محفوظ کر لیں۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے عبادت گاہوں کا ذکر کیا ہے یہ اس لیے ہے کہ یہ مراکز دین کے مظاہر اور شعائر دینی اور دین کی نشانیوں سے ہیں۔ ان جگہوں میں ہی اللہ کے دین کو یاد کیا جاتا ہے ان جگہوں پر دین کے احکام کی تعلیمات ہیں کہ دین محفوظ رہے، اس لیے جہاد کا حکم دیا۔

آخر میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ اللہ دشمن کے خلاف جہاد کرنے کی صورت میں مدد دینے پر قادر ہے کیونکہ اللہ ہی وہ توانا ہے جس کو کوئی کمزور نہیں کر سکتا اور اللہ ہی عزیز و مقتدر ہے کوئی اللہ کے اقتدار سے باہر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حتمی نصرت کا وعدہ دیا ہے، اللہ ہی اپنے ماننے والوں کو نصرت و غلبہ دشمنوں پر عطا کرتا ہے البتہ اللہ کی مدد اسی صورت میں ہے جب مسلمان اللہ کے دین کی مدد کریں، اللہ کے دین کی پاسداری کریں، اللہ کے دین پر عمل پیرا ہوں۔ اگر مسلمان ہوتے ہوئے اللہ کے دین پر عمل نہ کریں تو پھر اللہ کی مدد انکے لیے نہ آئے گی۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: ”وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور نیک کام کا حکم کریں اور برے کاموں سے روکیں، اور ہر کام کا انجام تو اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے۔“

اقتدار میں آنے والے مومنین کی شان

اس جگہ مومنین کی خاصیت بیان کی ہے کہ اگر مومنوں کے پاس اقتدار آجائے تو ہم

جب بھی انہیں اس مقام پر پہنچا دیں گے کہ وہ جو فیصلہ کریں گے اس پر عملدرآمد کر سکیں گے اور کوئی بھی انہیں روک نہ سکے، وہی مقتدر ہوں تو وہ ایک صالح اور نیک سوسائٹی اور معاشرہ کی تشکیل دیتے ہیں، احکام الٰہی کو نافذ کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، (نماز کے ذریعہ اللہ سے قریب ہوتے ہیں، زکوٰۃ کے ذریعہ اللہ کے بندگان کی خدمت کرتے ہیں) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں، تمام عبادات میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے کہ یہ دونوں اس لیے ہے کہ اللہ کی عبودیت کے اعلیٰ ترین مظاہر ہیں اور نماز اللہ سے تعلق اور ارتباط کا مظہر اور وسیلہ ہے اور زکوٰۃ فرد کی سوسائٹی سے ارتباط اور تعلق کا بھی مظہر ہے۔

ایسا صالح معاشرہ سب سے پہلے مدینہ میں قائم ہوا۔ اس کے قیام میں بنیادی کردار انصار نے ادا کیا نہ کہ مہاجرین نے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پھیلا اور یہ نظام پورے جزیرۃ العرب میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں رائج ہو گیا۔

تاریخ اسلام میں کسی بھی عہد و زمانہ میں ایسا نہیں ہوا کہ مہاجرین بغیر انصار کی دخالت کے ایسا معاشرہ تشکیل دیں، صدر اسلام کے بعض مہاجرین سے ایسے عمل بیان ہوئے ہیں کہ جنہیں کسی بھی حوالے سے احیاء حق کا نام نہیں دے سکتے اور یہ کہ انہوں نے باطل کا خاتمہ کیا۔ اب چاہے ہم انہیں مجتہد مقدور کا نام دیں کہ انہوں نے اپنی رائے پر عمل کیا یا اس کا کوئی اور نام دیں لہٰذا اس آیت میں توصیف مہاجرین کے لیے مخصوص نہیں وہ مہاجرین جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھے بلکہ مومنوں کی من حیث المجموع توصیف بیان کی گئی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ تمام امور کی بازگشت اللہ کی جانب ہے۔ یہ بات اللہ کی نصرت کے حتمی اور یقینی ہونے کے بارے تاکید کی گئی ہے کہ اللہ نے جو وعدہ دیا ہے یہ حتمی ہے۔ جب اللہ کے دین پر چلو گے تو اللہ دشمنوں پر تمہیں غلبہ دے اور اللہ کا نام ہی سر بلند رہے گا۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں جھٹلائیں تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود۔''

وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: ''اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم۔''

وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: ''اور مدین والے اپنے اپنے نبی کو جھٹلا چکے ہیں، اور موسٰی کو بھی جھٹلایا گیا پھر میں نے منکروں کو مہلت دی پھر میں نے انہیں پکڑا، پھر میری پکڑ کیسی تھی؟''

کافروں کے لیے مہلت

اس آیت میں اللہ نے یہ بتایا ہے کہ اے میرے حبیب جس طرح اس وقت تیری قوم تجھے جھٹلا رہی ہے یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جو انبیاء گزرے ان کی اقوام نے بھی اپنے اپنے انبیاء کو جھٹلایا۔ لیکن سزا دینے میں اللہ جلدی نہیں کرتا بلکہ انہیں مہلت دی گئی، بعد میں انہیں عذاب میں گرفتار کیا۔ اب دیکھا کہ ان کا اپنے انبیاء کو جھٹلانا اور ان کی دعوت کا انکار کرنا ان کے لیے کیسا رہا؟ یہ کتاب اس بات کو واشگاف الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ ان کو سخت ترین عذاب میں ڈالا گیا لہٰذا آج جو آپ کو جھٹلا رہے ہیں ان کا انجام بھی پچھلے کافروں کی مانند ہو گا۔ جب ہماری پکڑ ہو گی تو پھر ان کو کوئی چھڑانے والا نہ ہو گا، ہماری پکڑ بہت ہی سخت ہے۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

ترجمہ: ''سو کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں اور وہ گناہ گار تھیں اب وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، اور کتنے کنوئیں نکمّے اور کتنے پکے محل اجڑے اجڑے پڑے ہیں۔''

آبادیوں کا ویران ہونا

اللہ فرمارہا ہے کہ جب لوگ حق کا انکار کرتے ہیں، ظلم و ستم عام ہوتا ہے تو ہم نے ایسی ہی آبادیوں کو ہلاک کر دیا، ایسی بستیاں جن میں بڑے بڑے محلات تھے، اونچی اونچی عمارتیں تھیں، اب سب ہی ویران ہیں، ان میں رہنے والے ہی موجود نہیں، اب ان گھروں سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، اب یہ سب خالی ہیں، یہ ان کے گناہوں کا انجام ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: ''کیا انہوں نے ملک میں سیر نہیں کی پھر ان کے ایسے دل ہو جاتے جن سے سمجھتے یا ایسے کان ہو جاتے جن سے سنتے، پس تحقیق بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہو جاتے ہیں۔''

لوگوں کی بے توجہی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی مذمت فرمارہا ہے جو دل رکھتے ہیں لیکن ان

دلوں سے سوچتے نہیں۔ ایسا کیوں نہیں کہ یہ لوگ زمین پر گھومتے پھرتے اور سابقہ اُمتوں کے حالات کے بارے معلومات لیتے اور پھر یہ جان جاتے کہ سابقہ اُمتیں جو بڑی بڑی تھیں، ظاہری طور پر بڑے بڑے گھروں اور محلات میں آباد تھے لیکن اللہ کی نافرمانی کے نتیجہ میں ان کا انجام کیا ہوا اور وہ کس طرح برباد ہو گئے۔ ان کی ہلاکت کا سبب شرک تھا، دعوت حق سے رُخ موڑ لینا تھا، تفکر اور تعقل سے یہ لوگ شرک سے باہر آسکتے تھے، ان کے سننے والے کان ہی نہیں کہ وہ نصیحت پر مبنی باتوں کو سنیں اور پھر ان سے اثر لیں، اپنے نفع و نقصان کو دیکھیں اور پھر دل و جان سے حق کو قبول کر لیں کیونکہ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کے علاوہ کوئی بھی ان کے واسطے خیر خواہ نہیں ہے۔ اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کے بیانات انہیں سعادت کی ہدایت کرتے ہیں۔ آخر میں بہت ہی عمدہ تعبیر سے بیان کیا ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں جو دل موجود ہے وہ اندھے ہو جاتے ہیں یعنی جو تعقل نہیں کرتے، سوچ سے عاری ہیں تو وہ ایسے ہیں کہ ان کے پاس سننے والے کان نہیں ہیں۔ دل کا اندھا پن ہی حقیقی اندھا پن ہے کیونکہ جو شخص آنکھوں کا اندھا ہوتا ہے وہ پھر بھی اپنے منافع کی تشخیص کرتا ہے، لیکن جو کور دل ہوتا ہے تو پھر اس کے لیے ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۴۷

ترجمہ: ”اور تجھ سے عذاب جلدی مانگتے ہیں اور اللہ اپنے وعدہ کا ہرگز خلاف نہیں کرے گا، اور ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو۔“

مشرکین کا عذاب مانگنا

مشرکین رسول اللہ ﷺ کا استہزاء کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر تیرا رب عذاب دے گا تو عذاب جلدی لے آؤ۔ یہ عذاب جو تم کہہ رہے ہو یہ کب متحقق ہو گا جبکہ اللہ تو کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا جیسا کہ بدر کے دن اُنہوں نے اللہ کے عذاب کا مزہ چکھا، یا پھر اس دن عذاب کا مزہ چکھیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ اور ان کی قوم کے درمیان انصاف کے لیے قرار دیا ہے۔ اس دن یہ عذاب بھی ان پر آجائے گا۔ وہ قیامت کا دن ہے، وہاں کا ایک دن اس دُنیا کے ہزار سال کے برابر ہے، اللہ کے نزدیک کم مقدار یا زیادہ مقدار سب برابر ہے۔ فرصت اور موقعیت کے فوت ہونے کا اندیشہ موجود نہیں، اسی وجہ سے اللہ ان کو عذاب دینے میں جلدی نہیں فرماتا، ان کو مہلت دیتا ہے تاکہ ان کی شقاوت اور بدبختی کے درجات میں اضافہ ہو جائے جس دن ان کی موت آجائے گی تو اللہ اپنے عذاب سے ان کا موأخذہ کرے گا۔ اس آیت میں بھی رسولؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ وہ ان مشرکین کی باتوں سے پریشان نہ ہوں۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿٤٨﴾

ترجمہ: ”اور کتنی بستیوں کو میں نے مہلت دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر میں نے انہیں پکڑا، اور میری طرف ہی پھر کر آنا ہے۔“

کافروں کے لیے مہلت

یہ آیت پچھلی آیت کے مطالب کی وضاحت ہے۔ اللہ کے نزدیک تھوڑا عرصہ یا زیادہ عرصہ، کم یا زیادہ برابر ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت ساری آبادیاں ظالم تھیں، سرکش تھے،

انہیں مہلت دی گئی، اس کے بعد ان پر عذاب لایا گیا۔ جب سب نے اللہ کی جانب لوٹنا ہے تو یہ تصور ہی نہیں کہ موقع ہاتھ سے چلا جائے گا اس لیے اللہ عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: ''کہہ دو اے لوگو! میں تو صرف تمہیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔''

فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ كَرِیۡمٌ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: ''پھر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے۔''

وَ الَّذِیۡنَ سَعَوۡا فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ﴿۵۱﴾

ترجمہ: ''اور جنہوں نے ہماری آیتوں کے پست کرنے میں کوشش کی وہی دوزخی ہیں۔''

رسول خداؐ کی ذمہ داری

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا کہ کفر کے خطرناک نتائج سے لوگوں کو ڈرائیں کہ ان کی ہم نشینی جہنمی ہونے کا سبب ہو گی جبکہ ایمان لانا، مغفرت، بخشش اچھی روزی، بہشتی نعمات کا سبب ہے۔ رسالت اور پیغمبری یہ ہے کہ خطرات سے ڈرایا جائے اور نعمات کی خوش خبری دی جائے۔ پیغمبر منذر اور بشیر ہیں آخر میں بھی زور دے کر کہا کہ جو لوگ بس اس سعی اور کوشش میں لگے ہیں کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کریں تو انہیں معلوم رہے کہ وہ اہل جہنم ہیں اور جس نے جہنم سے بچنا ہے جہنمیوں کے ہم نشین نہیں بننا چاہتے تو پھر ایمان لاؤ، نیک اعمال کرو، اللہ کے رسول کی باتوں کو سنو اور ان پر عمل کرو۔ اللہ کے کلام سے نصیحت قبول کرو اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ اللہ کا رسول تمہیں خطرات سے ڈرانے اور نعمات

کی نوید دینے آیا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَكِیۡمٌ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی بھی ایسا رسول اور نبی نہیں بھیجا کہ جس نے جب کوئی تمنا کی ہو اور شیطان نے اس کی تمنا میں کچھ آمیزش نہ کی ہو، پھر اللہ شیطان کی آمیزش کو دور کرکے اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔“

انبیاء کی پیغام رسانی میں اللہ کی مدد

”اُمۡنِیَّتِهٖ“ دلی آرزو کہ جو آدمی کی پسند ہو اور اسے فرض کرلیں کہ ایسا ہی ہونا ہے جبکہ صاحب کشاف نے اس کا معنی تلاوت اور پڑھنا کیا ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔

رسول اسے کہتے ہیں جس کے پاس اللہ کے فرشتے وحی لے کر آتے ہیں اور وہ ان فرشتوں کو دیکھتا بھی ہے اور ان سے بات کر سکتا ہے۔ نبی وہ ہوتا ہے جس کے لیے خواب میں وحی آتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ہم نے کسی بھی رسول اور نبی کو نہیں بھیجا مگر وہ تو یہ چاہتا تھا وہ جو پیغام پہنچا رہا ہے اس میں پیشرفت ہو اور کوئی رکاوٹ نہ آئے، لوگ ایمان لے آئیں جبکہ شیطان اس کے سامنے دخل اندازی کرتا ہے، لوگوں میں وسواس ایجاد کرتا ہے کہ لوگ ان کے دین کو قبول نہ کریں۔ اس طریقہ سے شیطان انبیاء کی کوشش کو بے اثر کرتا تھا لیکن اللہ، شیطان کے تصرف کو باطل کرکے اپنی آیات کو غلبہ دیتا ہے۔

اس طرح اللہ اپنے پیغمبر کی سعی و کوشش کو کامیاب بنا دیتا ہے۔ اللہ سب کے اعمال و

اقوال سے آگاہ ہے اگر امنیۃ کا معنی تلاوت کیا جائے تو معنی اس طرح ہو گا ہم کسی بھی رسول اور نبی کو نہیں بھیجا مگر جب وہ آیات کو پڑھتے تھے شیطان گمراہ کرنے والے شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈالتا تھا شیطان ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا کہ وہ آیات کا انکار کر دیں اور وہ مؤمنین کے ایمان کو فاسد کر دے لیکن اللہ شیطان کے شبہات کو باطل کر دیتا تھا اور اپنے پیغمبر کو کامیاب بنا دیتا تھا ان کے جواب کے لیے آیت و معجزہ کو اُتار دیتا تھا کیونکہ اللہ ہی دانا و آگاہ ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۙ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ’’تاکہ شیطان کی آمیزش کو ان لوگوں کے لیے آزمائش بنا دے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں، اور بے شک ظالم بڑی ضد میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

شیطان کی شرارت

’’مرض قلب‘‘ کے نتیجے میں تعقل و تفکر کی استقامت ہاتھ سے جاتی ہے جس کا وہ عقیدہ رکھے وہ اس میں شک کرتا ہے۔

’’قساوت قلب‘‘ کا معنی دل کا سخت ہونا ہے۔ شیطان کے شیطانی القاء ات کے مؤثر ہونے میں بھی ایک مصلحت ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی آزمائش کرے، آزمائش الٰہی نور میں سے ہے جو پوری انسانیت میں ہے کیونکہ سعادت مند ہونے کے لیے سعید و نیک افراد اور شقاوت مند ہونے کے لیے شقی و بدبخت کا فیصلہ ہو جائے۔ اس طرح لوگوں کا امتحان ہو، ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا انتظام کیا، واضح نشانیاں انبیاء کو دے کر بھیجا ہے جبکہ شیطان

بھی موجود ہے جو لوگوں کو روکتا ہے، وسوسے ڈالتا ہے تاکہ لوگ ہدایت نہ پائیں، منافقین دل کے مریض ہیں وہ اپنے نفاق کو آشکار کرتے ہیں۔ اس جگہ بیمار دل والوں سے مراد کافر اور منافق ہیں۔ جس کا دل مریض ہوتا ہے وہ حق کو بہت جلدی سمجھتا ہے لیکن اس کو قبول نہیں کرتا۔ جو دل سخت ہے وہ حق کو دیر سے سمجھتا ہے اور دیر سے اس کا عقیدت مند بنتا ہے، دونوں قسم کے افراد شیطانی وسوسوں کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔

آخر میں اللہ فرماتا ہے جو ستمگر ہیں اہل عناد اور اھل شک ہیں اسی وجہ سے وہ حق سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، یہ ایسے مخالفین ہیں جو افتراق وانتشار والے ہیں، حق اور اہل حق سے بہت دُور ہیں۔

وَّ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: ”اور تاکہ علم والے اسے تیرے رب کی طرف سے حق سمجھ کر ایمان لے آئیں پھر ان کے دل اس کے لیے جھک جائیں، اور بے شک اللہ ایمان داروں کو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔“

اہل علم کا امتیاز

گذشتہ بحث کے تسلسل میں یہ بیان ہے کہ اللہ نے شیطانی وسوسوں اور القاء ات کو باطل کیا اور اپنی آیات کو دلوں میں جاگزیں کر دیا یہ اس لیے ہے کہ شیطانی وسوسے اور القاء ات بیمار دلوں کے لیے امتحان وآزمائش ہیں جس سے سنگدلوں کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جن کو اللہ نے علم عنایت کیا ہے شیطانی وسوسوں کے ناکام ہونے سے اس بات کو سمجھ جائیں کہ جس کی آرزو اللہ کا رسول اور اللہ کا نبی کر رہے ہیں وہ حق پر مبنی ہے اور وہ حق

تیرے رب کی جانب سے تھا تو ان اہل علم کو چاہیے کہ وہ ایمان لے آئیں اور اس کے نتیجہ میں ان کے دل اس کے سامنے نرم اور خاشع ہوں۔ آخر میں فرمایا: حق تیرے رب کی جانب سے ہے، اسی وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حقیقی ہادی اور راہنما ہے، اللہ ہی ہے جو انہیں قدم بہ قدم راہ راست کی ہدایت فرماتا رہتا ہے اور راہ مستقیم پر چلنے کی تعلیم دیتا ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾

ترجمہ: ”اور منکرین قرآن کی طرف سے ہمیشہ شک میں رہیں گے یہاں تک کہ قیامت یکایک ان پر آموجود ہو یا منحوس دن کا عذاب ان پر نازل ہو۔“

کافروں کا آخر عمر تک رویہ

اس آیت میں کافروں کے رویہ کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ زندگی کے آخری لمحات تک ایمان کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ جبکہ ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ بعض کافر مومن ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کافروں سے مراد ان کے قائدین و سربراہ ہیں جو دوسروں کو کفر پر آمادہ کرتے ہیں اور کفر کی تحریک کی قیادت کر رہے ہوتے ہیں اس سے مراد قریش مکہ کے وہ بڑے بڑے بت پرست ہیں جو آخر عمر تک مسلمان نہ ہوئے۔ اللہ فرما رہا ہے یہ کافر مسلسل قرآن کے بارے شک و تردد کرتے ہیں، اسی حالت میں رہیں گے کہ قیامت کا دن آجائے گا یا قیامت کے دن کا عذاب آجائے، اس میں کسی کو مہلت نہ ملے گی اور نہ ہی دوسرا دن آئے گا کہ دوبارہ وہ متولد ہو۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: ''اس دن اللہ ہی کی حکومت ہوگی وہی ان میں فیصلہ کرے گا، پھر جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔''

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

ترجمہ: ''اور جو منکر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا سو ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔''

اللہ کا ملک اور مملکت

مملکت اور اقتدار اللہ کے لیے ہے، یہ حقیقت قیامت کے دن سب پر آشکار ہو جائے گی۔ دُنیا میں اللہ ہی کا مطلق اقتدار اور اللہ ہی کا ملک تھا لیکن سب لوگ اس کو تسلیم نہ کرتے تھے اور اپنی من مانی کرتے رہے لیکن جب قیامت کا دن آئے گا تو سب کو پتہ چل جائے گا کہ اللہ کے سوا کوئی بھی حاکم نہیں ہے اور اللہ ہی ہے جو ان کے درمیان فیصلہ دے گا۔ حکم دینا، فیصلہ کرنا ملک اور مملکت و اقتدار کے لوازمات سے ہے۔ اللہ ان مومنوں کو جو نیک اعمال انجام دیتے ہیں بہشت میں ٹھہرائے گا اور جو سرکش و معاند ہیں اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے ہیں تو ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: ''اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل کیے گئے یا مر گئے البتہ انہیں اللہ اچھا رزق دے گا، اور بے شک اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔''

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

ترجمہ: ''البتہ انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جسے وہ پسند کریں گے، اور بے شک اللہ جاننے والا بردبار ہے۔''

اجر و ثواب کا معیار

اجر، عمل صالح پر ملتا ہے اور عمل صالح کا تعلق خلوص نیت سے ہے اس لیے ہجرت میں سبیل اللہ کی شرط لگا دی ہے۔ اس کی توجہ '' قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا'' کے فاعلوں کی طرف ہے یعنی جو قتل کیے گئے اللہ کی راہ میں اور جو مر گئے اللہ کی راہ میں یا راہ خدا میں غربت اور مشقت کی سختیاں برداشت کیں، ایسے مہاجرین کے لیے اللہ کے ہاں بہت اچھا اجر ہے اور اللہ ہی بہترین روزی دینے والا ہے۔ اس جگہ رزق سے مراد اخروی نعمت ہے جس کی جگہ موت کے بعد یا قتل ہونے کے بعد ہے۔

اس کے بعد رزق حسن کی تفصیل بتائی ہے کہ انہیں ایسی بہشت میں وارد کریں گے کہ جہاں وہ پہنچ کر اس جگہ کا مشاہدہ کرکے بہت خوش اور راضی ہوں گے، اس جگہ سے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کریں گے، اللہ دانا اور بردبار ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کونسی چیز لوگوں کی خوشنودی کا سبب ہے اسی لیے وہی جگہ انہیں عطا فرماتا ہے۔ اللہ ستمگروں اور منکروں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: ''بات یہ ہے، اور جس نے اسی قدر بدلہ لیا جس قدر اسے تکلیف دی گئی تھی پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ درگزر کرنے والا معاف کرنے والا ہے۔''

عقاب و سزا کا قانون

عقاب کا معنی ہے کہ ایسا مؤاخذہ و جواب طلبی جو ناپسندیدہ ہو، اچھی نہ لگے۔ کیونکہ کسی عمل کے بعد ہی ایسا ہوتا ہے عمل جیسا عقاب دیا جائے گا ویسا ہی اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ عمل شائستہ اور لائق تعریف نہیں اس لیے اسے بغی اور ظلم سے مقید کیا ہے۔ اس لیے اللہ فرماتا ہے کہ جو شخص ظلم کرنے والا ہے، زیادتی کی ہے اپنے اوپر، اس کا عمل ہی سزا متعین کرتا ہے، اگر وہ اس ظلم و زیادتی کا مقابلہ کرے گا تو اللہ اس کی مدد کرے گا۔ اللہ تو معاف کرنے والا ہے اور بخش دینے والا ہے تو اللہ تعالیٰ اس برائی کا جو برا اثر ہے اسے مٹا دیتا ہے کیونکہ اللہ اس کے اثر کو محو نہ کرے تو یہ معاملہ، تمثل اور انتقام، نظام حیات میں اپنا برا اثر چھوڑتا ہے اور عقاب اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے لیکن جس پر ظلم کیا گیا ہے اگر اس کی طرف سے ظالم کو عقاب دیا جائے تو اس صورت میں اللہ اس مبغوض اور ناپسندیدہ فعل کے اثر کو محو کر دیتا ہے۔ یہ قانون مسلمانوں کے درمیان باہمی روابط اور تعلقات میں موجود ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کسی پر ظلم ہوتا ہے تو مظلوم کو حق دیا گیا ہے کہ وہ ظالم سے اتنا بدلہ لے جتنا اس نے ظلم کیا ہے۔ جب ایسا کر لیا جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس ظلم کے برے اثر کو محو کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: ”وہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کیا کرتا ہے اور بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔“

رات اور دن کا دورانیہ

رات اور دن کے آنے جانے بارے اللہ کا ارشاد ہے کہ دن کا نور رات کی تاریکی پر

غالب آتا ہے اور تاریکی ختم ہو جاتی ہے گویا صبح کا نور آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں داخل ہو رہا ہوتا ہے یہاں تک کہ پوری تاریکی پر چھا جاتا ہے اور تاریکی پس پردہ چلی جاتی ہے۔ اسی طرح تاریکی شام کے وقت آہستہ آہستہ نورانیت پر چھا جاتی ہے اور روشنی و نورانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مثال دی ہے یہ اللہ کا قانون اور ضابطہ ہے کہ مظلوم کو ظالم پر غلبہ دیتا ہے جس طرح دن کو رات پر غلبہ دیتا ہے یا رات کو دن پر غالب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی آواز کو سنتا ہے اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ اللہ مظلوم پر ہونے والے ظلم کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس کی فریاد کو سن رہا ہوتا ہے اس لیے مظلوم کی نصرت و مدد فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝۶۲

ترجمہ: ”یہ اس لیے کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے اور جنہیں اس کے سوا پکارتے ہیں باطل ہیں اور بے شک اللہ ہی بلند مرتبہ بڑائی والا ہے۔“[1]

مظلوم کی نصرت

اس آیت میں بھی ”ذلك“ سے مظلوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ حق مطلق ہے

1۔ سورہ لقمان آیت ۳۰ بھی اسی آیت کے مشابہ ہے۔ اسم ”حق“ اللہ کے واجب الوجود ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسم ”علی“ اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ کی جانب اشارہ ہے۔ اور ”کبیر“ سے اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (مترجم)

اس میں باطل کے لیے گنجائش ہی نہیں اور لوگوں نے جن کو اپنے لیے خدا بنا رکھا ہے وہ سب باطلِ محض ہیں ان میں کوئی حق نہ ہے۔ اللہ قادر ہے وہ جیسے چاہتا ہے موجودات میں تصرف کرتا ہے، کچھ کے فائدے میں اور کچھ کے نقصان میں، بعض کے خلاف فیصلہ دیتا ہے اور بعض کے حق میں فیصلہ سناتا ہے اور جو چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے فیصلہ سناتا ہے، اللہ کا ہی حکم سب پر نافذ ہے۔ یا اس کا معنیٰ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، اللہ کا غیر حق نہیں ہے مگر جس کسی نے بھی غیر اللہ کو حق قرار دے رکھا ہے تو ہر صورت میں مشرکوں کے فرضی معبود باطل ہیں، ان میں حق کا شائبہ تک نہیں۔ اللہ ہی ہے جو کائنات میں تصرف کر سکتا ہے اور اس کے بارے قانون بنا سکتا ہے۔ قانون کا نفاذ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ ایسا حق ہے کہ ہر حق کی وابستگی اسی سے ہے۔

اللہ ہی بلند شان ہے، اللہ کے بلند مرتبہ اور بلند شان کے سامنے کوئی چیز برتر نہیں ہے، اس کی بزرگی اور کبریائی ایسے ہے کہ اس کے سامنے ہر چیز ذلیل و خوار ہے، وہ سب سے بزرگ تر ہے، وہ اس سے بھی بلند ہے کہ جو کچھ کسی کے بارے وصف بیان کیا جاتا ہے اللہ کا حساب دقیق ہے اور وہ کارساز و کاردار ہے۔ سب کچھ اسی کے ہاتھ میں اور سب اسی کی قدرت کے تحت ہے اسی کا حکم ہر جگہ اور ہر سطح پر جاری اور نافذ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۚ﴿۶۳﴾

ترجمہ: "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر زمین سرسبز ہو جاتی ہے، بے شک اللہ مہربان خبردار ہے۔"

آسمان سے پانی اُتارنا

اللہ ہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے اور پانی کو آبادکاری کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ زمین کی شادابی اور اس کا سبزہ پانی کی وجہ سے ہے۔اس بیان سے اللہ تعالیٰ کی عمومی قدرت پر ثبوت دیا گیا ہے اس کی وجہ کو اس طرح بیان کیا کہ اللہ بہت ہی باریک بین اور دقیق ہے، وہ ہی ہر چیز کے بارے اچھی طرح آگاہ ہے۔ تمام عالم کے دقائق و حقائق سے واقف ہے یہی امر اللہ کی قدرت کے عموم پر ثبوت ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۟ؒ

ترجمہ: ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، اور بے شک اللہ وہی بے نیاز قابل تعریف ہے۔''

اللہ کی مطلق مالکیت

آسمانوں اور زمین پر تعریف اللہ کی ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین پر ہے اس پر بھی اللہ کا تصرف ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ کی مالکیت مطلقہ ہے اس میں کچھ استثناء نہیں، کوئی بھی اللہ کی مالکیت سے باہر نہیں، سب اسی کے محتاج ہیں۔ اللہ غنی علی الاطلاق ہے، اسے ان تصرفات کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے لطف و کرم کے تحت تصرف فرماتا ہے جبکہ ان تمام تصرفات میں فائدہ دینے والا ہے اور لائق تعریف بھی ہے۔اس سب کے منافع مخلوق کے لیے ہیں، اللہ کے اپنے لیے نہیں ہیں۔ اسی لیے اس کی تعریف ہے، کسی اور کی تعریف نہیں ہے، تمام تعریفات اسی کی طرف پلٹتی ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ وَ الۡفُلۡکَ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَ یُمۡسِکُ السَّمَآءَ اَنۡ تَقَعَ عَلَی الۡاَرۡضِ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۶۵﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین کی سب چیزوں اور کشتیوں کو تمہارے تابع کر دیا ہے جو دریا میں اس کے حکم سے چلتی ہیں، اور آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے مگر اس کے حکم سے، بے شک اللہ لوگوں پر نرمی کرنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ کی قدرت مطلقہ کی نشانیاں

اس آیت میں اللہ کی قدرت مطلقہ پر ثبوت بیان ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین پر تمام موجودات کو انسان کے لیے رام اور مسخر کیا ہے اور تکوینی قانون کے تحت پانی کے اوپر اجسام تیرتے ہیں، کشتیاں سمندر پر رواں دواں ہیں، سب اللہ کا کرم ہے۔ آسمان کو اللہ تعالیٰ نے سماوی اجرام کے درمیان قوت جاذبہ قرار دی ہے اس کے تحت گرتے نہیں، آسمان سے آنے والے پتھر اور گرنے والی بجلیاں اگر زمین پر آئیں تو اللہ کے اذن سے ہی ہو گا۔ جو نہیں آتا تو اللہ کے حکم سے اور جو آئے گا تو اللہ کے حکم سے ہی۔ قوت نقل و حرکت، کشش و جاذبہ سب اللہ کی طرف سے ہے جو تمام اجرام سماوی کے درمیان قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات انسان کے اختیار میں دے دی ہے کہ وہ اس سے فائدہ اُٹھائے اور اپنی حیات کے نظام کو منظّم کرے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندگان پر مہربان ہے، رؤف ہے، تمام نعمات اللہ کی رؤوفیت اور رحمت کا مظہر ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: ''اور وہ وہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا، بے شک انسان البتہ بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

انسان کی حیات و موت کے مراحل

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متوجہ کیا ہے کہ اللہ ہی ہے جو تمہیں پہلے مردہ خاک سے ایک زندہ انسان کی صورت میں دُنیاوی حیات کے لیے زندہ کرتا ہے، خلق فرماتا ہے۔ جب تمہاری دُنیاوی زندگی کی معین مدت پوری ہو جاتی ہے تو تمہاری موت کا وقت آجاتا ہے۔ اللہ ہی ہے جو اس مرحلہ پر موت دیتا ہے پھر اللہ تمہیں بعث اور اُٹھائے جانے والے دن، قیامت میں دوبارہ زندہ کرے گا اور اُخروی زندگی عطا کرے گا یہ سب اللہ کی نعمات ہیں، ان کا شکر بجا لانا چاہیے لیکن یہ انسان ہے کہ اتنی ساری نعمات سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ناشکرا ہے، بالخصوص وجود کی نعمت اسے دی ہے وہ اسی ایک نعمت کو بھی یاد کرلے تو اسے شکر بجالانا چاہئے، اللہ کی نعمات ان گنت ہیں، جن کا شمار ہی ممکن نہیں تو پھر شکر بجا کیوں نہ لایا جائے؟

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾

ترجمہ: ''ہم نے ہر قوم کے لیے ایک دستور مقرر کر دیا ہے جس پر وہ چلتے ہیں، پھر انہیں تمہارے ساتھ اس معاملہ میں جھگڑنا نہ چاہیے، اور اپنے رب کی طرف بلا، بے شک تو البتہ سیدھے راستہ پر ہے۔''

ہر اُمت کے لیے خاص عبادت کا ہونا

"منسک" کا معنی عبادت ہے اور **"کل اُمۃ"** سے سابقہ اُمتیں مراد ہیں جو ایک کے بعد دوسری آتی رہیں۔ یہاں تک اُمت مسلمہ تک نوبت آگئی۔ ایسا لگتا ہے کہ جب مشرکین نے اسلامی عبادات کو دیکھا تو یہ ان کے لیے نئی تھیں تو وہ پیغمبر اسلام کے ساتھ جھگڑنے پر اُتر آئے اور یہ کہا کہ ہم نے تو گذشتہ اُمتوں میں ایسی عبادات نہیں دیکھیں اگر آپ پیغمبر ہیں تو سابقہ انبیاء کی اُمتوں میں بھی اسلام کی مانند عبادات موجود ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کا جواب دیا ہے کہ ہر اُمت کے لیے عبادات خاص تھیں کسی ایک اُمت کی عبادت کا طریقہ دوسری اُمت کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ اللہ سابقہ شریعت سے جامع تر شریعت کو لے آتا ہے اور سابقہ کو منسوخ کر دیتا ہے کیونکہ بعد والے عقلی ارتقاء میں پہلی اُمت سے بہتر ہوتے تھے، ان کے لیے کامل ترین اور جامع تر شریعت کی ضرورت تھی اس لیے شریعت کے معاملہ میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شریعت میں امر ونواہی اس شریعت کے زمانہ کی ضرورت کے تحت ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ اے رسول آپ ان کی باتوں کو اہمیت نہ دیں اور نہ ہی ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہو، اپنے رب کے قوانین کو بلا خوف وخطر بیان کرتے رہو، اطمینان سے رہیں کہ تم ہدایت کے ایسے راستہ پر ہو کہ اس میں انحراف موجود نہیں اور نہ ہی اس میں کچھ کمی ہے۔

وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾

ترجمہ: "اور اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔"

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

ترجمہ: "اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا جس چیز میں تم اختلاف

کرتے تھے۔"

مشرکین کے خیالات بارے بیان

پچھلی آیت کے تسلسل میں یہ بیان ہے، اگر مشرکین اس کے باوجود آپ کے ساتھ جھگڑا کریں، بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں تو آپ اس معاملہ کو اللہ کی طرف پلٹا دو کیونکہ حکم تو اللہ ہی کا نافذ ہونا ہے، اللہ ہی داناتر ہے کہ اس نے کسی کے بارے کیا فیصلہ دینا ہے۔ قیامت کا دن ہوگا یہ سب اللہ کے پاس حاضر ہوں گے، ابھی جن امور میں اختلاف کر رہے ہیں اور آپؐ سے جھگڑ رہے ہیں تو ان کو بتادو کہ قیامت کے دن فیصلہ ہو جائے گا، اللہ ہی حکم کرے گا کہ کون حق پر ہے۔ اللہ تمہاری حقیقت حال سے آگاہ ہے، قیامت کے دن پتہ چل جائے گا کہ تم نے جو حق اور اھل حق کی مخالفت کی ہے تو تمہارے معاملہ کا پورا جائزہ لیا جائے گا اور اس اختلاف کا حساب چکایا جائے گا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷۰

ترجمہ: "کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، یہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے، یہ اللہ پر آسان ہے۔"

مشرکین کے احوال بارے آگہی

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کس طرح مشرکین کے سارے اعمال سے آگاہ ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اعمال بھی کائنات میں رونما ہونے والے حوادث سے ایک ہیں، جبکہ اللہ کا علم احاطہ کیے ہوئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ کا جو علم ہے وہ ایک کتاب میں محفوظ اور درج شدہ ہے اور وہ کتاب کم بھی نہیں ہو گی اور اللہ اس کو بھولتا

بھی نہیں ہے۔ اللہ سے اشتباہ بھی نہیں ہوتی، بھول چوک اشتباہ یہ سب انسان پر طاری ہونے والی حالتیں ہیں، اللہ ہر نقص و عیب و حاجت سے منزہ و پاک ہے لہٰذا مشرکین کو بتایا گیا کہ ان کے سارے اعمال علم الٰہی میں محفوظ ہیں ان معلومات کی نگہداری اور حفاظت کرنا اللہ کے لیے آسان امر ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾

ترجمہ: ''اور اللہ کے سوا ایسی چیز کو پوجتے ہیں جس پر اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور نہ ان کے پاس کوئی اس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔''

مشرکین کی عبادت بارے بیان

مشرکین جن کی پرستش کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے بیان دیا کہ یہ لوگ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے بارے اس کے پاس کوئی دلیل اور برھان نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بارے کچھ بھی ان کے پاس ثبوت کے لیے نہیں اتارا گیا اور مشرکین کے پاس ایسی بات کا کوئی علم نہیں ہے نہ ہی ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے۔ کیونکہ آدمی کا مزاج ہے کہ وہ بہت ساری چیزوں کے بارے معلومات رکھتا ہے اور ان معلومات پر عقیدہ بنالیتا ہے جبکہ اس کے پاس پر کوئی دلیل اور ثبوت موجود نہیں ہوتا جیسے بعض معلومات تو ایسی ہیں جن پر کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی۔

آخر میں ان پر دلیل قائم کرنے کے لیے فرمایا ان کے پاس کوئی یاور اور مددگار نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان مشرکین کے کے پاس اپنے معبودوں کے بارے کوئی دلیل یا ثبوت موجود ہوتا تو پھر وہ دلیل بطور حجت پیش کرتے وہ جھوٹے معبود ان کے یاور و مددگار

ہوتے تو ان کے پاس دلیل و برہان ہوتی کیونکہ جو دلیل و برہان پیش کرتا ہے تو وہی دلیل و برہان اس کے لیے مددگار ہوتا ہے جس نے اسے پیش کیا ہے۔ یہ قانون ہے لیکن یہ مشرکین ظالم و ستمگار ہیں بغیر دلیل اور ثبوت بے ہودہ دعویٰ کرتے ہیں، اسی وجہ سے آخرت میں بھی ان کا یاور و مددگار نہ ہوگا۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾

ترجمہ: ''اور جب انہیں ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو تم منکروں کے چہروں میں ناراضگی دیکھو گے، قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں ان پر حملہ کردیں، کہہ دو کیا میں تمہیں اس سے بھی بدتر بات بتاؤں، آگ ہے کہ جس کا اللہ نے منکروں سے وعدہ کیا ہے، اور وہ بری جگہ ہے۔''

آیات سننے پر مشرکین و کفار کا ردعمل

اس آیت میں اللہ مشرکین اور کافروں کی اس کیفیت کو بیان کر رہا ہے کہ جب اللہ کی آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں تو اے رسولؐ تم کافروں کے چہروں پر یہ نظارہ کروگے کہ انکار کے آثار نمایاں ہیں، اس قدر انکار کہ ایسا لگتا ہے جیسے ان آیات کو پڑھنے والوں پر ٹوٹ پڑیں گے اور ان پر دست درازی کریں گے۔ اس آیت کا ہدف ہے کہ ان کو ڈانٹا جائے کہ وہ قرآن سننے سے انکاری ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ کو فرمایا کہ ان کافروں اور مشرکوں سے کہہ دو کہ میں ایسی

بات بتادوں کہ جس کو سن کر تمہیں قرآن سننے سے بھی زیادہ تکلیف ہو گی؟ اگر چاہتے ہو تو میں وہ بتادوں تاکہ تم اپنا بچاؤ کر سکو۔ پھر فرمایا: اے کافرو تم یہ اچھی طرح جان لو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے دوزخ کی آگ کا وعدہ دیا ہے اور آگ میں جاپڑنا یہ بہت ہی برا انجام ہے جو کافروں اور مشرکوں کے لیے مقدر ہے لہٰذا تم اس انکار سے پرہیز کرو۔ اس انکار کی وجہ سے آتش جہنم تمہارا مقدر ہو گا لہٰذا انکار کرنا چھوڑ دو۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

ترجمہ: "اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سنو، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اگرچہ وہ سب اس کے لیے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے تو اسے مکھی سے چھڑا نہیں سکتے، عابد اور معبود دونوں ہی عاجز ہیں۔"

تمام انسانوں سے اللہ کا خطاب

اس جگہ مشرکین اور غیر مشرکین سب انسانوں سے اللہ مخاطب ہے؛ اللہ فرماتا ہے: اے انسانو! ایک مثال تمہارے لیے پیش کی جارہی ہے اس پر کان دھرو اور غور سے سنو پھر اس سے نصیحت پکڑو۔ حقیقت امر اس طرح ہے یہ معبود جو اللہ کے سوا ہیں اور جن کی پرستش کی جاتی ہے اگر فرض کرلیں کہ وہ ایک مکھی خلق کرنا چاہیں تو یہ بناوٹی معبود مکھی کو خلق نہیں کر سکتے اگرچہ سارے اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ جبکہ مکھی ایک کمزور تر حیوان ہے، خلقت تو بڑی بات ہے اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے تو یہ سب مل کر اس چھینی ہوئی چیز کو اس سے

واپس نہیں لے سکتے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے معبود خود انہوں نے بنا رکھے ہیں وہ نہ خلق کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ تدبیرِ اُمور ان کے اختیار میں ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر یہ کس طرح اس لائق ہو سکتے ہیں کہ ان کی پرستش کی جائے۔

آخر میں فرمایا کہ طالب اور مطلوب دونوں ضعیف و کمزور ہیں۔ طالب سے مراد بت پرستوں کے معبود ہیں جو مکھی خلق کرنے کی کوشش کریں اور مکھی سے وہ واپس لینا چاہیں جو ان سے مکھی لے گئی ہے، مطلوب سے مراد مکھی ہے۔ یہ جملہ ان بتوں کی انتہائی کمزوری اور بے چارگی کو بیان کر رہا ہے۔ بتوں کی کمزوری اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ کمزور ترین مخلوق جو مکھی ہے اس کے بنانے پر قادر نہیں بلکہ اگر یہ کمزور مخلوق ان سے کچھ لے جائے تو اسے واپس نہیں لے سکتے۔ عقلمندوں کے لیے یہ مثال کافی ہے کہ بت پرست ان بتوں کی پوجا پاٹ کو چھوڑ دیں۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: ”انہوں نے اللہ کی کچھ بھی قدر نہ کی، بے شک اللہ زور والا غالب ہے۔“

اللہ کی معرفت کا نہ ہونا

اللہ کی بلندی کا، اللہ کی اعلیٰ صفات کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کی معرفت حاصل کرتے اور اس کی شان کا اندازہ انہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں جانی اور نہ ہی اللہ کی شان کو جانا اور اللہ کو اپنا رب نہ بنایا۔ اللہ کے اوامر پر عمل نہ کیا اور اللہ کی نواہی کو ترک نہیں کیا بلکہ اللہ کے غیر کو اپنا معبود بنا لیا۔ ڈر اور لالچ میں ان کی عبادت کرنا شروع کر دی جبکہ اُنہوں نے جن کو اپنا معبود بنا لیا وہ نہ تو کسی شئی کی ایجاد پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی جز کے امور کی تدبیر کر سکتے ہیں۔ اللہ تو یکتا ہے طاقتور ہے، اس میں ضعف و کمزوری نام کی کوئی کیفیت و حالت موجود نہیں۔ ہر گز ذلت اور کمزوری اس کے لیے نہیں ہے

لیکن مشرکین ایسے قادر مطلق اور عزیز مطلق خدا اور ان بتوں کے درمیان جو مکھی سے بھی کمزور ترین ہیں فرق ہی نہیں کر سکے اور اللہ کو اپنا رب قرار نہیں دیا۔ انہوں نے اپنے رب کے حق میں انکار ہی کیا ہے۔

اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ‌ۚ ۝۷۵

ترجمہ: ''فرشتوں اور آدمیوں میں سے اللہ ہی پیغام پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے، بے شک اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اللہ کے مصطفےٰ بندے

مصطفےٰ وہ ہوتا ہے جو خالص ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرشتگان سے اور انسانوں سے جو پیغام رسانی کی صلاحیت رکھتے تھے صاف و شفاف تھے انہیں اپنی رسالت اور پیغام رسانی کے لیے چن لیا اس امر کا لازمہ یہ ہے کہ:

۱۔ مخلوق کے لیے رسول کو قرار دینا اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔ یہ اللہ کا اپنے بندگان پر لطف و فضل کا تقاضا ہے۔

۲۔ رسول معصوم ہوتا ہے وہ ہر قسم کی بھول چوک غلطی اور ہر قسم کے گناہ سے پاک ہو۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ سننے والا اور بینا (دیکھنے والا) ہے اللہ رسولوں کے وسیلہ سے ہدایت پانے والوں کو جانتا اور پہچانتا ہے اور ان کی حاجات کو سنتا ہے اور انہیں پورا کرتا ہے اسی لیے تو اپنے رسولوں کو ان کے پاس بھیجتا ہے۔

اللہ ہی فرشتوں میں سے بعض کو پیغام رسانی کے لیے انتخاب کرتا ہے اور وہ فرشتے اللہ کا پیغام

اللہ کے رسول تک پہنچاتے ہیں اللہ ہی اپنے اور رسولوں کے درمیان فرشتوں کو الٰہی پیغام رسانی کا وسیلہ بناتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

ترجمہ: ''وہ ان کے اگلے اور پچھلے حالات جانتا ہے، اور سب کاموں کا مدار اللہ پر ہے۔''

فرشتوں کا رسولوں کے ساتھ ارتباط

''مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ'' سے فرشتوں اور ان کا جن کے پاس وحی آتی ہے ارتباط اور رابطہ مراد ہے اور ''مَا خَلْفَهُمْ'' سے مراد فرشتوں اور اللہ کے درمیان رابطہ و تعلق ہے۔ تمام فرشتے اللہ کی طرف سے وحی لے کر اللہ کے مصطفٰے بندوں کے پاس آتے ہیں لہٰذا فرشتے جو وحی لاتے ہیں حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے مقام سے وصول کرنے سے لے کر اسے اللہ کے مصطفٰے بندوں تک پہنچانے تک محفوظ مقام پر ہوتے ہیں، انہیں کوئی نقصان نہیں دے سکتا اور نہ ہی ان کی ذمہ داری میں کسی قسم کا خلل پیدا ہو سکتا ہے۔ اس پیغام میں کچھ کم ہوتا ہے اور نہ اس میں کچھ اضافہ ہوتا ہے اور وہ کچھ بولتے بھی نہیں۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ جن کے پاس وہ پیغام لایا گیا ہے وہ بھی معصوم ہوں، وحی وصول کرنے اس کی حفاظت کرنے اور اسے آگے پہنچانے میں معصوم ہیں، کچھ بھی کم کریں گے نہ کچھ اضافہ کریں گے۔

اس کے بعد اس کی وجہ کہ فرشتوں کے تمام احوال کا علم اللہ کے پاس ہے جس کو بیان کیا ہے۔ سب کی بازگشت اللہ کی جانب ہے تو پھر اللہ کی کسی بھی مخلوق کا کوئی کام اللہ سے کیسے غائب رہ سکتا ہے جبکہ ہر چیز اللہ کی مملوک ہے اور ان کا استقلال ہی نہیں بلکہ سب ذاتی طور پر اللہ کی طرف ہی پلٹیں گے لہٰذا کچھ بھی اللہ سے مخفی نہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾

ترجمہ: ”اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کرو تاکہ تمہارا بھلا ہو۔“

نماز کا حکم

رکوع اور سجود سے نماز کا قیام مراد ہے اور ”وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ“ سے ان عبادات کو انجام دینا مراد ہے جن کا شریعت اسلامی میں حکم دیا گیا ہے۔ (یا جو دین میں عبادات قرار دی گئی ہیں) کیونکہ معاشرہ کی بھلائی، افراد کی سعادت مندی اور ان کی پرامن زندگی ان قوانین پر عمل کرنے سے عبارت ہے جو دین نے انسان کے لیے قرار دیئے ہیں اس پر عمل کرکے ہی فلاح اور رستگاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز قائم کرنا اور دوسری عبادات کو انجام دینا اور دین کے احکام پر عمل انسان کی سعادت وفلاح کے لیے لازمی شرط ہے۔

وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: ”اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے، اس نے

تمہیں پسند کیا ہے اور دین میں تم پر کسی طرح کی سختی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام پہلے سے مسلمان رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ بنے اور تم لوگوں پر گواہ بنو، پس نماز قائم کرو اور زکوۃ دو اور اللہ کو مضبوط ہو کر پکڑو، وہی تمہارا مولیٰ ہے، پھر کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔"

جہاد کا حکم

جہاد کا معنی جدوجہد، کوشش و سعی کرنا ہے تاکہ خود سے دشمن کو دور کیا جائے۔ ہر وہ جو انسان کو نقصان پہنچائے اسے اپنے سے دُور کرنا جہاد کہلاتا ہے۔ شیطان انسان کو اللہ سے دُور کرتا ہے، غلط راستہ پر لگاتا ہے، نفس امارہ برائی پر آمادہ کرتا ہے اس لحاظ سے جہاد کا حکم شیطان سے مقابلہ کرنا اور نفسانی خواہشات کی مخالفت کو بھی شامل ہے۔ فقط تلوار سے دشمن سے لڑنا ہی جہاد کا مصداق نہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے نفس کے خلاف جہاد کو جہاد اکبر قرار دیا ہے۔ حقِ جہاد یہ ہے کہ ہر قسمی جہاد خالص اللہ کے لیے ہو، اس میں کوئی دُنیاوی غرض شامل نہ ہو۔ پھر مومنوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل و احسان جتایا کہ اللہ نے اے مسلمانو! ہم نے تمہیں ساری مخلوقات سے چن لیا ہے، ہدایت کی نعمت اور دین حق کی نعمت تمہیں عطا کی ہے۔ دین سے ہر قسم کلی حرج، مشکل و دشواری کو اٹھا لیا ہے کیونکہ شریعت اسلام سھل اور آسان شریعت ہے یہ وہی شریعت ابراہیمی ہے جس کو دین فطرت کہا گیا ہے جس میں شرک کی گنجائش نہ ہے۔ اس شریعت کے احکام اور اس کے قوانین میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو مسلمانوں کا باپ کہا گیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ سب سے پہلے اس شریعت کے پیروکاروں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے مسلمان نام رکھا اور وہی اللہ کے حکم کے آگے تسلیم محض ہوئے۔ سورہ البقرہ میں ہے "جب ان کے لیے (ابراہیم)

ان کے رب نے یہ کہا کہ اسلام لے آؤ تو ابراہیم نے کہا کہ میں رب العالمین کے لیے اسلام لے آیا ہوں"۔

اور پھر یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ۔۔۔ (سورۂ ابراہیم، آیت: ۳۶)

ترجمہ: "اور جس نے میری پیروی کی تو وہ شخص مجھ سے ہے۔۔۔"

لہٰذا دُنیا کے سارے مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں وہ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت اور اولاد ہیں، سب ابراہیمی ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پہلے اور اسی قرآن میں بھی تمہارا نام مسلمان قرار دیا ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا ہے اور ان کے اسلام لانے کو قبول کر لیا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے تاکہ رسول گرامی اسلام پر شاہد اور گواہ ہوں، تمام مخلوقات کے اعمال پر اور اُمت اسلامیہ دوسری تمام اُمتوں کے اعمال پر گواہ ہو۔[1]

اس کے بعد گذشتہ سارے مطالب پر یہ نتیجہ مرتب کیا ہے، لہٰذا آپ مسلمانوں پر ہے کہ تم سب

۱۔ نماز قائم کرو۔ ۲۔ زکوٰۃ ادا کرو۔

یعنی عبادتی اور مالی واجبات کو ادا کرو اور ہر حال میں اللہ سے وابستہ و متمسک رہو اور جو اللہ نے امر کیا ہے اس کے مطابق عمل کریں اور جس سے روکا ہے اس سے رُک جائیں۔

1۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں اعمال کی گواہی کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

کسی بھی حال میں اللہ سے رابطہ منقطع نہ کریں کیونکہ اللہ ہی تمہارا مولا اور سرپرست ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ بندہ اپنے مولا سے رابطہ منقطع کردے۔ اس کے بعد اللہ کی ستائش اور مومنوں کے دلوں کو خوش کرنے کے لیے اور مومنوں کے دلوں کو محکم بنانے کے واسطے فرمایا ہے:

"اللہ کتنا ہی بہترین مولا اور کتنا اچھا یاور اور مددگار ہے"۔